



Downloaded and PDF created
by
imarshad@gmail.com



308 خالد جیلانی عہد کے کوآن
306 آپ کا اور گی خانہ آسیہ آفتاب

318 نقیاتی از دواچی الجھنیں عدنان

320 نیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور

اکتوبر 2008
جلد 36 شمارہ 6
قیمت 40 روپے

285 ایک رنگارنگ سلسلہ شگفتہ جاہ
302 روشن حرف وہ سارے عمرانہ کوثر
314 خبریں ویریں غزل فتر
304 کلیاں شہگوفہ فاطمہ ثانی
312 باتیں گلابوں کی سائرہ غلامی

289 آپ کی بیاض سے خالد جیلانی

فرسٹ سالانہ بک کیلئے رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 3500 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 4500 روپے

پبلشر آزاد بیاض نے اس حسن پر غور کر کے اسے شائع کیا۔ مقام اشاعت: بی 91، بلاک W، دارالحکومت اسلام آباد، پاکستان

92 در کھول دو راحت جبین
166 متاع جان ہے تو فرحت اشتیاق

62 تمنا کا دوسرا قدم شمسہ بخاری
146 کالی نھی اور مٹا، فاترہ افتخار
264 تلاش میں میمونہ خورشید
238 تم ملو تو عید ہو، حمیرا خان

84 نیا طاحم، سمیعہ صدق
140 اے روشنیوں کے شہر فوزیہ فرخ
236 عشق ہو تو سعدیہ عزیزی

283 غزل رضوی آثم
283 غزل حسن عباسی
284 نظم فاطمہ نجیب
284 غزل اداجعفری

14 مدیر کہنی سننی
15 ادارت کرین کرین روشنی
294 نادرہ خاتون ہمارے نام

20 بیان ایک ساتس دانک، افشاجی

292 میری ڈائری سے امت الصبور

22 یاتیں جگن ناظم سے شاہین رشید

28 عید آتی ہے، شاہین رشید
300 خامشی کو سیال ملے ادارہ

212 تیری کلیاں، فاترہ افتخار
36 محبت خوابِ فخر و حسانتہ نگار

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمار عیدِ غیر پیش خدمت ہے۔

اور خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے آپ کو ملی عید مبارک۔

عیدِ اجتماعی خوشیوں کا پہلو ہے۔ ملتے جلتے خوشیاں بانٹنے کا دن ہے مگر آج بھی ہمارے وطن عزیز کے ایک حصے میں جنگ جاری ہے جس کا نشانہ بے گناہ شہری، معصوم بچے اور خواتین بن رہی ہیں۔ یہ جنگ ہماری ہے یا ہم کسی اور کے متاعِ ہوس کے کرے ہے؟ یہ بحث فضول ہے۔ زمینِ خالق یہ ہیں کہ اب اس جنگ کے شعلے ہمارے گھر و ملک کی دیوار تک پہنچے ہیں۔ غنائی احساس کی گرائی، توانائی کا بحران اور خوف و ہراس جس نے بیرونی سرمایہ کاری کو کیا مکملی سرمایہ کاری کے امکانات بھی محدود کر دیے ہیں۔ مستقبل کی کسی منصوبہ بندی کے بغیر بیرونی امداد کے سہارے زندہ رہنے والی قوموں کا حقدار اس کے گالبا ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے محروم قیادت اور علم و تہذیب کی کمی نے ہمیں اس موذی لاکھڑا کیا ہے جہاں مارے راستے محدود نظر آتے ہیں۔ جو میں کرنا چاہیے تھا وہ ہم نے نہیں کیا۔ اب کسی مجرّم کا انتظار کرنے کے بجائے اپنی قوتِ عمل کو بیدار کرنا ہو گا کہ اب ہماری بقا کا یہی ایک راستہ ہے۔

وہ بے خانان اے گھر لوگ جو خلی زمین اور گئے آسمان تھے امداد کے منتظر ہیں۔ ہمارے اپنے ہیں، ان کی مدد کرنا ہمارا فرضِ اولین ہے۔ خوشی کے اس موقع پر انہیں ضرور یاد کیجیے گا۔

محمود بابریسل (ذوالقرنین)

کچھ لوگ دنیا میں جتنیں اوروں کی سیالیاں بانٹتے آتے ہیں، وہ اپنی غریبوں سے سب کے دل میں گھر کر لیتے ہیں، محمود بابریسل ایسی ہی شخصیت تھے۔ اپنی ذہانت، زندہ دلی اور خوش مزاجی کی حسین باتیں پھر پھر اس دلہنائی سے وضاحت ہو گئے ہیں۔ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔

25- اکتوبر کو ان کی برسی کے موقع پر بڑے ملے مغفرت کی درخواست ہے۔

سانحہ ارتحال

مشہور شاعر شائق بلیاوی جلدی سامعی خاطر شانی کے والد اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔

آلہ اللہ و آتالہ لہ لرحمۃ

شائق بلیاوی ایک اچھے شاعر اور اچھے انسان تھے۔ آپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی اور صدمہ ہے ہم خاطر شانی کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حرم کو اپنے حمار رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں

- درپچہ کول دو ساچن - راحت جبین کا مکمل ناول،
- مستراح جال ہے تو - فرحت اشتیاق کا مکمل ناول،
- ثمرہ بخاری، فائزہ افتخار، بیہودہ خورشید علی اور حمیرا خان کے ناول،
- سعدیہ عزیز آفریدی، فخریہ فرخ اور میو صوف کے افسانے،
- رضوان نگار صدان اور فائزہ افتخار کے ناول،
- بکیتے ہیں عید کی ہے - معروف شخصیات سے خصوصی عید فریٹ
- میری ناشی کو بیاں ملے - قادر بن سے سونے،
- باتیں کستاویں کی - نئی کتابوں پر تبصرہ،
- عید کے بھوان، آپ اور آپ کا باورچی خانہ،
- کرن کرن سونی، لیلیاں ازاد جی، انجین اور دیگر مکمل سلسلے شاعریں۔
- خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کسلا گا؟ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔ پوری اُمتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور اوصوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چند مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

سکین کرین روشنی

ادارہ

انھارے جانیں گے۔ جس دن تمام لوگ رب العالمین سے سامنے کھڑے ہوں گے (یعنی اس دن سے ڈرنا چاہیے اور ناپ تول میں کمی سے توبہ کرنی چاہیے) (مطفیقین)

احادیث نبویہ

لوگوں میں عیب تلاش کرنا

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا اگر تم لوگوں کے عیوب تلاش کرو گے تو ان کو بگاڑ دو گے۔ (ابوداؤد)

ف: مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں عیوب کو تلاش کرنے سے ان میں نفرت، بغض اور بدعت ہی برائیاں پیدا ہوں گی اور ممکن ہے کہ لوگوں کے عیوب تلاش کرنے اور انہیں پھیلانے سے وہ لوگ ضد میں گناہوں پر جرأت کرنے لگیں گے۔ یہ ساری باتیں

مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے

بستان لگانا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور جو لوگ مسلمان مردوں کو اور مسلمان عورتوں کو بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی (ایسا کلمہ کیا ہو) جس سے وہ سزا کے مستحق ہو جائیں (ایذا پہنچاتے ہیں تو وہ لوگ بستان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں)۔ (احزاب)

ف: اگر ایذا زبانی ہے تو بستان ہے اور اگر عمل سے ہے تو صریح گناہ ہے۔

ناپ تول میں کمی کرنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بڑی باتیں ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے کہ جب لوگوں سے (پنا حق) ناپ کر لیں تو پورا لے لیں اور جب لوگوں کو ناپ کریا تول کر دیں تو کم کر دیں۔ کیا ان لوگوں کو اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے

ان میں مزید لگاؤ کا سبب ہوں گی۔ (بذل المجهود)
مسلمان کو ستانا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں کو ستانا نہ کرو، ان کو عار نہ دلایا کرو اور ان کی لغزشوں کو نہ تلاش کیا کرو۔ (ابن حبان)
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے وہ لوگو جو صرف زبانی اسلام لائے اور ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو اور ان کے عیوب کے پیچھے نہ پڑو۔ کیونکہ جو مسلمانوں کے عیوب کے پیچھے پڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس کے عیوب کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اسے گھر بیٹھے رسوا کر دیتے ہیں۔ (ابوداؤد)

ف: حدیث شریف کے پہلے جملہ سے اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی غیبت کرنا منافی کا کام ہو سکتا ہے مسلمانوں کا نہیں۔ (بذل المجهود)

راستہ بند کرنا

حضرت انس جہنی رضی اللہ عنہ کے والد فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں گیا۔ وہاں لوگ اس طرح ٹھہرے کہ آنے جانے کے لیے راستہ بند ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں اعلان کرنے کے لیے ایک آدمی بھیجا کہ۔

”جو اس طرح ٹھہرا کہ آنے جانے کا راستہ بند کر دیا اسے جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔“ (ابوداؤد)

اللہ کی ناراضی

حضرت ابوالامد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
”جس شخص نے کسی مسلمان کی بیٹیہ کو بگاڑ کر کے

ناحق مارا وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوں گے۔“ (طبرانی، مجمع الزوائد)
مفلس کون ہے؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (رضی اللہ عنہم سے) ارشاد فرمایا۔

”کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟“
صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے عرض کیا۔
”ہمارے نزدیک مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس کوئی درہم (پیسہ) اور (دنیا کا) سامان نہ ہو۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”میری امت کا وہ شخص ہے جو قیامت کے دن بہت سی نماز روزہ زکوٰۃ اور دوسری مقبول (عبادتیں) لے کر آئے گا مگر حال یہ ہوگا کہ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی۔ کسی پر تہمت لگائی ہوگی۔ کسی کا مال کھایا ہوگا۔ کسی کا خون بہلایا ہوگا اور کسی کو مارا پیٹا ہوگا تو اس کی نیکیوں میں سے ایک حق والے کو۔ (اس کے حق کے بقدر) نیکیاں دی جائیں گی۔ دوسرے حق والے کو اس کی نیکیوں میں سے (اس کے حق میں بقدر) نیکیاں دی جائیں گی۔ پھر اگر دوسرے کے حقوق چکائے جانے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو (ان حقوق کے بقدر) حقداروں اور مظلوموں کے گناہ جو انہوں نے دنیا میں کیے ہوں گے) ان سے لے کر اس شخص پر ڈال دیے جائیں گے۔ پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ (مسلم)

مسلمان کو گالی دینا

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا بے دینی ہے اور قتل کرنا کفر ہے۔ (بخاری)

ف: جو مسلمان کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے وہ اپنے اسلام کے کامل ہونے کی نفی کرتا ہے اور ممکن ہے کہ

قتل کرنا کفر مرنے کا سبب بھی بن جائے۔ (مظاہر حق)

مسلمان کو گالی دینے والا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”مسلمان کو گالی دینے والا اس آدمی کی طرح ہے جو ہلاکت — و بربادی کے قریب ہو۔“ (طبرانی جامع صغیر)

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے نبی! میری قوم کا ایک شخص مجھے گالی دیتا ہے جب کہ وہ مجھ سے کم درجہ کا ہے کیا میں اس سے بدلہ لوں؟“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”پس میں گالی کا پتھر کرنے والے دو شخص دوسرا شخص کی آنکھ میں پھینک دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو جھوٹا کہتے ہیں۔“ (ابن حبان)

نصیحت

حضرت ابو جری جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔

”مجھے نصیحت فرما دیجیے۔“
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”کسی کو گالی نہ دینا۔“ حضرت ابو جری فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی۔ نہ آزاد کو نہ غلام کو نہ اونٹ کو نہ بکری کو نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”کسی نیکی کو بھی معمولی سمجھ کر نہ چھوڑو۔ (مسلم) تک کہ (تمہارا) اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے بات کرنا بھی نیکی میں داخل ہے۔ اپنا تہمتہ آدمی بندہ لیں سے اونچا رکھا کرو۔ اگر اتنا اونچا نہ رکھ سکو تو (کم سے

کم) فتنوں تک اونچا رکھا کرو۔

تہمتہ کو فتنوں سے نیچے لٹکانے سے بچو کیونکہ یہ تکبر کی بات ہے اور اللہ کو تکبر پسند نہیں ہے۔ اگر کوئی تمہیں گالی دے اور تمہیں کسی ایسی بات پر عار دلائے جو تم میں ہو اور وہ اسے جانتا ہو تو اس کو کسی ایسی بات پر عار نہ دلانا جو اس میں ہو اور تم اسے جانتے ہو۔ اس صورت میں اس عار دلانے کا وبال اسی پر ہوگا۔“ (ابوداؤد)

برا بھلا کہنے پر خاموشی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرماتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اس شخص کے مسلسل برا بھلا کہنے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صبر کرنے اور خاموش رہنے پر) خوش ہوتے رہے اور تبتم فرماتے رہے۔ پھر جب اس آدمی نے بہت ہی زیادہ برا بھلا کہا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی کچھ باتوں کا جواب دے دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو کر وہاں سے چل دیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے آپ کے پاس پہنچے۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ (جب تک) وہ شخص مجھے برا بھلا کہتا رہا آپ تشریف فرما رہے پھر جب میں نے اس کی کچھ باتوں کا جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو کر اٹھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ (جب تک تم خاموش تھے اور صبر کر رہے تھے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا۔ پھر جب تم نے اس کی کچھ باتوں کا جواب دیا تو (وہ فرشتہ چلا گیا اور) شیطان (تم میں) آیا اور میں شیطان کے ساتھ نہیں بیٹھا (لہذا میں اٹھ کر چل دیا) اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا۔ ”ابو بکر! تین باتیں ہیں جو سب کی سب بالکل حق ہیں جس بندے پر کوئی ظلم یا زیادتی کی جاتی ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اس سے ورگزر کرتا ہے۔ (اور انتقام نہیں لیتا) تو بدلہ میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کر کے اس کو قوی کر دیتے ہیں جو شخص صلہ رحمی کے لیے دینے کا دروازہ کھولتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کو بہت زیادہ دیتے ہیں اور جو شخص دولت بربھانے کے لیے سوال کا دروازہ کھولتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دولت کو اور بھی کم کر دیتے ہیں۔ (مسند احمد)

کبیرہ گناہ

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ! کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالی دے سکتا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”ہاں (وہ اس طرح کہ) آدمی کسی کے باپ کو گالی دے پھر وہ جواب میں اس کے باپ کو گالی دے اور کسی کی ماں کو گالی دے پھر وہ جواب میں اس کی ماں کو گالی دے۔“ اس طرح گویا اس نے دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے کر خود ہی اپنے ماں باپ کو گالی دی ہوئی (مسلم)

دعا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔ ”یا اللہ! میں آپ سے عہد لیتا ہوں آپ اس کے

خلاف نہ کیجئے گا وہ یہ ہے کہ میں ایک انسان ہی ہوں لہذا جس کسی مومن کو میں نے تکلیف دی ہو اس کو برا بھلا کہہ دیا ہو لعنت کی ہو مارا ہو تو آپ ان سب چیزوں کو اس مومن کے لیے رحمت اور گناہوں سے

پاک اور اپنی ایسی قربت کا ذریعہ بنا دیجئے کہ اس کی وجہ سے آپ اس کو قیامت کے دن اپنا قرب عطا فرمادیں۔“ (مسلم)

مردوں کو برا کہنا

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”مردوں کو برا بھلا مت کہو کہ اس سے تم زندوں کو تکلیف پہنچاؤ گے۔“ (ترمذی)

ف : مطلب یہ ہے کہ وہ مرنے والے کو برا بھلا کہنے سے اس کے عزیزوں کو تکلیف ہوگی اور جس کو برا بھلا کہا گیا اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

مردوں کی خوبیاں

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”اپنے (مسلمان) مردوں کی خوبیاں بیان کرو اور ان کی برائیاں نہ بیان کرو۔“ (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”جس آدمی پر بھی اپنے (دوسرے مسلمان) بھائی کا اس کی عزت و آبرو سے متعلق یا کسی اور چیز سے متعلق کوئی حق ہو تو اسے آج ہی اس دن کے آنے سے پہلے معاف کرالے جس دن نہ دینار ہوں گے نہ درہم (اس دن سارا حساب نیکیوں اور گناہوں سے ہو گا لہذا) اگر اس ظلم کرنے والے کے پاس کچھ نیک عمل ہوں گے تو اس کے ظلم کے بقدر نیکیاں ملے کر مظلوم کو دے دی جائیں گی اگر اس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو مظلوم کے اتنے ہی گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔“ (بخاری)

بدترین سودا

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا ”بدترین سودا اپنے مسلمان بھائی کی آبروریزی کرنا ہے (یعنی اس کی عزت کو نقصان پہنچانا ہے چاہے کسی طریقے سے ہو)۔“ نصیحت کرنا، حقیر سمجھنا، سوا کرنا وغیرہ غیر (ظہری، جامع صغیر)

ف : مسلمان کی آبروریزی کو بدترین سودا اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جس طرح سود میں دوسرے کے مال کو ناجائز طریقہ پر لے کر اسے نقصان پہنچایا جاتا ہے اسی طرح مسلمان کی آبروریزی کرنے میں اس کی عزت کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اور چونکہ مسلمان کی عزت اس کے مال سے زیادہ محترم ہے اس وجہ سے آبروریزی کو بدترین سود فرمایا گیا ہے۔ (فیض القدر، بذل المجہود)

ناحق حملہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کبیرہ گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ ہے۔“ (ابوداؤد)

ذخیرہ اندوختی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”جس شخص نے مسلمانوں پر (غلہ کو) مزگا کرنے کے لیے روکے رکھا تو وہ گنہگار ہے۔“

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا جو شخص مسلمانوں کا غلہ (کھانے پینے کی چیزوں کو) روکے رکھے یعنی یا وجود ضرورت کے فروخت نہ کرے اللہ تعالیٰ اس پر کوڑھ اور فسخہ دیتی کو مسلط فرمادیتے ہیں۔ (ابن ماجہ)

ف : روکنے والے سے وہ شخص مراد ہے جو لوگوں کی ضرورت کے وقت منگائی کے انتظار میں غلہ روکے رکھے جبکہ غلہ عام طور پر نہ مل رہا ہو۔ (مظاہر حق)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! ”مومن مومن کا بھائی ہے ایمان والے کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کے سودے پر سودا کرے اور اسی طرح اپنے بھائی کے نکاح کے پیغام پر اپنے نکاح کا پیغام دے۔ البتہ پہلا پیغام بھیجنے کے بعد اگر ان کی بات ختم ہو جائے تو پھر پیغام بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔“ (مسلم)

ف : سودے پر سودا کرنے کے کئی مطلب ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان سودا ہو چکا ہو پھر تیسرا شخص بیچنے والے سے یہ کہے کہ اس شخص سے سودے کو ختم کر کے مجھے سودا کر لو۔ (نوری)

معاملات میں مکمل کے لیے علماء کرام سے مسائل معلوم کیے جائیں۔

نکاح کے پیغام پر پیغام دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی نے نہیں نکاح کا پیغام دیا ہو اور لڑکی والے اس پیغام پر مائل ہو چکے ہوں اب دوسرے شخص کو اگر اس نکاح کے پیغام کا علم ہے تو اس شخص کو اس لڑکی کے لیے نکاح کا پیغام نہیں دینا چاہیے۔ (بخاری)

دھوکا دینا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلہ کے ڈھیر کے پاس سے گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ مبارک اس ڈھیر کے اندر ڈالا تو ہاتھ میں کچھ تری محسوس ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ بیچنے والے سے پوچھا۔ ”یہ تری کیسی ہے؟“

اس نے عرض کیا ”یا رسول اللہ! غلہ بر بارش کا پانی پڑ گیا تھا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”تم نے بھیجے ہوئے غلہ کو ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں رکھا کہ خریدنے والے اس کو دیکھ سکتے۔ جس نے دھوکہ دیا وہ میرا نہیں (یعنی میری اتباع کرنے والا نہیں)۔“ (مسلم)





بیگان ایک سائنس دان کا انشائی

ابھی میں نے لیچر شتم کیا ہی تھا کہ وہ لپک کر میرے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پسل اور کھلی ہوئی نوٹ بک تھی۔ اس نے کہا۔
”معاف فرمائیے۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آج آپ نے جو تقریر کی ہے۔ اس میں اہم نکتے کیا تھے؟ اور اصل میں ابھی ابھی پہنچا ہوں جب آپ تقریر ختم کر کے میزبانوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔“
”گلیا بات ہے؟ آپ کو آنے میں کیسے دیر ہو گئی؟“
”جی۔ وہ ادھر ہاکی کا میچ ہو رہا ہے۔ ٹا میں ذرا اسے دیکھنے چلا گیا تھا۔“
”آپ کھیلوں کی رپورٹنگ بھی کرتے ہیں؟“
”جی نہیں۔ میں اس قسم کی رپورٹنگ نہیں کرتا۔ اپنی

سیاسی، ثقافتی اور اس قسم کی دوسری پیچیدہ تقریرات کی رپورٹنگ میرے ذمے ہے۔ کانٹے کا کھیل تھا آج ہاکی کا۔ ایک طرف اس میں پیٹیم خانہ حمایت اسلام کی ٹیم تھی اور اپنے اللہ دتے کھیل کا آغاز کیا تھا۔ دوسری طرف لیکن آپ کی تقریر کا موضوع کیا تھا؟“
”میری تقریر جدید سائنس کی فتوحات کے موضوع پر تھی۔“
”سائنس۔ خوب۔ بڑی اچھی چیز ہے سائنس۔“ اس نے فوراً پسل سے کاپی میں کچھ نوٹ کیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ ”معاف فرمائیے۔ فتوحات ”ط“ سے ہے یا ”ت“ سے ہے اور آگے چھوٹی ”ہ“ ہے یا بڑی ”ح“ ہے حلوے والی؟“

میں نے بتایا کہ ط اور چھوٹی ہ نہیں ہے۔
”اچھا۔ اب فرمائیے کہ لیچر کا مرکزی خیال کیا تھا؟“
”آج میں نے اس مسئلے کو لیا تھا کہ ریڈیائی لہروں کا ایسی تشکیلات پر کیا اثر پڑتا ہے؟“
”نہریے۔“ اس نے کہا۔ ”ریڈیائی کے کیا بچے ہوتے ہیں۔ ریڈیائی۔۔۔ ریڈیو۔ خیر میں سمجھ گیا۔“
اب اس نے اپنی نوٹ بک بند کرنے کی تیاری کی۔ اور پوچھا۔
”آپ کا پہلے بھی کبھی ہمارے شروذیر آباد سے گزر ہوا ہے؟“
”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ پہلا اتفاق ہے۔“
”میں کی چھروں، قینچیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“
”میرا کچھ خیال نہیں۔“
”آپ سلطان ہوٹل میں ٹھہرے ہوں گے۔ کیسا پایا اسے؟“
”اچھا خاصا ہے۔ ذرا کھیاں زیادہ ہیں۔“
”کھیاں۔ تو گویا گڑ کی منڈی تو شہر میں نہیں ہوتا چاہیے؟“
”آس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“
”آپ نے یہاں کا نام نہ لکھ دیا ہے؟“
”نہیں دیکھا۔“
”بڑا اچھا ہے۔“
”آپ سمجھتے ہیں تو اچھا ہی ہو گا۔“
اس نے جلد جلد اپنی ڈائری میں کچھ قلم بند کیا۔ پھر بولا۔
”یہاں کی میونسپلٹی کی کارگزاری کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”میں تو جی تو آیا ہوں۔ کیا کہہ سکتا ہوں؟“
”کیا یہ میونسپلٹی کیٹیوں والے ٹالاق نہیں ہوتے۔ کوڑے کے ڈھیر بڑے رہتے ہیں۔“
”ہاں اکثر شہروں میں تو ٹالاق ہی ہوتے ہیں۔ کوڑا نہ اٹھانے کی شکایتیں عام ہیں۔“
”آپ کا کیا خیال ہے؟ یہاں چنگی والے لوگوں سے رشوت نہیں لیتے؟“
”مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

”آپ کا خیال کیا ہے؟“
”بہت جگہ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں بھی لیتے ہوں۔“
”آوے کا آوازی بگڑا ہے۔“
وہ یہ محاورہ سن کر بہت خوش ہوا اور فوراً ”نوٹ بک میں چڑھایا۔ اور بولا۔
”آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ عام طور پر تو تقریریں کرنے والے خصوصاً ”سائنس پر بولنے والے بڑے پور“ ہوتے ہیں۔ بلکہ کوڑھ مغز اچھا تو خدا حافظ۔ ہاں ایک سوال اور ہے۔ یہ جو نیاریلوے کا بل بتا ہے۔ اس میں مکمل مل ہوا ہے۔ سنا ہے، سینٹ بہت تھوڑا ڈالا ہے۔“
”میں نے کہا۔“ آپ بہتر جانتے ہیں۔“
”آپ کا کیا خیال ہے؟“
میں نے عرض کیا۔ ”بہت جگہ ایسا ہو رہا ہے۔ ٹھیکیدار اور افسر ملی بھگت کیا کرتے ہیں۔“
اس نے خوش خوش سلام کیا اور چلتا ہوا۔
اگلے روز میری روائی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے میں نے اخبار خریدا اور کھولا تو سامنے ہی بڑی سی سرخی نظر آئی۔
”گڑ منڈی کو شہر سے باہر منتقل کیا جائے۔“
مشہور سائنس دان پروفیسر مولا بخش کی رائے۔ وزیر آباد۔ آج وزیر آباد کے نئی ہال میں مشہور سائنس دان پروفیسر مولا بخش کے یڈیو کے موضوع پر تقریر کی اور بتایا کہ ریڈیو کی کیسے حکامات کرنی چاہیے اور کیسے اس کے سیل بدلتے رہنا چاہیے۔ تاکہ فتوحات حاصل ہوں۔ پروفیسر مولا بخش نے وزیر آباد کی خوبصورتی کی تعریف کی لیکن چھری قینچیوں کے بارے میں تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ پروفیسر موصوف نے نئے مین کو بھی سراہا لیکن کیٹی کی مذمت کی جو کوڑا نہیں اٹھاتی۔ انہوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ وزیر آباد کے چوٹی والے رشوت لیتے ہیں اور ریلوے پل میں سینٹ کھڑا لگا دیا ہے۔ بلکہ آوے کا آوازی بگڑا ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے جو سلطان ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ مطالبہ کیا کہ شہر سے گڑ کی منڈی کو فوراً ہٹایا جائے ورنہ۔۔۔“
اس سے آگے میں نہ پڑھ سکا۔ اخبار میرے ہاتھ سے گر گیا۔
(بہ شکریہ بی کاک)



باتیں جگن کاظم سے

شاپین رشید

انہیں جگن کہتے ہیں۔

1 اصلی نام؟

سعدیہ مراد کاظم۔

2 پیار کا نام؟

جگن۔ پہلے مجھے جگنو کہتے تھے اب جگن کہتے ہیں۔

3 جنم دن/جنم شہر؟

7 جنوری/لاہور۔

4 قد بغیر جمل کے/ستارہ؟

5 فٹ 4 انچ/کیپری کورن

5 بسن بھائی اور آپ کا نمبر؟

ایک بسن جو مجھ سے 2 سال بڑی ہے اور ایک چھوٹا بھائی

ہے جو 13 ماہ مجھ سے چھوٹا ہے اب نمبر تو آپ کو پتہ چل

ہی گیا ہو گا۔

6 تعلیمی ڈگریاں؟

کمپیوٹر نیٹ ورکنگ میں ڈگری لی ہے۔ بی اے آنرز/

میڈیا اینڈ انفارمیشن سائنس اور تمام تعلیم میں نے کینیڈا

سے حاصل کی ہے۔

7 شادی کب کرنی ہے؟

میں شادی شدہ ہوں۔ میرا ایک بیٹا ہے دو سال کا حمزہ نام

ہے۔

8 ٹی وی پہ آمد؟

میں بچپن سے ہی ٹی وی پہ آ رہی ہوں۔ جب ساڑھے چار

سال کی تھی تو ”کوڈک“ کا کمرشل کیا تھا اور جب میں چار

سال کی تھی تو ”سیمسونٹ“ کا کمرشل کیا تھا۔

9 وہ پروگرام جس نے شہرت دی؟

میرے ہوسٹنگ کے پروگراموں نے اور اب ”پراسی“

سیرل نے۔

10 پہلی کمائی؟ کیا کیا تھا؟

بچپن کی کمائی تو یاد نہیں البتہ جب میں کینیڈا میں تھی تو

ایک انگریزی فچر فلم میں کام کیا تھا اس میں اتنا پیسہ ملا تھا کہ

میں نے کینیڈا میں ہی ایک گھر خرید لیا تھا۔

11 کس فنکار کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟

سلمان شاہد کے ساتھ اور نوجوان فنکاروں کے نام نہیں

لوں گی کہ پھر سب ناراض ہو جائیں گے۔

12 جس کے ساتھ کام کیا ان میں اچھا کس کو پایا؟

مجھے جن موفنکاروں نے متاثر کیا ان میں علی کاظمی، مسیح

خان اور اعجاز اسلم۔

13 آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟

اب تو ایک سی خواہش ہے کہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلواؤں

اور پاکستان میں ایک گھر خرید لوں۔

14 اپنی جسمانی ساقط میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟

قد چھوٹا ہے کاش ایک فٹ یا آدھا فٹ اور لمبی ہوتی۔

15 زندگی میں کیا کمی محسوس ہوتی ہے؟

کچھ نہیں سب کچھ اللہ نے دے دیا ہے۔ ہاں والد کی کمی

محسوس ہوتی ہے۔

16 فقیر کو کم سے کم کتنا دینی ہیں؟

سو سے کم ہیں کہ توہ بھی آپ کے منہ پر تھپڑ مار دے گا۔

17 گھروالوں کی کس بات سے موثر خراب ہو جاتا ہے؟

اگر تم نے شادی نہ کی ہوتی تو۔۔۔ بھی اللہ نے مجھے اولاد بھی

تو دے دی ہے۔

18 محبت کیا ہے؟

عزت محبت بغیر عزت کے کچھ نہیں۔

19 کھانے کے لیے زندہ ہیں یا زندہ رہنے کے لیے

کھاتی ہیں؟

میں تو کھانے کے لیے زندہ ہوں ”تماری“ زندہ باد۔

20 کن چیزوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟

موبائل فون۔

اپنے لیے بہت خرچ کر لیا اب دسروں پر کرتی ہوں۔

21 کیا جمع کرنے کا شوق ہے؟

بیک اور جوتے۔

22 فصاحت جوہری لگتی ہے؟

کہ سوچ سمجھ کر زندگی گزارو۔ بھی سوچتے سوچتے تو انسان

کی زندگی ہی گزر جاتی ہے اور پتہ ہی نہیں چلنا کہ زندگی

کمال لگی۔

23 وقت کی باندی کرتی ہیں؟

بہت زیادہ اپنے کام سے بندہ منٹ پہلے پہنچ جاتی ہوں۔

میرے لیے ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہوتا ہے۔

24 سنگٹل پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں؟

پارا میری ایک بری عادت ہے کہ میں دسروں کی گاڑیوں

میں گھورتی ہوں۔

25 زندگی میں شرمندگی کب ہوئی؟

جب میرے شوہر نے پہلی مرتبہ مجھے سب کے سامنے مارا

تھا۔

26 غصے کا اظہار؟

یا تو میں نظریہ انداز میں آپ آپ کر کے گفتگو کرتی ہوں اور

جب حد سے زیادہ غصہ آئے تو دروازہ بند کر کے روتی ہوں۔

27 اگر آپ پاور میں آجائیں تو پہلا کام کیا کریں گی؟

صاف پانی ہر خاص و عام کو مہیا کر دوں گی۔

28 کس چیز کے بغیر آپ نہیں رہ سکتی؟

حزہ اپنے بیٹے کے بغیر۔

29 مرد کی شخصیت میں کیا چیز خوب صورت لگتی

ہے؟

عزت کی نظر زبان کی نرمی۔

30 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟

بھوک پروا نہیں ہوتی اندھ لگتی ہوں۔

31 پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟

آنکھیں۔

32 سائنس کی بہترین ایجاد؟

موبائل فون۔

33 غصہ کب آتا ہے؟

جب میں کسی آدمی کو عورت کی بے عزتی کرتے ہوئے دیکھتی ہوں۔

34 کس شخصیت کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہیں؟
اپنے بیٹے حمزہ کو

35 آئینہ دیکھتی ہیں تو کیا خیال آتا ہے؟
اپنا وزن کم کروں۔

36 آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟
تو لکھتی ہوں اپنے خواب اور نئے نئے آئیڈیاز۔

37 پسندیدہ ڈانکے؟

نماری چائیاں کھانے اور اور نیل کھانے بہت پسند ہیں۔

38 والدین سے کوئی شکایت؟

ہاں کہ اگر وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھتے تو شاید بچوں کے غصے اتنے تیز نہ ہوتے۔

39 بس بھائی سے کوئی شکایت؟

بس اور بھائی بچپن میں اتنے شریف تھے کہ مجھے ذرا تیز چھینک بھی آجاتی تھی تو مجھے ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ ان کے سیدھے پن کی وجہ سے میرا ذرا سا ٹیڑھا پن بھی برداشت نہیں ہوا تھا۔

40 جھوٹ کب بولتی ہیں؟

جب کسی کو مسئلہ سے نکلانا ہو۔

41 آپ کیا چاہنا چاہتی ہیں؟

کچھ نہیں سب کچھ دے دیا ہے اللہ نے۔

42 کوئی گہری نیند سے اٹھاوے تو؟

میں گہری نیند نہیں سوتی اور صرف تین چار گھنٹے سوتی ہوں۔

43 تقدیر یہ یقین ہے یا تدبیر؟

دونوں پر یقین ہے صرف پیدا ہونے اور مرنے پر آپ کا کنٹرول نہیں ہے باقی جو کچھ ہے انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔

44 آپ شہر ہیں کہ...

جب میں آسکر ایوارڈ حاصل کروں۔

45 کن دہوں کو یاد کرتی ہیں؟

کالج اور یونیورسٹی کے دن۔

46 آپ کی کوئی عادت جو گھروالوں کو پسند نہیں؟
کہ میں گھروالوں کو ناگم نہیں دیتی۔ اپنے کام میں مگن رہتی ہوں یا حمزہ میں۔

47 کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟
نماری کھانے کے لیے۔

48 صبح اٹھتے ہی کس چیز کی طلب ہوتی ہے؟
سبز چائے (گرین ٹی)

49 بیدار ہوتے ہی کس کو دیکھنا پسند کرتی ہیں؟
حمزہ کو۔

50 کس پر چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟

ٹرفک پولیس پر۔

51 آپ کو یقین ہے کہ آپ جنت میں جائیں گی؟

بالکل نہیں بہت سی مشکل ہے کہ میں جنت میں جاؤں۔

52 کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں جاتیں؟

دونوں موبائل ڈائری (ایڈریس بک) اور کن گلاسز۔

53 اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا پسند ہے؟

مجھے اپنا چہرہ پسند نہیں ہے۔ عجیب گول سامنہ ہے۔

54 بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر کیا کیا رکھتی ہیں؟

اسکرپٹ بک۔

55 اچانک مہمانوں کی آمد کیسی لگتی ہے؟

بہت اچھی مجھے مہمان بہت اچھے لگتے ہیں۔

56 کس کو فون نمبر دے کر بچھتا ہیں؟

ہاں میں تو نہیں دیتی لیکن لوگ ادھر ادھر سے لے کر پریشان کرتے ہیں۔

57 کوئی دلچسپ SMS؟

ہاں ایک فین (پرستار) نے لمبا چوڑا ایس ایم ایس کیا کہ آپ مجھے بہت پسند ہیں میں آپ کے سارے پروگرام دیکھتا ہوں اور میری بیٹی ہوگی تو میں اس کا نام "جمن" رکھوں گا۔

58 اپنے لیے سب سے زیادہ قیمتی چیز کیا خریدی؟

اپنے شوہر کے لیے گاڑی خریدی تھی۔ اپنے لیے تو کچھ نہیں خریدا۔

59 دوسرے ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتی ہیں؟

میں ملک سے باہر آتھ تو دس سال رہی ہوں اور پروفیشنلزم کی جو ڈگری باہر کے ملک میں ہے وہ یہاں پاکستان میں نہیں ہے۔

60 کن باتوں کا بہت شوق ہے؟

میرا دل چاہتا ہے کہ میں سوشل ورک کروں۔

61 کون سا موسم دل کو کھاتا ہے؟

بہار بہت پسند ہے۔

62 اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟

لوگوں پر خرچ کرنا اور بری عادت یہ ہے کہ پوری لمبی چوڑی لسٹ ہے کہاں سے آغاز کروں کہاں پر ایڈ کروں۔

63 صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟

حمزہ کے ساتھ میری صبح ہوتی ہے وہ جب اٹھتا ہے میں بھی اٹھ جاتی ہوں۔

64 اکثر کیا سوچتی ہیں؟

کہ یہاں سے کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے۔

65 زندگی کب پری لگتی ہے؟

جب میں یہ سوچتی ہوں کہ جدھر مجھے پہنچنا ہے وہاں سے میں بہت دور ہوں۔

66 دنیا کی حسین مخلوق؟

کورے (انگریز)۔

67 اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ کیا کہتی ہیں؟

مجھے تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ اصل میں میاں کے جوتے کھانکھار آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں۔

68 دنیا کا خطرناک ترین ہتھیار؟

ہر وہ ہتھیار جو دوسروں کو نقصان پہنچائے۔

69 مذہب سے لگاؤ کتنا ہے؟

ایک ہوتی ہے صوفی سوچ اور ایک ہوتی ہے اسلامی میں صوفی ازم کی سوچ رکھتی ہوں کہ ہر چیز کو Accept کرنا سیکھو اور اس کے بعد جتنا سیکھو۔

70 کبھی نجوی کو ہاتھ دکھایا؟

ہاں۔ کہتا ہے تم جلدی مری جاؤ گی۔

71 اپنی شخصیت میں کیا یاد لانا چاہتی ہیں؟

شخصیت میں تو کچھ نہیں اپنی عادت بدلنا چاہتی ہوں۔

لوگوں پر اعتبار کرنا چھوڑنا چاہتی ہوں۔

72 اگر مذہب میں ایک فعل کی اجازت ہوگی تو کس کو قتل کرتیں؟

اگر یہ بہت ضروری ہو تو پھر اپنے آپ کو کرتی کسی کی جان لینے سے بہتر ہے کہ اپنی ہی جان لے لے۔

73 موت سے ڈر لگتا ہے؟

نہیں یا را

74 جیب میں کیا رکھتی ہیں پیسے کریڈٹ کارڈ یا اسے ٹی ایم؟

اسے ٹی ایم کارڈ۔

75 گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟

حمزہ کو جلدی سے گود میں اٹھاؤں اور ہار کروں۔

76 اسکیڈ لڑبٹے میں یا بانٹے جاتے ہیں؟

دونوں کوئی بات ہوتی ہے تو اسکیڈ لڑبٹے میں۔

77 میڈیا میں آنے کا فائدہ ہے یا نقصان؟

فائدہ تو بہت ہیں مگر ایک نقصان ہے کہ لوگ ہماری ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہے ہوتے ہیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 5 خوبصورت ناول

500/-	روحانی	رخسانہ نگار عدنان
180/-	تیرے نام کی شہرت	اشادہ چغتای
400/-	آئینوں کا شہر	فاخرہ انوار
150/-	میں سے عورت	غزلہ عزیز
300/-	دل آسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی

مکملے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 2216361

78 اگر کوئی آپ کو مسلسل گھورے تو؟
میں اسے گھورنے لگ جاؤں گی۔

79 بچپن میں کیا سوچا تھا کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟
جب میں چار سال کی تھی تو مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ بڑی ہو کر کیا ہوگی تو میں نے کہا تھا کہ میں بڑا ہو کر ایکسٹرنل گائے بھی نہیں پتہ تھا کہ میں لڑکی ہوں۔

80 ایک بات جس کا ہمیشہ آپ خیال رکھتی ہیں؟
کہ حزمہ کی ضروریات کی تمام چیزیں ہر وقت گھر پر موجود ہوں۔

81 کون سے جملے یا محاورے زیادہ استعمال کرتی ہیں؟
یار!

82 چوبیس گھنٹوں میں پسندیدہ وقت؟
صبح کا وقت۔

83 چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟
چھٹی ملے گی تو وقت گزاروں گی۔

84 کس لمحے نے آپ کی زندگی بدل دی؟
جب پہلی مرتبہ حزمہ کو میری گود میں دیا گیا تو احساس ہوا کہ اب بڑا ہونا پڑے گا۔

85 اگر میک اپ کے سالن پر باندی لگ جائے تو...
تو میں اللہ کا بہت شکر ادا کروں گی۔ مجھے میک اپ سے نفرت ہے۔

86 مردوں میں سنجیدگی اچھی لگتی ہے یا نہیں؟
مجھے وہ مرد اچھے لگتے ہیں جن میں حس مزاج ہوتی ہے۔

87 شو بزم میں تھپڑ پڑے؟
نہیں کسی سے نہیں پڑے۔

88 لوگوں کا آپ سے رویہ؟
میرے ساتھ تو تو نے فیصلہ افراد اچھے رویے کے ساتھ ہی ملتے ہیں۔

89 رقم کو کس انداز میں save کرتی ہیں؟
نفاذ سرنیفکٹ لے کر۔

90 دوسرے آپ کی کس بات کی تعریف زیادہ کرتے ہیں؟
کہ میں زندگی کو بہت زیادہ سیریس نہیں لیتی۔

91 موبائل فون فائدے یا نقصانات؟
مجھے تو فائدے ہی فائدے نظر آتے ہیں مگر نقصانات بھی ہیں۔

92 رومانٹک سن کرنا پر اہمیا ایزی؟
بڑی آسانی سے کرتی ہوں۔

93 کس بات کے لیے دل مچلتا ہے؟
کہ کاش میں اپنے بیٹے کو ایک باپ کا پیار دے پاؤں۔

94 ایک خواہش جس کی تکمیل تک اپنی زندگی کی دعا مانگوں گی؟
کہ میرے بیٹے کو جب تک ماسٹرز ڈگری نہ مل جائے میری زندگی کو کچھ نہ ہو۔

95 کس ملک کی شہرت لینے کی خواہش ہے؟
میرے پاس کینیڈا کی شہرت ہے۔

96 بات دل میں رکھتی ہیں یا اگل دیتی ہیں؟
ہر ایک کی سیکرٹ دل میں رکھتی ہوں۔

97 کوئی سوال پوچھ کر اکتا ہو؟
کہ تمہارا شوہر تمہیں مارنا کیوں تھا؟

98 کس ڈراما سیریز کے کپڑے پہنتی ہیں؟
عموماً ان باتوں پر دھیان نہیں دیتی جس ڈراما سیریز کے پسند آتے ہیں پس لیتی ہوں۔

99 کب او اس ہوتی ہیں؟
میں ذرا کم ہی او اس ہوتی ہوں۔

100 ڈراما سیریز کے وقت کس قسم کی میوزک سنتا پسند کرتی ہیں؟
میرا پسند حزمہ جو بھی سننے کی اجازت دے۔

101 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
خیر ہے کچھ اور کر لیں گے۔

بہنوں شعاع کا آئینا ماہنامہ

اکتوبر 2008 کے شمارے کی ایک جھلک

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ عید نمبر شائع ہو گیا ہے



”نوید عید“ عزیزہ سید کا مکمل ناول،
”زندگی کی دھوپ“ شمرہ بخاری کا مکمل ناول،
”شاید شمع جلتی رہے“ نزہت شہانہ حیدر کا مکمل ناول،
”دوستک“ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
”عید کا دن گزرے گا اس طرح“ قارئین سے سروے،
مشہور کمپیوٹر اداکار ”معین اختر“ کی یادیں،
”عید“ کے خصوصی پیکوان، مہینہ کے ڈیزائن اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
بشری احمد، رخسانہ نگار، عدنان اور فائزہ اختر کے ناول،
حبیبہ شمس، شمرین، شروت نذیر اور فائزہ راجہ کے افسانے،

شعاع کا اکتوبر کا شمارہ عید نمبر آج ہی خرید لیں۔

عید سروے

گوکہ ”عید“ خوشیوں کا پیغام لے کر آتی ہے۔ عید انعام ہے، رمضان المبارک کے تیس روزے رکھنے کا، لیکن دیکھا جائے تو اس مینے بحث سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ ایک تو منگائی پھر عید کی شاپنگ کا خرچ مگر عید تو بہر حال منانی ہے سحر و افطار میں چٹ پٹی چیزیں بھی کھائی ہیں تو پھر خرچ تو ہو گا ہی مگر آج کل جو منگائی ہے اس نے شاید ہمارے اس مذہبی تہوار کو ماند کر دیا ہے اب پہلے جیسا جوش و خروش نہیں رہا۔ عموماً ”لوگ آگئے آگئے اور پریشان پریشان سے لگتے ہیں۔ بیزاری ان کے چہروں پہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے عید سروے بھی کیا ہے۔

سوالات

☆ رمضان المبارک میں کون سا وقت اچھا لگتا ہے اور کون سا مشکل؟

☆ اس منگائی میں عید شاپنگ میں کس بات کو ترجیح دیں گے؟

☆ کیا مذہبی تہوار اب بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ منائے جاتے ہیں جیسے پہلے منائے جاتے تھے؟

کہتے ہیں عید لگتی ہے،

شائین رشید

شد روز ہزاری

1۔ مجھے سحری کا وقت مشکل لگتا ہے۔ خاص طور پر سحری کے وقت اٹھ کر کھانا کھانا پسند نہیں۔ ہاں سحری نماز



کے لیے اٹھتا ہوں۔ پھر مل جاتا ہے کہ جلدی سے سو جاؤں۔ ویسے روزے کا سارا وقت اچھا لگتا ہے اٹھنا اور اچھا لگتا ہے اور مشکل تو کوئی وقت نہیں لگتا۔ میں الحمد للہ پکا مسلمان ہوں۔

2۔ عید شاپنگ کے لیے میں لوگوں سے یہ کون سا گاہک جن کے پاس سب کچھ ہے، وہ ان لوگوں کی عید بنا دیں۔ بہن کے پاس کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ افروز نہیں کر سکتے۔ پیسوں والوں کی تو ہر وقت عید ہوتی ہے۔ غریبوں کی عید تو سال بعد آتی ہے۔ ان کے لیے آپ نئے پیرے اور جوتے خریدیں گے تو وہ زیادہ خوش ہوں گے۔

3۔ الحمد للہ مذہبی تہوار بہت جوش و خروش کے ساتھ منائے جاتے ہیں ہمارے گھر میں تو بہت ہی جوش و خروش ہوتا ہے۔ مثلاً ”شب برات“ میں ہمارے گھر ”مطلوے“ پکاتے ہیں۔ رات کو عبادتیں کرتے ہیں۔ رمضان المبارک کی تیاریاں، پھر عید کی تیاریاں، میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں مذہبی تہوار کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اس میں کوئی



کئی نہیں آتی ہے۔

مرتضیٰ چوہدری فورین شوپم

1۔ رمضان المبارک میں سحری اور افطار کا وقت اچھا لگتا ہے اور مشکل تو کوئی وقت نہیں لگتا۔ میں الحمد للہ پکا مسلمان ہوں۔

2۔ میں تو عید شاپنگ سینٹر کو زیادہ ترجیح دوں گا کیونکہ وہاں لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

3۔ مذہبی تہوار بہت جوش و خروش کے ساتھ منائے جاتے ہیں اور اس میں کوئی کمی نہیں آتی ہے۔

حنانول پندیر

1۔ سب سے پیارا وقت سحری کے بعد نماز پڑھنے کا ہے اور افطار اور سحری کے بیچ میں ایک مرتبہ ایسا وقت ضرور آتا ہے جب بہت اچھا محسوس ہوتا ہے جب آنکھ کھلتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ وقت کہہ رہا ہے کہ عبادت کے لیے آؤ۔ اور مشکل وقت وہ لگتا ہے کہ جب روزہ رکھ کر آپ فارغ بنی ہوئی ہوں۔ مجھے ہر وقت کام کرنا اچھا لگتا ہے اور روزہ رکھ کر بھی میں بہت کام کر سکتی ہوں۔ لیکن اگر کام نہ ہو تو بورت ہوتی ہے۔

2۔ عید کی شاپنگ کرنے کا تو وقت ہی نہیں ہے میرے

پاس اور بیچ پوچھیں تو مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے شاپنگ کرتے ہوئے ایک تو مجھے جمائیاں بہت آتی ہیں پھر بازار میں ڈھیر سارے رنگ دیکھ کر میں سوچتی ہوں کہ مجھے کیا لینا تھا اور میں کیوں بازار آئی ہوں۔ خیر! میں سمجھتی ہوں کہ عید شاپنگ میں اس چیز کو ترجیح دیں جو بہت ضروری ہے اور جس کے بغیر گزار مشکل ہے۔

3۔ ہمارے بچپن میں تو مذہبی تہوار بہت جوش کے ساتھ منائے جاتے تھے پھر جب جیسے جیسے معاشرے میں تبدیلی آتی جاتی ہے روایات بدلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے جیسے شادیاں ہوا کرتی تھیں اب ویسے نہیں ہوتیں، اسی طرح مذہبی تہواروں کی بھی پہلے جیسی بات نہیں رہی۔ اگرچہ سب کی روح ایک ہے مگر تھوڑا سا انداز بدل گیا ہے۔ لیکن بہر حال مجھے عید اور رمضان کی اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ بچپن میں ہوا کرتی تھی۔

شائستہ اقبال (نیوز کاسٹر ”آج“)

1۔ رمضان میں مجھے سب سے اچھا وقت وہ لگتا ہے جب میں اپنی فیملی کے ساتھ افطار کر رہی ہوتی ہوں اور سب سے مشکل وقت وہ لگتا ہے جب میں اسٹوڈیو میں خبریں پڑھ رہی ہوتی ہوں اور ”اذان“ کا وقت ہو جاتا ہے۔ اسٹوڈیو میں روزہ کھانا مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہاں اسٹوڈیو میں لوگ بھی کم ہوتے ہیں زیادہ اہتمام بھی نہیں ہوتا، بس سمجھ کر کھائی اور پھر بیٹھ گئے نیوز کے لیے ایک تو حکومت نے ٹائم بھی پیچھے نہیں کیا تو اور بھی زیادہ بوریٹ



بھی نہیں رہا۔ روزہ نہ رکھنا اب کوئی بڑی بات نہیں رہی۔
فہیم خان (خورشید شوہن)

1۔ مجھے عری کا وقت مشکل لگتا ہے کیونکہ کھانا پینا ختم کرنا پڑتا ہے۔ اور افطار کا وقت اچھا لگتا ہے کیونکہ کھانا کھاتا ہے۔

2۔ عید کی شاپنگ میں میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ اپنے گھر والوں کے لیے بہت سارا بہت سارا اور بہت سارا آٹا جمع کر لوں کیونکہ روٹی کے بغیر گزارا مشکل ہے یہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔

3۔ اب سچی بات ہے کہ مذہبی تنوار مذہبی رہے نہیں ہیں۔ اب ہم عید کو اس طرح مناتے ہیں جیسے ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں۔ چاند رات سے ہی ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ الحمد للہ آزاد ہو گیا ہے۔ بلا بازیاں لگائے بھانے اور شور شرابا شروع ہو جاتا ہے لگتا نہیں کہ عید ہے ایسا لگتا ہے جیسے نیو ایرنٹ ہے کہ بارہ بجتے ہی ہنگامے پٹاٹے اور سب خرافات شروع ہو جاتی ہیں۔ پہلے خوشی منائی جاتی تھی کہ عید آئی ہے اب خوشی منائی جاتی ہے کہ شکر ہے شیطان آزاد ہوا ہے۔ میری نظر میں مذہبی تنوار کی اب اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بلا رنارز ہو گئے ہیں۔ ہم نے مغرب کی اچھی چیزیں لینے کے بجائے بُری چیزیں لے لی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری خواتین

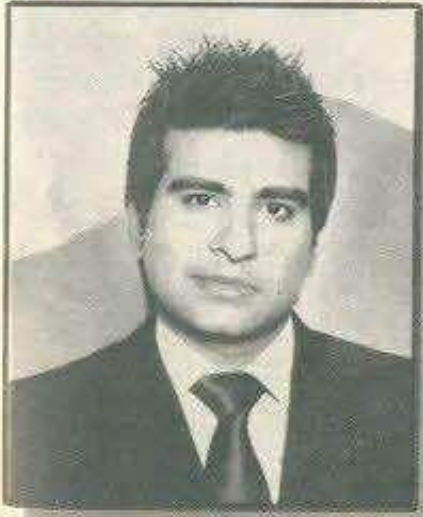


ہوتی ہے۔

2۔ سب سے پہلے تو اپنی جیب کو ترجیح دینا ہوگی کہ وہ عید شاپنگ کی اجازت دیتی ہے یا نہیں۔ منگانی اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ کوشش ہوتی ہے کہ کم چیزیں میں کچھ خریداری کریں۔ اب منگانی چیزیں خریدنے کے لیے تو بہت سوچنا پڑتا ہے۔ منگانی بڑھ رہی ہے۔ مگر تمنا ہیں وہیں کی وہیں ہیں۔ بہر حال اس منگانی میں کوشش یہی ہوگی کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی خیال رکھیں ان کی بھی مدد کریں۔ کیونکہ ہم تو پھر بھی بہت کچھ خریدنے کی

طاقت رکھتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کی خوشی عید سے وابستہ ہے ان کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کریں۔

3۔ میں تو سمجھتی ہوں اب مذہبی تنواروں کے لیے جوش و خروش بہت کم ہو گیا ہے۔ جس روایت کے ساتھ جس جذبے کے تحت پہلے تنوار منائے جاتے تھے اب نہیں منائے جاتے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو عید اور رمضان کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں افطاری بھیجا کرتے تھے۔ خاندان میں ایک دوسرے کے گھروں میں افطار کی دعوت ہوا کرتی تھی سب ایک جگہ اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب اگر کہیں افطار پارٹی ہوتی ہے تو اس میں ”دکھاوے“ کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ اب تو رمضان المبارک کا پہلے جیسا احترام



پھوٹے پھوٹے کپڑے پہنیں گی تو یورپین ہو جائیں گی تو بس اسی لیے مذہبی تنواریب جوش و خروش کے ساتھ نہیں منائے جاتے کہ ہم میں مغربی رنگ آگیا ہے۔ مذہب اور مذہبی تنواریک اہمیت اور برکت کو بھول چکے ہیں۔

شامل خان

1۔ رمضان المبارک کا مہینہ تو مجھے ویسے ہی اچھا لگتا ہے اور مجھے کوئی بھی وقت پورا مشکل نہیں لگتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عام دنوں میں بھی بندہ نمازیں پڑھ لیتا ہے لیکن اس مہینے میں تو عبادت کا کچھ اور ہی انداز ہوتا ہے۔ میں تو اس مہینے کا انتظار کرتا ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے اس مہینے عبادت کر کے سحر اور افطار کی تو کیا ہی بات ہے۔

2۔ سچی بات یہ ہے کہ میں عید کی کسی چوڑی شاپنگ نہیں کرتا۔ شاپنگ اور عید کی تیاری وغیرہ تو مہما ہی کرتی ہیں۔ اب زندگی میں تھوڑی سی تبدیلی آئی ہے تو یہ کہیں کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں عید اور تنواروں کے موقعوں پر بھی فضول خرچی نہیں کرتا اور نہ ہی اسلئے کہنے کا ارادہ ہے۔ اگر اس موقع پر ہم مستحق لوگوں کو زیادہ خیال رکھیں تو اپنا دل بھی مطمئن ہو گا اور خدا بھی خوش ہو گا۔

3۔ ہمارے ہاں تو ہر مذہبی تنوار بہت جوش کے ساتھ منائے جاتے ہیں۔ چونکہ ہم خود بہت اہتمام کرتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے سب ہی اہتمام کرتے ہیں۔ ویسے مجھے نہیں لگتا کہ جوش و خروش میں کمی آئی ہوگی۔

مدیحہ انجیل

1۔ مجھے سہری کا وقت اچھا لگتا ہے اور افطاری کے بعد کا وقت مشکل لگتا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے میں تو روزے بھی پورے نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ کام اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ پھر بھوک پیاس برباشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے تو عام دنوں میں بھی اتنی مصروفیت ہوتی ہے کہ وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلتا لیکن اس وقت یہ تسلی ہوتی ہے کہ روزہ نہیں ہے۔

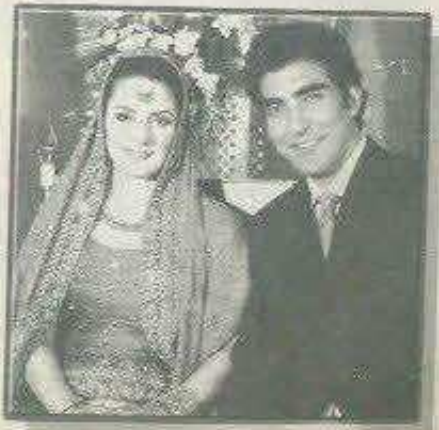
2۔ میری ترجیح تو یہ ہوگی کہ اس خوشی کے موقع پر غریبوں کی کچھ مدد کروں ان کی ضروریات کو پورا کروں تاکہ وہ بھی عید کی خوشیاں مناسکیں۔ ہم تو سارا سال ہی بہت کچھ حاصل کر لیتے ہیں اچھا اچھا پین لیتے ہیں لیکن غریبوں کی خوشی تو عید ہی ہوتی ہے۔

3۔ اب اس میں خاصی کمی آگئی ہے اب پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔ ایک وقت تھا کہ جب رمضان المبارک اور عید کی آمد بہت جوش و خروش اہتمام ہوتا تھا تیاریاں ہوتی تھیں مگر اب بہت ہی کم ہیں چنانچہ رمضان آجاتا ہے پھر عید آجاتی ہے اور اس کی وجہ میرے خیال میں تو منگائی ہے بیرون گاری ہے پریشانیاں ہیں دہشت گردی سیاسی حالات بھی ہیں اب بھروسہ اور ایمان لوگوں کا کمزور ہو گیا ہے نماز کے لیے مسجد میں جاتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں۔

عاصم علی (ڈائریکٹر اداکار)

1۔ عبادتوں کا مہینہ ہے اس لیے مجھے تو کوئی بھی وقت پورا مشکل نہیں لگتا۔ بلکہ کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارا جائے۔ اس مہینے کی خوبصورتی یہی ہے کہ لائف میں ایک چیلنج آتا ہے۔ سحر اور افطار کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔ میں تو اس مہینے کو بہت بھرپور طریقے سے مناتا ہوں۔ وہ سہری میں اٹھتا وہ پرائیوٹوں کا بننا سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ایک مخصوص وقت کے بعد کچھ نہ کھانا ہی تو اس مہینے کا سن ہے۔

2۔ سچ پوچھیں تو ہمارے جیسے ملک میں عید نہیں ہوتی چاہے۔ جہاں لوگوں کو کھانا میسر نہیں جہاں غربت حد



ہو گئی ہے کہ وہ پہلے جیسا جوش و خروش نظر میں آتا۔
کیونکہ اب لوگوں کو وہ وقت کے کھانے کی فکر ہے تو اس
مٹانے کے لیے ان کے پاس جذبات نہیں رہے ہیں۔

فضیلا: قیصر

1۔ مشکل تو کوئی نہیں لگتا البتہ کام بہت زیادہ ہو جاتا
ہے۔ رمضان میں دل کرتا ہے کہ نماز، قرآن پر زیادہ توجہ
دی جائے مگر عام ہی زیادہ نہیں ملتا اور بچن کا کام بہت بڑا
کرتا ہے۔ صبح سحری کے وقت نماز پڑھ کر سب فارغ ہوتی
ہوں تو وہ وقت بہت اچھا لگتا ہے۔

2۔ بچپن میں شاپنگ کا بہت شوق تھا پھر شادی کے بعد
بھی شوق پورے کے اب بچے بولے ہو گئے ہیں اسنے کچھ
دار ہو گئے ہیں کہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے
ہمیں کچھ نہیں لینا لہذا خرچ کیا دینی۔

3۔ جوش و خروش میں تو میرے خیال میں کمی نہیں
آئی بلکہ زیادتی ہی ہوئی ہے تو اس مٹانے کے جوش میں
لوگ فضول خرچ ہو گئے ہیں۔ اپنی جیب پر غلم کرتے ہیں
پھر کہتے ہیں کہ منگانی ہو گئی ہے۔

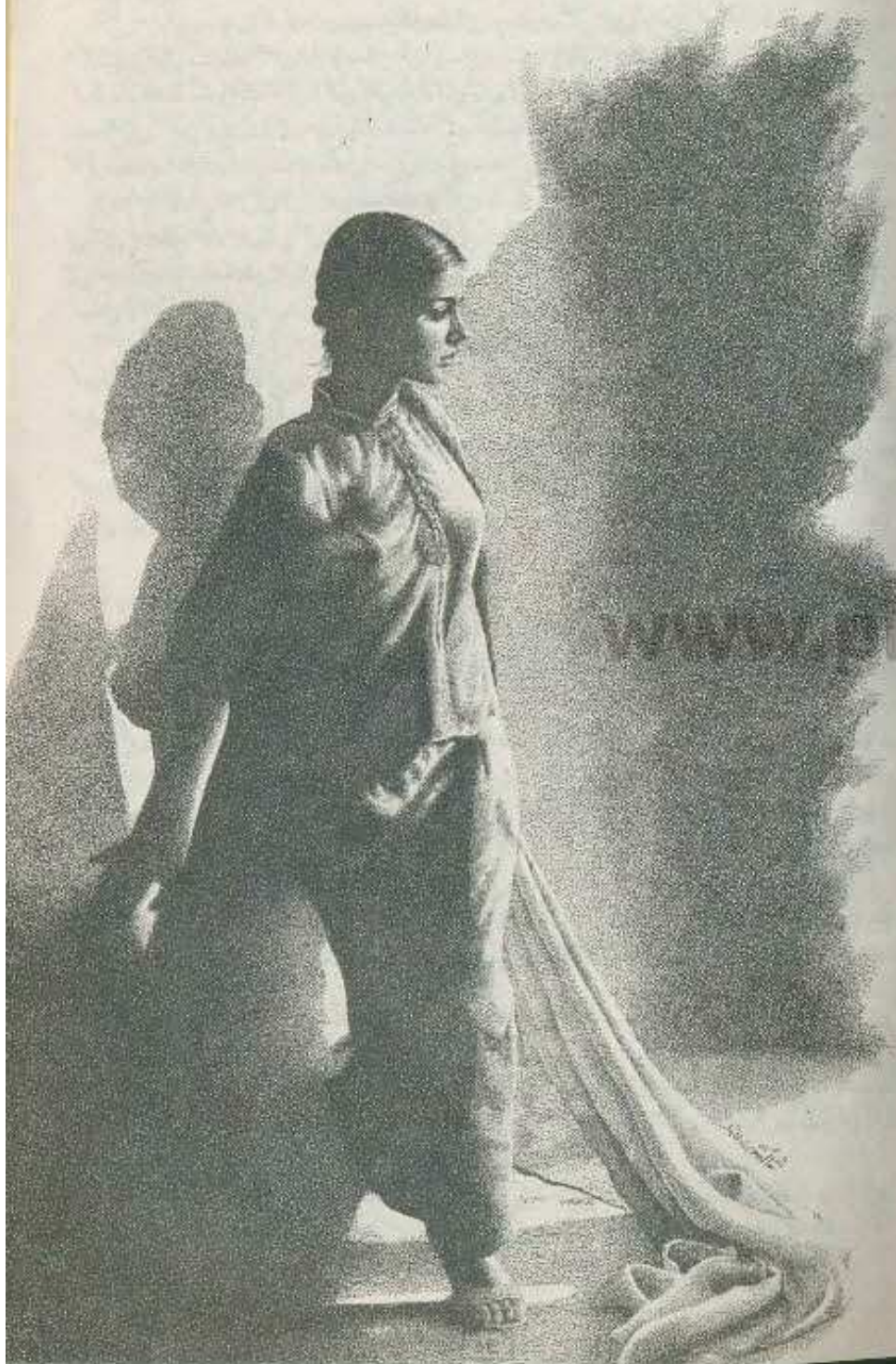


سے زیادہ ہے جو زندگی اور موت کی کشمکش میں جیتے ہیں۔ ہر
وقت اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کب کمبل سے ہم بلا سٹ
ہو جائے اور وہ ختم ہو جائیں گے۔ اب تو وال اور رولی کا ملنا
بھی دشوار ہو گیا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ اب دل مر گیا ہے۔
غریب بچوں کو دیکھتا ہوں تو محنت دل دکھاتا ہے کیونکہ سب
بچوں کے دل ایک جیسے ہوتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ عید سے دو دن پہلے میں ایک امارٹمنٹ
میں گیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک
پانچ چھ سال کی بچی بیٹھی ہے اسنے میں اس کا باپ آتا ہے
بچس کے پاس ایک تھیلا ہے جس میں پرانے جوتے ہیں۔
(جو غالباً "امارٹمنٹ والوں نے دیے ہوں گے) تو وہ تھیلا
جب اپنی بیٹی کو دکھاتا ہے اور بیٹی اس میں اپنے باپ کے
جوتے دیکھتی ہے تو اس کے چہرے پر خوشی کے جوا یکسپریشن
تھے جو خوشی کے رنگ تھے وہ میں نے کبھی کسی کے چہرے پر
نہیں دیکھے تھے تو بے ساختہ میں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ
اے اللہ! ان پھولنی پھولنی خوشیوں سے تو اپنے بندوں
کو محروم نہ کر۔ امیر لوگ ایک اشارے پر اپنے بچوں کو
قیمتی جوتے دلا دیتے ہیں اور غریب بس اللہ ہی بہتر جانے
کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔

3۔ مذہبی تہوار کو جوش و خروش کے ساتھ منانے کی
کوشش تو ہم مسلمان کرتے ہیں لیکن معاشی بد حالی اتنی





www.pkdigest.com

رخسانہ نگارِ عدنان

محبت و کفر

دائم مصطفیٰ لندن کی آزاد اور خود مختار فضا کا پروردہ ہے۔ تاہم مشرقی روایات اور کلیں سے محبت اس کے خون میں شامل ہے۔ ایم آئی ٹی کی تعلیم کے دوران لائبر (سوشل) اسلام سبحان اس کے سامنے ہیں۔ لائبر کا حد درجہ انکسار بھی دائم کو متاثر کرنے لگتا ہے۔ ناکام رہا۔ گھر میں بھی اس کی مرضی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ دائم کے والد ایک کامیاب بزنس مین جب کہ والدہ ڈاکٹر رشیدہ معروف گائنا کالوجسٹ ہیں۔ اتنی بے فکر زندگی کے باوجود اسے زندگی میں کسی کمی کا احساس ہر وقت رہتا ہے۔ اچانک اپنی والدہ سے پاکستان جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے جس پر وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

میڈم باقوت دی ماہر تعلیم آف گروپس کی روح رواں کاروبار میں ہر طریقہ آزمائے پر یقین رکھتی ہیں۔ چاہے اس کے لیے انہیں بڑی سے بڑی قربانی کیوں نہ دینا پڑے اس کے لیے وہ اخلاقی قدروں اور رشتوں کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ ان کے یہاں جماعتی ہمدانی کا ایک خاص مقام ہے جسے خوش کرنے کے لیے اپنی سیکرٹری عائشہ بخاری کو

استعمال کرتی ہیں۔
تنزل مراد ایک بے روزگار نوجوان ہے۔ منگائی کے اس دور میں وہ تین بنوں، والدین اور وادی کی امیدوں کا واحد مرکز ہے۔ تنزل کے والد احسن مراد چار سال قبل ایک حادثے میں اپنی ٹانگیں کھو چکے ہیں۔ گزشتہ دو سال سے محض گریجویٹ ہونے کے باعث تنزل کو کوئی قابل ذکر نوکری نہیں مل پاری جس پر اسے باپ کے طعنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تنزل 'انٹرویو کے سلسلے میں میڈم یا قوت کے آفس آتا ہے۔ وہ اس کی شکل صورت پر قدرے ٹھک جاتی ہیں۔

تنزل کے والد کا نام بن کر ان کے خدشے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔
عرزہ عالم کا شمار ارکلاس کی ان لڑکیوں سے ہوتا ہے جس کے لیے "ٹکشن" ہی سب کچھ ہے۔ وہ تعلیم کے میدان میں ہی نہیں غیر انسانی سرگرمیوں میں بھی آگے رہتی ہے۔ کانج کے سالانہ فنکشن میں وہ محض اس لیے وائس کالینیٹنس میں حصہ لیتی ہے کہ فنکشن میں بطور مہمان خصوصی میڈم یا قوت تشریف لاری ہیں۔ وہ ہر طریقے سے ان کی نظروں میں آنے کی خواہش مند ہے۔

جسٹس محمود عالم کی اکلوتی بیٹی عرہ عالم کے لیے اپنے ماں باپ کی ازدواجی زندگی ہمیشہ سوالیہ نشان رہی ہے۔ سارہ عالم جتنا محمود عالم کے عشق میں مبتلا ہیں۔ محمود عالم اتنے ہی ان سے الگ ہیں؟ فنکشن میں اس کے وائس کی سب تعریف کرتے ہیں لیکن میڈم یا قوت کے نہ آنے سے اس کا دل بچھ سا جاتا ہے۔

دائم واکٹر خشتہ کی تمام تر مخالفت کے باوجود پاکستان جانے پر بعد رہتا ہے جس پر واکٹر خشتہ کو یکدم ماضی کی ایک شخصیت یاد آ جاتی ہے جس کی انتقام بھری صدا ابھی تک ان کے کانوں میں گونجتی ہے۔ دائم کی ضد کے آگے واکٹر خشتہ اور ان کے شوہر کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں۔ دائم کی دیکھا دیکھی سوئی اور اسامہ کا بھی پاکستان جانے کا پلان بن جاتا ہے۔

تانیہ (تنزل کی بہن) انٹرویو دینے کے لیے گھر سے نکلتی ہے تو دلفشے اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ ایسے میں میڈم یا قوت اسے اپنی گاڑی میں لفٹ دیتی ہیں۔ عائشہ بخاری، میڈم یا قوت کی خواہش پر تانیہ کو جواب دہ کرتی ہے۔ تانیہ ان کا وزٹنگ کارڈ اپنے پاس رکھ لیتی ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر تنزل اسکول کے بچوں کے پک اپ ڈراپ کی نوکری کر لیتا ہے۔ جس سے گھر کی گاڑی ٹھیکے لگتی ہے۔

جہاگیر ہدائی کے لیے منصف ناز کی اہمیت ایک نشو و نما سے زیادہ نہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں اور چلی گئیں۔ جیوا میں ایک عدد بیوی بھی رکھتے ہیں۔ وہ اپنی بڑی بیٹی یا قوت کو بھی اپنی موانہ و حاجت کے حرم میں جکڑے ہوئے ہے۔ میڈم یا قوت نے اپنی بیٹی لانیہ کو لندن کی پرفضا ماحول میں پروان چڑھایا ہے۔ جہاگیر ہدائی میڈم یا قوت سے لندن جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو وہ سوئی (لانیہ) کو تفریح کی غرض سے اسکاٹ لینڈ بھیج دیتی ہے۔

دوسری طرف لانیہ کی اچانک روانگی اسامہ اور دائم کو حیران کر دیتی ہے۔
لندن میں جہاگیر ہدائی لانیہ کو نیا پارک شہید جمنیلا ہٹ کا شکار ہوتا ہے اسے اپنے والد کے دوست آغا فیاض مل جاتے ہیں جو اسے زبردستی اپنے گھر لے آتے ہیں۔ وہاں وہ قدرت کی مناعی کا شاہکار ایک پری ویش کو دیکھ کر ہلکا رہ جاتا ہے۔

کانج سے واپسی پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے عرہ کی گاڑی سے تنزل کا ایک سیڈنٹ ہو جاتا ہے جس پر عرہ کے حواس جواب دے جاتے ہیں۔

حادثے میں تنزل کو معمولی جوشیں آتی ہیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ اپنی پھوپھی زاد عرہ عالم کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ تاہم اس کی پریشان صورت کو دیکھ کر اسے گھر تک چھوڑ دیتا ہے۔ ان ہی مشکل دنوں میں تنزل کو نوکری مل جانے کی نوید ملتی ہے جو سارے گھر میں سرشاری کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ وہ اسے نعمت خداوندی قرار دیتا ہے۔

کانج کے فیشن شو میں میڈم یا قوت کی توجہ حاصل کرنے میں عرہ خاصی حد تک کامیاب رہتی ہے۔ اسے بہترین کارکردگی پر فرسٹ پرائز ملتا ہے۔ واپسی میں میڈم یا قوت اسے اپنا کونفیکٹ ممبر دیتی ہیں۔ وہ ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے۔

دائم ایک نئے عزم کے ساتھ ماں باپ کی دعا میں لیے پاکستان روانہ ہوتا ہے۔ اس کے جاتے ہی واکٹر خشتہ مستقل پاکستان سینیٹل ہونے کا فیصلہ کر لیتی ہے جس پر مصطفیٰ صاحب بھی حیران ہوتے ہیں۔

آغا فیاض کو لندن کی فضاؤں میں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے اور بہت سے مسلمان گھرانوں کی طرح وہ اپنی اولاد سے متعلق خدشات کا شکار ہیں۔ ہواور بیٹے کی وفات کے بعد آجینے اور اسامہ ان کے جینے کا سارا ہیں۔ خصوصاً آجینے سے متعلق وہ خاصے فکر مند رہتے ہیں جو اپنے کلاس فیلو میں پسندیدگی کا اظہار کر چکی ہے۔ وہ اس کی پرچائی چھڑا چکے ہیں اور دوستوں سے بھی اس کا رابطہ منقطع ہے۔ وہ سرسری معلومات کے بل بوتے پر جہاگیر ہدائی سے آجینے کے لیے بات کرتے ہیں۔ جہاگیر کی تو مراد بر آتی ہے اسامہ کو جہاگیر کی شخصیت ایک کھاگ شکاری کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ لیکن آغا جان اس کے تمام خدشات رد کر دیتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی تقریب میں آجینے کو جہاگیر کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ رخصتی کے بعد آجینے کے سامنے جہاگیر ہدائی کی اصل حقیقت آتی ہے۔ وہ آغا جان کو اپنی بربادی دے دے۔ اور سمجھتی ہے۔ تنزل نوکری کے لیے سب کی دعا میں سمیٹ کر آفس پہنچا ہے وہاں اسے دوسری برانچ میں بچنے کا مژدہ سنایا جاتا ہے۔ آفس کا ڈرائیو اسے ایک ویران بلڈنگ کے احاطے میں چھوڑ جاتا ہے۔

جیسے ہی وہ بلڈنگ میں داخل ہوتا ہے پیچھے سے دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال اس کے حواس بھل کر دیتی ہے۔

بہن موقع پر میڈم یا قوت تمام صورت حال سنہال لیتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر تنزل کے کھوئے حواس بحال ہوتے ہیں، تنزل کو ری مائینز گروپ کے فیشن میگزین میں بطور سب ایڈیٹر اپائنٹ کیا جاتا ہے تانیہ کو بھی سرسری انٹرویو کے بعد سلیکٹ کر لیا جاتا ہے۔ میڈم یا قوت، تانیہ کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ آفس میں تنزل عائشہ بخاری کی خوبصورتی سے متاثر ہوتا ہے۔

پاکستان پہنچنے ہی دائم کو اس وقت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب ایئر پورٹ سے واپسی پر دو نوجوان اس کے پیچھے اور تمام ڈائیوٹ چھین لیتے ہیں۔ آگے چل کر وہی نوجوان اسے سڑک پر زخمی حالت میں مل جاتے ہیں۔ ان دونوں کا عرہ کی گاڑی سے ایک سیڈنٹ ہوا ہے۔ دائم اپنی رقم واپس لے کر عرہ کا شکر سدا کرتا ہے۔ عرہ جو میڈم یا قوت کی دعوت پر ان سے مکملنے جاری تھی واپس گھر آ جاتی ہے۔ محمود عالم کو اس کا ایک سیڈنٹ کا پتا چلتا ہے تو وہ نوکروں کے سامنے ہی اسے سخت ست سناتے ہیں۔ عرہ ان کے دوسرے پر وہابی ہو جاتی ہے۔

جہاگیر ہدائی آجینے سے شادی کے بعد اچانک دینی واپس جانے کا اعلان کر دیتا ہے۔ آجینے کی رخصتی کا لمحہ اسامہ کو خدشات میں مبتلا کر دیتا ہے جہاگیر دینی پہنچنے ہی آجینے کو جیز میں مداخلت بھیجتا ہے۔ فلیٹ کا نیا مالک آکر آغا فیاض کو اس حقیقت سے مطلع کرتا ہے جس پر وہ صدمے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں جہاگیر سے بات کرتے ہیں تو اس کا بدلا ہوا لہجہ انہیں اور اسامہ کو پریشان کر دیتا ہے۔ ان دونوں کے بدترین خدشات کی تصدیق آجینے کی خود کشی کی خبر سے ہو جاتی ہے۔ یہ خبر سننے ہی آغا جان کو زبردست ہارٹ ایٹک ہوتا ہے۔ اسامہ اس صورت حال پر بوکھلا کر رہ جاتا ہے۔

آغا جان کی خراب حالت کے پیش نظر اسامہ، آجینے کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہوا۔ اس ناؤک صورت حال میں لانیہ، اسامہ کو جذباتی سہارا دیتی ہے۔ وہ اسے تمام صورت حال سے آگاہ کر دیتا ہے۔ آجینے کی جہاگیر ہدائی سے شادی

کامیاب کر دے حیران رہ جاتی ہے۔ تاہم وہ تصدیق کے لیے آجینے کی شادی کی تصویر دیکھنے کی ضد کرتی ہے۔ اس دوران آغا جان کی حالت قدرے سنبھل جاتی ہے۔ وہ آجینے کی موت کا زہم دار خود کو سمجھتے ہیں۔ اسامہ انہیں سنبھالنے کی فکر میں لگان ہو جاتا ہے۔

عرہ کی اتری صورت جسٹس محمود عالم کو قدرے نرم کر دیتی ہے۔ عرہ ان کے دو کو دیکھتے ہوئے نانو کے گھر چلنے کی فرمائش کرتی ہے۔ جسٹس محمود اس کی خواہش پر اسے نانی سے ملوانے احسن مراد کے یہاں لے آتے ہیں۔ لیکن انہیں سارہ کی ناراضی کا خطرہ بدستور رہتا ہے۔ عرہ اور جسٹس محمود عالم گھر میں دیکھ کر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے کہ اچانک تیسرے فرد کی آمد سب کو متاثر کر دیتی ہے۔

اتفاقاً جان پاکستان میں احسن مراد کے ہاں آکر ٹھہرتے ہیں۔ وہ رشتے میں ان کے بچپا ہیں جو عرصہ پہلے محض پیسے کے حصول کے لیے لندن آباد ہوئے تھے۔ عرصے بعد ان کی اس طرح آمد سب کو سرشار کرتی ہے لیکن ان پر گزری قیامت کا احوال سب کو آزرہ کر دیتا ہے۔ تنزل، تانیہ کو فوراً "جانب چھوڑنے کا کتا ہے تو وہ حد درجہ بد مزیزی پر اتر آتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کی بری طرح جھٹلا ہے اور تنزل کے دوبارہ جانب چھوڑنے سے صاف انکار کرتی ہے۔ غصے میں آکر اس کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ سب یہ منظر دیکھ کر حق دق رہ جاتے ہیں۔

ماں کی لار وائی لائیب کو زندگی سے بے زار کر دیتی ہے جس سے اس کے قدم غلط سمت میں ہلک جاتے ہیں۔ اسامہ میڈم یا قوت کی درخواست پر لائیب کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کے غلوں پر بھی شک کرتی ہے۔ شک اگر اسامہ اسے اس کے حال پر چھوڑتا ہے۔ دل برداشتہ ہو کر وہ سلیڈنگ پلڑے کا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے لیکن ڈاکٹر زرخندہ اس کی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ میڈم یا قوت کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں۔

جشن محمود عالم اور سارہ کے بگڑے تعلقات عزم کی فرسٹیشن کو برہا کر اس کے مائٹنگ کے ارادے کو مستحکم کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسے لیڈل میں شاندار کامیابی پر جشن محمود کی لگاوت بھی عزم کو مصنوعی محسوس ہوتی ہے۔ اس بل اچانک ایک اجنبی مہمان کی آمد سب کو حیران کر دیتی ہے۔

۳۰ تیسویں قسط

"ماما! آپ سے ایک بات کتنا تھی۔" سارہ درزی سے لائے ہوئے کپڑے دیکھ رہی تھیں جب کتاب پر ممتی عزم نے ان سے کہا۔

"ہوں بولو۔" وہ بے دھیانی سے بولیں ان کا سارا دھیان کپڑوں کی سلاخی کی طرف تھا۔

"ماما! مجھے چندہ بیس دنوں یا شاید مہینہ بھر کے لیے اپنی فرینڈ فرج کی طرف شام کو کباٹن اسٹڈی کے لیے جانا پڑے، کل سے تین چار گھنٹوں کے لیے۔" وہ کتاب بند کر کے آگے ہو کرتانے لگی۔

"ہیں۔" وہ بے اختیار جو نکلیں "کباٹن اسٹڈی اور تم کو گدی کسی اور کے ساتھ۔"

"کیوں اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے سب ہی اسٹوڈنٹس کرتے ہیں۔" وہ ذرا ناک چڑھا کر بولی۔

"میں سب ہی کی نہیں صرف تمہاری بات کر رہی ہوں۔" آج تک تو تمہیں ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑی۔" وہ پھر سے کپڑوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

"جس چیز کی بھی ضرورت نہیں پڑی کیا ضروری ہے کہ کبھی بھی ضرورت نہ پڑے۔" وہ جھلا کر بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایسی کیا ضرورت آن پڑی؟" وہ اس کے انداز پر پھر سے اس کی طرف پورے دھیان سے متوجہ ہوئی تھیں۔

عزم کے انداز میں اضطراب سا تھا۔

"ماما! مجھے کیسٹری اور فزکس میں ضرورت ہے تھوڑی کوچنگ کی اور فرج کے پاپا ان دونوں سبجیکٹس میں پرفیکٹ ہیں۔ وہ ہمیں تھوڑا گائیڈ بھی کر دیا کریں گے اور ہم دونوں مل کر اپنی پراپلینز بھی شیئر کر لیا کریں گے۔ اتنی سی بات ہے۔" وہ تفصیل سے بتا رہی تھی مگر آنکھوں میں انداز میں بولتی ہوئی بے چینی صاف جھلک رہی تھی۔

"تمہارے پاپا نہیں مانیں گے اگر تمہیں کسی قسم کی کوچنگ کی ضرورت ہے تو وہ تمہارے لیے گھر پر ٹیوٹر کا بندوبست کر دیں گے مگر بولو کسی دوسرے کے گھر جا کر وہ بھی روزانہ تین چار گھنٹوں کے لیے قطعاً "اجازت نہیں دیں گے، تمہیں معلوم ہے۔" سارہ نے قطعی انداز میں کہا اور کپڑے سمیٹنے لگیں۔

"ماما! مجھے کوئی دو چار ماہ کے لیے یوشن وغیرہ نہیں پڑھنی ہوں بھی اتنی ہیٹ یوشن۔ یہ تو جسٹ تھوڑی گاڑی لینی ہے اور ہم دونوں تھوڑا مل کر ڈسکس کر لیا کریں گے۔ کون سا دو چار ماہ کے لیے کہہ رہی ہوں پندرہ بیس دنوں کے لیے اور بس۔" وہ بے چینی سی تھوڑی ممتی سی ہو کر کہہ رہی تھی۔

"تمہارے پاپا نہیں مانیں گے ان سے بات کرنے یا بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا جو کرنا ہے گھر میں کرو۔" سارہ کپڑے سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ تو مان سکتی ہیں نا؟" عزم نے آگے بڑھ کر کپڑے ان کے ہاتھ سے لیے اور دوبارہ صوفے پر رکھ دیے۔

"تو میرے ماننے سے کیا ہوگا میں کون سا ان سے منوا سکتی ہوں میری اس گھر میں ویلیوی کیا ہے؟" وہ خود ترسی والے انداز میں کچھ تلخی سے بولیں۔

"پاپا آج کل تو یوں بھی گھر آٹھ نوے پہلے نہیں آ رہے۔ اول تو میں ان کے آنے تک آجایا کروں گی وہ آتے ہی تو اپنی اسٹڈی میں چلے جاتے ہیں آج کل کھانا تک وہیں کھا رہے ہیں اگر۔" وہ کہتے کہتے فحش کر رک گئی۔

"تمہارا مطلب ہے ان کی تانج میں لائے بغیر۔ میں تمہیں اجازت دے دوں، یہ کہہ رہی ہو تم۔" وہ تیزی سے بولیں تو عزم اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"ناممکن۔" سارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس گھر میں زلزلہ نہیں لانا، اتنا برا فیصلہ خود ہی کر لوں اور تمہارے باپ کو خبر نہ ہو یا کل ناممکن۔ جو انہیں ذرا سا بھی پتا چل گیا تو۔۔۔" سارہ نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"تو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ وہ زور زور سے چلائیں گے، دس بارہ برتن تو میں گے تو کون سی نئی بات ہوگی ہیوں بھی تو وہ یہ سب بلا جواز کرتے ہی رہتے ہیں۔" وہ منہ موڑ کر تلخی سے بولی۔

"عزم۔" سارہ تنہی انداز میں بولیں "وہ تمہارے فادر ہیں تمہیں ان کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔" سارہ نے شاید پہلی بار عزم سے محمود عالم کے بارے میں اتنے مثبت انداز میں بات کی تھی۔

"سوری ماما! مجھے ان کے بارے میں آپ کے بارے میں کیا سوچنا چاہیے اور کیا رائے رکھنی چاہیے یہ بتانے میں آپ نے خاصی دیر کر دی۔"

وہ ذرا لب بیز ہوئی تھی مگر سارہ نے سن لیا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"خیر آپ اجازت دیں یا نہ دیں میں شام سے جاری ہوں فرج کی طرف اور۔ گاڑی بھی خود لے کر جاؤں گی۔" وہ یکدم کون بدل کر بولی تھی بالکل دو ٹوک انداز میں۔ سارہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا یہ کس انداز میں مجھ سے بات کر رہی ہو اور کیا میری یا محمود کی اجازت کے بغیر تم پوری شام باہر گزار سکتی ہو، کیا ہمیں دینا سے گزرا ہوا۔" سمجھ لیا ہے تم نے۔" وہ غصے سے بولیں۔

"ایسا تو شاید آپ دونوں نے سمجھ رکھا ہے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"عزم۔" سارہ تنہی انداز میں انگلی اٹھا کر بولیں۔

"ماما! شام آپ دونوں کی لڑائی دیکھتے ہوئے اپنا دماغ خراب کر کے گزاروں یا کہیں کسی پر سکون ماحول میں کچھ دیر ریٹیکس انداز میں۔ ظاہر ہے مجھے دوسری چوائس ہی اپیل کرتی ہے۔" وہ بڑے آرام سے کہہ کر مڑی اور کتابیں اٹھانے لگی۔

"دیکھو تمہاری فضول کی ضد میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہو اجازت لینی ہے اور جو بحث مباحثہ کرنا ہو گا شام کو اپنے طرہ خان باپ سے کرنا۔ اس نے آج تک مجھے چوں نہیں کرنے دی اس گھر میں کس کی اجازت کا سکھ چلنا

ہے، جنہیں بخوبی علم ہے پھر بھی ایسی ہٹ دھرمی دکھانا چاہتی ہو تو شوق سے اپنے باپ کو دکھا لیتا۔ ”وہ کندھے اچکاٹی بے نیازی سے کہہ کر جانے لگیں تو عجزہ کو ٹھکانا پڑا۔

”اس طرح تو کام خراب ہو جائے گا“ اگر بابا کے تاج میں یہ بات آگئی تو میرا گھر سے نکلنا تو کیا۔ کمرے سے نکلتا موقوف کر دیں گے اور مجھے وہ انتہائی قدم جو میں نے آخری حد کے طور پر سوچ رکھا ہے ابھی اٹھانا پڑ جائے گا اور ابھی تو نیا ساحل کنارے ہے ابھی سے چٹانوں سے سر پھوڑنا بہت نقصان دہ ہو گا۔ اس نے یہ سب سوچنے میں ایک لمحہ ہی لگا دیا تھا اور دوسرے بل دہر کر جاتی ہوئی ماں کے کندھے سے لٹک گئی۔

”ماما پلیز! اچھی ماما! آپ کو تو بتا ہے بابا کے غصے کا خواتوا اشتعال میں آجائیں گے، مجھے بس تھوڑے سے دنوں کے لیے تو جانا ہے اگر آپ چاہیں تو بابا کی تاج میں لائے بغیر بھی یہ ہو سکتا ہے ورنہ پلیز۔ ماما امیری تھوڑی سی براہم ہے۔ آپ کو بتا تو ہے میں نے ابھی ٹیوشن نہیں لی نہ مجھے پسند ہے یو کی ذرا آج کل اکیلے بیٹھ کر پڑھنے میں نمی نہیں لگتا بس تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔ کچھ میں گھر پر ہی پڑھ لوں گی۔“

جو کڑے مر سکتا ہوا سے فوری طور پر زہر دینے کی پھلا کیا ضرورت ہے۔ وہ مسلسل سارہ کے کندھے سے چپکی ان کے گلے میں جھولتی لاڈ سے کہے جارہی تھی۔

اور سارہ بھی شاید اس کی محبت کے اس مظاہرے سے کچھ نرم پڑ گئی تھیں مخوری طور پر اس کے بازوؤں کو جھٹکا نہیں ورنہ انہیں ایسے لاڈیلا سے سخت چڑھتی۔

”عجزہ! یہ ٹھیک نہیں اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا کہ محمود کو بتا نہ چلے اور پھر تم جو کہہ رہی ہو کہ گاڑی خود لے کر جاؤ گی یہ تو اور بھی ان کے غضب کو ہوا دینے والی بات ہے۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہیں۔“

وہ نرمی سے اس کے بازو اپنے گلے سے نکالتے ہوئے اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے بولیں۔

”ماما! ذرا سوچو گے ساتھ جاؤں گی تو وہ بابا کو بتا دے گا اور ماما گھر میں دوپٹی تو میرا پور ہوتے ہیں ماں اور باپ۔ آپ کی کیا اتنی بھی ہمت نہیں آپ میرے بارے میں ایک بھوٹا سا بے ضرر فیصلہ کر سکیں جو کہ کسی ناجائز بات کے لیے نہیں۔ میری کلاس فیلو کی ہمدردی کو آپ میری ذاتی پبلیک فل ہوتی ہیں اپنی بیٹیوں کی ہسٹ فرینڈز اپنے فادرز کے ہر اٹل فیصلے کے مقابل میں اپنی ہمدردی فل سپورٹ اور ان کا ووٹ حاصل ہوتا ہے وہ سارا سارا دن اپنی فرینڈز کے ساتھ گھر سے باہر رہیں نہیں بھی جائیں، انہیں کوئی ٹیوشن نہیں ہوتی کہ ماما کو بتائی تھی میں ماما کو فون کر کے انفارم کر دیا ہے میں نے اور بس۔ جبکہ میں تو آج تک آپ کی اجازت کے بغیر کہیں گئی بھی نہیں اور۔“

وہ سارہ کو نرم پڑتے دیکھ کر بولتی چلی گئی اور جس انداز میں اس نے ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”محمود بنگلہ کر دیں گے بہتر ہے ایک بار تم ان سے پوچھ لو میں تمہارا ساتھ دوں گی جب تم ان سے بات کرو گی۔ انہیں شاید اس کے منت بھرے انداز پر رحم آگیا تھا۔

”ماما! آپ تو بابا کی طبیعت کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہیں وہ تو سنتے ہی آپ سے باہر ہو جائیں گے یا پھر گھر بیٹوڑ کا انتظام ہو جائے گا اور بس پھر نہ آپ کی حمایت کام آئے گی اور نہ میری کوئی دلیل۔“

”تو اس میں حرج کیا ہے“ اچھا ہے بیٹو نہ گھر آجائے گا تو تمہارا مسئلہ گھر بیٹھے حل ہو جائے گا نہ پڑھنا دھارنا جتنے دن چاہو پڑھ لیتا اور فارغ کر دیتا۔“

”ماما مجھے کچھ دن۔۔۔ پلیز کچھ دنوں کے لیے اس گھر کے۔۔۔ ٹینس ماحول سے علیحدہ ہو کر میں پورا دھیان اپنی اسٹڈیز کی طرف لگانا چاہتی ہوں۔“ اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ سارہ لمحہ بھر کو چپ سی رہ گئیں۔

”اب ایسی کون سی تمہاری پڑھائی لف ہو گئی ہے جس سے اس گھر کے ماحول سے فرار لازمی ہے۔ بچپن سے آج تک اسی ماحول میں رہتی رہی ہو اور پوزیشن لیٹی رہی ہو اب اس ماحول کو کیا ہو گیا ہے۔“

وہ بھی سارہ تھیں عزت کے اتنے بڑے طعنے کو کیسے لی سکتی تھیں۔
”پہلے میرا بچپن تھا، آپ کی چپقلش، آپ دونوں کے جھگڑے مجھے خوف زدہ تو کرتے تھے مگر اب میں بڑی ہو گئی ہوں، آپ کو شاید علم نہیں، وہ طعنے کبھی مجھے میں جتا کر بولی“ اور میری اسٹڈیز بھی اور میں بھی اس سے کتنی متاثر ہو رہی ہیں شاید آپ جاننے میں انٹرسٹ نہیں ہوں گی تو پھر شام کو میں چلی جاؤں فرح کی طرف؟“

اس نے بات کرتے کرتے کناٹا سارہ اس کی طرف دیکھ کر رکھ لیں۔
”میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔“ ان کے دھیان کی سوئی عزت کے اس جملے پر ٹک ٹک بجے جاری تھی۔
”ہوں۔ چلی جانا مگر صرف دو گھنٹے کے لیے پانچ بجے سے سات بجے تک اس سے زیادہ نہیں۔“ انہیں بالکل نخواستہ اجازت دینا پڑی تھی۔
”تھینکس ماما، آ کر گھٹ۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا، آپ اجازت دے دیں گی۔“ وہ آگے بڑھ کر ان کا منہ چومتے ہوئے خوشی سے بولی۔

سارہ ساٹا چرو لیے کھڑی رہیں۔
”اب کیا سوچ رہی ہیں؟“ عزت نے جاتے جاتے یونہی پوچھا۔
”ہوں کچھ نہیں۔ اماں جان نے اتنے دنوں سے نہ فون کیا نہ میں نے ہی کیا۔ آج یونہی ان سے ملنے کو دل کر رہا ہے۔ سوچ رہی ہوں ابھی جا کر ہو آؤں پھر شام کو تو شاید تمہیں بھی جانا ہو گا۔“ وہ جو سوچ رہی تھیں۔ اس سے اپنے دماغ کو ہٹانے کے لیے بولی تھیں ورنہ پہلے ایسا کوئی خیال بھی ان کے دماغ میں نہیں تھا۔
”میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔“ وہ فوراً تیار ہو گئی۔
”ہوں۔ چلو ٹھیک ہے تم پیچ کر لو۔ میں بھی تیار ہو جاتی ہوں۔ آدھے گھنٹے میں نکل چلتے ہیں۔“
سارہ فوراً ”مان گئیں ورنہ احسن مراد کی طرف نہ تو وہ خود بھی جانے پر اتنی آسانی سے راضی ہوتی تھیں نہ کسی اور کا جانا پسند کرتی تھیں مگر آج۔۔۔“
”نہج یقیناً“ سوچ تھوڑا آڑا تر چھا نکلا ہو گا۔ ماما اور میری ساری باتیں مانتی جائیں۔ امپا سبل۔“
وہ کچھ حیران کچھ خوش سی تیار ہونے چل دی تھی۔



”لائبہ“ میری جان! سوئی، کیا ہوا لائبہ؟“ میڈم یا قوت پریشان سی اسے یوں گرتا دیکھ کر کچھنے کو آگے ہوئی تھیں مگر وہ پہلے ہی تیور کر کر چکی تھی وہ اب فکر مندی سے اس کے سر نہاتے پر کسی امکانی چوٹ کو تلاش کر رہی تھیں اور اسے زور زور سے پکار رہی تھیں۔
لائبہ شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔

اور دائم کون سا اپنے حواسوں میں تھا۔ ہوش تو اس کے بھی گم ہو چکے تھے۔
لائبہ اور اس کی بہن۔ لائبہ۔ اس کی نگاہوں کے سامنے چٹ ملیں لائبہ ہی نہیں سارا منظر بھی گول گول گھومے جا رہا تھا۔
میڈم یا قوت اب نوکروں کو آواز سے دے رہی تھیں، جو لائبہ کو اٹھا کر اندر کمرے میں لے جا رہے تھے اور میڈم یا قوت حواس باختہ سی اپنا میل اٹھا کر شاید ڈاکٹر کو کال کر رہی تھیں۔

پریشانی کی اس گھڑی میں وہ پیچھے کھڑے دائم کو شاید بالکل فراموش کر چکی تھیں، ڈاکٹر کا نمبر ملا کر اسے فوری طور پر گھر آنے کا کہتے ہوئے وہ اس جانب جا رہی تھیں، خود ملازم لائبہ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔
دائم لمحہ بھر کو دم بخود سا اس خاموش منظر میں کسی مجسمے کی مانند کھڑا رہا اور پھر مڑ کر جو جھل قدموں سے باہر آ گیا۔

باہر اندر جیسا سکوت تھا ہوا بالکل بند تھی۔ اتنی زند کہ لان کے درخت نمودے پھول سب یوں سانس روکے اپنا وجود تھامے بے حس و حرکت کھڑے تھے جیسے ذرا سا بھی ہلے تو کائنات کا کوئی اہم راز فاش ہو جائے گا۔
اہم راز تو فاش ہو گیا شاید۔ اسے اتنی قناعت اتنی کمزوری ہو رہی تھی جیسے ذرا دیر اور کھڑا رہا تو گر پڑے گا۔
اس نے گھر سانس لیتے ہوئے سر اٹھا کر تاروں بھرے نیلگوں آسمان کو دیکھا۔

”کتنی عجیب بات ہے دنیا میں بڑے سے بڑا حادثہ ہو جائے جھوٹی موتی قیامتیں تو کائنات بھر میں روز کہیں نہ کہیں برپا ہوتی ہی رہتی ہیں اور یہ تمام مظاہر فطرت کتنے آرام سے کتنے معصومانہ انداز میں ملک جھکے بغیر یوں ساکت کھڑے کتنے رہتے ہیں جیسے ان سے برا تماشا ہی اور کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ جھوٹی موتی قیامتیں اتنی لرزہ خیز اتنی خوف ناک ہوتی ہیں اور مظاہر فطرت اس سے مس نہیں ہوتے اور جب اصل قیامت ظہور میں آئے گی تو وہ کیسی۔۔۔ بلا دینے والی ہو گی جب چٹائیں روٹی کے گالوں کی مانند اڑیں گی۔ اور جو اس جھوٹی سی قیامت سے میرا دل کسی روٹی کے گالے کی مانند ہی بے وزن ہو کر میرے سینے میں چکرانا پھر رہا ہے اسے میں کیسے ٹھکانے پر لاؤں۔۔۔ اور اس حقیقت؟

”اگر یہ“ حقیقت ہے کہ لائبہ میری بہن ہے۔ میرا دل میرا دماغ کیسے یقین کرے گا۔ کیسے؟
اور میں یقین کر بھی لوں۔۔۔ تو لائبہ۔ جس نے دوستی کے اتنے سالوں میں بلکہ شناسائی کے اوّل دن ہی سے میرا تصور کسی اور ہی علق سے وابستہ کر رکھا ہے۔ وہ جذباتی حد سے زیادہ حساس لڑکی جو ایک بار اپنی جان لینے کی کوشش کر چکی ہے۔ کیا وہ اس قیامت خیز انکشاف پر یقین کرے گی۔ مکمل یقین۔ مان لینے کے ساتھ کہ میں دائم مصطفیٰ اس کا حقیقی بھائی ہوں اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس کے دھیان کی سوئی دائم کے ساتھ لگے مصطفیٰ پر آکر کیسے تھر تھرائی تھی، ٹک کر رہ گئی۔ مصطفیٰ کون ہیں پھر۔۔۔ میرا ان سے علق۔

مائی گاڈ! میں پاگل ہو جاؤں گا یہ میڈم یا قوت نے مجھے کس الجھاؤ، کس بھنور میں چکرایا ہے۔ میں اب اور ضبط نہیں کر سکتا۔ انہیں مجھے تمام تر حقیقت بتانی ہی ہو گی۔ اگر یہ سب اس عورت کی سوچی سمجھی کسی چال، کسی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ تو میں کسی بہت گہری سازش کے جال میں پھنس چکا ہوں اور اگر ایسا کچھ نہیں تو پھر وہ دونوں کون ہیں؟ ڈاکٹر رخشندہ اور مصطفیٰ۔ ان سے میرا رشتہ میرا علق کیا ہے؟ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی میرا دل ان ہی کی طرف کیوں جھکا جا رہا ہے؟

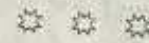
اگر یہ سب مجھ سے بچ منوانا چاہتی ہیں تو انہیں سب کچھ۔ سب کچھ مجھے بتانا ہو گا اول و آخر۔ کل۔ کل ہی میں فیصلہ کن بات کروں گا اگر اس عورت نے مجھے بچ۔۔۔ کلی بچ بتانے میں اتنا کافی کی تو میں یہاں ایک دن بھی نہیں رکوں گا۔ ماما یا کس پاس چلا جاؤں گا یہ عورت شاید مجھے ٹرپ کرنا چاہتی ہے؟ مگر کیوں؟“
اس کیوں پر آکر اس کے دماغ کی ساری توانائی پھڑ پھڑ کر رہ جاتی۔ وہ کھلے گیٹ سے چلتے ہوئے پیدل ہی کافی آگے نکل آیا تھا۔ رگ کر سوچنے لگا کہ وہ کہاں ہے؟

پیچھے مڑ کر دیکھا تو میڈم یا قوت کے گھر کا گیٹ کھلا تھا اور وہ اپنی گاڑی اندر ہی چھوڑ آیا تھا۔
وہ جھٹکے جھٹکے قدموں سے مڑا اور گاڑی لینے چل دیا۔
اندر اسی طرح جامد خاموشی تھی اس نے گاڑی اشارت کی اور دست رفتاری سے گاڑی باہر نکال لایا۔

وہ سستی دیر تک یونہی بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ اسے یہ سب بہت عجیب و غریب، بہت ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔
 ”کوئی ہو ایسا جس سے وہ اپنی زندگی کے ساتھ ہونے والا یہ انوکھا واقعہ شیئر کر سکے“ ایسا واقعہ جس نے اس کا ماضی، حال، مستقبل سب کے معنی بدل ڈالے تھے۔ سب چیزوں سب واقعات کو بے ترتیب سا کر دیا تھا اور وہ تو بہت ترتیب بہت ڈسپلن سے زندگی گزارتا آیا تھا۔ اب ایسی سنگمہ خیز بے ترتیبی۔ کہ اس کا اندر رہا ہر بل کر رہ گیا تھا۔

دو بار میڈم ہیا قوت کی کال آئی تھی اس کے سیل پر اور اس نے نمبر دیکھ کر سیل واپس رکھ دیا تھا۔
 ”اب کوئی عذر لنگ نہیں۔ کوئی مجبوری کی“ چھوٹے کی کہانی نہیں سنوں گا، جو بچ ہے صرف وہی۔ بس رات کے یہ چند گھنٹے گزر جائیں۔ میں اس ”بچ“ کے سوا اور کسی بات پر کھڑا نہ رہتا ہوں۔ گھر میں خود کو آزما پایا گل کرنے کے مترادف ہو گا۔
 اور وائٹ مہر مہر! یہ چند گھنٹے یقیناً ”یوں“ سڑکوں پر مشغول کرنے سے بھی نہیں گزارے جاسکتے اس کے لیے بہر حال گھر جانا اور تھوڑا بہت رست یا نیند۔ اس نے بالآخر دل کو سمجھاتے ہوئے گاڑی کو گھر کے رستے پر ڈال دیا۔

اس کا جسم ہی نہیں دماغ بھی جیسے ان دیکھے بوجھ سے شل ہو رہا تھا جب وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے تھکا ہارا لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اندر سے آئی مانوس آواز نے اس کے قدموں کو کسی بھاری زنجیر سے باندھ دیا۔ وہ خواہش کے باوجود اگلا قدم آگے نہیں بڑھا سکا تھا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسی رہ گیا۔
 ”آج کی رات لگتا ہے کائنات کے سب ہی جیسے ہوئے راز اس پر منکشف ہو جائیں گے“ ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہوئے اس نے آخری بات یہی سوچی تھی اور کراس اس لیے ہوئے ہینڈل ہاتھ سے چھوڑ دیا۔



”سرشی از کو اینٹ ڈٹ آئی۔ مجرڈا پوری تھنگ۔“
 وہ جو کسی باہر حسن و زیبائش کی طرح کافی دیر سے ادھر ادھر اوپر نیچے سے اسے تاپنے تو لے میں لگی تھی ایک لمبی پروڈیشنل چپ کے بعد سرگرم آواز میں بولی گئی۔
 جہاں تیرہ ہائی ان سے کافی فاصلے پر تین چار فائلوں میں سر دیے گم بیٹھا تھا، لیٹا کی چمکتی آواز پر فائلیں وہیں چھوڑ کر ان کے پاس گیا۔
 ”بھئی۔ تم نے باقاعدہ measurement کے بعد یہ اعلان کیا تو داد دو تو ہماری باریک بینی کو۔ ہم نے پہلی نظر میں اس قاتل سراپے کو اوکے کر ڈالا تھا۔“
 اس کی آواز میں لیٹا سے بھی زیادہ چچماہٹ تھی اور تانیہ کو لگا کسی نے گرم گرم سیال اس کے کانوں میں اندھیل دیا ہو۔

”آپ کی کیا بات ہے۔ میری مہارت آپ کی جو ہر شناس نگاہوں کے سامنے اپنی بھرتی نظر آتی ہے۔“
 اس نے سامنے بڑی نازک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی نیم عریاں دو دھیا ٹانگوں کو ایک دوسرے پر رکھا اور دلچسپ نظروں سے سیاٹ چہرے کی بیٹھی تانیہ کو دیکھنے لگی۔
 ”گڈ لیٹا! تم خوب ترقی کر گئی۔ اس کی پروڈکشن تو میں نے پہلے دن ہی کر دی تھی اب ایسا ہے کہ آج ہی سے

کام شروع کر دو۔ تانیہ یوں بھی بہت کو آپریٹو ہے، تم سے عمل تعاون بھی کرے گی اور بھی تم بھی اپنی تمام تر بروڈیشنل اسکل (مہارت) اس پر لگانا کہ ہمارا جہاں جہاں کرکٹ میں آئے۔ تو آئے ہائے۔ تھکنا کچ جائے جی مت ہی ہو جائے، پھر دیکھنا لینا! جہاں تیرہ ہائی کیسے تمہیں سونے میں توڑتا ہے۔ وہ خالص کاروباری انداز میں کہہ رہا تھا۔

اس لمحے کے تصور سے اس کی آنکھوں میں گلابی سانسہ تیرنے لگا تھا جب۔ تانیہ۔ کام معصوم حسن۔ سرعام بے نقاب ہونے جا رہا تھا۔

”اوکے سرا! آپ میری مہارت کی انتہا دیکھیے گا اور میں آپ کی زبان کی ساکھ کو۔“ وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور چھوٹے سے ہلکے بلاؤز کو درست کرتی تانیہ کی طرف بڑھی۔

”چلو میری باری ڈول! تمہیں سچ کی ڈول بنانا ہے، یہ سر نے چیلنج دیا ہے مجھے۔“ وہ بے تکلفی سے تانیہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اک آواز سے جہاں تیرہ ہائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

تانیہ نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

جہاں لیٹا اس کی اس اچانک حرکت کے لیے تیار نہیں تھی وہیں جہاں تیرہ ہائی کا منہ بھی لمحہ بھر کو کھلا رہ گیا۔
 ”ہوں۔“ اپنی کھسیا ہٹ کو مصنوعی مسکراہٹ سے چھپاتے ہوئے وہ بیڈ روم کی طرف بڑھا جہاں تانیہ لگی تھی۔

لیٹا کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی اس نے اپنا پرس اٹھا کر اس میں سے سگریٹ نکالا اور سنہری لائینر سے سلگا کر اطمینان سے کش بھرنے لگی، کیونکہ اسے جانتا تھا ابھی فوری طور پر دونوں کا باہر آنا ممکن نہیں تھا۔

”یہ کیا تماشا ہے۔“ وہ اندر جا کر بیڈ کے آخری کونے پر سمٹ کر بیٹھی تانیہ سے غرا کر بولا۔

”تمہارا تو تم شروع کرنے جارہے ہو پھر اور اپنا۔“ وہ یکدم آپ جناب سے تم پر آتے ہوئے نڈر لہجے میں بولی تھی۔ جہاں تیرہ ہائی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”مطلب کیا ہے اس کو اس کا۔“ وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے خوشخوار لہجے میں بولا۔

”اگر تم نے میرے ساتھ زبردستی کی تو تمہیں اس کا مطلب بھی میں سمجھا دوں گی۔ اتنا کمزور اور بے وقوف نہ سمجھنا مجھے۔“

وہ پہلے سے بھی زیادہ لیری سے جہاں تیرہ ہائی کی لمحہ بہ لمحہ سرخ ہوتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔

”کمزور بے وقوف ہا ہا ہا۔“ وہ پہلے اسے گھورتا رہا پھر دانت پکچا کے بوتے ہوئے کھوکھلا قبضہ لگانے لگا۔

”لگتا ہے۔ اتنے زیادہ عیش و آرام یہ ٹھانڈا ہاتھ اور مزے کی زندگی دیکھ کر تمہارا دماغی توازن بگڑ گیا ہے تو کوئی بات نہیں میری جان! اگر ان چیزوں کی وجہ سے تمہارا میٹر گھومے تو میں اس میٹر کو درست بھی کر سکتا ہوں۔ ابھی تم نے میرا ریا رہی تو نہ دیکھا ہے جانو! وہ چپا چپا کر بوتے ہوئے اس کے قریب آ رہا تھا۔

”اگر تم مجھے اپنی بیوی اٹاؤس کر دو تو میں، خوشی یہ سب کرنے پر تیار ہو جاؤں گی جو تم مجھ سے چاہتے ہو اور اگر بطور داشتہ رکھ کر مجھے اس گندگی میں چھلانگ لگانے کو کہو گے تو یاد رکھو یہ تم مجھ سے قیامت تک نہیں کر سکتے میں اپنی اور تمہاری جان تو لے سکتی ہوں مگر اس دلدل میں نہیں اتر سکتی۔“

وہ اس سے بھی زیادہ خوں خوار انداز میں کہہ رہی تھی اور بیڈ کے اوپر سے چلتے ہوئے دوسری طرف کود گئی تھی۔

جہاں تیرہ ہائی اس کے انداز و اطوار کو ابھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ فتور ابھی تمہارے دماغ میں آیا ہے یا تم یہ سب پلان کر کے آئی تھیں۔“ وہ اسے شاید ٹائم نہ دینا چاہ رہا تھا۔

”تم نے مجھے اپنے کون سے پلان سے آگاہ کیا ہے جو میں تمہیں اپنی سوچوں میں شریک کروں۔“ وہ بے لحاظ لہجے میں بولی۔

”مطلب کیا ہے اس سارے کا۔“
”بتا چکی ہوں اپنے شیطانی حلقہ احباب کو دعوت و لہجہ۔ مجھے اپنی بیوی اناؤلس کرو اور پھر اگلے دن سے جو مجھ سے کہو گے میں کروالوں گی مگر یوں نہیں جیسے تم چاہ رہے ہو۔“
وہ انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کرنے والے انداز میں بولی۔
”تم کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہو۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے کچھ پُرسوج انداز میں بولا تھا۔
”مجھے کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں صرف تمہیں ہماری شادی کے بارے میں سب کو بتانا ہے پھر جو تم کہو گے۔“

”ورنہ؟“ وہ دھیرے دھیرے اس کے پاس آ رہا تھا۔
”ورنہ میں تمہیں ختم کر سکوں یا نہیں اپنی جان ضرور لے لوں گی اور تم جانتے ہو میں اپنے ارادوں میں کیسی مصمم ہوں جو کہتی سوچتی طے کرتی ہوں کر کے چھوڑتی ہوں ورنہ تم مجھ سے شادی کر سکتے تھے بھلا۔“ وہ صاف جمائیکر ہدائی کو اپنا مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہوئی۔
اس کے خون میں چنگاریاں سی اڑنے لگیں گویا وہ اس کے بے وقوف بن جانے کا مذاق اڑا رہی تھی۔
”اپنی جان ضرور لے لوں گی۔“ دوسرے ہی بل جمائیکر ہدائی کے دماغ میں یہ جملہ کسی بازگشت کی طرح گونجا جیسے پیچھے سے کسی نے ٹیپ کو ریورس کر دیا ہو۔

تانیہ کی جگہ آئینے کھڑی تھی۔
”اگر تم نے مجھے مجبور کیا تو میں اپنی جان لے لوں گی ابھی اس وقت میرے قریب مت آنا۔“ اس کے ہاتھ میں تیز و حار چمکتے پھل والی چھری تھی اور باہر ہلنا کی جگہ جمائیکر ہدائی کا سب سے مزگ کسٹرم اپنے آرڈر کی تکمیل کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

جمائیکر ہدائی نے غیر ارادی طور پر قدم آگے بڑھائے۔
”ایک قدم۔“ ایک قدم بھی اور آگے مت بڑھانا ورنہ۔“ وہ تانیہ تھی کہ آئینے نہیں وہ آئینے تھی۔“ اور جمائیکر ہدائی کے قدم آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔



”ایس۔۔۔ ہیں۔۔۔ کیا کیا بک رہی ہو میں سمجھی نہیں۔“ ٹریا بانو کی عینک بدحواسی میں ناک سے پھسلنے اور زمین پر جا پڑی۔

یاسمین نے جلدی سے آگے کو جھک کر عینک اٹھائی۔ آگے پیچھے سے دیکھ کر عینک کی سلامتی کا یقین کرتے ہوئے عینک انھیں تھما دی جن کا دھیان عقب کی طرف بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ تو آنکھیں چندھیا کر ایک ٹک یا سمین کو تنکے جا رہی تھیں جو انھیں عینک تھما کر اب مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھیں۔
”تم نے یہ کہا۔“ انہوں نے اپنے حواس قابو میں کرتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ذرا متوازن آواز میں بولیں۔

”کہہ تم نے۔ یعنی تم نے خود تانیہ کا نکاح کر دیا۔ میری غیر موجودگی میں محض چار دن کے لیے میں گھر سے نکلی اور تم اتنی خود مختار اتنی طاقت ور ہو گئیں کہ تم نے سوچا بڑھیا جہان سے گئی۔ جس کم جہاں پاک رسول کی جنتی

بھی حسرتیں ہیں اپنی خود مختاری ظاہر کرنے کی سو کر ڈالو۔“ تانیہ کی بات ہے نا۔“
آہستہ آہستہ ان کا جلال عود کر آ رہا تھا اور یاسمین کو نظر آ رہا تھا ٹھوڑی دیر میں اس گھر میں کیا بھونچال آنے والا ہے۔ ان کو زندگی کی بدترین ذلت ملنے والی ہے جو مل تو چکی ہے

”اماں مجبوری۔۔۔ سخت مجبور ہو گئی تھی میں۔ آپ احسن سے پوچھ لیں کس طرح۔ یہ سب ہوا۔ عزت بچانے۔“ وہ ہکلا ہکلا کر کوئی بھی جملہ پورا نہیں کر پاتی تھیں۔

”اے جانے دو۔ کون سی عزت۔ کون سی بے عزتی بے حیائی کو رات کے اندھیرے میں بھگا کر اب اسے کون سی پچھلی پرانی عزت کی چادر پہنا کر ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہ رہی ہو اور اس۔۔۔ اس محتاج لنگڑے لوہے کو کیوں الزام دیتی ہو۔ تم ماں بیٹی نے جانے کیا ڈھونگ رچا کر اس کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکی اور اب مجھے بھی بے وقوف بنا رہی ہو۔ کیا سمجھتی ہو مجھے ایسی کم عقل شخصیاں ہوتی ہو گئی ہوں کہ تمہاری اس بے پرکی بکواس پہ یقین کر لوں گی گلیا آفت آگئی تھی؟ ایسی کون سی مجبوری کہ راتوں رات۔۔۔ تم نے دو دن اس پاگل بڑھیا کا انتظار کیا نہ اسے کسی مشورے کے قابل جانا۔ کیا سمجھا تم نے مجھے بولو۔“ ٹریا بانو کے منہ سے غصہ اب کف کی شکل میں اڑ رہا تھا۔

”اماں جان پلیر! میری بات پوری سنیں میں نے یہ سب اس گھر کے لیے۔۔۔ آپ میرا یقین کریں۔ معاملہ ایسا تھا تانیہ کی ضد۔“ یاسمین کا بیتی آواز کے ساتھ روی پڑیں۔

”کیا ضد۔۔۔ کھلونا مانگ رہی تھی۔ اس گھر کو تیلی لگا کر آتش بازی کا مزہ لینا چاہ رہی تھی اور تو نے اس کی ضد کی خاطر اس گھر کو ایک انار ایک پھل پوری کی طرح پھونک ڈالا۔ یہ کیا تم نے اس گھر کے لیے بولو۔ ارے انہی باتوں سے نکلی جا رہی تھی تو ہر کیوں نہ دے ڈالا اس کرموں جلی بد بخت نامراد کو۔ وہ تھ بھر کی چھو کر تیری آنکھوں کے نیچے سارا اھیل ٹھیکتی رہی اور تو نادان انجان بنی اس کی نوکریوں کے چکر میں نوٹ اٹھتی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ ارے تف۔۔۔ تف۔۔۔ تف۔۔۔ یا سمین بیگم! تیرے ماں ہونے پر۔۔۔ ایسا گندا دودھ تھا تیرا۔ ہماری پرکھوں کی لالچ کو تو نے گندے جوڑ میں پھینک ڈالا۔ اور۔“

ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اٹھ کر یا سمین کو جنوٹوں ہاتھوں نکول لائقوں سے بیٹ ڈالیں یا آگے بڑھ کر ان کے سر پر جو توں کی بارش کر ڈالیں۔

”پاے ہائے۔۔۔ اندھیرے میں گیا۔ غضب خدا کا چار دن۔۔۔ چار دن کے لیے میں گھر سے گئی اور اس نے جوان ملی پلائی بیٹی اللہ جانے کس بدکار کے ساتھ روانہ کر دی اور اب مظلوم ملی بیٹی سوے بہا رہی ہے اور۔۔۔ میں میں گیا ہوں۔۔۔ مٹی کے ماٹھو اوکاٹھ کے آوا حسن! اس اٹھ کے تیری ماں کو بھیتے جی اس تیری لاڈلی مظلوم بیوی نے کیسے مرا ہوا جان لیا چار لوگوں کو بلا کر گناہ کو ثواب میں بدلتے ہوئے اس نامراد کو ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ لوگ اس بڑھیا کے بارے میں کیا سوچیں گے۔“

”ارے ٹریا بانو۔ وہ ٹریا بانو جو ہمیشہ ٹانگ اٹھا کر لوگوں کے سامنے ناک اونچی رکھ کر بات کیا کرتی تھی اس کی ہونٹوں نے اسے جیتے جی مار ڈالا ایک مشورے کے قابل نہ جانا۔ یہ یہ اوقات رہ گئی میری ٹریا بانو کی تو میں رہوں گی اس گھر میں۔ مگر کبھی نہیں۔“ وہ تو غصے میں پاگل ہو رہی تھیں۔

اندھیرے میں آٹھ جان نے ہتھیلی پر رکھی گولیوں کا ڈھیر پانی کے پورے گلاس کے ساتھ لٹکا اور باہر جا کر ٹریا بانو کو سمجھانے ٹھنڈا کرنے کی ترکیب سوچنے لگے مگر اس وقت اس پھری شیرینی کے سامنے جا کر اپنی بے وقعتی کو اور بھی دو کوڑی کرنے کے برابر تھا۔ وہ تو یوں بھی اس گھر میں ذرا بیچ بچا کر رہے تھے عین بلائے مسمان وہ بھی۔

مستقل وہاں جان کا مشورہ ہمدردی بھی کسی تازیانے کی طرح لگا کر رہا ہے۔
 یہی سوچ کر وہ دوبارہ اٹھے اور پھر بے ہمت ہو کر بیٹھ گئے۔
 باہر ٹریا بانو کا اشتعال برص ہستانی جا رہا تھا۔

انہیں احسن مراد کے سکوت ایسے ضبط پر حیرت ہو رہی تھی جو ان کے سارے بیان کو اندر بیٹھے آرام سے
 سن رہا تھا۔ ذرا باہر نکل کر ہوی کی ہمدردی میں نہ کسی معاملے کی روشنی کے لیے دوچار لفظ بول دیتا تو شاید ٹریا بانو کو
 اتنی شہہ ملتی نہ اتنا پیش آتا۔ یا سمین کے رونے نے انہیں اور بھی غصہ ناک کر ڈالا تھا۔
 ”اماں جان پلیز۔ تھوڑا ٹھنڈے دل سے میری بات سنیں۔ میں آپ کو ساری بات آرام سے سمجھاتی ہوں۔“
 یا سمین نے ایک بار پھر اپنی ہمت کے تہوار سنبھالے اور شوریدہ لبوں پر ہر کشتی جہانے کی کوشش کی۔
 ”کیا۔ کیا سمجھاؤ گی مجھے۔ کیا بتی رہا ہے اس معاملے میں سمجھانے کو۔ کچھ ہے۔ ہو گا یقیناً ہو گا۔“
 ایک دم ان کو جیسے کسی بات کی سمجھ آئی تھی اور زور سے سہلاتے ہوئے کہنے لگیں۔
 ”میریے پورے ہوں گے تو نے اس سینٹھ سے تب ہی جوان کم سن بیٹی اس بڑھے کے ہمراہ کر دی۔ بول کی بات
 ہے نا؟“

یا سمین کو تو جیسے کسی بچھونے ڈنک مارا بدک کر ان سے پرے ہٹ گئیں وہ ان کے سمجھنے پکڑنے کے معافی طلباں لگتے
 ہوئے انہیں منانے کے لیے پاس آ بیٹھی تھیں اچھل کر پھر رہے کر رہی پر جا کے بیٹھیں۔
 ”اماں جان! خدا کے لیے ایسا برستان نہ لگا میں مجھ پر۔“ ان کے رکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔
 ”یہ برستان نہیں لی لی! بچ ہے۔ حق ہے بیٹی جی ہے نا تو نے اور۔ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ یوں کالی اندھیری
 رات میں چپ چپے لٹکی ہو چھٹی کی۔ اللہ جانے اس نے بھی نکال دیا جیسا ڈی۔ تو اتنی سمجھ بوجھ والی ہشیار
 ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آئی۔ وہ چھپا ہوا بیلا کاغذ نکاح نامہ بنا کر لے آیا ہو گا کچھ آنکھ کی اندھی کو کیا پتا چلا ہو گا۔“
 یوں بھی کرارے نیلے ہرے ٹونوں کے سامنے تجھے وہ بیلا کاغذ دکھایا ہی کہاں ہو گا۔
 وہ اس روانی سے بول رہی تھیں جیسے سارا کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔
 یا سمین تو اب حد سے کمارے تنگ سی تھیں۔ بولنے کو جیسے اب کچھ بچا ہی نہیں تھا۔
 اسی وقت باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔
 ذرا دیر میں ہونے والی ڈور تیل نے بتایا کہ آسنے والا دھری آیا ہے یا سمین کے منہ سے تھکی ہوئی سسکی سی نکلی۔

”اب نہ جانے قدرت کیا تماشا دکھائے۔“ دروازہ کھلا تھا۔ کوئی دھکیل کر اندر آ گیا۔
 اور یا سمین کو لگا ان کی زندگی کے سارے امتحان ساری ذلتیں آج ہی ان کے نامہ اعمال میں درج ہو کر رہیں
 گی۔
 سارے عالم کے ساتھ عرصہ بھی تھی اور سارہ کی چال اور طعنائی نے یا سمین کے رہے سے حواس بھی گم کر دیے۔
 ”ام گئیں ام گئیں تم۔ سارہ میری بیٹی۔ بہت اچھا کیا۔ اللہ نے غیب سے تمہیں ماں کی مدد کو بھیجا نہ اتنی ام بھی
 تو میں خود تیری طرف آنے والی تھی اب تو چاہے مجھے اپنے گھر کے کتے کے ساتھ بھی رکھے کی تو یہ بڑھیا خوش خوشی
 رہ لے گی پر“ اور صبر نہیں رہے گی اور ابھی چلو میں یہاں ذرا دیر کو بھی نہیں رک سکتی۔“ وہ جھٹ پٹ اٹھ کر بیٹھے
 پڑی جوتیاں پیروں میں پہننے لگیں۔
 ”اماں جان! اماں جان! پلیز۔“ یا سمین نے گھکھک کر انہیں روکنا چاہا۔
 ”کیا ہوا؟ کیا ہو گیا اماں جان! خیریت تو ہے۔“ سارہ حیران سی آگے بڑھ کر بولیں۔

”بیٹی رانی نے گل کھلایا ہے“ اماں جان خدا جانے کون سے سہانے سپنوں میں پڑی اونگھ رہی تھیں خبری نہ ہوئی اور جب معاملہ پک گیا لڑکی بھی ہاتھ سے نکل گئی اور عزت بھی تو راتوں رات چوروں کی طرح بیٹی رخصت بھی کر ڈالی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی میرے گھر سے نکلنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ماں بیٹی میں بھی کموں اس روز کیسے اصرار کر کے مجھ سے کئے جا رہی تھیں۔ اماں جان جانیں آپ کا جانا تو بہت ضروری ہے موت کا معاملہ ہے جانیں ضرور جائیں۔ ”انہوں نے ناسف سے ہاتھ ملے دلوں کے بھید اللہ جانے پر ہمیں تو جو نظر آتا ہے وہی کہیں گے اللہ معاف کرے قرب قیامت بلکہ قیامت ہی سمجھو ایسا قہر نہ اندھکھا ماں خود اپنے ہاتھوں سے بیٹی کا۔“

”اماں جان پلیر بس کر بس۔ برت ہو گیا۔ میری بیٹی تھی۔ میں نے رخصت کی یا قبر میں اتاری۔ آپ کو کیا خبر۔۔۔“ سچ کہا آپ نے دلوں کے بھید اللہ جانتا ہے۔“

یا سمیمن کی روتے روتے آواز بھٹ رہی تھی، ”انہیں اماں جان سے ایسے واویلے ایسی حدود پار کر لینے کی توقع تو تھی مگر وہ یہاں تک نہ صرف سوچ لیں گی، بلکہ سارے جہان کو بھی سنا ڈالیں گی اس کی انہیں ذرا بھی امید نہیں تھی“ آخر کو اتنے سال یا سمیمن نے دل و جان سے ان کے برے ترین رویوں کے باوجود خدمت کی تھی مگر۔ مگر آج تو جیسے ہر خدمت کیا۔ ہر تعلق خاطر پر انہوں نے پانی پھیر دیا تھا۔ اس سے زیادہ سننے کی نہ ان میں تاب تھی نہ حوصلہ۔

روتے ہوئے اندر بھاگ گئیں۔

”دیکھا۔۔۔ من لیا ہماری عزت افزائی۔۔۔ اے مولا۔۔۔ چار دن جو زندگی کے لکھ رکھے تھے۔ عزت سے کاٹے دیتا ایسی ذلت ایسی بے وقعتی ہم جن پوتے پوتیوں کو جگر کا ٹکڑا سمجھے“ میں نے لگا کر جیسے کا سب جانتے رہے بہو بیگم فرما گئیں کہ وہ ان کی اولاد ان کا مال ہے جو چاہے فیصلہ فرمائیں ہمیں منہ سے بھاپ نکالنے کی بھی اجازت نہیں۔“

آج ثریا بانو اپنے آپے میں نہیں تھیں، یا نہیں برس پہلے والی خوب رعب و اب طمطر والی ثریا بانو جاگ اٹھی تھیں۔

”چلو بی بی! ہمارا تو دانہ بانی یہاں سے اٹھ گیا۔ ہم تو ایسے بے غیرت نہیں نہ ایسے پتے والے کہ بے غیرتی سے ہی سہی جیسے چلے جائیں اور سنو سارہ بی بی! تم بھی بول دو ساتھ لے کر چلو کی وردن شہر میں، تیرے ہم جیسے لاوارث بدبھوں کے لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہیں بھی نموشی (شرمندگی) سے بڑھ کر چار دن گزار لیں گے۔“

انہوں نے تخت کے ایک طرف رکھ لیا وہی سفری بیگ اٹھایا جو ملتان سے واپسی پر ان کے ہمراہ تھا، تخت پر پڑی چادر اٹھائی اور جی اور آگے چل پڑیں۔

”اماں جان! کہیں تو سہی میں بھائی جان سے مل لوں۔ پتا تو کروں آخر معاملہ کیا ہے؟“

سارہ کے تو فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ اوھر آتے ہی لینے کے دینے پڑ جائیں گے تو یونہی دینا داری کواں کی خیریت دریافت کرنے آئی تھیں، یہ نہیں پتا تھا کہ اماں جان ساتھ ہی چل پڑیں گی وہ بھی نہ جانے کتنے دنوں میں ان کے لیے یا پھر ہمیشہ کے لیے۔

سارہ عالم کو سوچتی ہی گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

وہ احسن مراد سے مل کر اماں جان کی واپسی کے لیے محفوظ راجن کا اندازہ کرنا چاہ رہی تھیں۔

”ارے رہے دو بھائی جان بن بیٹھے۔“ وہ فضا میں ہاتھ نچا کر خوب ہی ہمزاجی سے بولیں ”تم تو قیامت نہیں ہوئی کہ ماں اتنا لمبا سفر کر کے آ رہی ہے اٹھ کر اس کا حال احوال ہی پوچھ لوں میوں اپنا کوئی ذرا سا بھی دکھاؤ سارے

زمانے کو سانے کے لیے چلا کر سارے گھر میں جانچتا ہے اماں کے پاس آنے کو قدم دکھ گئے۔ آتے ہی بیوی نے جو ہوش ریا کمائی سنا ڈالی اس کے آنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ ”آنا بھی کس منہ سے۔۔۔ میں تمہاری گاڑی میں بیٹھتی ہوں۔ تم جا کر بھائی جان سے مل آؤ میں یہاں اب مل بھر کو بھی نہ رکوں گی۔“

وہ تیز تیز بولتی باہر نکل گئیں تو سارہ کچھ حیران کچھ تجسس سی محسن کے درمیان میں کھڑی اندر جاؤں کہ نہ جاؤں والی کیفیت میں کھڑی رہیں۔

ثریا بانو کے باہر نکلتے ہی جیسے گھر کے در و دیوار بھی دم سادھ کر کھڑے ہو گئے تھے مگر جہ بکلی بکلی ہوا چل رہی تھی مگر امروہ کے درخت کے پتے یوں سا لیں رو کے کھڑے تھے جیسے انہیں کسی نے پھاکی کی سزا سنائی ہو۔ ایک بھیا نک چپ!

سارہ کو خوف سا آیا اور وہ تیزی سے مڑیں اور باہر نکل گئیں عزت پہلے ہی ثریا بانو کے ساتھ باہر جا چکی تھی۔ حسب توقع اماں جان ابھی بھی اونچا اونچا بولے جا رہی تھیں۔ سارہ کو کوفت سی ہوئی۔

”پلیر! اماں جان! گھر جا کر کر لیں گے باتیں۔ ابھی کچھ تو خیال کریں۔“ انہوں نے جھجھکا کر آنکھ سے ڈرا میو کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا اور بولتے ہوئے بیٹھ گئیں تو ثریا بانو خاموش ہو گئیں۔

یوں بھی اب وہ سارہ عالم کے گھر رہنے جا رہی تھیں سو گھر والوں کی خواہشات کو ملحوظ خاطر رکھنا لازم تھا، وہ چکی بیٹھی رہ گئیں۔

ایک دھڑکا بس ثریا بانو اور سارہ دونوں کو ہی لگا ہوا تھا کہ کہیں گھر جاتے ہی محمود عالم سے سامنا نہ ہو جائے اماں جان کے وہاں رہنے کے لیے تو کوئی بھی جواز گھر جا سکتا تھا مگر ابھی جو اشتعال ثریا بانو پر طاری تھا اگر اس کے باعث وہ جاتے ہی بولنا شروع ہو گئیں تو کیا محمود عالم کو بھی ساری کمائی سانی پڑے گی؟

”ہرگز نہیں پہلے ان کی نظروں میں ہماری عزت دو کوڑی کی نہیں اس شاندار کارنامے کے بعد تو۔۔۔“ سارہ اس سے آگے نہیں سوچ سکتی تھیں میوں بھی ابھی محمود عالم کے گھر آنے کا نام نہیں تھا۔

وہ تینوں آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئیں اور سامنے بیٹھے محمود عالم کو دکھ کر تینوں ہی ٹھک گئیں۔

ثریا بانو کی تیز تیز چلتی زبان اور یا سمیمن کو کوٹنے ملا مت دیتی زبان سے چلتی زبان فوراً ہی ٹھنڈا کر رہ گئی۔

ٹھنڈا دینے والی تو محمود عالم کی نگاہیں ہوتی تھیں ایسی سرواہی پھر ملی کہ سامنے نظر آنے والے کو بھی پتھر کا کر ڈالیں گی اور وہ ان تینوں کی طرف سی دیکھ رہے تھے۔



”تمہیں گھنہ بھر میں یہاں سے ڈسچارج کر دیا جائے گا“ ڈیوڑھی نے پے کر دیے ہیں میوں بھی میرے خیال میں تم اب کافی بہتر ہو۔“ عائشہ بخاری نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

تیز بل بیڈ پر ٹائلیں لٹکا کر بیٹھا تھا۔ اس کے معمولی زخم تو مندمل ہو چکے تھے، صرف سر کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا اور ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا تین دن اور میڈیج کروانی ہوگی اور ایک ہفتہ میڈیسن لیتی ہوگی وہ یوں بھی جلد یہاں سے نکلنے کے لیے بے چین تھا۔

اس نے رات خواب میں یا سمیمن کو بہت بیماری حالت میں دیکھا تھا تب سے اس کا دل جیسے اڑا جا رہا تھا۔

”یقیناً“ وہ اچھی نہیں ہیں۔ تانیہ کے بعد میں بھی جس طرح انہیں چھوڑ آیا ہوں وہ کیسے اچھی رہ سکی ہوں گی۔“

اگر ڈاکٹر اسے آج نہ بھی ڈسچارج کرتے اس نے خود ہی زبردستی چھٹی لے لینی تھی۔

”کہاں گم ہو؟“ عائشہ نے اس کے گم صم انداز دیکھ کر اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا کر پوچھا۔
 ”تم تو دن میں آنہیں سکتی تھیں آج کیسے آگئیں؟“ وہ عائشہ سے بات کرتے ہوئے خود بخود تلخ ہو جاتا تھا۔
 لاکھ خدائی میں سوچتا کہ اب اس ہمدرد لڑکی سے نرمی سے نہ سنی نارمل انداز میں بات کرے گا مگر اسے اپنے سامنے دیکھتے ہی اس کا انداز ایک دم سے ٹیکھا ہو جاتا۔
 ”ہاں آؤ نہیں سکتی۔ آج میڈم آفس نہیں آئی تھیں اس لیے موقع مل گیا۔“ وہ اس کے تلخ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے سادگی سے بولی۔
 ”تم نے آگے کیا سوچا ہے؟“ وہ ذرا دیر بعد بولی شاید اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرنا چاہ رہی تھی۔
 ”میں بھی گھر جاؤں گا کافی الحال۔“ اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ عائشہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔
 ”تم ان لوگوں کے چنگل میں کیسے پھنس گئیں مشکل سے تو سمجھ دار لگتی ہو۔“ تنزیل جو اس کے جھکے ہوئے چہرے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہا تھا کئی سے بولا۔
 ”تقدیر اگر شکلیں دیکھ کر لکھی جاتی تو اس دنیا میں کسی شخص کی قسمت میں تکلیفیں نہ آتیں۔“ وہ ایک آہ سی بھر کر بولی۔
 ”چھوڑ کیوں نہیں دیتیں یہ سب۔“ وہ ذرا تیز لہجے میں بولا۔
 ”اتنا آسان ہے دلدل سے نکلتا۔“ وہ اسی طرح سرد آہ بھر کر بولی۔
 ”اگر کوئی ہاتھ پکڑ کر نکالنا چاہے تو بھی نہیں۔“ جانے کیسے تنزیل کے منہ سے پھسل گیا کہ جواب میں عائشہ یوں گو گئی ہوئی کہ کتنی دیر بولی ہی نہیں سکی۔
 ”یہ تم واقعی نکلتا نہیں جانتیں۔“ وہ اس کی خاموشی پر طنز سے بولا۔
 ”جو تم سمجھو۔“ اس نے گہرا سانس لیا اور نظروں کا زاویہ پھیر لیا۔
 ”تو پھر میرے پیچھے کیوں آئی ہو۔“ تنزیل کو اس کے مبہم سے جواب پر غصہ آیا۔ وہ اس کے منہ سے کچھ اور سننے کے لیے بے تاب ہو کر بولا۔
 ”بار بار بتانا پڑے گا۔“ وہ اٹھ کر بیڈ کے سرانے بڑی میز سے اس کی وہ انیاں سمیٹنے لگی۔
 ”ہمدردی میں ترس کھا کر؟“ ہے نا۔“ وہ یکدم اٹھا اور اس کی حرکت کرتے ہاتھ کو زور سے پکڑ کر طیش میں بولا۔
 عائشہ کو اس سے ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی میران سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔
 ”چھوڑو میرا ہاتھ۔“ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے دوسرے ہاتھ سے تنزیل کا ہاتھ پرے ہٹانے کی کوشش کی۔
 ”ہاں مجھے معلوم ہے۔ تمہیں ہاتھ لگانے کے بھی چار جزاؤں کرنے پڑتے ہیں اور میری جیب میں تو ہسپتال بل کے میسے نہیں سو تمہیں ہاتھ لگانا انورڈ کر سکتا ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے یکدم اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوڑ دیا۔
 عائشہ کا چہرہ تاریک رہ گیا۔
 ”شٹ اپ۔“ وہ منہ پھیر کر گھٹی ہوئی آواز میں بولی اور چہرے کا نقاب درست کرنے لگی۔
 ”میں اب چلتی ہوں اگر بھی مجھ سے کانٹیکٹ کرنا ہو تو میرا سیل ہے تمہارے پاس۔“ لیکن۔“ وہ رکی تھی
 ”کوشش کرنا اس کی نوبت نہ ہی آئے۔“
 ”تانیہ کہاں ہے؟ ہٹاؤ گی نہیں۔“ وہ اس کے سامنے آکر ٹٹے ہوئے انداز میں بولا۔
 ”ٹٹل ایٹ جا چکی ہے۔“ وہ نارمل انداز میں بولی۔
 ”ایڈریس مل سکتا ہے؟“

”میرے پاس نہیں کوشش کروں گی۔“ تنزیل اپنی ٹھوڑی کو سہلاتا ہوا کسی سوچ میں گم تھا شاید اس نے عائشہ کا جواب سنا نہیں تھا۔
 ”یہ کچھ پیسے رکھ لو فوری طور پر تو ابھی تم کچھ نہیں کر سکتے۔“ عائشہ نے پرس سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔
 ”تم کیوں چاہتی ہو کہ میں ضروری تمہارا احسان مند ہوں اور یہ اپنا سیل بھی لے جاؤں۔ مجھے تم سے رابطہ کرنے کی اول تو کوئی ضرورت نہیں اگر ہوئی بھی تو تمہارے اور تمہاری میڈم کے اڈے کا مجھے پتا ہے وہیں اگر بات کر لوں گا۔“ اس نے مٹر کر بیڈ کے سرانے پر اپنا سیل فون اٹھا کر عائشہ کو ٹھہرایا جیسے اس نے خاموشی سے پکڑ لیا اور کچھ بھی کہنے بغیر جانے لگی۔
 تنزیل کے دل میں پھر بے چینی سی ہوئی۔
 ”یہ کیا ہے؟ یہ سب کیا ہے؟“ وہ ابھ گیا۔ وہ میرے پاس آتی ہے تو مجھے غصے اور طنز کے سوا کچھ سوچتا نہیں۔
 دل کرتا ہے جی بھر کر اسے ذیل کروں اور جانے لگتی ہے تو جی چاہتا ہے پک پک کر پکڑ لوں رابطہ کی کوئی وجہ ہم دونوں کے بیچ بندھی رہے اور رابطہ کا ہر ذریعہ اپنے ہاتھوں سے لوٹا بھی دیتا ہوں۔ یہ سب کیا ہے؟
 ”ویسے تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ اپنی ہی نکمکش سے گھبرا کر اس نے عائشہ کے قدموں میں سوال کی بیڑی ڈالی۔
 ”کون سے سوال کا؟“ حسب توقع وہ رک گئی تھی۔
 ”اگر تمہیں کوئی ہاتھ پکڑ کر اس دلدل سے نکالنا چاہے تو۔“
 وہ شاید ہلکا سا مسکرایا تھا عائشہ کو تو یہی لگا مگر اگلے بل اس کا چہرہ پہلے کی طرح سخت ہو چکا تھا۔
 ”ایسا کوئی جی دار ہے نہیں اگر ہو بھی تو۔“
 ”تو؟“
 ”نکل کر میں کیا کروں گی۔ مجھے کون قبول کرے گا۔“ وہ غم سے لہجے میں بولی اور چہرہ گھمایا۔
 ”تم میرا ایک پیغام اپنی میڈم کو دے سکتی ہو؟“
 ”نہیں۔“ عائشہ نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے تیزی سے کہا۔
 ”اتنی خوف زدہ ہو اس مکار بڑھیا سے۔“
 ”جو بھی سمجھ لو۔ میں چلتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے ابھی تک تو میم آفس نہیں آئی تھیں۔ ان کی بیٹی کی طبیعت اچھی نہیں تھی مگر وہ کسی بھی وقت آ بھی سکتی ہیں اور مجھے نپا کر۔ اوکے میں۔“
 ”سنو اس کی بیٹی بھی ہے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ ایک دم اس کے سامنے آیا اور عائشہ کو کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف گھما کر بولا عائشہ نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹکا۔
 ”اس میں بتانے والی کون سی بات ہے بھلا۔“ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔
 ”بتانے والی نہیں ڈیرا یہ تو چھپانے والی بات تھی جو تم میرے سامنے اگل گئیں ٹھیکس فرینڈ۔ تم نے مجھے جاتے جاتے ایک اچھی خبر دی ہے میڈم یا قوت کی بیٹی۔“ یقیناً اس عورت کو بہت عزیز بھی ہوگی اپنی جان سے بھی بڑھ کر اور اس کی زندگی اس کی جان اس کی عزت۔ دنیا کی ہر قیمتی شے سے زیادہ بیش قیمت ہوگی اس عزتوں کی ٹھیکری عورت کو بہنا۔“
 وہ چمکتی آنکھوں اور پرجوش چہرے کے ساتھ عائشہ کو پلک جھپکے بغیر نکلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 عائشہ پہلے تو اس کے جوش کا مطلب نہ سمجھ سکی اور جب سمجھ میں آیا تو کندھے اچکا کر رہ گئی۔

”اگر تم میرا ساتھ دو۔۔۔۔۔ عائدہ! اگر تم میرا ساتھ دو۔ ہم دونوں اس عورت کو اسی طرح چاگل کر سکتے ہیں جیسے جیسے اس نے مجھے، تمہیں تم سے وابستہ لوگوں کو اور مجھ سے منسلک رشتوں کو دیوانہ کر دیا ہو میرا ساتھ دو کی؟ وہ سرخوشی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”کیا مطلب؟ کیا ساتھ؟“ عائدہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

”جس طرح اس نے تمہاری زندگی کو، تمہاری خودداری اور عزت کو بامال کیا ہے اگر اس کی بیٹی کی ایسی بامالی کے لالے بوجا میں تو سوچو اس پر کیا ہوتی گی۔“ وہ خوش میں اس کا ہاتھ پکڑ چکا تھا۔

”مگر یہ سب کیسے ممکن ہے اور کیونکر؟“ عائدہ الجھ کر بولی۔

”اگر تم میرا ساتھ دو تو یہ ناممکن نہیں، صرف ایک پتا کھیل کر ہم اپنے سارے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ تم اس دلدل سے نکل سکتی ہو اور میں۔ میں تانیہ کو واپس لا سکتا ہوں اور۔“ وہ خوش میں اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”آئیڈیا اچھا ہے مگر ایسا ہونا ممکن نہیں جس طرح ہم تک پہنچنا ناممکن ہے، اسی طرح ان کی بیٹی تک۔۔۔“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، صرف میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔

”میں وعدہ نہیں کر سکتی۔ یہ بہت مشکل کام ہے پھر۔۔۔“ وہ ہچکچا کر رہ گئی۔

”پھر کیا!؟“ وہ خفگی سے بولا۔

”تمہارے عراکم کیا ہیں اس کے بارے میں؟“ عائدہ نے پوچھا تو تنزل یکدم ٹھٹھک گیا۔

”یہ میڈم یا قوت کی جاسوسہ بھی ہو سکتی ہے اور میرے عزائم جاننے کے لیے میرے ساتھ ساتھ ہے اور میں بے وقوفوں کی طرح۔“ اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا تھا۔

”کچھ خاص نہیں اور تمہاری بات صحیح ہے یہ سب تو بہت مشکل ہے۔ چھوڑو پرے۔“ وہ ایک دم بھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

عائدہ حیران سی اسے دیکھنے لگی یہ عجیب سا لڑکا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ بل میں تولد بل میں ماشہ۔

”اچھا خیر میں پھر بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گی گھر جا کر پشت بھر آرام کرو اور پھر کوئی مناسب جاب تلاش کر کے کسی کام سے خود کو لگاؤ فارغ رہو گے تو اس طرح کی منفی سوچیں آتی رہیں گی اور تمہاری زندگی کا بیزا غرق کرتی رہیں گی دوست سمجھتے ہو تو میرا مشورہ ماننا یہ زندگی ایک بار ہمیں ملتی ہے اس کی نافرمانی نہ کرو یہ سیل رکھ لو۔ میں اگر کسی سلسلے میں تمہارے کام آسکی تو مجھے خوش ہوگی۔ میں اب چلتی ہوں خدا حافظ۔“

وہ اس کے ہاتھ میں وہ سیل فون تھا کر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ ساتھ ہی تنزل کے دماغ میں سوچوں کے کئی دروا کر گئی۔



”لائیو ڈیر! اٹھو بھی اب۔ صبح سے یونی پڑی ہو، ناشتہ بھی نہیں کیا، اٹھ کر ہاتھ لوزر افریش ہو جاؤ۔ میری جان کچھ کھاؤ۔“

وہ صبح سے اس کے کمرے کے تین چار بار چکر لگا چکی تھیں، مگر وہ ہر بار انہیں آتا دیکھ کر آنکھیں بند کیے سوتی بن جاتی۔

وہ جانتی تھیں وہ جاگ رہی ہے، نہ جانے کیوں ان سے نظریں نہیں ملانا چاہ رہی۔ ”یہ خود ہی خود کو سمجھا لے تو اچھا ہے۔“ وہ ہر بار اس کی ایکٹنگ کو جھٹکے ہوئے چپکے سے باہر نکل گئی۔

”مجھے جھوک نہیں اور پلیز! مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“ وہ کڑوٹ بیدار ہوتے ہوئے رکھائی سے بولی۔

میڈم یا قوت اس کے بیڈ کے پاس کھڑی کچھ سوچتی رہیں۔ ”آخر یہ غصہ یہ ناراضی کس بات پر ہے۔“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے بالوں پر ہاتھ پھرنے لگیں۔

”کوئی غصہ ناراضی نہیں۔ پلیز بیوی الوں۔“ اس نے جھلا کر ان کے ہاتھ جھٹکے اور بیڈ پر زور پارے کھسک گئی۔

”جو تمہارے دل میں ہے۔ کہہ ڈالو، شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“ وہ اس کے کیلئے انداز کو دیکھتے ہوئے نرمی سے بولیں۔

”آپ تو شاید اپنی مدد نہیں کر سکتیں، میری کیا کریں گی؟ وہ طنز بھرے انداز میں بولی سلائیہ کے سارے ڈھنگ ہی بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”کیوں ایسی کیا بات ہے؟ تم نے مجھے کہاں بے بس پایا۔“

”جو انسان اپنے ہی وجود کے حصوں کو شناخت کا ہنر نہ دے سکے اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔“ وہ ذرا اٹھتے ہوئے اسی جگہ کئے انداز میں بولی جس سے پہلے بول رہی تھی۔

”تمہیں شک لگا ہے دائم کو بھائی کے رشتے میں دیکھ کر؟“ انہوں نے صاف گوئی سے بات کی۔

”پلیز باما آئی ہیٹ آل دس۔“ وہ یکدم اپنی دونوں پٹینوں کو زور سے ہاتھوں میں جکڑ کر تیز آواز میں بولی۔

”حقیقت کا سامنا کرنا سیکھو پھر زندگی اتنی سچ نہیں لگے گی ضروری نہیں ہمارا ہر خواب ہی سچا ہو۔“ وہ اس کی فرسٹریشن کا سبب سمجھتی تھیں تب ہی نرمی سے بول رہی تھیں۔

”ہر خواب، ہونہ۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ کی بڑی مولائی ہوگی، شوہر رشتی سے بولی اور منہ پھیر لیا۔

”اس طرح کیا حقیقت بدل جائے گی۔“ بڑا صلح جو سا انداز تھا ان کا۔

”کیسی حقیقت؟ کون سی حقیقت؟“ وہ جھجھک کر بولی۔

”دائم تمہارا بھائی ہے اور تم اس کی بہن۔“ وہ بڑے تحمل سے بولیں۔

”ایک کام کر س مام ڈیر! اپنی یادداشت پر زور دے کر کوئی اور بھولی، سری حقیقت ایسی ہی کوئی اور کہانی، کچھ اور ایسے قریبی رشتے، گروار جو آپ کی اس مصروفیت بھری زندگی کے جنجال میں کہیں گم ہو کر رہ گئے ہوں، انہیں بھی ذرا فرصت میں بیٹھ کر یاد کر لیتے اور ایسی تمام پر اسرار کہانیاں ایک ہی بار مجھے بیٹھ کر سنا ڈال لے تاکہ میں ہر بار اس نروس بریک ڈاؤن کا شکار نہ ہونے پاؤں۔ آپ جیسے مضبوط حوصلے نہیں ہیں میرے جواپے ایسے انہوں نے راز سینے میں دبائے نارمل زندگی گزارتی رہوں۔“

وہ چپا چپا کر غصے میں بولتے ہوئے انہیں کیسی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اندر سے کٹ کٹ جا رہی تھیں۔

”لائیو! تمہیں جتنا غصہ مجھ پر ہے، ایک ہی بار نکال لو مگر ایک بار ٹھنڈے دل سے یہ سب تسلیم کر لو اور اپنی ماں کی بے بسی اس کے حوصلے کا بھی خیال کرو جو زندگی کے ایسے مصائب تن تنہا سستی، تمہیں پرورش کرتی، ماں تک لے آئی اور اب قدرت کو اس کے صبر اس کے ضبط پر رحم آگیا تو پھر ڈائیٹا۔“

”کم آن ماما! تمہیں پنی فلی اسٹوری آپ کسی اور کو سنائیے گا۔ مجھے یہ سنوں چاہیے کہ تم شہرہ بے کا جوان ہو کر ملنا خون کی کشش کی بنا پر پچھانا اور پھر سب کچھ قدرت کا انعام سمجھنا۔ ریش۔ آپ کے لیے یہ انعام ہو گا۔ اور میں میں کتنی دور جا چکی ہوں آپ کو اس کا احساس ہی نہیں۔ نہیں ہے آپ کو احساس۔“

وہ غصے میں تلخے اٹھا اٹھا کر سامنے ڈرننگ ٹیبل پر مارنے لگی۔ شدت جذبات سے اس کا چہرہ ایک دم سے بھڑک اٹھا تھا۔

”تو بات اتنی سادہ نہیں ہے، یا قوت! جتنا تم سمجھ رہی تھیں۔ اس کے من پسند سنے کو تم اس کی آنکھوں سے نوج کرنے رشتے کے تقدس میں لپیٹ کر اسے کسی قیمتی تحفے کی طرح پیش نہیں کر سکتیں اسے اتنی دیر سے واپس لانا بہت مشکل ہے۔ بہت۔“ وہ دیکھ بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہ گئیں۔

مام میں واپس جانا چاہتی ہوں فرسٹ ایویل ایبل فلائٹ میں جو بھی غلط مل سکے۔ پلیز! میرے لیے کفرم کروا دیجئے۔ مجھے اب یہاں ایک دن بھی نہیں رہنا اور یہ آپ کی مجھ پر آخری مہمانی ہوگی پلیز۔“ وہ اٹھی اور ان سے نظریں ملائے بغیر کہتے ہوئے تیزی سے دواش روم میں کھس گئی اور دروازہ لاک کر لیا۔

”میرے خدا میرے لیے ابھی اور کتنے امتحان باقی ہیں۔ خوشی بھی ملتی ہے تو غم کے کانٹوں میں لپٹی ہوئی۔ میں تھک گئی ہوں یہ کانٹے چبھتے چبھتے اور کتنا سفر کروں۔ ایک ہر سکون سادہ زندگی۔۔۔ کیوں میرے مقدر میں نہیں۔ کیوں؟“ آج برسوں بعد ان کی آنکھوں میں ایسا ٹوٹ کے بادل آیا تھا۔

”ہر سکون سادہ زندگی۔۔۔ اگر یہ کانٹوں بھری خوشیاں مکمل خوشیوں میں بدل جائیں تو بھی ایسی زندگی مجھے نہیں مل سکتی۔ بہت سارے کانٹے میرے مقدر نے میری زندگی میں بوئے اور بہت سارے کانٹے خود جن کر میں نے اپنی راہوں میں بچھا لیے ہیں کہ اب چاہوں بھی تو نہ ان کانٹوں کو ہٹا سکتی ہوں نہ راہ بدل سکتی ہوں تو پھر یہ سکون سادہ زندگی۔۔۔ تو شاید مجھے مرنے کے بعد ہی نصیب ہو۔۔۔ مگر وہ بھی ممکن نہیں۔ محض ایک زندگی کی بربادی کا انتقام لینے کے لیے میں نے بے شمار زندگیوں کو تباہ کر ڈالا ہے۔ ان بے شمار زندگیوں کی آہیں بدعا میں کیا مجھے مرنے کے بعد ہر سکون عاقبت بخش سکیں گی؟ کبھی نہیں۔“

یہ کون تھا جو آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ انہیں کیا بھیانک آئینہ دکھائے جا رہا تھا۔ شاید ان کا ضمیر جو جب ان کے سامنے آتا ان کو اندر رہا ہر ملامت کے پتھروں سے سنگسار کر ڈالتا۔

”دائیم علامت۔۔۔ بھی تو دونوں ایک دوسرے کو اس نے رشتے کے حوالے سے قبول نہیں کر رہے۔ بالفرض کر بھی لیں تو جب میری حقیقت ان کے سامنے کھلے گی۔ کیا وہ میری طرح مجھے مظلوم متن بجانب سمجھ سکیں گے کبھی نہیں اور میں ان دونوں کو یا کر بھی کھودوں گی، کیسی بد نصیب ہوں میں جسے نہ خوشی راس آتی ہے نہ غم۔ غم میں انتقام اندھا کر دیتا ہے اور خوشی میں دوسرے۔ ایک بیچلی کا جہنم۔۔۔ میرے اندر سلگ رہا ہے، کس کو اس دوزخ کی جھلک دکھاؤں جو بھی دیکھے گا اٹنا میرے منہ پر تھوک کرے۔“

شاید وہ جذبات کی پورش میں ابھی دھائیں مار مار کر رو پڑیں کہ ان کے ہاتھ میں دیا ان کا سیل بج اٹھا تو جیسے وہ کسی گہرے کونے سے باہر نکلی ہوں۔

”دائیم از کانٹ۔“ چمک رہا تھا اور وہ خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”لیں۔۔۔ تم رات کو چپکے سے ہی چلے گئے۔ ہاں لائیب ٹھیک ہے اب۔۔۔ ظاہر ہے اسے شاک تو لگتا تھا اس نے چل۔“ وہ اپنی آنسوؤں سے بوجھل آواز کو گلا گھٹکار کر صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”ہو جائے گی ٹھیک۔۔۔ ہاں میں خود ملنا چاہتی ہوں تم سے۔ نہیں میں آج آفس بھی نہیں گئی۔ لائیب کے پاس کچھ ٹائم گزارنا چاہتی تھی اس لیے۔“ وہ خود کو سمیٹتے سنبھالتے اٹھ کر باہر نکل آئیں۔

”میں آجاتی ہوں تھوڑی دیر میں تمہاری طرف۔ گھر میں ہوتا۔“ وہ اب خود کو مکمل طور پر سمیٹ چکی تھیں۔

”مگر نہیں آفس میں ہو۔ اوکے۔ میں تمہارے آفس آجاتی ہوں اور سنو۔“ انہوں نے پلٹ کر دیکھا لائیب

پیچھے تو نہیں آ رہی۔

”تم ذرا لائیب کو فون کر لو۔ اس کی خیریت پوچھنے کے لیے اور ذرا اپنی طرف سے تھوڑی خوشی خوشی آئی میں سربراہ کا اظہار کرنا شاید اسے سمجھنے میں کچھ آسانی ہو۔ نہیں نہیں۔ یوں تو ٹھیک ہے بس ذرا جذباتی زیادہ ہے

تم دونوں میں کیونکہ کشن ذرا بہتر ہو جائے اس لیے۔ چلو جیسے تم چاہو۔“
 ”نہیں میں آ رہی ہوں مجھ سے بھر میں۔ اوکے ٹیک کیڑا پناہت خیال رکھنا۔ آئی اوبو میری جان۔ اللہ حافظ۔“ ان
 کے لیے میں وہی وارفتگی عود کرتی تھی جو دائم کو سوچتے اس کو دیکھتے ہی ان کے لیے میں آجایا کرتی تھی۔
 ”وسوسہ شیطان کا سب سے موثر آلہ کار ہے جو انسان کو گھٹوں میں کم زور کر کے چت کر سکتا ہے اور مجھے کم
 زور نہیں پرنا نہ کانٹوں سے گھبراتا ہے نہ راہ بدلتا ہے۔ وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ خود کو تسلی
 دیتی تیار ہونے چل دیں۔
 جاتے ہوئے وہ ملازمہ کو اپنا اور لائبر کائناتہ ٹیبل پر لگانے کا کہہ گئیں اگرچہ انہیں لائبر کے میز پر آنے کی امید
 کم ہی تھی پھر بھی وہ اس وقت کوئی مایوس خیال دل میں لانا نہیں چاہ رہی تھیں۔

”السلام علیکم۔ ماما۔“ پہلی بار اپنی زندگی میں اس کی زبان کو یہ چار حرفی لفظ ماما ادا کرنے میں اتنی دشواری ہوئی
 تھی وہ اندر داخل ہوتے ہوئے چہرے پر ایک فراموشی مسکراہٹ سجایا تھا جسے ڈاکٹر خشنہ بڑی جاچتی نظروں سے
 پرکھ رہی تھیں۔
 ”وعلیکم السلام تم روز اس وقت گھر آتے ہو۔“ انہوں نے جاتی ہوئی نظروں سے سامنے دیوار پر لگے سنری
 وال کلاک کی طرف اشارہ کیا جس کی سوئیاں رات کا ڈیڑھ بج رہی تھیں۔
 ”نو۔ آج ہی دیر ہو گئی۔ آپ نے اچھا سربراہ کر دیا۔ کم سے کم آنے کے بارے میں بتا دیتیں میں ایئر پورٹ پر لینے
 آجاتا۔“

وہ ان سے ذرا فاصلے پر بڑے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا تو ڈاکٹر خشنہ جو اسے گلے
 لگانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھیں ان کے بیٹھ جانے پر حیران و ششدر سی کھڑی کی کھڑی
 رہ گئیں۔
 ”دائم کو بھی لمحہ بھر بعد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ متذبذب سا کچھ اٹھ ہی گیا مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔
 ڈاکٹر خشنہ مایوس دل گرفتہ سی دوبارہ بیٹھ چکی تھیں۔
 اب دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔

”نہ گیت پر چوکیدار تھا نہ کوئی اور ملازم۔ انہوں کی طرح میں تیل بجاری تھی۔ بے چارہ بشیر کا کاغذ میں
 مددوش جانے کیسے گیت تک اٹھ کر آیا ورنہ میں ابھی تک گیت ہی پر نہیں کھڑی ملتی۔“ ایک تکلیف دہ خاموشی
 کے بعد وہ بولیں تو دائم کو ان کا انداز مان کا لہجہ کیسا اجنبی سا لگ رہا تھا۔
 ”ایسا کیوں؟“ وہ حیران سا سوچ رہا تھا ان کی باتوں کو ان سنا کرتے ہوئے۔
 ”آپ مجھے کال کر لیتے؟“ وہ چپ ہوئیں تو کافی دیر بعد دائم بولا۔
 ”اور تم بیل آف کر دیتے میرا نمبر دیکھ کر یا سانیٹس پر لگا دیتے ہے نا؟“ وہ ترشی سے بولیں۔

”نہیں۔ میں بھلا ایسا کیوں کرتا۔“ وہ پھٹکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔
 ”جیسے اب تک اتنے دنوں سے کرتے آ رہے ہو وجہ پوچھ سکتی ہوں مجھے اس طرح نظر انداز کرنے کی؟“ وہ
 پھٹ پڑنے کے انداز میں بولی تھیں۔
 ”نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یونہی کچھ دنوں سے فیکٹری میں کام بہت تھا مصروفیت کے باعث یا کسی
 میٹنگ کے دوران ایسا ہو گیا ہو گا ورنہ میں جان بوجھ کر ایسا کیوں کروں گا۔“ اپنا جواب اسے خود بھی بے وزن بودا

محسوس ہوا تھا۔

”کیا پریشانی ہے دائم تمہیں آج کل؟“ ان کی بے چینی متنازعا درخورد پر سختی کا خول قائم نہ رکھ سکی۔
 ”کوئی پریشانی نہیں۔ بس یونہی تھک سا گیا ہوں آرام کروں گا تو تھیک ہو جاؤں گا۔ آپ نے کھانا کھالیا؟“ وہ
 کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم نے کھالیا؟“ وہ اس کے یوں اٹھنے پر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”جی کھالیا تھا۔“ وہ دانستہ نظریں چرا کر بولا۔

”اوکے ماما گڈ نائٹ! آپ بھی آرام کریں، سفر سے تھکی ہوں گی صبح باتیں کریں گے۔“ وہ رسا ”ان کے پاس
 رکا۔ ڈاکٹر خشنہ بے تابانہ آگے بڑھیں اور وہ سر ہلاتا آگے چلا گیا۔

”تم نے اپنے پیپا کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں۔“ وہ میڑھیاں چڑھ رہا تھا جب ڈاکٹر خشنہ نے پیچھے سے طنز
 بھرے لہجے میں پوچھا۔

”سوری۔ بھول گیا۔ کیسے تھک گیا؟“ وہ بالکل غائب دل لگ رہا تھا۔

”تم واقعی تھکے ہوئے ہو سو جاؤ جا کر۔“ وہ تھکی ہوئی آواز میں کہہ کر دوسری طرف مڑ گئیں۔

دائم کچھ دیر کھڑا انہیں جاتا دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ میڑھیاں چڑھنے لگا اور ڈاکٹر خشنہ کو صبح اٹھتے ہی دوسرا
 شک لگا تھا۔

دائم ان کے اٹھنے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔

وہ حق دق سی بیٹھی رہ گئیں۔ صبح انہوں نے اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی تھی لان میں پھرتی بھی رہیں دو تین بار جی
 میں آیا کہ جا کر دائم کو دیکھیں مگر پھر اس کا رات کا لہجہ ہوا رویہ انہیں روک لیتا۔

رات بھر وہ تھیک سے سو نہیں سکی تھیں۔

انہوں نے بے دلی سے ناشتہ کیا۔ رات بھی انہوں نے دائم کے انتظار میں کچھ نہیں کھایا تھا اس کے روکے
 پھکے رویتے نے ان کا دل ہی توڑ دیا تھا۔

”تو یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے۔ میرا دل تھیک سنگل پاس کر رہا تھا کہ یہاں کوئی گزرتا ہے۔ وہ جاو کر عورت اپنا
 وار کر چکی ہے۔ میرا پلا پلایا بیٹا مجھ پر جان چھڑکتے والا بیٹا ہوا تھا تو سے نکلا جا رہا ہے اور میں جو سات سمندر پار کر
 کے اس کے پاس آئی ہوں۔ یہاں آکر ہتھیار ڈال دوں۔ اپنا بیٹا اسے تھال میں سجا کر پیش کر دوں اور خود پیچھے
 ہٹ کر دیوار سے لگ جاؤں۔ ہرگز نہیں ڈاکٹر خشنہ بزدل کبھی بھی نہیں رہی اور میں میدان بھی نہیں چھوڑوں
 گی ابھی بہت کچھ نہیں بگڑا۔ مصطفیٰ کو پریشان کرنے کے بجائے مجھے خود کو شش کرنا ہوگی۔“
 انہوں نے بشیر کا کا کویلا کر کچھ ہدایات دیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی دائم کے آفس کی طرف جاری تھیں۔

”مجھے اس سختی کو خود ہی سلجھانا ہوگا۔“ وہ برعزم سی آفس میں داخل ہوئی تھیں۔ دائم کے سیکرٹری کو پہلے سے
 ان کے بارے میں بتا دیا گیا تھا یوں بھی اس وقت آفس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ گلاس ڈور دھکیلتی اندر جانا چاہتی
 تھیں مگر کمرے کے اندرونی منظر نے ان کے قدم جکڑ لیے جو بلا سنڈ زایک طرف ہونے کی وجہ سے نظر آ رہا تھا۔

باقی آئندہ شمار کریں

شہزادہ

”جی اچھا امی! بس پتا ہے امی جب تک بھائی گھر نہ آجائے کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔“

”ہاں بیٹا! یہ تو ہے میرا بھڑا اور بڑا ہی فرماں بردار بیٹا اور اچھا بھائی ہے۔“ حقیقتہ کی آنکھوں میں بیٹے کا نام لینے کے ساتھ ہی چمک اتر آئی تھی۔

کنزلی بچن میں آئی تو بڑی ایٹلا روئی ڈال رہی تھی اسے دیکھتے ہی بولی۔

”تج بھائی نے دیر کر دی ہے۔ میرا سارا کام ختم ہو گیا۔ وہ ابھی تک نہیں آئے۔ تم ذرا فون کر کے پتا تو کرو۔“

”میں نے امی سے کہا ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں۔ نئی نئی جاب ہے۔ دیر سویر تو ہو جاتی ہے کچھ دیر دیکھ لیتے ہیں پھر فون کر لیں گے۔“

پانچ منٹ بعد بھڑا کی بائیک کا بارن سنائی دیا اور بنہیں تیزی سے برآمدہ عبور کر کے صحن میں آ گئیں۔ ہنسا مسکراتا بھڑا گھر میں داخل ہوا اور سمجھو کہ بہار آ گئی۔

”اتنی دیر کیوں ہوئی بھائی؟“ چھوٹی رومی نے سب سے پہلے سوال کیا۔

”بازار چلا گیا تھا میں۔“

”اکیلے اکیلے۔“ سب نے شور مچا دیا۔

”اپنی کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ دوست کہہ رہے ہیں اچھی جاب مل گئی ہے۔ اب حلیہ بھی اسی کے مطابق ہونا چاہیے۔ میں عرفان کے ساتھ بازار گیا تھا۔ اصل میں اسے شاپنگ کا خاصا تجربہ ہے اور چو اس بھی اچھی

”آج بھائی نے گھر آنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں کر دی امی! کنزلی کب سے بھڑا کے انتظار میں بیٹھیوں پر بیٹھی تھی غمب تک کمر کے پاس کمرے میں چلی آئی۔“

”آجائے گا۔ دیر سویر تو ہو جاتی ہے پھر اس کی نئی نئی نوکری ہے۔ ہم اوھر اوھر چکر لگا کر انتظار کرنے کے بجائے بچن میں جا کر ایٹلا کا ہاتھ بٹا دو اور ہاں اس سے پہلے دروازے سے پوچھو اس نے بھائی کے کپڑے تو استری کر دیے تھے ناں۔“

سکالوٹ



”جیسا کہ“
”چلو بیٹا کھانا کھاؤ۔ باتیں تو تم لوگوں کی رات گئے تک چلتی ہی رہتی ہیں۔“ عتیقہ نے ٹوکا۔
”ہاں بس میں چیخ کر لوں۔“ وہ ہائیک کی چابی کسری کو تھما ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔
کھانے کے دوران بھی باتیں جاری رہیں مہینوں نے اپنے اپنے اسکول کالج کی رپورٹ دی۔ وہ آفس کی سنا تار ہا۔ ہنسی مذاق کے دوران کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد بجائے آرام کرنے کے وہ پھر پی وی گارینہ گئے۔ اب بھی پی وی کم دیکھا جا رہا تھا اور باتیں زیادہ ہو رہی تھیں۔ عتیقہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھیں۔ بچوں کی ہنسی آپس کا پیار محبت ان کو خوشی اور طمانیت بخش رہا تھا۔ اس کا اندازہ صرف ایک ماں ہی لگا سکتی ہے۔

بہنو اکلوتا بیٹا تھا۔ چار بیٹیوں سے بڑا۔ پچھلے برس ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا تب ابھی بہنو کو جاب نہیں ملی تھی۔ بڑا ہی کڑا وقت تھا۔ ایک طرف شوہر کی جدائی کا صدمہ تو دوسری طرف گھریار کی فکر، بہنو خود بھی باپ کی اچانک موت سے ٹوٹا تھا لیکن خود کو سمیٹ کر وہ امی اور بہنوں کو سنبھالنے میں لگا تھا۔ اچھی جاب کے لیے کوشش تو جاری تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک سپر اسٹور پر سیلز مین بھی لگ گیا تھا۔ ہر معاملے میں اس کے دوست عرفان نے بہت مدد کی اور اب جو اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں پُرکشش جاب مل گئی تھی تو یہ کسی نے اس کے ٹیلنٹ سے متاثر ہو کر تو کہاں دینا بھی۔ اس میں بھی عرفان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے والد گورنمنٹ آفیسر تھے اور وہ ان کا اکلوتا چچا بیٹا تھا۔ دوست کے لیے اپنی منوا کر پی چھوڑی اور نیچر آج بہنو اور اس کے گھر والے پھر سے خوش حال تھے۔ اس کے لیے وہ عرفان کے ممنون تھے جبکہ عرفان من موچی ٹائپ لڑکا تھا۔ احسان کر کے کبھی نہ جتانے دوستوں کی خاطر سب گر گزرنے والا۔

عتیقہ اسے بہنو کے دوست کی حیثیت سے تو پسند کرتی تھیں۔ بحیثیت انسان بھی وہ انہیں بہت اچھا

لگتا تھا جب بھی ان کے ہاں آتا کہتیں۔

”بیٹا! اپنی امی کو بھی کبھی ہمارے ہاں ملاؤ ناں۔“ وہ وعدہ ضرور کر لیتا لیکن ابھی تک ان کی ملاقات عرفان کی والدہ سے نہیں ہوئی تھی جن دنوں عتیقہ کے شوہر کی وفات ہوئی عرفان کی والدہ افسوس کے لیے آئی تھیں لیکن تب عتیقہ کو کچھ ہوش ہی کہاں تھا۔
”عرفان تو کتنا ہے ہائیک سے قرض لے کر گاڑی لے لو۔“

”ہائے جی بھائی! کتنا مزہ آئے گا۔ آپ گاڑی لے لیں۔“ چاروں بہنیں سر ہو گئیں۔
”ہی کے مشورے کے بغیر تو میں لے سکتا اور مجھے پتا ہے۔ امی نہیں مانیں گی۔“
”ہم سب مل کر زور ڈالیں گے۔ وہ ضرور مان جائیں گی۔“

”پتا ہے بھائی! اپنی گاڑی کی تو بات ہی اور ہوتی ہے اور کتنے مزے بھی تو ہو جاتے ہیں۔ جب گھومنے کو جی چاہا۔ اپنی گاڑی نکالی اور چل پڑے، کوئی پراہم ہی نہیں۔“
”اچھا اچھا چلو! زیادہ خواب مت دیکھو۔ مجھے پتا ہے۔ امی اجازت نہیں دیں گی لیکن تمہا یوں بھی مت ہو۔ ایک سال کے اندر اندر میں گاڑی لے لی لوں گا۔“

”تب تک میں تو کالج چھوڑ چکی ہوں گی تب کیا فائدہ۔“ انیلانے منہ بتایا۔
”تم ایسا کرو اس سال فیل ہو جاؤ، ایک سال مزید کالج میں لگاؤ بہنو کے مشورے پر چھوٹی تینوں بہنیں ہنسنے لگیں۔

”اچھا ہاں مجھے یاد آیا۔ عرفان کی داری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں میں پھر بھول جاؤں گا تم امی سے کہہ دیتا۔ کسی وقت اس کے گھر سے ہو آئیں۔“
”امی کو ان کے گھر کا ایڈریس کب معلوم ہے۔“
وردہ نے کہا۔

”اچھا پھر ٹھیک ہے۔ میں ہی ٹائم نکال کر امی کو لے جاؤں گا۔ بس تم لوگ امی سے ذکر ضرور کرو دیتا۔“

”کتنے لوگ ہیں عرفان بھائی کے گھر میں؟“ رومی نے پوچھا۔

”بس اس کے والدین اور دو امی جان۔ دو بہنیں ہیں۔ وہ نون بیانی ہوئی ہیں اس کی امی بڑے مزے کی خاتون ہیں میں تو جب بھی اس کے ہاں جاتا ہوں پھر عرفان سے زیادہ باتیں اس کی امی سے ہی ہوتی ہیں۔“



بہنو کی جاب نے جہاں گھر کے حالات بدلے وہاں ملنے جلنے والوں میں ان لوگوں کی اہمیت میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہو گیا۔ سچ ہے دنیا میں گھر کے ساتھ ہے جن کے گھروں میں جوان لڑکیاں تھیں وہ تو تعلقات بڑھا ہی رہے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے بھی اب آگے بڑھ سکتے تھے اور جب بہنو نے گاڑی لے لی تو پھر تو سمجھو لوگ حد سے زیادہ ملنسار ہو گئے۔ لڑکیاں بہت خوش تھیں۔

”ہائے جی۔ یقین نہیں آتا۔ یہ ہماری گاڑی ہے۔“ لڑکیاں بار بار پھو کر دیکھتیں اور ہنس کر کہتیں۔
ای نے شکرانے کے نفل اوا کئے، صدمہ دیا اور پھر گاڑی میں آکر بیٹھیں۔

”یہ میری آرڈو تھی! اپنی ماں کو گاڑی لے کر دوں۔“ بہنو ان کے شانے پر رکھ کر کہہ رہا تھا۔
”میرے بچے! اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ شاد آباد رکھے۔“ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

”ہم سب سے پہلے عرفان کے گھر جائیں گے، مجھے گاڑی کے ساتھ دیکھ کر وہ سب بھی بے حد خوش ہوں گے۔“

”ہاں عرفان کے گھر کے سب ہی افراد بہت سادہ اور محبت کرنے والے ہیں۔ میں تو جب بھی ان سے ملی ہوں بہت متاثر ہوئی ہوں۔“ عتیقہ نے کہا۔

پھر عتیقہ اور بہنو تو عرفان کی طرف گئے۔ امی اس کی والدہ بھی مبارک باد دینے ان کے ہاں آئیں۔ عتیقہ تو کئی بار ان سے مل چکی تھیں کہ بہنو اکثر انہیں عرفان کی طرف لے جاتا تھا۔ لڑکیوں نے آج پہلی بار اس کی

والدہ کو دیکھا اور حیران ہوئیں۔ عرفان کے والد اتنے بڑھے لکھے سرکاری عہدے پر فائز شخصیت اور والدہ اچھی خاصی سادہ اور دیہاتی لٹچ والی خاتون تھیں لیکن جب ان سے بات چیت شروع ہوئی تو سب ہی گرویدہ ہو گئیں۔ بہت ہی سادہ لیکن اپنائیت بھرا انداز تھا ان کا۔ وہ جتنی دیر بیٹھی رہیں۔ لڑکیاں بھی ان کے گرد گھیرا ڈالے رہیں اور جب کہیں تو ان کی بیٹی والی خالدہ بن چکی تھیں۔

پہلے تو صرف عرفان ہی بہنو کے قریبی دوستوں میں شامل تھا لیکن آج کل وہ کسی عظیم کا بہت نام لے رہا تھا۔

”اب تم عرفان سے کم ملنے لگے ہو؟“ ہر بات میں عظیم کا ذکر سن کر ایک روز امی نے پوچھ لیا۔

”عرفان کی کیا بات ہے۔ وہ تو بھائیوں جیسا ہے۔ ہم سالوں بھی نہ ملیں تو ہماری دوستی ویسی کی ویسی ہی رہے گی۔ عظیم سے تو نئی نئی دوستی ہے اور سچ تو یہ کہ آج کے زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے مجھے ایسے ملنے ملانے والوں کی ضرورت ہے۔“

پھر یہ دوستی صرف عظیم تک ہی محدود نہیں رہی۔ اب اس کی باتوں میں عظیم کے گھر والوں کا بھی ذکر آنے لگا بقول اس کے کہ وہ سب ہی میرا تھے۔
”کسی دن ملو امیں نا ہمیں بھی اس کی ٹیلی ہے۔“
انیلانے ایک روز کہا۔

”بالکل۔ میں تو خود ایسا سوچ رہا تھا۔ اصل میں وہ پتا ہے کہ میں تم لوگوں کو شمع سے ملوانا چاہتا تھا۔“
”سمجھ کون؟“ بہنیں چونکیں۔

”عظیم کی بہن۔ بہت ہی متاثر کن شخصیت کی مالک ہے۔ تم لوگ دیکھو گی تو گرویدہ ہو جاؤ گی اور سنو! امی کے کان میں بھی یہ بات ڈال دو۔“

”وہ کس لیے بھائی؟“ وردہ کا دل تیزی سے دھڑکا پھر جیسے غم گیا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”بس میں چاہتا ہوں۔ شمع ہی تم لوگوں کی بھائی بن کر اس گھر میں آئے۔“ بہنو نے مسکرا کر کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے لیے ان میں

سے کوئی کچھ بول ہی نہیں سکا۔
 عرفان کی امی نے کئی بار لوگوں کے سامنے ہی
 عقیدہ سے کہا تھا جب تک وہ بیٹیاں بیاہ نہ لو بیٹے کی
 شادی کا مت سوچنا اور ابھی سزاؤ کی عمر ہی کیا ہے۔
 ”بس آپ! میں تو ایسی لڑکی چاہتی ہوں جو ہماری طرح
 سادہ اور اپنی روایات سے پیار کرنے والی ہو۔“
 عقیدہ ہر بار اسی خواہش کا اظہار کیا کرتی تھیں۔
 عظیم کی فیملی کا ذکر تو اکثر سزاؤ کرتا تھا جس سے اندازہ
 ہوتا تھا۔ وہ خاصے آزاد خیال ہیں اور پھر شمع کی سزاؤ
 میں یا سزاؤ کی شمع میں دلچسپی یقیناً وہ دونوں لے رہتے
 تھے جب کہ ان کے ہاں بھائی کے دوستوں کے سامنے
 آنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ عرفان کا کتنا آنا جانا تھا
 لیکن صرف ڈرائنگ روم کی حد تک اس کی والدہ آتی
 رہتی تھیں۔ عقیدہ بھی ان کے ہاں جاتی تھیں لیکن
 صرف چھوٹی رومی کو ساتھ لے کر۔
 ”ہمیں بھائی کو سمجھانا چاہیے۔“ انیلا تھی تو بڑی
 لیکن بہت جلد گھبرا جاتی تھی جبکہ وردہ اس کے مقابلے
 میں زیادہ سمجھ بوجھ والی تھی۔ بڑی بہن کی بات پر کہنے
 لگی۔
 ”سمجھانے کا کام ہمارا نہیں۔ امی کا ہے اور امی تو
 ہرگز ایسی بھولنا پسند نہیں کریں گی۔“
 ”مجھے بھائی پر چڑھتا ہے۔ وہ کس طرح ایک ایسی
 لڑکی کو پسند کرنے لگے۔“ کنزئی بولی۔
 اس کی بات کے جواب میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔
 وہ سب اپنی اپنی جگہ ایک ہی سوچ میں گم تھیں۔
 انیلا اور وردہ نے اگلے روز امی سے بات کی۔
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے سزاؤ کو کیا پتا اس گھر کے لیے
 کسی لڑکی کی ضرورت ہے۔“
 ”امی! اپنی بات کریں بھائی سے۔“
 ”ہاں ہاں بالکل میں بات کروں گی اور پھر ابھی تو یہ بے
 وقت کی رائی ہے۔ میں پہلے وہ بیٹیاں بیاہوں گی پھر ہی
 سزاؤ کی شادی کروں گی۔“
 شام کو سزاؤ آیا تو انہوں نے بات چھیڑ دی۔ صاف کہہ
 دیا۔

”اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دو“ میں اس سے
 ملے بغیر ہی سمجھ سکتی ہوں۔ وہ کیسی ہوگی اور پھر ابھی
 میں تمہاری شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔“
 سزاؤ نے زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔ چپ
 چاپ سنا رہا اور پھر اس کے بعد تو جیسے اسے چپ ہی
 لگ گئی۔ کہاں تو اس سے سیدھا گھر آتا تھا۔ ہمیں
 انتظار میں ہوتی تھیں جب وہ گھر آتا تب ہی دسترخوان
 بچھتا، کھانے کے دوران خوب باتیں ہوتیں۔ یہاں
 تک کہ امی کو بار بار نوکنا پڑتا، کھانا کھا کر کچھ دیر رست
 کرنے کے بعد وہ شام کو دوبارہ گھر سے نکلتا اور اکثر تو
 بہنوں کو بھی ساتھ لے لیتا۔ کبھی ریس کورس تو کبھی
 کوئی اور تفریحی پارک مگر اب تو یہ سب خواب ہو گیا۔
 وہ لوگ انتظار کرتی رہ جاتیں۔ سزاؤ گھر نہ آتا۔ فون
 کرنے پر کہہ دیتا۔
 ”آپ لوگ انتظار نہ کرنا۔ میں دیر سے آؤں گا۔“
 شام کو کبھی رات گئے واپسی ہوئی۔ مسکراتا تو وہ
 بھول ہی گیا تھا۔ اس کی یہ حالت محبت کرنے والی ہاں
 جان چھڑکنے والی نہیں کس طرح برداشت کر سکتی
 تھیں۔ امی کو خود گھبراوا۔
 ”میں شمع کے گھر جانے کے لیے تیار ہوں۔ بولو“
 کس دن لے کر جاؤ گے؟“
 ”آج شام ہی چلیں بلکہ تم چاروں ہی چلاؤ۔ دیکھنا
 اس سے مل کر کتنی امپریس ہوگی۔ دادو کی میری پسند
 کی۔“ امی کی رضامندی کی دیر بھی وہ پھر چلنے لگا۔
 ~~~~~  
 امی کے ساتھ وردہ ہی گئی تھی۔ سب کو امی لے کر  
 جانا نہیں چاہتی تھیں انہوں نے بڑی ہونے کے ناتے  
 انیلا سے ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تو  
 پھر انہیں وردہ کو کہنا پڑا۔ سزاؤ نے فوراً ”ان لوگوں کو  
 فون کیا اور اپنے گھر والوں کی آمد کی اطلاع دی۔  
 گاڑی میں سزاؤ ہی بولتا رہا۔ وہ دونوں صرف سنتی  
 رہیں۔ گنجائش کی کمی انسا مکان تھا جس کے سامنے  
 سزاؤ نے گاڑی کھڑی کی تھی۔

”یہ گھر ہے؟“ وردہ کے بغیر نہ رہ سکی کہ اس کے  
 خیال میں شمع کو کسی بڑے سے خوب صورت گھر کا  
 تکین ہونا چاہیے تھا۔  
 ”ہاں ہاں۔ ہماری ہی طرح سفید پوش ہیں۔“ سزاؤ  
 نے یہ بات بھی بڑے جوش کے ساتھ بتائی۔ آج بڑے  
 دنوں کے بعد وہ بول رہا تھا بلکہ بے تحاشا بول رہا تھا۔  
 بات بے بات ہنس رہا تھا اور امی سوچ رہی تھیں۔ وہ  
 لڑکی اس کے لیے کتنی زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہے۔  
 اب ہمارا اسے دیکھنے جانا اور دیکھ کر ہاں کہنا سب رکی  
 سی باتیں ہیں۔  
 یہ لوگ ان کے ہاں پہنچے تو ڈرائنگ روم میں بہت  
 سے افراد پہلے سے بیٹھے تھے یقیناً ان کا انتظار ہو رہا  
 تھا۔ سب ہی بے تکلف اور بڑبڑولے اور وردہ کے لیے  
 ایک مسئلہ یہ کہ وہاں لڑکے لڑکیاں سب بیٹھے تھے۔ وہ  
 چادر اوڑھتی تھی اور کبھی غیر لڑکوں میں نہیں بیٹھی  
 تھی۔ آج اس کا پیار بھائی یہ بات بھی بھول گیا تھا۔  
 سزاؤ بڑھ چڑھ کر ان کا تعارف کروا رہا تھا۔  
 ”یہ میرا دوست عظیم ہے۔“ اس نے اچھے خاصے  
 انجیڈ آؤٹی کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ ان کی بیگم مونا اور یہ  
 دو پیارے سے ٹیوٹ سے بچے۔“  
 اس نے دونوں بچوں کے گل پر پیار کیا جبکہ امی اور وہ  
 ان کی جانب دیکھ کر مسکرا بھی نہیں سکتیں۔  
 ”یہ عظیم سے چھوٹے حسین اور اٹمن ہیں۔ یہ  
 عظیم سے چھوٹی فرحت تیا ہیں۔ یہ پیاری سی نیکی جو  
 چیس کھاری ہے۔ ان ہی کی بیٹی ہے اور۔ اور بھی وہ  
 کہاں ہیں اور آئی بھی دکھائی نہیں دے رہیں۔“  
 ”اوہو! بڑی بے چینی ہو رہی ہے۔“ سب ہی گلا  
 پھاڑ کے ہنسنے لگے۔ ہنسی میں سزاؤ بھی شریک ہو گیا۔  
 ”بس وہی دونوں تھیں جو عجیب مصیبت میں  
 پھنسی دکھائی دیتی تھیں۔ دل کی جو حالت تھی وہ ان  
 کے بعد خدا ہی جانتا تھا۔ اکلوتی بھائی ایسے نقار خانے  
 سے آئے گی۔ پورے گھر میں کوئی ایک بھی تو معقول  
 دکھائی نہیں دے رہا۔  
 دس منٹ کے بعد شمع اور اس کی والدہ بھی

آگئیں۔ شمع ان سے لپٹی اور گل پر پیار بھی بڑی ادا  
 سے کیا۔ اپنی بہن اور بھائی کی طرح چست قیص کھلا  
 گریبان اور بالوں کا بے ہودہ سا طرہ جو اس کی سالونی  
 رنگت پر اور بھی برا لگ رہا تھا۔ وہ آکر کتنے استحقاق  
 کے ساتھ سزاؤ کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور  
 سب کو نظر انداز کر کے پتا نہیں وہ دونوں کون سی  
 ضروری باتیں کرنے لگے تھے۔ اس کی والدہ جولانہ بلکہ  
 نو جوان دکھائی دینے کی کوشش میں بے حال دکھائی دیتی  
 تھیں۔ ماں کا یو قار تصور ان میں سرے سے ناپید تھا  
 امی سے حال احوال پوچھا پھر وہ بھی سزاؤ کی جانب متوجہ  
 ہو گئیں۔  
 ”چلیں سزاؤ! کچھ دیر کے بعد عقیدہ کا ضبط جواب  
 دے گیا۔  
 ”ہائے ایسے کیسے چائے تو پیتے جائیں۔“ شمع کی  
 والدہ جو نکلیں پھر بیٹیں سے آواز دے کر مازمہ کو چائے  
 کے لیے کہا۔ وردہ دیکھ رہی تھی گھر کی حالت فریج پر  
 یہاں تک کہ کرا کر ہی کچھ بھی تو تھیتی اور نفیس نہیں  
 تھا۔ یقیناً یہاں سارا خرچ خواتین اپنی ہی ذات پر کر  
 ڈالتی تھیں۔  
 بد مزہ سی چائے ساتھ میں بازار کے سوسے  
 بسکٹ اور مٹھائی انہوں نے کچھ چکھا تک اس اور  
 اہل خانہ باتوں میں ہنسنے میں اتنے مصروف تھے کہ  
 اصرار کیا بھی نہیں۔  
 چائے پیتے ہی امی نے سزاؤ سے چلنے کو کہا۔  
 ”ہائے ابھی تو آئے ہیں۔“ یقیناً اشارہ سزاؤ کے  
 آنے کی جانب تھا۔  
 ”ہاں امی! کچھ دیر تو بیٹھیں۔“ سزاؤ نے بھی کہا امی  
 نے وردہ کی جانب دیکھا جو ابھی تک چادر آگے  
 کھدکائے سب سے الگ بیٹھی تھی اور اسے اپنی  
 جانب متوجہ پا کر دروازے کی جانب چل پڑیں۔ وردہ  
 بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور ماں کی تقلید کی۔  
 ”آئی پلینز۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔“ شمع کو بات  
 کرنے کے دوران گلے کا ہار بن جانے کی بھی عادت  
 تھی۔



”گھر میں بچیاں اکیلے ہیں۔“ امی نے بڑی مشکل سے بے زاری پر روہ ڈالتے ہوئے کہا اور روہ کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ پار کر گئیں۔ گھبراہٹ میں انہوں نے دوبارہ ہنزا کو نہیں بلایا۔

وہ خود ہی اٹھ کر باہر آیا اور بولا۔  
”کتنا اصرار کر رہے تھے وہ لوگ مگر آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔“

”کس سے اصرار کر رہے تھے۔ تم سے ناٹو جاؤ جا کر بیٹھو۔ میں نے تمہیں نہیں بلایا۔ میں اور روہ رکشہ لے کر گھر چلے جائیں گے۔“

”اوہو! امی! آپ تو جانتے نہیں کس طرح کی باتیں کرنے لگی ہیں وہاں بھی منہ بنا کر بیٹھی رہیں آپ دونوں حالانکہ وہ کس قدر خوش گفتار لوگ ہیں۔“

”ان کی ساری خوش گفتاری تمہارے ساتھ تھی اور تمہاری ان کے ساتھ۔ بہت بے عزت کروایا ہے۔ تم نے مل اور ہن کو۔“

ہنزا کی تیوری چڑھ گئی۔ سارا راستہ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ گھر آکر صرف اتنا کہا۔

”آپ کو غصہ ہے کہ میں نے اپنے لیے جیون ساتھی خود کیوں پسند کر لیا۔ بس اسی لیے آپ ان لوگوں سے پرہیز کر رہی ہیں۔“

وہ تو کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ امی کتنی دیر روتی رہیں اور بیٹیاں اداس دلوں کے ساتھ انہیں تسلی دلاتے دیتی رہیں۔ دوائے کر رات کے بارہ بجے امی سوئیں تو یہ چاروں اپنے مشترکہ کمرے میں آ گئیں۔

”کیسی ہے وہ؟“ انیلانے سب سے پہلے سوال کیا۔  
”ہمارے اندازوں سے بڑھ کر طرار اور آڑو خیال انیلانے اب مستقبل میں ہمیں اپنے لیے خود ہی جدوجہد کرنا ہوگی۔“

”میں نے شادی کے بعد ہنزا بھائی ہمارے لیے پڑوس میں رہنے والے دوسرے لوگوں کی طرح ہی ہو جائیں گے۔“

”پلیز روہ! ایسے مت کہو۔ تم جانتی ہو۔ میرا دل کتنا کمزور ہے۔“ انیلانے گھبرا کر کہا تھا۔ کمزوری اور روی بولیں کچھ نہیں لیکن پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا

ہوتی۔

اگلے روز ہنزا آفس سے آیا، دھیرے سے سلام کرنے کے بعد سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ امی نے روہ سے کہا۔  
”کھانے کا پوچھو۔“ وہ گئی تو کپڑے تبدیل کیے بغیر بیڈ پر لیٹا تھا۔

”کھانا لاؤں بھائی؟“ اس نے پوچھا۔ آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا اور بولا۔

”بیٹھو، مجھے تم سے بات کرنا ہے۔ روہ ساری بہنوں میں تم سب سے زیادہ عقل دہلی ہو۔ تم امی کو سمجھاتیں کیوں نہیں۔ کس طرح کل وہ سب کے منع کرنے کے باوجود اٹھ کر آ گئیں اور جتنی دیر بیٹھی رہیں۔ وہ بھی بولیں جیسے مارے باندھے بیٹھی ہوں اور خود تمہارا رویہ بھی کتنا روڈ سا تھا۔ وہ بے چاری شمع بہت حساس لڑکی ہے۔ اس کی ماں کا فون آیا تھا۔ تم لوگوں کے دھبے کو بہت محسوس کیا ہے اس نے۔“

”ساری رات روتی رہی ہے۔ طبیعت خراب کر لی ہے اس نے اپنی۔“

”طبیعت امی کی بھی بہت خراب ہے۔ ساری رات روتی رہی ہیں۔ رات کو نیند کی دوا سے کرا نہیں سلا یا تھا۔ اب بھی سر میں درد ہے۔“

”اف!“ ہنزا نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔  
”تم مجھے بتاؤ روہ امی آخر مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ اکلوتا ہوں تو کیا میرے اپنے کوئی ارمان نہیں مجھے صرف بہنوں کی ذمہ داریاں اٹھانے اور امی کی خدمت کے لیے زندہ رہنا ہے۔ میری اپنی کوئی زندگی نہیں ہونی چاہیے۔ خواب دیکھنا میرے لیے جرم سمجھرایا جائے گا۔“ وہ ایک لفظ نہیں بولی جب چاپ ملتی رہی۔ وہ سمجھ سکتی تھی۔ ہنزا اس وقت کس کی زبان بول رہا ہے، رویہ بھی کہ اس کے سر پر جو جاوہ سوار ہے تو اس وقت کچھ بھی کہنا سنا ہے کار ہے۔

”کھانا کھا میں گے آپ؟“ اس کی اتنی باتوں کے جواب میں اس نے ایک بار پھر سر کی پوچھا۔  
”نہیں۔ اتنی پریشانی میں میں کھانا کھا سکتا ہوں بھلا؟“

”آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ اوہ روہ سب شمع لوگ بیٹھے قہقہے لگا رہے ہوں گے۔ عادت کے مطابق اونچا اونچا بول رہے ہوں گے اور آپ نے بس سر پر ہی سوار کر لیا ہے۔“

”وہ لوگ خوش مزاج ضرور ہیں لیکن بے حس ہرگز نہیں ہیں۔“

”آپ کا خیال ہے ہم بے حس ہیں؟“

”کم از کم میرے معاملے میں امی ایسا ہی مظاہرہ کر رہی ہیں۔ اپنی پسند سے شادی کرنا گناہ ہے۔“

”روہ خاموشی سے پلٹ آئی واپس آکر اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ تصور کی آنکھ سے آنے والے دنوں کو دیکھ سکتی تھی۔“

”کھیا فضول بول رہی ہو۔ روہ! اب میں نے یہ سب کیا ہے۔“

”بھیا! یہ سب ہونے کے بعد ہی شادی کا نمبر آتا ہے نا۔“ وہ اسی سنجیدگی سے بولی تھی۔

”میں تم لوگوں سے بات نہیں کر رہا امی! آپ تیار رہیں گے۔ آج شام ہی ان کی طرف جائیں گے۔ آپ دو ماہ بعد کی ڈیٹ دے دیجئے گا۔ پوچھیں تاریخ ٹھیک رہے گی۔“

”ہیٹا! تم کیوں میرا تمنا بیانے پر تکتے ہوئے ہو۔ سب کچھ تو تم نے اس کے گھر والوں نے طے کر لیا ہے اب صرف رسمی طور پر مجھے لے جانا چاہتے ہو۔“ امی سک رہیں۔

”اوہو! آپ نہیں آپ لوگوں نے اس سے کیوں ہیر باندھ لیا ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے بھائی! ایک ماں کی حیثیت سے آپ کو سمجھانا ہی کا فرض ہے۔ باقی آپ کی مرضی۔“ روہ کو پھر بولنا پڑا جبکہ بڑی دلی انیلانے گھر چلی گئی تھی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تمہاری مرضی۔“ امی ٹھنڈی آہ بھر کر بولی تھیں۔

”میں عرفان کی امی کو فون کرتی ہوں۔ انہیں بھی ساتھ لے جائے گا۔“ روہ نے کچھ سوچ کر کہا تھا۔

”ٹھیک ہے لے لیتا۔ انہیں بھی ساتھ اور تم بہنیں بھی تو تیار رہنا۔“

”نہیں نہیں بھیا! ہمیں ابھی اپنی روایات یاد ہیں اور ہم انہیں پر چلنا بھی چاہتے ہیں اور ان کے ہاں کا ماحول تو یہ کیا مڑ گیا عورتیں سب ہی نہایت بے ہودہ اور بے پاک ہیں آپ کی موجودگی میں وہ عقلمند صاحب بار بار مجھے گھورتے رہے بڑی مشکل سے خبا کیا میں نے اب اگر دوبارہ ایسا کچھ ہوا تو لحاظ نہیں کروں گی۔“

”ساتھ جو پڑا ہو گا اٹھا کر سر پر مار دوں گی اور ان کی والدہ پر کئی کبوتری تو یہ کسی فلمی ویپ کا گمان ہوتا ہے۔ آپ تو بڑے بے چارے سے لکتے ہیں ان سب کے درمیان۔“

”آپ کو تو پتا ہے اس نے ایک بار پھر سر کی پوچھا۔  
”نہیں۔ اتنی پریشانی میں میں کھانا کھا سکتا ہوں بھلا؟“

”آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ اوہ روہ سب شمع لوگ بیٹھے قہقہے لگا رہے ہوں گے۔ عادت کے مطابق اونچا اونچا بول رہے ہوں گے اور آپ نے بس سر پر ہی سوار کر لیا ہے۔“

”وہ لوگ خوش مزاج ضرور ہیں لیکن بے حس ہرگز نہیں ہیں۔“

”آپ کا خیال ہے ہم بے حس ہیں؟“

”کم از کم میرے معاملے میں امی ایسا ہی مظاہرہ کر رہی ہیں۔ اپنی پسند سے شادی کرنا گناہ ہے۔“

”روہ خاموشی سے پلٹ آئی واپس آکر اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ تصور کی آنکھ سے آنے والے دنوں کو دیکھ سکتی تھی۔“

”کھانا کھا میں گے آپ؟“ اس کی اتنی باتوں کے



وردہ نے بڑے آرام سے سخت لفظوں میں سب جتا دیا کہ بھائی کی پسند کو اپنانا مجبوری تھی۔ انہیں پسند بھی کرنا تو مجبوری نہیں تھی۔ کنزلی نے داد دینی لگا ہوں سے وردہ کو دیکھا اور بولی۔

”ہی! ہم شادی پر نہ تو اپنے رشتہ داروں کو بلائیں گے نہ دوستوں کو خواہ مخواہ مذاق بنے گا۔“

بہنو کا چہرہ مسخ ہو گیا وہ بولا۔  
”دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تم لوگ ابھی تک کونٹوں کا مینڈک بنی ہوئی ہو۔“

”بالکل دنیا نے منہ منہ میں ترقی کی۔ سر جری کتنی ایڈوانس ہو گئی۔ کمپیوٹر کے شعبے نے ہر طرف دھوم مچا دی ہے۔ آپ کی سسرال نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے۔ پیارے بھائی! آج کل جسم پر لباس، آج کل جسم عریاں چھوڑ کر کوئی ایڈوانس نہیں بن جایا کرتا۔ آپ کو وہ پسند ہے یہ آپ کی بد قسمتی۔ اب پلیز ان کی سب سے حمایت کر کے خود کو ہماری نظروں میں مت گرائیے۔ ہم تو یہی سمجھتے تھے۔ ہمارا بھائی بہت غیر مت مند اور اپنی اقدار سے محبت کرنے والا ہے۔“

وردہ کی باتوں کے جواب میں اس نے تیزی سے اتنا کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ نہیں جانا چاہتیں تو مت جاؤ۔“

”ہاں“ آپ کو فرق جو نہیں پڑتا اگر ذرا بھی ہمارا احساس ہو تا تو گملا سکتے تھے۔ میری بہنوں کی آمد پر مرو اس کمرے میں نہیں بیٹھیں گے۔“

وہ چپ رہا۔ یقیناً اس میں ان لوگوں سے ایسی بات کہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

تین گھنٹے کے بعد امی کو اس کے ساتھ ان لوگوں کی طرف جانا تھا اور عرفان کی امی کو بھی اسی بلانا تھا وہ اٹھ کر فون کرنے لگیں۔ صرف ایک گھنٹے کے بعد عرفان اور اس کی والدہ موجود تھے۔ امی کا سنا ہوا چہرہ لڑکیوں کی او اس صورتیں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی کہاں تھی۔

”تم لوگ نہیں جا رہیں؟“ انہوں نے لڑکیوں سے پوچھا۔ جواب میں انہوں نے وجہ بتادی۔

”چاروں تیار ہو جاؤ۔ تم سب جاؤ گی۔“ کچھ سوچ کر انہوں نے کہا تھا۔ عرفان کی امی تھیں تو کم تعلیم یافتہ اور وہ مائی ٹچ رکھنے والی لیکن ان لوگوں نے پیشہ ہی ان کی باتوں میں وزن محسوس کیا تھا پھر وہ ان کے ساتھ اتنی مخلص تھیں کہ ان کا کوئی مشورہ غلط ہوئی نہیں سکتا تھا۔ لڑکیاں تیار ہونے لگیں۔

عرفان کو انہوں نے روک لیا کہ بہنو کی گاڑی میں اتنی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں چھوٹی بہنوں کو عرفان کی گاڑی میں بٹھا کر خود وہ ان کے ساتھ آئیں نہیں اور بولیں۔

”راستے سے ڈیڑھ دو گھنٹہ کا ڈیڑہ خرید لیتا۔“

”زندہ باو آئی! یہ ہوتی ثابت۔“ بہنو نے انہوں کو گایا۔

عرفان کی والدہ دل شاد بیگم نے عتیقہ کے سفید رتے چہرے کی جانب نگاہ دوڑائی پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سلانے لگیں۔

جب یہ لوگ شمع کے ہاں پہنچے تو وہاں آن بھی محفل جمی ہوئی تھی۔ ان کی آمد پر ایک نعوبلند ہوا اور سب استقبال کو بڑھے۔

”وہ منہ منہ! اگر کوئی اور کہو ہے تو دھڑکے جاؤ ورنہ باہر جا کر بیٹھو۔ ہماری لڑکیاں یوں غیر مردوں کے سامنے کھلے منہ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتیں۔“

دل شاد بیگم کی آواز میں گونج اور لہجہ دینگ تھا۔ شمع کی پرکھی کبوتری بنی ہاں آگے بڑھی اور بولی۔

”ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں اب تو رشتہ داری بننے جا رہی ہے۔“

”نہیں یہ نہیں پتا اس طرح کی رشتہ داریوں میں بے پردگی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔“ وہ اب بھی ڈیٹ کر بولی تھیں۔

بہنو اب چار کی تصویر دکھائی دے رہا تھا نہ انہیں روک سکتا تھا نہ انہیں خفا کر سکتا تھا۔ یہ سب ابھی تک کھڑی تھیں۔ ان کے ہاں کے مردوں کا اٹھ کر جانا پڑا۔ عرفان ابھی تک باہر گاڑی میں بیٹھا تھا۔

وہ میرا منہ! باہر گاڑی میں بیٹھا ہے مجھے بھی بلا لیتا۔“ انہوں نے شمع کے بھائی سے کہا۔

لوگوں کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو ان کے ہاں کی خواتین باقاعدہ منہ منہ کھڑی رہیں پھر اس کی بھائی کو ہی آداب میزبانی یاد آئے۔ انہیں بیٹھنے کو کہا پھر ایک بیگ سی ضرورت سے کہیں زیادہ اسٹارٹ، خاصی ساوٹی لڑکی آگے بڑھی اور اپنا تعارف شمع کی چھوٹی بہن کی حیثیت سے کروایا۔

”پیار رہی ہو؟“ عرفان کی والدہ نے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”من نہیں تو آئی!“ وہ اس سوال پر حیران ہوئی۔

”یہ میرے دوست عرفان کی امی ہیں۔ بتایا تھا ناں آپ سب کو۔“ بہنو کہہ رہا تھا۔

”وہ اچھا وہ عرفان جن کے والد کشم میں آفیسر ہیں۔“ سب ہی کا انداز بدلا اور والدہ کی سادگی پر حیرت چھپی ہوئی۔

”سوئی! ذرا دیکھنا۔“ عظیم نے عرفان کو اندر تو بلا لیا ہے نا۔ نہیں بے چارے ابھی تک گاڑی میں ہی نہ بیٹھے ہوں۔“ اب کے والدہ کو بھی فکر ہوئی۔

عتیقہ اور لڑکیاں خاموش بیٹھی تھیں اور ان کی طرف کی خواتین بہنو سے باتیں کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد شمع بھی آگئی۔ سیلیویس بلیک سوٹ چہرے پر نمائشی مسکراہٹ، وردہ نے تو پہلے بھی دیکھ رہی تھی۔ پانی تینوں کو اب مایوسی ہوئی۔

پھر دل شاد کے کہنے پر عتیقہ نے بڑی دھیمی آواز میں شادی کی تاریخ رکھنے کا ذکر کیا اس کی والدہ بولیں۔

”جی ہاں عجب شادی ہو جانی چاہیے۔ دیکھیے نا۔ ہمیں اس سے چھوٹی بھی بیاہنی ہے۔“

”کیوں رشتہ اس کا بھی پکا کر لیا ہے؟“ دل شاد بیگم نے جس انداز میں کہا ان کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ جواب میں کچھ بول نہیں سکیں پھر دل شاد بیگم ہی بولیں۔

”میں نے اور عتیقہ نے اکتوبر کی پندرہ تاریخ رکھی ہے۔“

”لیکن ہم نے تو نومبر کی پچیس کو ہی تھی۔“ اس کی والدہ اور بڑی بہن کے بغیر نہ سکیں۔

”کب عتیقہ! ہم نے تم سے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔“ دل شاد نے پہلے ان سے پوچھا پھر عتیقہ سے کہنے لگیں تو وردہ بولی۔

”ایسی تو کوئی بات ہوئی ہی نہیں ہے۔“

”بس پھر ہمیں تو اکتوبر کی پندرہ ہی سوٹ کرتی ہے۔ چلو سب منہ میٹھا کرو۔“ مٹھائی کا ڈیڑہ وردہ کے قریب رکھا تھا۔ شمع کی بڑی بہن اس جانب بڑھی۔ دل شاد نے روک دیا اور بولیں۔

”یہ کام ہم کریں گے۔“ وردہ نے ڈیڑہ کھولا اور سب کو مٹھائی پیش کی۔ شمع شرمائے کی اداکاری کرتی اسے اتنی بری لگی کہ جی چاہا یہ سب ایک ڈراؤنا خواب ہی ہو، لیکن حقیقت یہی تھی اسے شمع کے منہ میں گلاب جاسم ڈالنی پڑی۔

”اب لوگوں نے اکتوبر کی ڈیٹ کیوں دے دی؟“

واپسی پر بہنو اور بڑا سجدہ تھا۔

”بات سن دے کا کا! ہر بات میں جی جی کر رہے تھے ناں۔ تم نے کس کی اجازت سے نو مہر میں ڈیٹ رکھی تھی ناں کو ساتھ لے کر گئے تھے تو پھر اس معاملے میں ماں کی ہی جگہ کی۔ خبردار جواب ڈیٹ تبدیل کی تو ورنہ میں اور عرفان بھی اس شادی میں شریک نہیں ہوں گے۔“

ہن تو نے کیا ہمیں بے عزت کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم وہاں کیسے منہ میں گھٹنیاں ڈال کر جو نہ بنا بیٹھا تھا۔ مرد بے مرد بن۔“

دل شاد بیگم کے ہاں بچپن کا آنا جانا تھا وہ اسے ڈانٹ لیا کرتی تھیں اور پھر عرفان جیسے دوست کیسے کھو دیتا۔ ابھی تو پتا نہیں زندگی کے کتنے مرحلوں پر اس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ اس لیے چپ ہی رہا۔

انہیں کھر ڈراپ کر کے وہ اور عرفان ہمیں باہر نکل گئے۔ امی کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ آنسوؤں سے روئے لگیں۔ یہی حال انہیں کا بھی تھا۔

”آہ! اس دن کے لیے پاپوس کر جانا کیا تھا بیٹے کو، کیسی فکر تھی مجھے اس کی اس کی اچھی نوکری کے لیے کتنی دعا میں مانگی تھیں میں نے اور دیکھ لیں یہ کیا کرنے چلا ہے۔“

”میں نے اور عتیقہ نے اکتوبر کی پندرہ تاریخ رکھی ہے۔“

”لیکن ہم نے تو نومبر کی پچیس کو ہی تھی۔“ اس کی والدہ اور بڑی بہن کے بغیر نہ سکیں۔

”میں نے اور عتیقہ نے اکتوبر کی پندرہ تاریخ رکھی ہے۔“

”لیکن ہم نے تو نومبر کی پچیس کو ہی تھی۔“ اس کی والدہ اور بڑی بہن کے بغیر نہ سکیں۔

”میں نے اور عتیقہ نے اکتوبر کی پندرہ تاریخ رکھی ہے۔“



ساتھ ہے اس سے بگاڑ بھی نہیں سکتی۔  
اور ج تو یہ وہاں جو کچھ دیکھا دل تو دل شادی تک کا بھی  
اداس تھا پھر عتیقہ تو وہ عورت تھی جس کے گھر کی بنیاد  
مل رہی تھی۔ وہ تلی کا ایک لفظ بھی منہ سے ادا نہیں  
کر سکیں۔



ڈیڑھ ماہ بعد شادی تھی اور گھر میں کوئی پچھل ہوئی  
ہنگامہ نہیں تھا۔ شمع نے کہا تھا وہ اپنی شاپنگ خود ہی  
کرے گی اور انہیں تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ بھڑا دل  
اسے اس سلسلے میں کتنی رقم دی تھی۔ رشتہ داروں کو  
فون کر کے بھڑا کی شادی کی اطلاع دے دی گئی تھی  
جس نے بھی سنا۔ حیران ہوا انہی اسے ملازمت ملے  
دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ عتیقہ پہلے ایٹلا کا ہی  
کرو تھیں۔ ہر کسی نے ایسی ہی بات کی۔ اب وہ کسی کو  
کیا بتائیں۔ چپ چاپ سب کی سنی رہیں۔ ان کی کوئی  
لمبی چوڑی رشتہ داری تو تھی نہیں۔ پنڈی سے خالہ اور  
ماموں آگئے اور وہ بیٹی سے پچھو آ رہی تھیں۔

سب ہی رشتہ داروں نے ان کی خاموشی اور اداسی  
سے محسوس کر لیا تھا کہ رشتہ صرف بھڑا کی مرضی سے  
ہو رہا ہے اور وہ سب بھی چپ تھے۔



بھڑا نے اپنا کمرہ بہت اچھے طریقے سے ڈیکورٹ  
کر دیا تھا اور شمع کے استقبال کے لیے وہ ایٹلا ہی بلکان  
ہو رہا تھا۔ کوئی خوش ہے یا نہیں۔ اس سے اس کو کوئی  
سرور کار نظر نہ آتا تھا۔

مہندی کے روز جب ای سردرد سے بے حال اپنے  
کمرے میں لیٹی تھیں۔ دل شادی تک ان کے پاس  
موجود تھیں کہ پچھو بھی چلی آئیں۔ آج ای ضبط نہ  
کر سکیں۔ سب ان کے سامنے کہہ دیا اور بیٹیوں کے  
لیے فکر کا اظہار کیا۔

”تم میرے شائق کو تو جانتی ہو ناں بھائی! میں اپنے  
منہ سے کیا کہوں سارا خاندان ہی اس کی تعریف کرنا  
ہے۔ میں نے جب بھی اس کے لیے سوچا۔ ایٹلا کا ہی

خیال آیا مگر میں چاہتی تھی کہ اپنی تعلیم مکمل کر لے  
اس طرح سے ذہن بٹ جاتا ہے آج میں ایٹلا کو آپ  
سے مانگتی ہوں۔“  
اور عتیقہ کی روتی آنکھیں مسکرانے لگیں وہ اٹھ  
کر منہ کے گلے لگ گئیں۔

دل شاد نے دونوں کو مبارکباد دی پھر تینوں کافی دیر  
کمرے میں بیٹھی رہیں یہاں تک کہ خالہ بلائے  
آگئیں۔ اسی نے اس بات کے بارے میں کسی کو نہیں  
بتایا کہ واقعی ذہن بٹ جاتا ہے ایٹلا تو بھی بھی بڑی  
شرابی سی لڑکی۔ پچھو اور شائق کے سامنے جھجک  
محسوس کرنے لگتی۔ ہاں لگتا تھا جانے سے ایک روز  
پہلے پچھو پھوٹنے شائق کو بتا رہا تھا جب ہی تو وہ بات بات  
پر شمع ہو رہا تھا اور جانے سے پہلے ان سب کو گفت  
دے کر گیا تھا جن میں ایٹلا کا گفت نمایاں طور پر بہت  
خوب صورت اور قیمتی تھا۔

”کمال ہے شادی میری ہوئی ہے اور گفت آپ  
انہیں دے رہے ہیں۔“

شمع کو بتا چلا تھا یہ لوگ مال دار آسامی ہیں۔ وہ سوئی  
کے لیے راہ ہموار کرنا چاہ رہی تھی اس لیے پچھو پھوٹ  
فیملی کے ساتھ خاص طور پر بڑی محبت سے بات کر رہی  
تھی۔ شائق نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا کہ  
کل سوئی ادھر آئی تھی جس طرح اس کے آگے پیچھے  
ہو رہی تھی۔ اس سے شائق کو شمع کی فیملی کی اوقات کا  
اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔

شادی کے تیسرے دن ہی مہمان رخصت ہو گئے۔  
اسی نے دل شاد اور عرفان سے کہا۔

”آپ لوگ آتے رہیں گے۔ مجھے آپ کے آنے  
سے بہت ڈھارس ملتی ہے۔“

”دو نہیں بہن! تمہارا گھر اس گھر کی۔“  
”عورت اور وہ بھی میرے جیسی ساری عمر گھر کی  
چار دیواری میں گزارنے والی۔ یہ تو قدم قدم پر کبھی  
باپ، کبھی بھائی اور کبھی بیٹے کی محتاج ہوا کرتی ہے۔“  
”میں آتی رہوں گی گھر آؤں گی۔“



شروع کے دن تھے اور شمع کا رویہ سب کے ساتھ  
نیک ہی تھا۔ ہاں وہ بار بار پچھو پھو لوگوں کا ذکر کرتی اور  
ایک روز تو نمبر بھی مانگ لیا جو کہ امی نے نہیں دیا۔ شام  
کو بھڑا ان کے پاس تھا شمع نے پچھو پھو کا نمبر مانگا تھا  
آپ نے دیا نہیں۔“ وہ جواب طلب کر رہا تھا۔

”اس لیے کہ تمہاری پچھو پھو منع کر گئی تھیں۔  
انہیں اندازہ ہو گیا تھا یہ اپنی بہن کے لیے شائق کا  
رشتہ چاہ رہی ہے اور نہ تو تمہاری پچھو پھو میری طرح ہے  
بس عورت ہے اور نہ ہی شائق تمہاری طرح ہے  
وقوف ہے اس کی ماں نے اس کے سامنے ہی منع کیا  
تھا اور وہ بتا رہا تھا۔“ سوئی کس طرح اس کے آگے  
پیچھے رہی ہے۔ میرا تو شرم سے سر ہی جھک گیا۔ کیا  
سوچتے ہوں گے۔ کس گھر کی لڑکی یہاں بہو بن کر  
آئی ہے۔“

یقیناً اس نے سب کچھ جاکر شمع سے کہا اس روز  
کے بعد سے اس کا رویہ ہی بدل گیا۔

پہلے جو کبھی کبھار ان کے درمیان بیٹھ جاتی تھی۔  
بول بول کر مسکراہٹ بکھیر لیتی تھی۔ اب وہ سب پروے  
اتر چکے تھے۔ روزانہ شام کو دونوں تیار ہو کر کہیں نکل  
جاتے کہ شادی کے شروع دنوں میں یہ سب ہوتا ہے۔  
لیکن وہ جانے سے پہلے اور آنے کے بعد سلام کرنا بھی  
ضروری نہیں سمجھتی تھی۔

عتیقہ نے جب ایک روز اس کے رویے کی  
شکایت بھڑا سے کی تو وہ طنز یہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر  
لا کر بولا۔

”آپ کو تو آپ کو اس سے شکایتیں بھی ہیں۔ کبھی  
آپ لوگوں نے اپنے رویوں پر غور کیا ہے سارا سارا  
دن وہ اپنے کمرے میں اکلی بڑی رہتی ہے۔ گھر کے  
اتنے افراد میں سے کسی کو توجہ نہیں ہوتی کہ جا کے  
کچھ دیر اسے بھی کہنی دے۔ وہ اس گھر کی بڑی بلکہ  
انگلی بیو ہے لیکن آپ لوگ تو اسے ملازمہ کا درجہ  
دیتے رہے ہیں سارا نہیں اسے مڑبند نہیں۔ جب سے  
وہ باہر آئی ہے تین بار مڑبند چکے ہیں۔“  
”ہمیں خواب تو نہیں آتا تھا کہ اسے مڑبند

نہیں۔“

”کبھی تو میں کہہ رہا ہوں اس کی پسند ناپسند اس کے  
مشورے کی ضرورت ہی نہیں۔ کبھی جاتی حالانکہ مہینہ  
ہونے لگا ہے شادی کو۔ بے چاری کہتی ہے ابھی تک  
مجھے یہ لگتا ہے کہ میں یہاں بن بلانی مہمان ہوں اور یہ  
سب مالک مکان ہیں۔“

”تمہیں معلوم ہے لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ اسکول  
کالج سے واپس آتی ہیں تو کچھ میں لگ جاتی ہیں شمع  
آخر اب تک مہمان کیوں بنی ہوئی ہے اسے اب گھر  
کے کاموں میں دلچسپی لینی چاہیے۔“

”اسے مہمان بننے پر آپ لوگوں کے رویے مجبور  
کر رہے ہیں۔“ بھڑا اٹھا کہہ کر اٹھ کر چلا گیا۔

بھڑا کی باتوں نے سب کو اتنا دل برداشتہ کیا تھا کہ ان  
میں سے کسی نے نہ تو کچھ پکایا اور نہ ہی کھانے کو جی  
چاہا۔ اب یہ اتفاق کہ اسی شام شمع کے گھر والے  
آگئے۔ گھر میں وہ شور ہوا۔ ایسے ایسے بے باک قہقہے  
گوئے کہ خدا کی پناہ۔

”جی چاہتا ہے میں یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں  
۔“ روی نے ایٹلا کی گود میں سر رکھ کر بڑی اداسی اور  
بے بسی سے کہا تھا۔

”آج کچھ بنایا نہیں؟“ بھڑا کمرے میں چلا آیا اور  
بڑے اچھی انداز میں سوال کر رہا تھا۔

”نہیں۔ آج جی نہیں چاہا بنانے کو۔“ وردہ نے  
جواب دیا۔

”اتنا تو احساس ہونا چاہیے گھر میں مہمان آئے  
ہیں۔ لیکن یہاں میری عزت کی کسی کو پروا ہی کب  
ہے۔“

”بازار سے لے آئیں بھائی! ویسے بھی میرا خیال  
ہے یہ لوگ بازار کا ہی کھاتے ہیں۔ ہم تو جب بھی ان  
کی طرف گئے۔ انہوں نے اپنے محلے کی دکان کے  
خریدے وہ گھٹیا سے سموسے ہی آگے رکھے تھے۔  
آپ بھی ہماری عزت کا خیال کریں۔ انہیں بھی ادھر  
محلے کے ہوٹل سے کھانا لکر کھلائیں۔“  
وردہ کمال کی چیز تھی۔ اتنی ٹینشن میں بھی ہنس کر



اتنے آرام سے کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ ہنزاد کو واپس ہونا پڑا تو پیچھے سے آواز آئی۔

”ہاں اگر بھائی کچھ بتا رہی ہیں تو ہمارے لیے بھی رکھیے گا۔ اسی ہمارے ہم ان کے ہاتھ کاٹیٹ بھی کچھ لیں گے۔“

اودھ ہنزاد روڑے سے نکلا اور اٹھلانے وردھ کے ہاتھ تھام لیے۔

”دور تا کس بات کا اگر ان چند ماہ میں بھائی کی تنخواہ سے کھایا ہے تو اس سے پہلے کتنے ہی برس ہم نے اپنی چھوٹی بڑی آرزوؤں کو تھک تھک کر اس لیے سلا یا بھی ہے کہ بھائی اعلا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس کے لیے پیسے کی بھی ضرورت ہے۔ آج وہ جس پوزیشن میں ہے۔ اسے اس پوزیشن پر لانے والے ہم ہیں۔“

”تھک کتنی ہے وردھ اور اٹھلانے! تم سب سے بڑی لیکن بہت زیادہ حساس اور زود رنج ہو۔ اسی لیے آج میں ایک بات تم لوگوں کو بتا رہی ہوں مگر تمہاری مایوسی ادا ہی میں کی آجائے۔ ہنزاد کی منہدی کے روز تمہاری گچھو نے ہمیں ماقب کے لیے مانگ لیا تھا اور اسی وقت دل شاد کیا نے بھی کہا تھا وردھ کو میری امانت سمجھیں تو میری بیٹیوں تم لوگ ان حالات سے گھبراؤ نہیں۔ اچھے دن تمہارے منتظر ہیں۔ جس طرح تم دونوں کو اللہ نے میری سوچ سے بوجھ کر نوازا ہے، مجھے یقین ہے میری باقی دونوں معصوم بچیوں کے نصیب بھی ایسے ہی قابل رشک ہوں گے۔“



ایمی کا ان سے یہ کہہ دینا واقعی بہت خوشگوار اثر چھوڑ گیا۔ اب اٹھلانے اور بھائی کے رویے پر سہم نہیں جاتی تھی اور وردھ تو اب پہلے سے زیادہ با اعتماد تھی اس نے اور اٹھلانے شام میں ٹیوشن پڑھائی شروع کر دی۔ وہ اپنی کسی ضرورت کے لیے ہنزاد کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا چاہتی تھیں۔ پھر ہنزاد کی شادی کے تیسرے ماہ ہی وہ رقم کم ہو کر آدھی رہ گئی جو وہ گھر کے خرچ کے لیے دیتا تھا۔

”تو کم پیسے؟“ ایمی نے حیرت سے اس رقم کو دیکھا۔

”ہمارے اپنے بھی کچھ خرچ ہیں ایمی! پھر شمع کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔ اسے اچھی خوراک اور دواؤں کی ضرورت ہے۔“

وہ چپ رہیں کہ ان کے بحث کرنے سے اس نے رقم بچھا کھوڑائی دینی تھی۔

جمع آج کل تخلیق کے مراحل میں تھی اور ہنزاد پروانے کی طرح اس پر غار ہو رہا تھا۔ جمع پہلے بھی کہیں گئے جانے کے لیے ہی کمرے سے نکلتی تھی اب تو ناشتہ اور چائے کے لیے بھی بستر سے نیچے اترنا محال تھا۔ ہاں عرفان آجاتا تو پھر دوسری بات تھی، اس کے ساتھ وہ بڑی گرم جوشی سے ملتی۔ تھوڑی دیر کو بھی آتا تو زیادہ دیر بیٹھنے پر اصرار کرتی اور جو کچھ پہلے سے اس کے آنے کا پتا ہوتا تو فون کر کے سوینی کو ضرور بلا لیتی۔ پہلے تو وردھ محسوس نہ کرتی لیکن اب جبکہ وہ جان چکی تھی۔ عرفان سے اس کا کیا رشتہ ہے اسے سوینی کا آنا اور بے تکلفی سے عرفان سے باتیں کرنا بے حد گھٹا تھا۔ وہ ایمی سے کہتی۔

”آپ بھی جا کر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔“

اور عتقد کے وہاں اگر بیٹھ جانے پر دونوں ہمیں جل کر خاک ہو جاتی تھیں اور پھر عرفان کی ایمی بھی بڑی ٹیڑھی کھیر تھیں۔ اکثر آئی جاتیں اور مجال ہے جو جمع کو لٹ کر داتی ہو۔ اس کی کسی بات کا جواب پیار سے دیا ہو۔ ان ہی لڑکیوں کے واری صد سے ہوئی رہتی تھیں۔



وردھ کو کچھ کتابیں لینا تھیں ہنزاد سے اردو بازار لے جانے کو کہا تھا اور اس نے کہا تھا۔

”شام کو چھ بجے تیار رہنا۔“ وہ وقت پر تیار ہوئی تھیں۔ بھائی کے کمرے کے دروازے پر ٹانگ کر کے انہیں اپنے تیار ہونے کی اطلاع دی اور خود باہر آئی۔ وہ گاڑی کے قریب کھڑی تھی جب جمع تیزی سے



کمرے سے نکلی اور گاڑی کی جانب بڑھی۔ بوٹ پر رکھا ورہ کا ہاتھ جھٹکنے سے پیچھے ہٹایا اور بولی۔  
 ”ہٹو یہاں سے“ ہمیں ضروری کام سے جانا ہے۔  
 ایک تو گاڑی رکھنا بھی عذاب ہو گیا ہے۔  
 اتنی دیر میں ہزاروں بھی نکل آیا اور زرد پڑتی بہن سے سرسری انداز میں بولا۔

”سوری۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ شمع کو ضروری کام سے جانا تھا۔“ اور دونوں گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔  
 یہ منظر بابتی تینوں بہنوں نے بھی دیکھا اور جو جہاں تھا وہیں گھم گیا۔ وہ سب بت بتی کھڑی تھیں پھر سکیاں ابھرنے لگیں۔ رومی رو رہی تھی۔ اس کے رونے کی آواز نے ورہ کو پلٹنے پر مجبور کیا۔ وہ ست قدم اٹھاتی برآمدے میں کھڑی رومی تک آئی اور اسے اپنے ساتھ لٹا کر بٹھکنے لگی۔ انیلا اور کنزی نے دیکھا ورہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”کیا ہوا رومی کیوں رو رہی ہے؟“ عتیقہ نے آکر پوچھا۔  
 کنزی نے سب بتا دیا پھر عجیب سی ہنسی خنک کر بولی۔  
 ”کتنا خوش تھے ہم اس گھر میں گاڑی آجائے بر“  
 اپنی دوستوں میں بتاتے تھے ہم نے گاڑی لے لی ہے۔“ اس کی بات سن کر رومی کے رونے میں اور بھی شدت آگئی۔

ابھی یہ لوگ یہیں تھیں کہ دل شاد بیگم چلی آئیں۔ رومی رونہ رہی ہوئی تو وہ انہیں کچھ نہ بتائیں لیکن آج کنزی بہت جذباتی ہو رہی تھی اور سن کر کچھ دیر کے لیے تو وہ بھی کچھ نہ بول سکیں پھر اٹھ کر ورہ کے پاس آئیں جس کا چہرہ سستا ہوا تھا اور آنکھوں میں دیرانی تھی۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”میں عرفان کے اب سے کہوں گی سڈر ایور رکھ لیں“ میری بیٹی کو آنے جانے میں مشکل ہوتی ہے جب تم بہنوں کا نہیں آنے جانے کو جی کرے گا۔ فون کر کے گاڑی منگوا لیا کرنا۔“

اور ورہ کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔

”ماں بچو ماں تم لوگ کوئی لاوارث تھوڑی ہو۔ تمہاری ماں ہے اور یہ خالہ بھی موجود ہے جس نے اپنے لیے تو کبھی کچھ نہیں مانگا لیکن رب کے بندوں کے ساتھ جہاں زیادتی ہوتے دیکھی ہے ضرور آواز اٹھاتی ہے۔“

انیلا ورہ خالہ کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ عتیقہ نے کہنے پر دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”رومی پتر اٹھ“ منہ دھو کر آ۔ باہر عرفان بھی آیا ہے۔ اسے بیٹھک میں بٹھا بلکہ کہہ دیا ہزاروں گھر پر نہیں ہے اگر وہ واپس جانا چاہتا ہے تو چلا جائے۔“  
 ”نہیں کنزی! جا کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولو۔ عرفان کو بلاؤ۔ آپ آج آپ لوگ کھانا کھا کر ہی جانا“ حج دل بڑا واس ہو رہا ہے۔“

عتیقہ کی بات پر دل شاد نے بتایا۔  
 ”میں تو یہ کہنے آئی تھی میری ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میری بیٹی بھی سرگودھا سے آئی ہے بلکہ میں نے بلایا ہے۔ اب اس کو ساس جی کے پاس چھوڑ کر اوپر ہی کہنے آئی ہوں آپ اور لڑکیاں چکر لگاتی رہنا“ اچھا ہوتا ہے“ میں تو آپ لوگوں کو جانتی ہوں۔ عرفان کے اب بھی رائے تو اچھی رکھتے ہیں لیکن اس طرح ان کی رائے اور بھی اچھی ہو جائے گی۔“  
 ”ٹھیک ہے پھر میں ابھی چلتی ہوں۔“ عتیقہ تیار ہونے لگی۔

”ورہ کو بھی ساتھ لے لو۔“  
 انہوں نے استسگی سے کہا۔ انہوں نے انکار نہیں کیا۔ ورہ کے ساتھ ابھی جو کچھ ہوا وہ اس شاک سے نکلی تو نہیں تھی لیکن ماں کو انکار بھی نہیں کر سکی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو عرفان کی موجودگی کا احساس دل کو گدگداتا لیکن اب وہ کچھ اور ہی سوچوں میں ابھی اور خود کو مشکل سمجھا لے ہوئے تھی۔

عرفان یقیناً اپنے اور اس کے رشتے کے بارے

میں پہلے نہیں تو آنے والے دنوں میں جان گیا تھا۔ اس کی داوی کو ہسپتال ایڈمٹ کرنا پڑا تھا۔ عتیقہ اور لڑکیاں جاتی رہتی تھیں اور ورہ کے آنے پر اس کا چہرہ چمک اٹھتا تھا والد اور والدہ کی جانب سے تنبیہ نہ تھی۔  
 ”خبردار جو کوئی جذباتی حرکت کی وہ بہت شریف بچیاں ہیں۔“ لیکن اس عمر اور رشتے کے تقاضے اپنی جگہ تھے۔

انہوں نے ڈرائیور رکھ لیا تھا۔ اس لیے اب انہیں آنے جانے میں مشکل نہیں تھی۔ یہ سب جمع کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اکثر ہزاروں کے ساتھ واوی کی عیادت کو جاتی اور سوئی کو ساتھ لے جاتی لیکن دل شاد اور ان کی بیٹی عفت ہزاروں سے تو اچھی طرح ملتیں لیکن دونوں بہنوں سے سلام دعا کے علاوہ کوئی بات کم ہی کرتیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ان کے بیٹھے ہی انیلا ورہ یا عتیقہ میں سے کوئی آجاتا۔ دل شاد فون کر کے شمع کے اپنی بہن کے ساتھ آنے کا پتا تین اور کہتیں ”گاڑی بھیج رہی ہوں تم میں سے کوئی آجائے۔“ ان کی کد پر جس طرح دل شاد اور عفت پرہہ کر استقبال کرتیں شمع کو بہت برا لگتا۔

”بڑی شریف بی پھرتی ہیں تمہاری بہنیں۔ میں پوچھتی ہوں ہمارے ساتھ جاتے انہیں کیا تکلیف ہوتی ہے۔ عرفان لوگوں کی گاڑی میں آتی جاتی ہیں کیا لگتا ہے وہ ان کا دیکھ لیتا ہزاروں کہیں کا نہیں چھوڑیں گی یہ جو نکلیں تمہیں۔ خون تو چوس ہی رہی ہیں۔ عزت بھی واؤ بر لگا نہیں گی۔ کوئی رشتہ دیکھو اور چٹا کرو انہیں بلکہ تم کیا دیکھو گے میں ہی دیکھتی ہوں۔“ وہ اپنے کمرے میں کھڑی پوری آواز سے چلا رہی تھی یقیناً ”یہ سب کہانی انہیں سنانے کے لیے تھا۔“  
 ”میں منع کر دوں گا“ وہ عرفان کی طرف نہ جایا کریں۔“ ہزاروں کی آواز دھیمی تھی۔

”میں کہہ رہی ہوں ساری عمر ہماری ترستے ہی گزرے گی۔ ان کے خرچے پورے کرتے کرتے ہم بوٹھے ہو جائیں گے۔ لڑکی تو ایک بھی ہو تو پیار کے برابر ہوتی ہے۔ یہاں تو چار چار پیار ہیں۔ نرے

خرچے ہی خرچے۔ ہر وقت کاغذاب۔“  
 کنزی نے آکر دروازے پر دستک دی اور کہا ”بی بلا رہی ہیں۔“  
 ”چلو جی ہو گئی پشی“ یہاں تو جی بات کرنا بھی مشکل ہے۔ ہزاروں تم ہی بگھٹو جا کر۔“ جیسے فضول میں کسی کی باتیں سننے کی عادت نہیں ہے۔“

اس کی ایک بات باہر وہ سب سن رہی تھیں اور خاموش تھیں ہاں رومی کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ نہ وہ امی کی بات سننے باہر نکلی اور نہ ہی اس وقت ہزاروں باہر آیا۔

”اگر۔۔۔ اگر بھائی نے ہمیں گھر سے نکال دیا تو ہم کہاں جائیں گے۔“ رومی خوف سے پتلی پڑ رہی تھی۔

”یہ گھر تمہارے والد کا بنایا ہوا ہے اور اپنی زندگی میں انہوں نے یہ مجھے گفت کیا تھا۔ تم لوگوں کو یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔“ امی نے کہا تھا لیکن ان کا سنا ہوا چہرہ کمزور آواز ان کی اندرونی کیفیت کا پتہ دے رہی تھی۔

میں بہت سارا دھنا چاہتی تھی ڈاکٹر بننا میرا خواب تھا لیکن اب میرا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ بھائی کبھی مجھ پر پیسہ ضائع نہیں کریں گے۔“ وہ رونے لگی۔  
 ”فکر مت کرو رومی ہم ہیں ماں۔ ہم تمہیں ڈاکٹر بنائیں گے۔“ ورہ نے اسے اپنے لگایا۔

اگلے روز آفس سے واپسی پر ہزاروں نے امی کے پاس آکر بڑے بڑے انداز میں ان کے عرفان کی گاڑی استعمال کرنے پر اعتراض کیا تھا۔  
 ”تو کیا کریں۔“ ٹیکسی یا رکشے میں بیٹھنے کو میرا دل نہیں مانتا۔“

”کیوں۔ وہ میرے اور شمع کے ساتھ نہیں جا سکتیں۔ آخر ہم بھی تو اوپر ہی جا رہے ہوتے ہیں۔“  
 ”تمہاری بیوی انہیں ساتھ لے جاتا کب پسند کرتی



”جہ۔“ اسی آپ لوگ تو ہر چھوٹی بڑی بات کا جھگڑا بنالیتے ہیں۔ اس روز شمع کو اپنی ایک دوست کی طرف جانا تھا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں دوست کی طرف جاتے ہوئے اس نے وردہ کو گاڑی میں بٹھا کر بازار تک لے جانا پسند نہیں کیا تو ب کیا کرے گی۔“

”میں جھگڑا نہیں چاہتا میں گھر میں امن و سکون چاہتا ہوں۔ آپ جانتی ہیں میں شروع سے لڑائی جھگڑوں سے بہت گھبراتا ہوں۔“

”اور اس کا تم نے یہ طریقہ نکالا ہے ہماری کسی بات کو دھیان سے سنو یہ مت۔ صرف بیوی کی باتوں پر توجہ دو اور آنکھیں بند کر کے اعتبار کرو۔ جہاں تک عرفان اور دل شاد آپ کی بات ہے تو سمجھ لو وہ اب تم دونوں سے زیادہ ہمارے اپنے ہیں میں جاؤ۔ میں بحث نہیں چاہتی اور یاد رکھنا بھراؤ مرد گھر کا حکمران اور منصف ہونا کرتا ہے۔“



عرفان کی داوی کا انتقال ہو گیا۔ ان دنوں شمع کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی وہ زیادہ نہیں آسکتی تھی۔ ہاں سوینی اور صبری کی پوکر رہ گئی تھی۔ لیکن وردہ بھی کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی۔ اس نے جن کا تمام کام اپنی گھرانی میں لے لیا تھا۔ ہر آئے گئے مہمان کی خبر رکتی۔ کس نے رات کو ٹھہرنا ہے، کسے کون سا کمرہ دینا چاہیے۔ بستر کہاں رکھے ہیں ملازمہ نے صفائی ٹھیک سے کی ہے یا نہیں۔ مہمانوں کو کھانا تو ٹھیک سے ملا ہے۔ سوینی ایک ایک لمحے کی رپورٹ شمع کو دیتی اور نمک مرچ بھی لگاتی۔

”تم صرف عرفان پر توجہ دو بے وقوف۔“ شمع نے سمجھایا۔

”اب تو وہ بھی وردہ صاحبہ اور ان بہنوں سے بڑا بے تکلف ہو گیا ہے اور تو اور کل ان سب نے مل کر میرا مذاق بھی اڑایا۔“

”و کچھ لوگوں کی میں ان سب کو۔ بھراؤ سے بات کروں گی۔ عرفان بہت گھراؤ دوست ہے اس کا۔ وہ بھراؤ کی بات سے انکار نہیں کرے گا وہ مان جائے باقی اس کی اہل کو ڈالو جو لمے میں۔ تمہیں یاد ہے یا یہ ہماری ساس محترمہ بھی ہمارے لیے راضی نہیں تھیں اب دیکھ لو کس کی چل رہی ہے۔“ شمع ہنس پڑی۔

جب بھراؤ نے عرفان سے بات کی تو اس نے کہہ دیا۔

”یہ اختیار تو میں نے اپنی امی کو سونپ دیا ہے وہ جسے چاہیں گی۔ مجھ سے منسوب کروں گی۔“

”لیکن تم سوینی کے لیے انہیں کوئی فیس تو کر سکتے ہو۔“

”جیسے تم نے شمع بھالی کے لیے کیا تھا۔ خود تو ڈوبے ہو یا راجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہو۔“ عرفان نے ہنس دیا۔

”زندگی یہی ہے پارے، دوسروں کے لیے سوچتے رہنا ہر دم ان ہی کی فکر کرنے میں وقت گزر جاتا ہے۔ جب احساس ہوتا ہے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ کل کو یہ بہنیں اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔ اپنی خوشی سے اپنی زندگی جنیں گی لیکن میرا وقت تو گزر چکا ہوگا۔“

”وہ شمع کے سکھائے سبق دہرا رہا تھا۔“

”بہر حال یہ معاملہ میں نے امی کو سونپ رکھا ہے۔“

جب بھراؤ نے یہ بات شمع کو بتائی تو اس نے بھراؤ سے اس کی امی سے ہی بات کرنے کو کہا۔

”پاکل ہو کیا؟ تمہیں کیا معلوم نہیں وہ تمہیں بالکل پسند نہیں کرتیں۔“

”وہ تو ہے ہی پینڈو عورت اس کے فادر سے بات کرو۔“

”اس کے فادر سے میری کوئی بے تکلفی نہیں ہے۔“

”سچ تو ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے ہر کسی سے ڈرتے رہتے ہو۔“

یہ بڑا بچ تھا جو شمع بول گئی اور وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

شمع کی والدہ اور بہنیں آتی رہتی تھیں اگلے روز آئیں تو اس نے ساری بات بتادی۔

”شمع! میں سوچ رہی ہوں۔ تمہاری اس دیوی بڑی نیرکار شہ ہے ہم اپنے تحسین کے لیے نہ مانگ لیں۔“

”کیا کہہ رہی ہیں ماما آپ؟“ اس نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ وہ ہماری بڑی بہو صاحبہ تو ہر بات میں مقابلہ کرتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی۔ تحسین اور امین کی بیویاں بالکل سیدھی سادی اور ایسی لاؤں کی جن کا ہیکہ مضبوط نہ ہو اور اس سلسلے میں تمہاری بڑی نیرکار بڑی فٹ بیٹھتی ہے۔ دیکھو

ماں رشتہ دے کر ایک تو تم بھراؤ اور اس کے گھر والوں کو زیر بار کر لو گی۔ اور ہمیں بھی خدمت گزار بے زبان ہوں مل جائے گی۔ یہ رشتہ ہو جائے پھر تم اپنی ساس پر دباؤ ڈالنا۔ وہ سوینی کے لیے عرفان کی ماں سے ہاں

کروائے۔“

”ہاں ہاں شمو! ماما بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ایسا کر کے تم تو ہماری سسرال پر چھا جاؤ گی۔ چوں نہیں کر سکیں گی پھر یہ ماں بہنیں تمہارے آگے۔“ ماں کی تجویز پوری سننے کے بعد اب سوینی چک رہی تھی۔

”یہ لوگ مانیں گے نہیں۔“ شمع نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیسے نہیں مانیں گے اچھے رشتوں کا آج کل کال ہے۔ یہاں تو ایک نہیں پوری چار چار بیٹھتی ہیں بھراؤ کو سمجھاؤ۔ اتنی چیزوں کا چیز اور رشتے ڈھونڈنا۔

دونوں ہی آسمان نہیں۔ اب جو بیٹھے بنائے اللہ نے سبب بنا دیا ہے تو سوچنے اور ماں کی باتوں میں آنے میں وقت ضائع نہ کرے۔ وہ اس گھر کا سربراہ ہے سب

اسی کا دیا کھا رہے ہیں۔ اس لیے فیصلوں کا حق اسے اور اس کی بیوی کی حیثیت سے تمہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے اپنی ساس کی باتوں پر دھیان نہ دو بس آجیں یہ

باد کرواؤ کہ یہ ان کی خوش نصیبی ہے جو اس ریورڈ

میں سے ایک نکل رہی ہے۔“

ان کے بیٹھے ہی بھراؤ بھی آ گیا اور اس کی ساس نے شمع کے ساتھ ساتھ خود بھی بات کر لی۔

”بھی تو ایتلا بڑھ رہی ہے۔ امی نہیں مانیں گی۔“

”بڑھنے سے شمع نے منع کیا ہے پڑھتی رہے۔ ہم تو بیٹا! تمہارے شانوں کا بوجھ بھارنا چاہ رہے ہیں تم تو انہیں بیاتے بیاتے بوڑھے ہو جاؤ گے بلکہ پتا نہیں سب کو بیاہ بھی پاؤ گے یا نہیں۔ سمجھو یہ چار پہاڑ ہیں جو تمہارے سینے پر دھرے ہیں۔“

”میں سمجھتا ہوں ماما! سب سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ میری امی۔ وہ کبھی نہیں مانیں گی۔“

”دیکھو تو ڈرنا۔ اے بیٹے یہ سعادت مندی اچھی بات ہے لیکن ایسا بھی کیا کہ بندہ بالکل ہی کاٹھ کا لوہا نہ جائے۔ دن رات محنت کرتے ہو جو کاتے ہو لا کر ماں کی بھولی میں ڈال دیتے ہو۔ تمہارے اور تمہاری بیوی کے حصے میں کیا آتا ہے، بس چند روپے، اتنی قربانی دینے کے بعد بھی تمہارا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔“

ساس تو باقاعدہ لتے لینے لگیں، شمع ہاں ہاں ملا رہی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں کروں گا بات۔“

”کب کرو گے بھئی۔ ہمارا الزکا بھی تو لاکھوں میں ایک ہے۔ بہت رشتے ہیں اس کے لیے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں۔ بس جلدی بات کی ہو جائے۔“



اس کے یوں کہنے پر کتنی دیر توانی گم صم سی کیفیت میں اسے دیکھتی رہیں پھر جب اس نے یہ کہا۔  
"اگلے ہفتے وہ لوگ انکو بھی پستانے آرہے ہیں۔"  
توانی نے صاف انکار کر دیا۔

"کیوں کیا آپ یہ بوجھ ہمیشہ میرے سینے پر دھرے رکھنا چاہتی ہیں۔ یاد رکھیے ایسی بھی حور پریاں نہیں ہیں آپ کی بیٹیاں کہ رشتوں کی لائن لگ جائے۔ خدا خدا کر کے ایک رشتہ آیا ہے اور میں نے تو شکر کیا ہے لیکن آپ اپنی بے جا ضد کی وجہ سے انکار کر کے میری پرانہ میں اضافہ کر رہی ہیں۔"

"بھالی! آپ سمجھیں آپ کی کوئی بہن ہے ہی نہیں۔ مر گئیں ہم سب آپ کے لیے۔"  
وردہ اندر آگئی تھی جبکہ رومی باہر کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ انیلا اور کنزی جن میں تھیں اس لیے بے خبر تھیں۔

اس انکار کا خیزا زہ یوں بھگتا ہوا کہ شمع نے جولا گنا بندھا خرچ وہ گھر کے لیے اپنی امی کو دیتا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اب جس طرح ٹاپ تول کرا نہیں کھانے کو مل رہا تھا۔ ملازموں کو بھی بہت تنگ ذہنیت کے مالکان ہی دیتے ہوں گے۔



وقت کا کام گزر جاتا ہے سو وہ گزر رہی جاتا ہے۔ لیکن دل پر لگنے والے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔ ہنزاد کے ہاں چلی بیٹی پیدا ہوئی۔ ہسپتال میں امی اور وردہ دیکھنے کے کمرے میں خوب رونے لگی تھیں، شمع کی فریڈز اور رشتہ دار سب جمع تھے اور ہنزاد کے خوسے پچی کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ وردہ نے جا کر پچی کو پیار کیا اور اسے کرکھا۔

"مو بھیا! ایک اور پہاڑ تمہارے سینے پر دھر گیا ہے۔"

اور ہشتے چہرے قہر و غضب پر سائے لگے۔ بعد میں امی نے ڈانٹا بھی لیکن اس نے کہا۔

"کیا میں نے غلط کہا ہے جب وہ آپ کی بیٹیوں کے

لیے ایسا بول سکتے ہیں تو اپنی بیٹی کے لیے بھی کہیں نا۔"  
انیلا بیاہ کر پہلے وہی پھر جرمنی چلی گئی کہ اب ثاقب کی جانب وہیں تھی۔ ڈرپوک نازک سی انیلا نے وہاں جا کر جانب کر لی اور گھر میں پیسے بچھنے لگی۔

وردہ نے دل شاد آنٹی سے شادی سے پہلے ہی کہا دیا۔ میں جانب ضرور کروں گی۔ انہوں نے اعتراض نہیں کیا۔ اس نے تعلیم بھی شادی کے بعد مکمل کی کہ امی نے بی ایس سی کرتے ہی اس کی رخصتی کر دی تھی۔

انیلا نے پیسے بچھنے شروع کیے تو شمع کی محتاجی نہ رہی۔ اب وہ آدھا گلو گوشت سامنے رکھ کر یہ نہیں کہتی تھی دونوں ٹائم بھی پورا کرتا ہے۔

اور باندی تیار ہوتے ہی اپنے لیے دوپہر اور رات کا کھانا بھی نہیں نکال سکتی تھی کہ عتیقہ نے اس کے لائے راشن کو پکانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود قریبی مارکیٹ سے سوالاتیں اور فرنیچر میں محفوظ کرتیں۔

کنزی کا رشتہ انیلا اور ثاقب کی کوششوں سے جرمنی میں ہی طے ہوا۔ ان ہی دنوں سوئی کو طلاق ہوئی تھی اور کنزی کی اتنی اچھی جگہ بات پبی ہو جانے پر شمع واقعی شمع کی طرح جل رہی تھی۔

"میں ہمارے کوئی عزت نہیں۔ ہمیں یہاں رہنا ہی نہیں۔" اس نے اعلان کر دیا۔

ہنزاد کچھ اچکی یا گرا اپنی دو بیٹیوں کی ماں کی بات ٹال بھی نہیں سکتا تھا پھر امی نے کچھ سوچ کر یہ بھی کہا دیا۔  
"میں یہ مکان فروخت کر رہی ہوں۔"

انہوں نے یہ کام عرفان کے ذمہ لگایا اور مکان بکتے ہی رقم بچوں میں انصاف کے ساتھ بانٹ دی۔ عتیقہ اور رومی وردہ کے قریب ہی کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں آگئیں۔ رومی کو ڈاکٹر بننے کا جنون تھا اور دونوں بڑی بیٹیں اس کے اس شوق کو ہر حال میں پورا کرنا چاہتی تھیں۔

دل شاد بیگم کی صحت اب زیادہ اچھی نہیں رہتی تھی۔ وردہ کے دونوں بیٹوں کو جانب پر جانے کے بعد عتیقہ سنبھالیں کہ وہ بالکل قریب ہی رہتی تھیں اکثر

دل شاد کے پاس بھی آجاتیں۔



بیمار تو دل شاد رہتی تھیں لیکن ان سے پہلے عتیقہ ایک روز چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔  
"بھیا کو اطلاع مت دینا۔" رومی کے کچے میں ہنزاد کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ لیکن وردہ کو دنیا کا چلن دیکھنا تھا۔

عتیقہ کی وفات پر کنزی اور انیلا بھی باہر سے آئیں ہنزاد اور شمع بھی آئے لیکن بیٹیوں بہنوں نے بات تک کرنا گوارا نہیں کی۔ ہاں وردہ نے مہمان سمجھ کر بات کر لی تھی۔

یہ سب ہی نے دیکھا۔ ہنزاد اپنی عمر سے کہیں زیادہ اور تھکا تھکا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بہنوں سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ بھی اسے نظر انداز کر رہی تھیں اور شمع بھی موقع نہیں دے رہی تھی۔

"یہ آپ کی پھوپھی ہیں۔" اس نے بڑی ولی کو پھر چاروں کو بلا کر وردہ کا تعارف کروایا۔  
"ہاں لیکن یہ پھوپھی کی بیٹیاں نہیں۔ خالہ کی بھانجیاں لگتی ہیں۔" بچے کے رنگ اور بیمار جسم۔  
آج بھی ویسی ہی تھی بڑے آرام سے سچی بات کہہ جانے والی۔

"پھوپھی! آپ کبھی ہمارے گھر آئیں نا۔" بڑی ولی کہہ رہی تھی اس نے مسکرا کر ٹال دیا۔

پھر ہنزاد اکثر آنے لگا حالانکہ وردہ اس کے پاس زیادہ بیٹھتی نہیں تھی۔ ٹائم ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ کالج میں لیکچرار تھی۔ پھر گھر کی ذمہ داریاں بھی ادا کرتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہنزاد بھائی سے کہنے کو اب اس کے پاس تھا ہی کیا۔

"وردہ! تم ادھر میرے لیے کوئی کرائے کا گھر دیکھو۔" ایک روز اس نے کہا تھا۔

"خیریت! اس نے اسی قدر بوجھ تھا۔"  
"خیریت ہی تو نہیں ہے شمع شک کرتی ہے مجھ پر۔ وہ بھی اپنی ہی مطلقہ بہن سوئی کے حوالے سے۔" شمع

بالکل بے قصور ہوں تم خود سوچو چار بیٹیوں کا باپ ہوں بھلا ایسی حرکت کر سکتا ہوں لیکن وہ عورت ذہن ہی بڑا عقلی رکھتی ہے اور ان کے گھر کے ماحول کو تو تم جانتی ہی ہو، وہ سوئی تو حد سے زیادہ بے پاک ہے اور اس کا اثر میری بیٹیوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں وردہ!

"پھر ایک روز شمع نے اسے فون کیا وہ بھی اس پاس کوئی مکان دیکھنے کی بات کر رہی تھی کہہ رہی تھی۔

"کیا بتاؤں وہ سوئی ہے تو میری بہن پر اسے بہن کہتے شرم آتی ہے ان ہی گرتوتوں کی وجہ سے طلاق ہوئی ہے۔ اب میں بیٹیوں والی ہوں یہاں نہیں رہنا چاہتی اور پتہ ہے میری ماں بھی ہر معاملے میں اس گنجت کی سائیلنٹ ہیں۔"

"رومی کی شادی سے فارغ ہو جاؤں پھر سوچوں گی۔"

"چھاروی کا بھی رشتہ طے کر دیا بتایا ہی نہیں۔" "بھئی۔ ابھی کارڈ بے کہاں ہیں۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا۔  
"کہاں ہو رہا ہے رشتہ؟" شمع کو تجسس ہوا۔  
"ڈاکٹر ہے لڑکا۔"

"چھا! چھا! دونوں کی پسند سے ہو رہا ہو گا۔"  
"بھالی! ہمارے گھر کی بیٹیوں میں فی الحال تو یہ رواج نہیں۔ اب آگے کا کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہنزاد بھائی کی بیٹیاں کیا کل کھلاتی ہیں۔"

رومی کی شادی پر ہنزاد بھرپور حصہ لینا چاہتا تھا۔ بیٹیوں سے بھی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن رومی نے صاف انکار کر دیا۔ وہ سلام کے علاوہ ان دونوں سے بات نہیں کرتی تھی وہ چھوٹی تھی گھر کی لاڈلی بچی اور جس بھالی کو اس نے جان سے بڑھ کر چاہا تھا اسے ہی بدلتے دیکھا تھا۔ وہ بھیا کی کڑیا بھیا کی جان تھی اور ایک وقت وہ آیا کہ خون چوسنے والی جو تک سینے پر دھرا بھاری پتھر ہو گئی۔

وہ گاڑی جس کے آنے پر وہ اسے چھو چھو کر دیکھتی کہتی تھی۔ "یقین نہیں آتا بھیا یہ میری ہے۔" اور



اسی گاڑی کی موجودگی میں وہ شدید گرمی اور برسی بارش میں بھی پیدل اسکول جایا کرتی تھی۔ وہ راتوں کو سو نہیں سکتی تھی یہ خوف کہ ایک روز بھیا انہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے پھر گھر کا خرچ کمال سے پورا ہو گا۔ اس کی پریشانی تو دھور رہی رہ جائے گی وہ کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکی۔

اور پھر ماں کی زندگی کے آخری ایام وہ ہنزاد کو بہت یاد کرنے لگی تھیں۔ اس کا بچپن اس کی شرارتیں اور اس کا ماں کے ساتھ پیار۔ اس کی باتیں کرتے کرتے وہ رونے لگتیں اور ان کے آنسو روی کے دل پر گرتے تھے۔

”بابی! تم انہیں گھر کیوں آنے دیتی ہو۔ ان سے پوچھو تو یہ اب کیوں آتے ہیں؟“ ایک روز وہ دروہ سے اچھڑی تھی۔

”آج یہ اسی جگہ کھڑے ہیں روی! جنہاں پر کل ہم تھے۔“

”تو کھڑا رہے ہو۔ ہمیں ان سے کیا لیا تو۔“  
”لیا تو نا واقعی کچھ نہیں لیکن ان سے مل کر مجھے مکافات عمل پر یقین آتا ہے۔ ہم چار بہنیں تھیں لیکن ہمارے ساتھ ماں کی دعا میں تھیں۔ ماں نے کبھی ہمیں بوجھ نہیں سمجھا۔ بس اللہ پر بھروسہ رکھا اور اللہ نے ہمیں وقت پر اپنے اپنے گھروں کا کیا۔ اب ان کی چار بیٹیاں ہیں ابھی بہت چھوٹی ہیں۔ لیکن پریشانی سے ان کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔“

ابھی ان میں باتیں ہو رہی تھیں کہ ہنزاد اور شمع ساتھ میں چاروں بچیاں چلی آئیں۔

”چلو بچوں تم لوگ باہر جا کر گھیلو۔“ اس نے فی دی پر اسپورٹس چیمپل لگا کر بیٹھے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا اور خود مہمانوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”عرفان بہت مصروف ہو گیا ہے دروہ! ملاقات کم ہوتی ہے اور جب ملتا ہے تو بھی سرسری انداز میں۔ لگتا ہی نہیں کبھی یہ میرا جھگڑا دوست ہوا کرتا تھا۔“  
”بس بھیا! وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر اسی قدر بولی۔

”آج ہم کھانا کھا کر جائیں گے بہت دن ہو گئے تمہارے ہاتھ کا پکا کھانا کھائے تم مڑ کوشت بہت اچھا بناتی تھیں اور انیلا جاول بہت مزے کے بناتی تھی۔ کنزنی کی چائے مجھے اکثر یاد آتی ہے۔“

اب اسے سب یاد آنے لگا تھا۔  
دروہ کچھ نہیں بولی۔ وہ بھی جیسے ماضی میں اترے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد بولا ”یاد ہے دروہ! سردیوں میں شام کو جب امی کھانا بنانے کی تیاری کرنے کچن میں جاتیں تو ہم سب بھی کچن میں ہی ڈیرہ بٹالیا کرتے تھے اور اپنے اسکول کی ہر چھوٹی بڑی بات امی کو بتایا کرتے تھے۔ وہ کتنی دلچسپی سے ہمارے یہ سارے قصے سنا کرتی تھیں۔“

”چھوڑیں بھیا! اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔“ وہ اس ذکر سے بچنا چاہتی تھی۔

”مجھے امی بہت یاد آتی ہیں دروہ! اس نے جیسے آہ بھری تھی۔“

”اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ دروہ بہت سنجیدگی سے بولی تھی۔

”وہ مجھے یاد تو کرتی ہوں گی۔ میری باتیں دہراتی ہوں گی۔ ہے نا۔“

دروہ نے جواب نہیں دیا اٹھ کر کچن میں چلی آئی، پیاز کاٹتے ہوئے اس نے ڈھیروں آنسو بہا ڈالے۔

”دروہ! روی سے کہو مجھے معاف کر دے۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے معاف کر دے گی تو امی بھی مجھے معاف کر دیں گی۔“ وہ کچن میں چلا آیا تھا۔

”اب آپ کو امی سے معافی کیوں چاہیے بھیا؟“

”اب آگے مجھے احساس ہوا ہے میں کتنی غلطی کرتی رہی۔“

زندگی گزارنے کے لیے میں نے غلط عورت کا انتخاب کیا تھا اور پھر اس کی سزا بھی پارہا ہوں تم روی سے کہو مجھے معاف کر دے۔“

”میں کہہ دوں گی۔“ وہ بھاری اور بھیگی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

”پچھو! آپ کی گاڑی کتنی اچھی ہے۔“ کیا ہم

آج شام اس میں بیٹھ کر آکس کریم کھانے جاسکتے ہیں؟“  
ہنزاد کی سب سے چھوٹی بیٹی ادھر آئی تھی اور کچن کے دروازے میں کھڑی اجازت کے رہی تھی۔ وہ آنسو جن پر دروہ نے مشکل بند باندھا تھا پھر بسنے لگے اور کیا کیا نہ یاد آگیا۔ ہنزاد کو اب یہاں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ واپس پلٹ گیا۔



بچے ابھی چھوٹے ہی تو تھے ہم بھی سب اسکول لیول پر ہی تھے کہ دروہ نے ہنزاد کی بیٹی کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگ کر دھماکہ کر دیا۔ بسنے تو روی نے ہی اس کے ساتھ مغز کھائی کی پھر انیلا اور کنزنی کو فون کر ڈالا۔

”دلغ تو تھک ہے ناں تمہارا“ ارے امی کا وقت بھول گئی ہو جو کچھ ہم بہنوں نے سنا۔ یاد نہیں ہے کیا؟“ انیلا ڈانٹ رہی تھی کنزنی کہہ رہی تھی۔

”ابھی بھی وقت ہے منع کر دو۔ کہہ دو باقی تینوں بہنیں نہیں مان رہیں۔“

لیکن اس نے انکار نہیں کیا اور کسی کو ایسا کرنے کی وجہ بھی نہیں بتائی۔ وہ جو سب بہنوں میں ڈیر اور منہ پر بات کر دینے والی تھی۔ آج کسی کو وضاحت نہ دے سکی۔

وہ بتا نہیں سکی۔ پیاری بہنوں! تم سب بھیا سے محبت کرتی تھیں۔ میں تو اپنے اکلوتے لاڈلے بھائی کی پرستش کرتی تھی۔ بہت دوستی بھی تو تھی ہم دونوں میں۔ بھیا کو میرا بے دھڑک ہر بات بول جانا کتنا اچھا لگتا تھا وہ مجھے میری ہمارا بہن کہتے تو مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ محبت کا یہ ننھا پودا تناور درخت بن گیا اور پھر وہ وقت آیا جب یہ محبت اپنا دامن چھڑانے لگی۔ بھیا ہمارے پاس رہ کر تھی ہم سے دور ہو گئے لیکن یادیں مر نہ سکیں اور جب اچھی یادیں ساتھ ساتھ رہیں تو پھر محبت کیسے مرجاتی۔ میں نے بھیا کو تب بھی چاہا جب وہ ہمارے نہیں رہے تھے اور ان کی یاد میں ہر رات آنسو بہاتے ہیں۔

تم نہیں جانتیں میری بہنو! کیا سوچا ہے میں نے؟

ان کی بیٹی کو اپنے عادل کے لیے مانگ کر میں نے ان کو ہمیشہ کے لیے قید کر لیا ہے۔ (ایک سے دوسرے رشتے کی قید)

اب وہ کبھی مجھ سے دور نہیں جاسکیں گے۔ بیٹی کو دیکھنے کے لیے ہی سہی اس کی محبت کی تڑپ میں جھٹکا ہو کر رہی سہی وہ یہاں آئیں گے تو میں دل ہی دل میں میرے بھیا میرے راجہ کہہ کر بلائیں گے لوں گی۔ میں گئے وقت کو پھر سے منھی میں لے لوں گی۔



### ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

| کتاب کا نام            | مصنف             | قیمت  |
|------------------------|------------------|-------|
| زندگی ایک روشنی        | رخسانہ گارمہ خان | 500/- |
| خوشبو کا کوئی گھر نہیں | رخسانہ گارمہ خان | 150/- |
| شہر دل کے دروازے       | شازیہ چوہدری     | 300/- |
| حیرت نام کی شہرت       | شازیہ چوہدری     | 150/- |
| دل ایک شہر بنوں        | آسیہ مرزا        | 400/- |
| آئینوں کا شہر          | فاخرہ افکار      | 400/- |
| چھلان دے رنگت کالے     | فاخرہ افکار      | 180/- |
| میں سے عورت            | غزالیہ عزیز      | 150/- |
| دل آسے دھوپ لایا       | آسیہ رزاقی       | 300/- |
| کھربا جائیں خواب       | آسیہ رزاقی       | 150/- |
| خواب در پیچے           | سعدیہ یال کاشف   | 150/- |
| امہوں کا چاند          | ہتری سید         | 150/- |
| رنگ خوشبو بھیا دل      | المشاں آفریدی    | 400/- |

ناول نگار کے لیے کتاب ڈاک خرچ 300/- روپے

منکھانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 2216361



# سیدہ ام ولد



”نرن نرن نرن۔“ نون کی تھنٹی بجنے پر میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو جی ماڈرن پبلک اسکول۔“ میں نے صبح سے کوئی پچھتہ دین یا حکمرانوں کے ”سب ٹھیک ہے“ کی طرح یہ رٹا رٹایا جملہ دہرایا۔

”جی وہ میڈم آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ آپ لوگوں نے بچوں کے سالانہ امتحان کا کیا ٹائم رکھا ہے؟“ دوسری طرف کوئی خاتون تھیں۔

”سو موافق صبح نو بجے پیپر شروع ہو گا۔ نوٹس سب بچوں کو دیا تھا ہم نے۔“

”جی معلوم ہے، اصل میں یہ کنفرم کرنا تھا کہ پرانے ٹائم کے نو بجے یا نئے ٹائم کے۔“ اس جملے نے میرے تن بدن میں ایسی آگ لگا دی کہ کبھی کسی نے عراق کے تیل کے کنوؤں کو بھی نہیں لگائی ہوگی۔

”جی وہ ٹائم جو اس وقت پورے ملک میں چل رہا ہے۔“ میں نے اندر ہی اندر دانت پیسے۔

”وہ اصل میں میں نے کہا آپ کارپوریٹ اسکول ہے تو کیا پتا آپ نے ٹائم چیلنج نہ کیا ہو۔“ دوسری طرف سے جملہ عمل ہوتے ہی کھٹ سے فون رکھ دیا گیا تھا۔

میں شدید غصہ کے عالم میں فون کو مٹھورنے لگی گھڑیاں آگے کیے ہوئے بٹھتے ہوئے والا تھا اور ان چند دنوں میں میرا دل آگے کے گوداموں کی طرح خالی

ہو چکا تھا۔ فون رکھ کر میں دوبارہ سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسی وقت رابعہ اجازت لے کر اندر داخل ہوئی۔

”میم! وہ سب نیچرز پوچھ رہی ہیں کہ کل کانٹراپ کنفرم ہے نا!“ میرے اشارہ کرنے پر وہ بیٹھ گئی۔ وہ اسکول کی سیکنڈ ہینڈ یعنی وائس پرنسپل تھیں۔

”ہاں ڈرائیور آتا ہے تو میں کنفرم کر دیتی ہوں۔“ میں یہ کہتے ہوئے راونڈ لینے کے لیے اٹھی تو وہ بھی میری تقلید میں پیچھے آئی۔

اسکول میں اگلے ہفتے سے فائنل ایگزامز شروع ہو رہے تھے اس لیے پورے اسکول کو اس طرح سے سناٹا ہو گیا تھا جیسے ٹائن الیون کے فوراً بعد امریکہ کو گر اوٹنڈ اور کلاسز میں اکاؤنٹنٹ نظر آرہے تھے جنہیں کلاسز میں بٹھا کر نیچرز گر اوٹنڈ کے بیچوں بیچ شہوت کے درخت کے نیچے بیٹھی جاموں پر ٹمک لگا کر کھا رہی تھیں۔

لوڈ شیڈنگ کے باعث کلاسوں میں سخت گھٹن اور اندھیرا تھا۔ میں نے گیٹ پر نظر دوڑائی تو حسب توقع چوکیدار غائب تھا۔ کل کی بارش اور آندھی کے سبب گیٹ پر لگا ہوا بورڈ نیچے گر رہا تھا۔ جس پر نیچرز کی تہہ میں سے صرف ”انکس میڈیم“ لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”کہاں سے آ رہے ہو؟“ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے بچوں کو میں نے پس بلا کر ڈانٹا۔

”میڈم! وہ مس شازیہ نے ایسے گھر بھیجا تھا یہ

سلمان لانے کے لیے۔“ بچوں نے گھبرا کر ہاتھ میں پکڑے شارز آگے کیے۔ شازیہ کلاس دن کی نیچر تھیں۔ اس کا گھر اسکول کے ساتھ ہی تھا۔

”چاچا خیر دین کہاں ہے؟“ بچوں کو بھیج کر میں نے رابعہ سے پوچھا۔

”میں نے اسے بازار بھیجا ہے مل جمع کرانے کے لیے۔“ اس نے کھسکتے ہوئے بتایا۔

خیر دین ہمارے اسکول کا ستر سالہ چوکیدار تھا۔ جو نیچرز کے کاموں کے سلسلے میں زیادہ تر گیٹ سے غائب ہی رہتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں چوکیداری کا کام

نیچے بخوبی انجام دیتے تھے ویسے بھی اسکول میں کون سے خزانے دھڑے تھے جن کی چوکیداری کی ضرورت پڑتی۔ اصل مقصد تو اور کام تھیں دن کو اسکول سے باہر کے کام مثلاً کو صفائی اور رات کو چوکیداری جس کام کو وہ بخوبی انجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اسکول کے اسٹاف کی خبریں ادھر سے ادھر پہنچانے میں تو وہ کسی پرائیویٹ نیوز چینل سے بھی زیادہ ماہر تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ۔۔۔ ہمارے اسکول کا ملٹی فنکشن ملازم تھا۔

دسمت میں واقع اس گھر کی عمارت کو کرائے پر



حاصل کر کے اسکول کی شکل دی گئی تھی۔ میٹرک تک کلاسوں کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے پانچ کمروں کو زبردستی تقسیم کر کے دس کلاس رومز بنائے گئے تھے۔ بڑی کلاسوں میں تو پھر بھی گزراے لائق فرنیچر نام کی چیز موجود تھی مگر چھوٹی کلاسوں کے لیے دھرتی ماں زندہ پاؤ۔ اوپر کے میسر کو چھت ڈال کر اسٹاف روم کا نام دیا گیا تھا۔ جبکہ میسر سے جھانک کر ارد گرد کے کھیتوں اور باغات کے نظارے کرتی ہوئی نیچر بے خبری میں اسکول آنے جانے والے ملاقاتیوں اور ارد گرد کے رہائشیوں کو بل غبار کرنے کے مواقع بھی فراہم کرتی تھیں۔ بچے کے چکن کو تھوڑی سی مرمت کے بعد پرنسپل آفس کمرے کا حق دیا گیا تھا۔ باقی چاک ڈسٹر اور بلیک بورڈ کے لیے باہم اخوت و بھائی چارے سے کام لیا جاتا تھا۔ گھر کے اندرونی نوائیلٹ کو گزراے ہاتھ روم کا نام دیا گیا تھا جبکہ لڑکے ارد گرد کے آلودگی سے پاک ماحول میں واقع کھیتوں میں اوپن ایر نوائیلٹ سے کام چلا لیتے تھے۔

”مس شازیہ! آپ کا پیڑ فری ہے؟“ خوش گہویوں میں مصروف نیچر بے پاس جا کر میں نے کلاس ون کی نیچر سے پوچھا جو گھر سے منگوائے گئے لگانے میں سے کل کے ٹرپ پر بننے جانے والا سوٹ باقی نیچر کو دکھا رہی تھی۔ ان کے پیچھے کی دیوار پر لگا ”گوالٹی ایجوکیشن“ کا بورڈ میرا منہ چرا رہا تھا۔

”میڈم! کلاس میں تین ہی بچے تھے تو میں نے تھری کلاس کے واجد کے ذمہ لگا دیا ہے کہ وہ ان سے نیبل سنے۔“ اس نے کلاس تھری کے اکلوتے اسٹوڈنٹ کا نام لیا۔

”اوکے لیکن دھیان رکھنا کہ سر میڈم کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔ اس لیے چاچا کی غیر موجودگی میں سینئر کلاسز میں سے دو بچوں کو گیٹ پر بٹھادیا کریں۔“ اسکول کے مالک اور ان کی بیگم ہفتہ دس دن میں ایک بار اسکول کا پتہ لگا لیتے تھے۔ سو بچوں دس نیچر اور چاچا خیر دین پر مشتمل اس نام کے ”ماڈرن اسکول“ کا حال بھی ملکی صورت حال جیسا تھا، جس

حکمران بہت تھے مگر حکومت ناپید۔

”مس جی یہ لیں آپ کا بل یہ آپ کا برگر اور یہ مس عارفہ کا کلپ بھی میں بدلا لایا ہوں۔“ چاچا کے منہ اٹھا کر آنے پر سب نیچر نے سیدھا ہوتے ہوئے دوپے درست کیے۔

چاچا خیر دین کو پولیس کی نوکری سے ریٹائر ہوئے تقریباً دس سال ہو گئے تھے مگر اس کی ہر جگہ بلا اجازت دندناتے ہوئے پھرنے کی عادت اب تک قائم تھی۔

”چاچا! ڈرائیور آئے تو میرے آفس میں بھیج دینا۔“ میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ چاچا کو میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ٹھیک اسی طرح برداشت کرنے پر مجبور تھی جیسے حکومت اپوزیشن کو۔ کیونکہ وہ اسکول کے کمالوں کا رانا ملازم تھا۔

آفس میں واپس پہنچ کر میں نے فون پر سوکتوں والی ایک نظر ڈالی۔ جس پر آنے والی کالز میں سے ننٹوے فیصد نے اور پرانے ٹائم سے متعلق ہوتی تھیں۔ چند دنوں میں لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے اتنا دلخ خراج ہو چکا تھا کہ اگر اس سے آدھا بھی خرچ کرتی تو بڑی ملک میں ”کون بے گاروڑ پتی“ کی جیمپٹن بن گئی ہوئی۔ صرف اسکول میں ہی نہیں گھر پر بھی یہی جلی تھا۔ صبح ابھی میں سو کر اٹھی ہی تھی کہ کسی کی فون کی کے اعلان کے بعد گھر میں جمع ہونے والا ہجوم میرا پارہ چڑھا گیا تھا۔ مرنے والا تو مر گیا تھا مگر اب پورے گاؤں کی عورتیں جن میں میری اماں جان بھی شامل تھیں۔ اس معاملہ کو حل کرنے میں جان بیکان کر رہی تھی کہ جنازے کا نام پرانا گیارہ ہے یا نیا؟۔

راجہ نے ڈرائیور کے آنے کی اطلاع دی تو ساتھ ہی ہمارے گاؤں کا مجید اپنے کچرے سے لت پت پاؤں لیے آفس کے کارپٹ پر اکھڑا ہوا جو میں نے پچھلے ہفتے ہی سیکنڈ ہینڈ ٹولائیٹیل نال کی مارکیٹ سے منگوا یا تھا۔ اس کے جوتوں سے بننے والے نقش و نگار دیکھ کر میں چیخ و نوب کھا کر رہ گئی۔ اس سے نیچر ٹرپ کے سارے معاملات طے کر کے ابھی میں گیارہ بچے چھٹی کر کے

اس کی گاڑی میں فی سبیل اللہ گھر جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ چاچا خیر دین چلا آیا۔

”میڈم! میں جتنا بھول گیا کہ بارہ بجے بڑی میڈم نے آتا ہے۔“

میرے چہرے کی جلتی روشنیوں پر لو شیدنگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ دو سال ہو گئے تھے جاں کرتے ہوئے مگر جال ہے جو خیر دین کبھی خبر کی خبر لایا ہو۔

”ٹھیک ہے آپ جائیں کل آٹھ بجے آجانا۔“ میں نے دل کی جلن پر بمشکل قابو پایا۔

”میڈم! میرا خیال ہے کہ ساڑھے سات کا ٹائم رکھیں۔“ چاچا کی امریکہ کی طرح ہر بات میں ٹانگ اڑانے والی عادت سے میں بے حد تنگ تھی۔ میں نے فوراً انکار کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ مس بے نظیر! میں آٹھ بجے ہی آؤں گا۔“ مجید نے اپنا انگوٹھیوں سے بھرا ہاتھ دیا۔

”میرا نام نعرہ ہے۔“ میں نے جواباً اسے گھورا۔ ”اونچی معاف کرنا۔ چنڈی کی کئی جنگوں کے نام بدلے ہیں۔ ایڈوانس میں سارے اشاپوں کے نئے نام لے کر عادت ہی پڑ گئی ہے۔ اتنی بار تو بھی اپنی گھر والی کا نام نہیں لیا جتنا باجی بے نظیر کا لیا ہے۔“ وہ بھونڈے انداز میں ہنسنا تو میں بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

”کون سی جنگیں؟“ چاچا نے بھی اپنی معلومات میں اضافہ ضروری سمجھا تھا۔

”بے نظیر باغ بے نظیر چوک بے نظیر ایر پورٹ بے نظیر روڈ بے نظیر اسپتال اتنا سنا نام بلاتے ہوئے منہ میڑھا ہو جاتا ہے اور گھر میں اگر کبھی جو غلطی سے منہ سے بے نظیر نکل جائے تو جیدے کی اماں الگ ٹنک کرتی ہے۔“ اس کی گفتگو سے پورہ کر میں اٹھ کر باہر آگئی۔ اسٹاف روم جا کر سب نیچر کو روانگی کا نام بتایا۔

”میڈم! پرانے آٹھ بجے یا نئے والے بہت سی آوازوں پر میرا خون کھول اٹھا۔ بے بسی سے سب کو

میں نے ایسے دیکھا تھا جیسے امریکہ اسلامہ کی تصویروں کو۔



”حد ہوتی ہے۔ اعلان کرو اتنے وقت جتنا چاہیے تھا۔“ خالہ خیرن غصہ میں چار پائی پر بیٹھ کر پٹکھا اور تیز جھلانے لگی۔

”اور نہیں تو کیا۔ سیدھا سدا اعلان کر دیا کہ جنازہ گیارہ بجے ہے۔ میں پرانے ٹائم کے گیارہ بجے پہنچی۔ کیا بتاؤں منہ دیکھنا تک نصیب نہیں ہوا میت کا۔“

اماں کے انداز میں بھی افسردگی تھی۔ فائل اور برس اٹھا کر اندر جاتے ہوئے میں نے برا سامنہ بتایا۔ ”اسکول سے جان چھڑا کر گھر آئی تو گھر میں بھی یہی موضوع زیر بحث تھا۔“

”مرے کو بھی تو بتا کر مرنے چاہیے تھا تاکہ پرانے ٹائم کے حساب سے مرے گلاب نے ٹائم کے حساب سے۔“ بلال اس موقع پر بھی باز نہیں آیا تھا۔

”مور فرشتوں کو بھی متفرق کرنا چاہیے تھا کہ نئے ٹائم کے مطابق حساب لینے آفس کے یا پرانے ٹائم کے ہو سکتا ہے تاکہ وہ نئے ٹائم کے حساب سے پہلے آکر بیٹھ گئے ہوں یا پرانے ٹائم کے حساب سے لیٹ ہو گئے ہیں۔“ اماں نے گھورے پر وہ جلدی جلدی بات ختم کرتے اندر بھاگ گیا۔

”تو اور کیا جی۔ میں دفتر سے چھٹی کر کے آیا جتنا پڑھنے کے لیے۔ میرا خیال تھا کہ گاؤں میں کہاں ٹائم بدلا ہو گا۔ مگر یہاں پہنچا تو دیکھا ہوں کہ لوگ مرے کو دفن کر دیا ہے جارہے تھے۔“ لالہ سجاد نے بھی اپنا دکھڑا رویا۔

”کوئی حل نہیں ہے حکومت کا۔ کوئی بتائے کہ اب یہ گھڑیاں آگے پیچھے کرنے سے کیا ہو گا۔ کچھ لوگ نئے ٹائم کے حساب سے چل رہے ہیں اور کچھ کے ہاں وہی پرانا ٹائم ہے۔ پرسوں شہر میں میرے بھانجے کی بارات تھی۔ میں پرانے ٹائم کے حساب سے پہنچا تو بارات والی ساری گڈیاں (گاڑیاں) ٹنک بھی چکی تھیں۔“ لالہ کفایت نے حقے کا شش لے کر ہٹکارا



حکومت کے خلاف بولنا اور سسٹم پر لعن طعن کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، سو گھڑیاں آگے کرنے پر بھی انہوں نے دل کھول کر مذمت کی تھی جیسے عوام ہمیشہ آمریت کی کرتی آئی ہے۔ گھڑیوں والے معاملے کو بھی انہوں نے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیا تھا ایسے گھر کی گھڑیاں آگے نہیں کی تھیں بلکہ وقتاً فوقتاً وہ دوسروں کو بھی اس سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتے رہتے تھے۔

”ایک فائدہ بھی ہوا ہے کہ اب میں دفتر جانے کے لیے جلدی اٹھتا ہوں تو نماز بھی پڑھ لیتا ہوں۔“ لالہ سجاد نے ان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی صبح کی نماز پڑھنے والی عادت پر بالما کفایت سے اچھی خاصی عزت افزائی ہوتی تھی۔

”کچھ بھی ہو جائے میں نہیں بدلوں کا نام۔ روز روز کے تماشے ہیں گورنمنٹ کے۔“ وہ حقہ اٹھا کر خفگی سے گھر کی جانب چل دیے۔

”گورنمنٹ کو بھلا فرق بھی کیا پڑتا ہے تاہم بد سنے سے۔ تاہم بد سنے والے خود تو زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتے ہیں اور عوام کا تو سارا سال ایک ہی نام ریتا ہے۔ غریبی کا۔“ بلال اندر بیٹھے ہوئے منمنایا۔ ساتھ ہی اس نے میری طرف دیکھا اور میرے گھوڑنے پر ہنس گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ مجھے اس ذکر سے بے حد چڑھتی تھی۔

”چلو اچھا ہے تاہم بد سنے سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ مری کے لیے جلدی ٹیکس لگے اور واپسی پر رات کے آٹھ بجے بھی جگ گئے تو کوئی پروا نہیں۔“ ہاٹ پاٹ برتن اور دیگر سامان اٹھاتے سارا اسٹاف ہی بہت چمک رہا تھا۔

”سلیپ کو بھی تو اتنا تھا پھر کیوں نہیں آئی؟“ نازیہ نے رابعہ کو پانی کی بوتل پکڑاتے ہوئے اس کی بسن کے متعلق پوچھا۔

”نیرسے ٹرپ کا ڈیپاسٹ دیکھ کر جل رہی تھی۔“

اس نے جواب دیا۔

”جلنے کا ذکر مت کیا کرو۔ لوڈ شیڈنگ آٹھ کے بجائے بارہ بجنے کی ہو جائے گی۔“ میں نے مذاق کیا۔

”اور نہیں تو کیا۔ میڈم بالکل سچی بات کرتی ہیں۔ یہ نہ ہو کہ بل بھی زیادہ آنے لگے۔“ چاچا نے حسب عادت مداخلت کرتے ہوئے ساتھ ہی میری طرف دلو طلب نظروں سے دیکھا۔

”چاچا! آپ تو میڈم کی خوشامد ایسے کرتے ہیں جیسے خوش ہو کر انہوں نے آپ کو F-16 انعام میں دیے ہیں۔“ شازیہ نے جل بھن کر کہا۔

”F-16 میں کیلانی ڈال کر چلاؤں گا۔ میڈم کی مہمانی ہو کہ اگر وہ خوش ہو کر میرے گھر دو پوری آتا ڈلو اور۔“ چاچا کبھی کبھی کام کی بات بھی کر جاتا تھا۔

”چھوڑیں چاچا! آئے کی پوری تو اب ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ البتہ آپ کو ہر ماہ تنخواہ کے ساتھ ایک ساٹھ فری مل سکتا ہے۔“

ٹرپ کی وجہ سے میرا موڈ بھی خاصا خوشگوار تھا۔ مگر انتظار کرتے کرتے ایک بار پھر سے طبیعت پر بے زاری طاری ہونے لگی تھی۔ پونے آٹھ کی آئی ہوئی نیچر زاب تھک بار کر رہی تھی پھر بھی بیٹھ گئی تھیں۔ مگر انتظار کی گھڑیاں تو تجزیر کی بجائے ڈیڈ لائن کی طرح طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک صبر آزمایا انتظار کے بعد مجیدے کی آمد نے سب کو یوں خوش کر دیا تھا جیسے حقیقتاً ”جنر کی بحالی عمل میں آئی ہو۔“

”یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے اس کے سوچے ہوئے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا بتاؤں جی۔ کل آواز لگا رہا تھا بے نظیر باغ چلو کہ ایک سواری نے میرا وہ حشر کر دیا جو جلے کے لیے بے نظیر باغ جانے والوں کا ہوتا آیا ہے۔ بہت مارا جی! اس نے لیاقت باغ کا نیا نام لیا۔ جو ابھی تک عملاً تبدیل نہیں ہوا تھا۔“

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔

”اس کے ساتھ اس کی بسن تھی جی اس کا نام ہے

نظیر تھا۔“ وہ افسوس کے عالم میں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا جبکہ ہم سب نے بمشکل اپنی ہنسی دہائی۔

”تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟ نام تو آٹھ بجے کا تھا۔“ کافی دیر بعد چاچا خیر و کوہوش آیا۔

آج تو چاچا کی تیاری بھی دیکھنے والی تھی۔ نیلی پتلون، سرخ شرٹ (جو اس نے بیٹے کی مانگ کر پہنی تھی) سبز سن گلاسز جو غالباً ”کسی ریڑھی سے خریدے گئے تھے اور پاؤں میں سفید لیٹی شوز۔“

”میڈم جی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ پرانے آٹھ بجے آتا ہے یا نہیں۔“ اس کے جواب پر میرے تن بدن میں اگ لگ گئی تھی۔



”مولوی صاحب آج لوگ نماز کے لیے کیوں نہیں آئے؟“ سجاد لالہ اذان کی آواز سن کر مسجد میں پہنچے وہاں مولوی صاحب کی جگہ بلال کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔ ان کے سوال کے جواب میں بلال نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

بلال کو فرماتے آئیں کے پیروں کے بعد اذان دینے کا نیا نیا جوش چڑھا تھا مولویوں کی طرح دائرہ رکھ کر وہ اذان سے پانچ دس منٹ پہلے بھاک بھاک مسجد جا پہنچتا تھا۔ پورے گاؤں میں وہ چھوٹے مولوی صاحب کے نام سے مشہور تھا۔

”ہنس بیٹا قیامت کی نشانیاں ہیں۔ مسجد میں نمازیوں سے خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ لوگ فیندے کے مزے لوٹتے رہتے ہیں۔“

مولوی صاحب مسجد کے احاطہ میں بنے ہوئے اپنے گھر سے نمودار ہوئے۔

”گلتا ہے باہر باطن ہیں۔ تب ہی اتنا گھپ اندھا ہوا ہے۔“ ایک اور نمازی مسجد میں داخل ہو کر وضو کرنے لگا تھا۔

”چھوٹے مولوی صاحب ایسے آپ نے کس وقت کی اذان دی ہے؟“ مسجد سے ملحقہ گھر کا مالک امجد اندر داخل ہوا۔ اس کی فیندے سے بو جھل آنکھوں میں غصہ کی لکیریں اور ماتھے پر پل پڑے ہوئے تھے۔

# مناہٹا خنا

بہنوں کا اپنا اپنا نام۔

لاہور

اکتوبر کا شمار ”عید نسیم“ شائع ہو گیا ہے

اکتوبر 2008 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ مشہور اداکار ”شان“ سے ملاقات،

☆ ”کیسے مالوں تم میرے ہو“ ام مریم کا خوبصورت مکمل ناول،

☆ ”میری عید تیرے رنگ“ عائشہ مرگلی کا مکمل ناول،

☆ ”کوہ چاند کیسا تھا“ مسیحہ تیسم کا مکمل ناول،

☆ ”تو میری انتہا ہے“ حنا علی شاہ کا ناول،

☆ ”حاصلِ تنہا ہو“ ساجدہ تاج کا ناول،

☆ ”میرے چارہ گھر سے میرا“ قسین اختر کا سلسلے دار ناول،

☆ ”عجب سلسلے ہیں وقا کے“ سعد پال کاشف کا سلسلے دار ناول،

☆ سکول ریاض، ہمارا امداد، قسین اختر، سعد پال کاشف،

ہمارا وفاتِ شوکت اور شاناز یہ نقش کشا افسانے،



اس کتاب کے علاوہ

جیسے تمام کتابوں کی باتیں، انشاء اللہ، اشرفیہ، شریز

کی دنیا کی دلچسپ معلومات اور مزید سروس کے علاوہ سنا

کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں

اکتوبر 2008 کا شمارہ

آج ہی اپنے قریبی بیک اسٹال سے طلب کریں



”بیٹا چلو نماز پڑھ لیں۔ نیند نماز کے بعد پوری کر لیتا۔“ مولوی صاحب اونچا سنتے تھے۔ اس لیے بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

”مولوی صاحب! آپ بھی کن اناڑی لوگوں کے ذمے اذان دینے کا کام لگا دیتے ہیں۔ غور سے دیکھیے ابھی چار بجے ہیں۔“ غصہ سے آگ بولہ ہوتے ہوئے اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی مولوی صاحب کے سامنے کی۔

”تو میں پہلے بھی چار بجے ہی اذان دیتا آیا ہوں۔ بس یہ درمیان میں ایک ہفتہ نہیں آسکا۔“ بلال نے ناہنجی میں باقی لوگوں کی طرف دیکھا۔

”اوہو بیٹا! ہفتہ بھر پہلے تم اذان دیتے رہے تھے مگر کچھ دن پہلے گھڑیاں بھی تو آگے کی ہیں نا۔“ صحن میں موجود دس بارہ نمازیوں میں سے کوئی بولا تھا۔ بلال کی وہ حالت تھی کہ کالو تو بدن میں لہو نہیں۔

”اے میرا بھی دھیان نہیں گیا گھڑی کی طرف۔“ مولوی صاحب نے بوکھلائے ہوئے مسجد کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ جو پرانے ٹائم کے حساب سے سواتین بج رہی تھی۔

”کیا بتاؤں نمازیوں نے مجھے کن کن نظروں سے گھورا۔ اتنی شرمندگی ہوئی کہ سائیکل والوں کو سائیکل کی ہوائی پمپ پر بھی نہیں ہونے ہوئی۔“ اس نے کھیا کر ساری بات بتائی۔ میری ہنسی سمجھنے کا کام ہی نہیں لے رہی تھی۔

”اچھی طرح نکالو دانت۔“ اس نے براہ راست بتایا۔ اسی وقت ماما کفایت اسے پکارتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ان کا برسوں پرانا ٹائم پیس تھا۔

”کیا ہوا ماما! پھر دھادے لگی آپ کی محبوبہ!“ بلال نے آدھا جملہ اندر ہی اندر ادا کیا تھا۔

ماما کا یہ پرانا ٹائم پیس انیس بے حد عزیز تھا۔ مگر وہ بھی کسی سرکاری محکمہ کے کلرک کی طرح دھکا اشارت تھا۔ کھائے پیے بغیر چلتا ہی نہیں تھا۔ بلال ہر بار اسے مرمت کے لیے شہر لے جاتے ہوئے نیا ٹائم

پیس خریدنے کا مشورہ دیتا۔ مگر ماما کفایت بھی ہر معاملے میں چکنا چڑھا ثابت ہوتے تھے۔

”نہیں ٹائم ٹھیک کروانا تھا۔“ انہوں نے ٹائم پیس بلال کے ہاتھ میں پھلایا جو نو بج رہا تھا۔

”ٹھیک تو ہے ماما پرانا ٹائم۔“ میں نے اپنی گھڑی آگے کی جس میں دس بجے تھے۔

”نہیں۔ میرا مطلب ہے نیا ٹائم لگاؤ۔“ ان کے انداز میں اس قدر شرمندگی تھی کہ جیسے کوئی لیڈر الیکشن ہار کر پانی بدل رہا ہو۔ ہم دونوں حیرت سے ان کا منہ ٹکٹے لگے۔

”کیا کروں کل کی گاڑی سے مجھے گوجرانوالہ جانا تھا۔ اسٹیشن پہنچا تو نئے ٹائم کے حساب سے نکل چکی تھی۔ ایک ہمارے ٹائم نہ بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ باقی سارا ملک تو نئے ٹائم کے حساب سے چل رہا ہے۔ بس مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“

ماما نے ٹائم پیس واپس پکڑا۔ ان کی بلاوجہ تنقید کرنے اور میں سچ نکلنے کی وجہ سے اکثر ان کی گاڑی چھوٹ جاتی تھی یا کوئی نہ کوئی کام اوھورا دیا جاتا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”کیا مسئلہ ہے؟ جلاؤ نا بلب۔“ میرے مٹن آف کرتے ہی بلال چارپائی پر کھڑے کھڑے چلایا۔

”مگر تم دن میں بلب جلا کر کیا کر رہے ہو؟“ میں نے اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ پچھلے ہفتے ہی اس نے نیا موبائل خریدا تھا اور وہ بھی کیمرہ والا۔ ہر وقت اسے ہاتھ میں لیے وہ بلا مقصد تصویریں اتار رہا تھا۔

”میں بلب کی تصویریں کھینچ رہا ہوں۔“ اس نے بلب کو کیمرے سے فوکس کیا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ ”لو ہو گئی چھٹی۔ تم نے بھی اسی وقت انٹری دینا تھی۔“ وہ چڑھ کر بولا۔

”مگر تم بلب کی تصویریں کیوں اتار رہے تھے؟“ میں باہر صحن میں چارپائی بچھا کر درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔

”اپنے بچوں کو تصویریں دکھایا کروں گا کہ بجلی کیسی

ہوتی تھی اور ہمارا بلب جلتا بھی تھا۔“ اس نے مجھے ہوئے بلب کو دیکھ کر پوچھی سے سر ہلایا۔

”اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آج کے اخبار میں لکھا تھا کہ 2009 تک لوڈ شیڈنگ پر قابو پایا جائے گا۔“ میں نے اپنی معلومات کا رعب جھلایا۔

”مگر خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوگا۔“ اس نے مصنوعی آدھری۔

”غور سے رہنا تھا وہ 2009 نہیں 9002 لکھا ہو گا۔“ اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹھٹھٹھیں۔

”یہ دیکھنا ذرا میرے ایم اے کے انگریزی ڈیٹ شیٹ آگئی ہے۔“ یاد آنے پر میں نے فائل میں سے پراؤن انفاقہ نکالا۔

”حکومتوں کی طرح یہ بھی آتی جاتی رہتی ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے میری دوبار آنے والی سپیلی پریچٹ کی تو میں جل کر کباب ہو گئی۔

”جی نہیں اس بار میری تیاری بہت اچھی ہے۔ تم دیکھنا اس بار میرا رزلٹ کتنا شاندار آئے گا۔“ میں نے بھی انتہائی امید واروں کی طرح اس بار کسی انقلاب کا دعویٰ کیا اور اندر سے فون اٹھا لائی۔ سب بار مامانے پر آخر کار یونیورسٹی آف مینسٹریشن آف سائنسز مل ہی گیا تھا۔

”ہیلو جی میں ماڈرن پبلک اسکول کی پرنسپل بول رہی ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف یوں کروایا جیسے میں کوئی مشہور یونیورسٹی کی پرنسپل ہوں۔ دوسری طرف کوئی خاصی غلٹ میں تھا۔

”جی مجھے یہ پوچھنا تھا کہ پیپر 20 تاریخ کو ہو رہے ہیں نا! گھبراہٹ میں میں یہ بھی بھول گئی کہ مجھے کیلیات کرنی تھی۔“

”ایم اے کے پیپر کے لیے پہلی اے کرنا پڑتا ہے۔“ میرے ہاتھ میں موجود ڈیٹ شیٹ کا جان کر میں نے جل کر جواب دیا۔

”جی لی اے میں نے چار سال پہلے کا کیا ہوا ہے۔“ میں نے دانت ڈیرین ہٹانے سے گریز کیا۔

”مجھے یہ پوچھنا تھا کہ اب پھر سے ٹائم چینیج ہونے

والا ہے۔ اگلے ہفتے گھڑیاں پیچھے کریں گے تو پیپر کا ٹائم نیا والا ہو گا۔ یا پرانا والا یا پھر اور پرانا والا میرا مطلب ہے مٹی والا؟“ ٹائم کے اس گھن چکر میں کنفیوز ہو کر میں اول فیل بے جا رہی تھی۔

”اگر آپ نے لی اے کیا تھا تو بہتر ہوتا کہ صحیح والا کرتیں۔“ انتہائی امید واروں والا نہیں۔

کسی نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ میرے عقب میں بلال کا گو بختا ہوا ققمہ میرے تن بدن میں آگ لگا گیا تھا۔

”کول ڈاؤن سسٹر! ہو جاتا ہے ایسا۔“ اس نے مجھے شوخی سے منہ چڑایا تو میں اس سے جیج ناراض ہو گئی تھی۔

”او نہ! پھر سے ٹائم چینیج ہو گا۔ پھر وہی روز کی بک بک۔“ میں اپنا غصہ اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے بھئی۔ ہر چیز کے فائدے اور نقصان دونوں ہی ہوتے ہیں۔ اب دیکھو نا ٹائم آگے کرنے کے بعد سے میں شام کو دیر سے بھی آتا ہوں تو لوڈ شیڈنگ کے باوجود تم مجھے پڑھنے بٹھا دیتی ہو۔“ اس نے میرا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔

”اور پھر جو چیز اپنے کنٹرول میں نہ ہو اس پر جلنے کڑھنے کا فائدہ۔“ اس کے پاؤ پوائنٹس دیکھنے کی کوشش کرو۔ فضول میں جی جلائے سے خود کا ہی نقصان ہوتا ہے۔“ کافی دیر کے بعد وہ میرا موڈ بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”ایک بات اور بھی ہے کہ ٹائم آگے پیچھے کرنے سے انرجی کی توجہ ہوتی یا نہیں مگر اچھے خالص لوگوں کا بچا کھچا داغ ضرور خراب ہو گیا ہے۔“ اس کے شرارتی انداز پر میں کچھ دیر تو اسے گھورتی رہی۔ پھر اس کے قہقہے میں میری ہنسی کی آواز بھی شامل ہو گئی۔



## دلچسپ کہانیاں

تاجہ نظر کی ہوئی سنہری گندم کے کھیت جن پر سورج چمکتا تھا۔

اکاؤ کا مٹی کے ہریا دل بھرے کھیت آتے تو نظروں کو ذرا سا سکون کا احساس ہوتا۔ طویل سڑک اگرچہ مٹی تھی۔ مگر ایسی باریک خاک سے بھری کہ گاڑی کے پیسے و ہنس جا میں گاڑی کے چلنے سے مٹی کے بال اڑتے اور ارد گرد کا سارا منظر ہند لاجاتا۔

ابھی اپریل کا وسط تھا۔

مگر گرمی ایسی کہ گاڑی کا اے سی بھی لگتا ملام کرنا چھوڑ چکا ہے۔ طویل بوریٹ بھرے سفر نے گویا سب

کو جسمانی ہی نہیں ذہنی طور پر بھی تھکا دیا۔

زین ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر اونگھ رہا تھا۔

جیند کچھ لمبی پیر سے ادھر ادھر ڈولتا رہا۔ پھر آرام سے

اس کے کندھے پر سر رکھ کر خراٹے لینے لگا۔ وہ

تھوڑی دیر اپنے کمزور کندھے پر یہ پوجہ سارے بیٹھی

رہی۔ پھر کندھا شل ہو گیا۔ سیاہ کھور آنکھیں بند

سے بو جھل ہونے لگیں۔ تو اس نے کسمسا

کسمسا کر اپنی مشکل کا اعلان کیا۔ تب پاس اوٹھتی

قدسیہ کی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے جیند کو پرے

دھکیل کر اسے گود میں سمویا۔ اس نے آنکھیں تو بند

مکمل ٹافل





کر لیں۔۔۔ مگر سفر میں نیند کہاں۔۔۔؟  
 ذہن میں گاڑی آگے کو اور منظر پیچھے کو بھاگ رہے  
 تھے۔

دماغ الگ چکرار ہاتھ۔  
 تب ہی مارن کا تیز آواز نے ان کو بڑبڑایا۔  
 اک تیل گاڑی اپنی سست رفتار سفر کے ساتھ ان کا  
 رستہ روک رہی تھی۔ ڈرائیور ہارن پر ہاتھ رکھ کر  
 بھول گیا۔ مگر نہ بیلوں کے کانوں پر جوں رہنسی نہ  
 تیل والے پر۔

مٹی خاک منہ میں جلنے لگی قدس نے ٹھیک ٹھاک ڈالنا۔ مگر وہ شیشہ تب چڑھانے پر آمادہ ہوئے جب قریب کے کسی کھیت سے ایک گنا نکلا۔ اور گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگنے اور بھونکنے لگا۔ شیروں کی قطار اک کھیت سے نکلی اور دوسرے میں جا چھپی۔

”ہا۔ ہا آجاؤ آجاؤ مانی کو کھالو مانی کو کٹ لو۔“ وہ دونوں ہندو شیشوں کے پیچھے شور مچانے اور منہ چڑانے لگے۔

۵۵ جو مندی مندی آنکھوں سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ ڈر کر قدیرہ کی گود میں گھس کر رو پڑے میں منہ چھپا لیا اور سے آنکھیں میچ نکلیں۔ ننھا سا دل کانپ کانپ گیا۔

وہ کہتے ہیں: کیا اس معصوم کی جان نکالے رکھتے ہو  
قدسیہ نے پاس اچھلتے چھپرے کی گدی پر ہاتھ رسید  
کیا تب ہی تیل والا مراقبہ سے باہر آیا۔ مگر —  
بے زاری سے گاڑی کو دیکھا پھر بیلوں کو بٹکار پچکار کر ایک  
طرف کھانسی کا زور سے آگے بڑھ گئی۔

طرف کیا تو کاری زن سے اسے بڑھ گئی۔  
 کھیتوں کے بعد باغات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔  
 نارنگی اور مالٹے کے اجڑے ہوئے باغ۔  
 آہر کے گھنرے رخت بہن پر پور آگیا تھا۔

چھوٹی گلدے پانیوں والی نہر عبور کر کے گاڑی پہاڑ  
جا کھڑی ہوئی جہاں گھنے، لمبے درختوں میں گھرا ہوا  
وسیع و عریض گھر تھا۔ جس کی پہلوی چار دیواری

بیابان کچن، جس کے ایک خانے میں ملی اپنے چار بچوں کے ساتھ استراحت فرما رہی تھی۔ انہوں نے تیزی سے خانہ بند کر دیا۔

”قدیسہ کی گھر کی پردہ فوراً دفع ہو گیا۔“  
 قدیسہ کی نظریاتی کی کمالی صورت پر پڑی۔  
 ”کبیر۔۔۔ او کبیر۔۔۔“ انہوں نے ڈر آہو کو پکارا جو  
 ان کا سامان لے کر آ رہا تھا۔

”مجھے۔۔۔ بے وید نے وہ صوٹ سن سے ہے  
چھوڑ سکے۔ جاؤ اپنے صاحب کو بلاؤ ہمیں کیا یہ سار  
پاسا سار نے کس لیے بلوایا ہے۔“ وہ گرجیں گئیں تیز  
سے صحن پار کر گئیں۔  
”بھئی! آج آج لگے۔“

اپنے صاحب کو موصوفہ و حاتہ کرے۔ آیا۔  
 ”آگے تم لوگ۔“ انہوں نے خوش دلی  
 کہتے ہوئے ہائی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ جو اب ”قدیرہ“  
 کہا جانے والی نظروں سے مجازی خدا کو کھورا۔  
 یہاں کا سا رکھنے لگے۔

ایک کھونٹ نہیں بچے پیاس سے مر رہے ہیں۔  
 تھی تو فریج چلوا لیا ہوا۔ کسی کو بلوا کر صفائی ہی  
 لینے آخر آپ یہاں کرتے کیا رہے ہیں؟  
 انہوں نے شپٹا کر پہلے اپنے روٹین کا جائزہ لیا  
 بکڑ کر لے۔

”میں کیا فارغ ہوتا ہوں۔ سو بکھیرے اور۔۔۔“  
 ”اب چوبچھے آ رہے ہیں گن کا کیا کروں؟“ وہ  
 تھملا کر گویا ہو گیا۔  
 انہوں نے سر جھپایا، غور کیا پھر فیصلہ کن لمحے میں  
 گویا ہو گئے۔

”ایسا کرو۔ یہ کو لراٹھا کر میرے سر پر دے مارو۔“  
”دے مارتی۔ اگر سر سے خون کی جگہ پانی کا فوارہ

کریم، پینہ، طویل سفر کی تھکن، گھریں۔۔۔  
نامساعد حالات۔۔۔ سب نے مل ملا کر آنسوؤں۔۔۔

کھانا خزانہ  
سچیو کپور، کانیا ایڈیشن

20 خوبصورت رنگین تصاویر  
نئے ایڈیشن میں - 25/- روپے کی خصوصی رعایت

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی۔

2008 21 95

عید الہی کا تحفہ

سنجیو کپور، کانیا ایڈیٹیشن

جس میں گوشت کے پکوانوں

کی 25 لذیذ ترکیبیں

20 خوبصورت رنگین تصاویر

یشن میں - 25 روپے کی خصوصی رعایت

225/- روپے ڈاک خرچ - 25 روپے

ی مضمی آؤریاؤرافٹ ارسال فرما کیں۔

منگوانے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار کراچی۔

فون 2216361

\_\_\_\_\_







بد معاش منٹ سے پہلے غائب ہو گئے۔ قدسیہ نے اشارے سے اسے پاس بلایا۔ وہ روتی ہوئی ان کے پاس آئی۔ تو قدسیہ نے پاس کھڑی فضا کو دھپ لگا کر ایک طرف کیا پھر سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔

”کبھی! یہ معصوم کا کیا بنایا ہے۔“

قدسیہ بھاگ کر چھوٹا آئینہ اٹھا لائی۔ جس کے عقب میں چینی لڑکی کی تصویر تھی۔ اپنی ہیئت کذالی دیکھ کر مابین بلک بلک کر روئی۔ اس کے پورے چہرے پر سیاہی سے لکیریں کھینچی تھیں۔ بالوں کی پونی عین ہاتھ کے اوپر تھی۔

”نہی۔ اونٹنوں! ادھر آؤ، مانی کامنہ دھلو آؤ۔“

ایسی مزے کی محفل چھوڑ کر آنے کو مانی کا دل نہ تھا۔ بادل ناخواستہ اٹھ کر آئی۔ مانی کا بازو پکڑ کر بھیجتی ہوئی نکلے تک آئی۔ صابن رگڑ رگڑ کر یوں منہ دھویا کہ سارا صابن آنکھوں میں چلا گیا۔ نہ جانے کیسی سیاہی تھی جو اترتی نہ تھی۔ وہ چھوڑ کر چلی گئی۔ مانی نے چند چھپا کے منہ پر مارے۔ سرخ آنکھیں رگڑتی قدسیہ کے پاس چلی آئی۔ اسے زین اور جین پر بہت غصہ تھا۔ مگر اپنی کمزوری اور بے بسی کا احساس زیادہ حاوی تھا۔ وہ جانتی تھی۔ وہ ان شیطانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

”ہا۔ ہا۔ یہ سینک تو اتار لو۔“ قدسیہ نے ہنستے ہوئے کہا تو مانی نے اسے غصے سے گھورا۔ ہم عمر ہونے کے باوجود دونوں کی آپس میں ہنسی نہ تھی۔ قدسیہ اس کے بال ٹھیک کرنے لگیں۔

سر منی شام کے ساتھ ’منی‘ کی انوکھی خوشبو میں چائے کی خوشگوار منک شامل ہو گئی۔ نازو آپا سب کو نیلی کنارے والی سفید پیالیوں میں چائے سرو کرنے لگیں۔ چائے جس میں کٹری کی ہلکی سی کڑواہٹ کے باوجود ذائقہ تھا۔

رات کے کھانے کے بعد اسفند بھائی کا بکس کھل گیا۔ انہوں نے ساری عمران سیریز بھاڑ پونچھ کر الماری میں سجائیں۔ دوسری طرف اپنی کورس کی کتابیں۔ سب سے اوپر انگریزی کی موبی سی ڈسکری

اور فیوز اللغات رکھی۔ اپنے بکس میں موجود اخبار جہاں اور انگریزی رسالوں سے اچھی اچھی تصویریں کٹ کر الماری کے پٹ سجائے گئے۔ قابل اعتراض تصویریں۔ پٹ کے اندر کی طرف لگا دیں۔ ”چھی۔ چھی۔ کتنے گندے ہیں آپ۔“ گورے نئے کندھوں والی انگریزی یونین کی تصویر دیکھ کر نازو آپا نے ناک چڑھائی تو انہوں نے جمل سے ہو کر پٹ بند کر دیے اور ایک انگریزی رسالہ نازو کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ تصویر کاٹو۔“

نازو نے ٹائٹل پر بنی تصویر کاٹی۔ گوند لگا کر انہیں تھادی۔ اسفند نے وہ تصویر سب سے اوپر لگا دی۔ مانی نے بے حد اشتیاق سے وہ تصویر دیکھی۔ جس میں اک سر سبز و شاداب سیب کا درخت تھا، اک کچا پکا سیب درخت سے گر کر یوں گھاس میں پڑا تھا گویا ابھی تصویر سے باہر لڑھک آئے گا۔ اک سفید ملی پاس کھڑی اپنی کالج سی آنکھوں سے کیمرے کو گھور رہی تھی۔ مانی کو لگا اگر اس نے سیب اٹھانے کی کوشش کی تو پی اسے کٹ لے گی۔

”اب بس کریں۔ اوٹ پٹانگ عورتوں کی تصویریں۔“

”جیس کیا پتا اس کی آنکھیں کتنی حرا نگیز ہیں۔ بالکل بالکل۔“ وہ ایک دم ہنس دے۔ نازو آپا ہنستے ذرا سا جھکیں۔

مانی کامنہ کھل گیا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتیں اسفند ہیا کر سی پر بیٹھ چکے تھے۔

”آ۔ آ۔“ نازو آپا ہنستے ہنستے ہنسی ہو گئیں۔ انہوں نے کرسی پر گوند پھیلا دی تھی۔

”نازو۔! اسفند کی دھاڑ پر نازو نے فوراً ”اٹن چھو ہو جانا چاہا۔ مگر اسفند نے بازو پھیلا کر اس کی پٹیا بچھائی۔

”ہائے اللہ!“ نازو آپا کے لبوں سے جی نکلی۔ وہ دہری ہو کر ان کے کندھے پر جھک آئیں۔ ”یہ کیا تھا؟“

”ہائے اللہ چھوڑیں، میری چوٹی چھوڑیں۔“ میری پینٹ کا ستیاناس کرو یا۔“ انہوں نے چٹیا کو ہاتھ پر لیٹ لیا۔

”میں دھو دوں گی۔“

”وہ تو دھونا پڑے گی۔ پر جرمانہ بھی دینا ہو گا۔“ ان کی نگاہوں میں شرارت جانی۔

”مجھے درد ہو رہا ہے۔“ نازو آپا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”اور جو درد مجھے دیا ہے وہ۔“ اسفند نے اپنے بے حد قریب ان بھلماتی آنکھوں کو دکھا اور آہستہ سے چٹیا چھوڑ دی۔ نازو آپا روتی ہوئی باہر بھاگ گئیں۔ مانی نے کچھ حیران ہو کر اسفند بھیا کو دیکھا۔ جو کم صم سے بیٹھے کھلے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔

\*\*\*

”اچھا بازو کاٹو لگتا تھا۔ داغ ہی الٹ گیا۔ گھر میں دل ہی نہ لگتا۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہنے لگے۔ اس چڑی کے بوٹ کو کون سنبھالے، چاچیاں مارے ہاتھ سنبھال رہی تھیں۔ اللہ پالنے والا۔ ایک دن کئی ہفتوں کے بعد جو گھر آئے۔ تو دونوں چاچیوں میں جنگ چھڑی تھی ایک دوسرے کو طعنے دینے میں مصروف۔ بھول گئیں کہ منی سی جان دودھ کے لیے بلک رہی ہے۔ اچھا زانے بیٹی کو دیکھا۔ سافٹی سوکھی، مرل سی، دھوپ میں پڑی۔ کھیاں اسے چاٹ رہی تھیں۔ یونی اٹھایا۔ ویٹن پکڑی۔ رات گئے بن کے گھر۔ پوچھا سنبھال لو گی؟“

قدسیہ نے کیچے سے لگا لیا۔ تب سے اب تک سنبھالے ہوئے ہے۔ باپ کا دل چاہا تو برسوں بعد بکھر لگا لیا۔ نہ چاہا تو مڑ کر نہ دیکھا۔

نہ آپا جھیل اس کی آمد کا قصہ سناتے چھٹی تھیں نہ وہ دونوں سنتے ہوئے، کھی کھی کر کے ہنستے۔ ایک دوسرے کو اشارے کرتے۔ وہ جڑبڑ ہو کر شرمندہ شرمندہ سی باہر نکل آئی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں بھرے شکموں کے ساتھ قیلولہ کر رہے

تھے۔ باہر سنان دوسرے پھیلی تھی۔ دوسری خاموشی اس کے اندر کی خاموشی سے ہم آہنگ ہونے لگی تو وہ اداس سی سیرجیوں پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل چاہتا وہ آپا جھیل کو گالیاں دے۔ وہ کیوں جیند اور زین کو اس کے قصے سناتی ہیں۔

”سکھ چین کی شاخوں میں ہلکی ہلکی سی ہلچل تھی۔“ مجھے بھی ان کے ساتھ نہیں بیٹھنا۔“ وہ اٹھی۔

اپنا بستہ، تختی، کتابیں سنبھال کر باہر آ گئی۔ درخت کی چھایا میں پٹ سن کی پوری پھیلی۔ اس پر اپنی ساری چیزیں رکھ دیں۔

”یہ مانی کا گھر ہے۔“ اس نے پتوں سے پوری کے گرد حد بندی کی۔

اس میں مانی۔ اپنی امی۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کی ماں اسے جنم دیتے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

”اس میں مانی اپنے ابو۔“ وہ دوبارہ رک گئی۔ باپ کے نام پر ایک شخص جو یاد آتا تھا۔ وہ ملے لباس، بڑھی شیو والا دیوانہ سا مرد تھا۔ سردیوں کی اک شام اچانک ہی آ گیا۔ قدسیہ اس کے گلے سے لگی روتی رہیں پھر کچھ کر مانی کو سامنے کیا۔

”اپنی بیٹی سے تاملو۔“

اس نیم دیوانے شخص کی لالچ آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے آہستہ سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ جلدی سے باہر بھاگ گئی۔

”بھیا! بتاؤ نا۔ کیا کھاؤ گے؟“ وہ اپنے منی کے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ جو آپا جھیل اس سے اسے بنا کر دیے تھے۔ جب پچھوا اصرار سے اس سے پوچھنے لگیں۔ وہ شخص ٹپ چپ سا رہنے جا رہا تھا۔ آپا جھیل کو ماؤ آیا۔

”اے اچھا پتر! اب بس کر۔ مرنے والی مر گئی۔“ اب تو اس کی روح کو بخش دے۔ ایسی بھی کیا محبت۔

اولاد کی طرف دیکھ کر بسا لوگ تو بیویوں کے قل پڑھ کر اگلی گھر لے آتے ہیں۔ تم ایک ہی پر پاگل ہو گئے۔“

”زردہ بناؤ۔ بہت سے میوے والا۔“ اس نے



بغیر نظر میں اٹھائے کہا۔

”کیا جیلاں بڑی باتی رہ گئیں۔۔۔ پچھو خوشی خوشی زورے کی تیراری میں لگ گئی۔

ہامی نے کھیلنے کھیلنے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اشارے سے ہامی کو پاس بلایا۔ کیا جیلاں بچے اغوا کرنے والے شخص کا جو جلیہ بتاتی تھیں۔ ہو سو وہی تھا۔ اس نے رخ ہی بدل لیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا ہے؟“

وہ ایک ٹھوڑا ہاتھ میں لے کر پوچھ رہا تھا۔ ”ٹھوڑا۔۔۔“ وہ آنکھوں میں جسم لیے آسکی سے بولی۔ وہ کچھ لمحے اس کی آنکھوں کا خوف دیکھتا رہا۔ پھر جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ اسے خوف زدگی سے دیکھتی سارے ٹھلوے جھولی میں بھر کر اندر بھاگ گئی۔

”لو بھیا!“ ست رنگے میوے سے بھرے زورے کی بھاپ اڑاتی پلیٹ سامنے آگئی۔ ”ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“

قدسیہ بچن میں جا کر کام بنانے لگیں۔ جب واپس آئیں تو ست رنگے زورے کی بھری ہوئی پلیٹ پر کھیاں بچھنا رہی تھیں۔ جانے والا چلا گیا تھا۔ ”اے شش۔“

اس نے چونک کر دیکھا وہ دونوں فرار ہونے والے تھے۔

”بلغ میں جا رہے ہیں۔ چلو گی۔“ زین سر رکھڑا پوچھ رہا تھا۔

”چھوڑو۔۔۔ اس کو۔۔۔“ جنید نے کچھ کہنا چاہا زین نے اس کا ہاتھ دبا کر دوبارہ پوچھا۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

”ان دونوں کے ہاتھ میں ریلٹ تھے۔“ پہلے بچن سے نمک اور مرچ ملا کر لاؤ۔ امیاں کھائیں گے۔“ زین نے لالچ دیا۔ وہ بچن کی طرف دوڑی۔

”دیکھو شور نہ کرنا۔“

اس نے ایک ایک کر تک اور مرچ کے ڈبے اتارے۔۔۔ اک کھنڈ کی پٹیا میں ملا کر پربا بند کرنا چاہی تو سارا نیچے گر گیا۔ اس نے جلدی جلدی دوبارہ مطلوبہ چیزیں لیں اور بارہ کی طرف بھاگی۔

”شباباش سنبھال کر رکھو۔“ آم کا ٹھنڈا ہوا تھا۔ سبزے تھمسا گھاس۔ بٹیوں بچ بستا ہوا ٹھنڈا ٹال۔ تو تے کٹر کٹر کیاں نیچے پھینک رہے تھے۔ رنگ برنگی چیزیاں گھاس پر پھدک رہی تھیں۔ کئی تھلیل اس کے آس پاس منزلانے لگیں۔ اسے لگا وہ جنت کے کسی گوشے میں آگئی ہے۔

”یہ تو وہی تصور والا بلغ ہے۔“ اس نے جوش سے بلی ڈھونڈنا چاہی تو نظروں کی گرفت میں وہ چیز آگئی۔ جو علی کا تعاقب کر رہی تھی۔

گھاس میں کتنی کیریاں تھیں۔ اس نے سب بچن کر جھولی بھرنا شروع کیں مگر جنید نے ڈانٹ دیا اور خود ہمدردی طرح درخت پر چڑھ کر دیکھ مارا کیریاں توڑنے لگا۔ زین نے اک اخبار کھینچا۔ حیب سے چاقو نکالا فافست سے کیریاں کاٹنے لگا۔

”تم کیری کھاؤ۔ میں جھکے کھاؤں گا۔“ ”نہیں نہیں۔ میں جھکے کھاؤں گی۔“ ہامی نے نمک لگا لگا سارے جھکے کھا لیے۔

وہ دونوں بیڈ مستحق کھنے لگے۔ ہامی ٹالے کے پاس بیٹھی پانی میں بٹے تے گنتی رہی۔ یا پھر تھلیل ڈھونڈنے لگیں۔ عشق عشق اور آسودگی تھی۔ اس کی پلکیں جڑنے لگیں۔ دونوں پسینے میں شرابور چلے آئے۔

”اچھا لگا؟“ زین نے پوچھا تو ہامی نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلادیا۔

”دوسری طرف گلابوں کے کھیت ہیں۔ تمہیں دکھانے کے لیے آئیں گے۔ مگر ایک شرط ہے۔“ گلابوں کے کھیت دیکھنے کے لیے وہ ہر شرط ماننے کو تیار تھی۔ ”میرے نمائندے کے لیے پانی تم بھرا کر دو۔“

ہامی خوشی خوشی مان گئی۔ تینوں خوب مزے کر کے گھر لوٹے مگر رات کے میں اسفند نے دھرایا۔ ان دونوں کی جوتے سے تواضع کرنے کے بعد ہامی کا بازو پکڑا جو متوحش نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”تم کیوں ساتھ گئی تھیں؟ وہ تو ڈفر ہیں، تمہیں کہیں راستے میں ہی بھول آتے تو بھری وہ میں جن نکل آتے ہیں یہ بڑے بڑے۔ تم جیسی لڑکیوں کو کچا کھا جاتے ہیں۔ یا جالو سے درخت بنا دیتے ہیں۔“

انہوں نے ہامی کو خوب ڈرایا۔ اور جب وہ اچھی طرح ڈر گئی تو بازو چھوڑتے ہوئے بے نیازی سے بولے۔

”سب سو رہے ہیں۔ چپکے سے اپنی نازو آپنی کو اٹھا کر کو اسفند بھائی یاد آتم کا شربت مانگ رہے ہیں۔“

ہامی نے بچی نگاہوں سے مرغابے زین اور جنید کو دیکھا۔

”بھاگ جاؤ ورنہ تمہیں بھی مرغاباؤں لگا۔“ وہ سر پٹ بھاگی۔ نازو آپنی ایک بازو سر کے نیچے رکھے سیدھی لپٹی تھیں۔ ان کے ساتھ عانیہ ٹھو

غواب تھی۔ ”تنبلی!“

”ارے! اتم سو نہیں نہیں۔“ انہوں نے آنکھیں کھولیں اور حیران ہو کر پوچھا۔

ہامی نے اسفند کا پیغام دیا۔

”ہو نہ۔“ نازو نے کروٹ بدل لی۔ ان سے کہہ دو میں سوری ہوں۔“

”نازو آپنی! کہتی ہیں میں سوری ہوں۔“ ہامی نے جوں کا توں کہہ دیا۔

”اوہو ایسے تجھے۔ دیکھ لوں گا میں بھی۔“ انہوں نے نخت سے کہا مگر ہاتھ پر نظر کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ ہامی جا کر قدسیہ کے ساتھ لیٹ گئی۔ کچھ دیر قدسیہ کے بلکے بلکے خراٹے سننے کے بعد اسے بھی نیند نے گھیر لیا۔ دو گھنٹے کی نیند میں زین اور جنید ککڑوں کوں ککڑوں ہی کرتے رہے۔

”اوہ تمہیں گلاب کے کھیت دکھا لاؤں۔“ اگلی

دوپہر جب وہ پوری پر بیٹھی سختی لکھ رہی تھی تب زین نے آکر کہا۔ اس کا اسکول میں ایڈیشن ہو گیا تھا۔ روز صبح اسفند اسے تھنہ اور عطیہ کو بائیک پر لا کر اسکول چھوڑنے جاتے۔ وہ تینوں پورا راستہ ان سے عالمگیر اور شہسکی کے گانے سن کر محفوظ ہوتیں۔ پھر وہ اونچا لہجہ لگاتے۔

”ہمارو گواہ رہنا۔“ دو دلوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسم کھائی ہے

مسور سے اسفند بھیا کی آواز ہامی کو بہت پسند تھی۔ دوپہر میں وہ درخت کے نیچے پوری بچھا کر اپنا اسکول کا کام کر لی یا درخت میں چھپی چیزیاں تلاش کی۔ قدسیہ گھر گئیں ڈانٹیں۔ دوپہر میں ٹھوڑا سونے کی تاکید کرتیں۔ مگر اسے نیند آتی ہی نہ تھی۔

”مجھے نہیں جانا۔“ اس نے قلم سیاہی میں ڈبویا۔ اور روتے کی شکل بنانے لگی۔ ابھی کل تو اسفند بھیا نے اتنا ڈانٹا تھا۔

”اچھا۔ پانی کی بائیں ہی بھر دو میں نہالوں۔“ ”نلکا گرم ہے۔“

”اچھی بسن نہیں ہو۔“ اس نے پھر سے نفی میں گردن ہلائی تو خفا ہو کر چلا گیا۔

خیازہ شام کو بھگتنا پڑا۔ جب وہ اپنے منھے منے ہاتھوں سے نلکا چلا کر اپنے

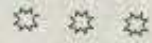
نہانے کے لیے پانی بھر رہی تھی تو وہ بھاگتا ہوا آیا۔ تھی پھر مٹی اندر جھونک گیا۔ وہ روپاسی ہو کر پانی کو دیکھنے لگی۔ اس کی جگہ فضا ہوئی تو جیج جیج کر آسمان سر پر اٹھائی۔ مگر ہامی نے آسو ضبط کرتے ہوئے پانی گرایا اور دوبارہ بھرنے لگی۔ نلکا اس کے قد سے کہیں اونچا تھا۔ بہت دقتوں سے پانی نکلتا۔ بائیں آدھی ہوئی تو وہ بوتل کے جن کی طرح ظاہر ہوا۔ سیاہی کی پوری دولت بائیں میں خالی کر گیا۔

وہ ششدر رہی رہ گئی۔ اس نے دھندلائی آنکھوں سے کالے ہوئے پانی کو دیکھا۔ پھر اپنی چھولی چھولی سرخ پتیلیوں کو آنسو



ٹپ۔ ٹپ ہتھیلیوں پر گرنے لگے۔  
زین جو فاقہ خانہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم ہونٹوں سا ہو گیا۔ اس نے ہانسی کے خاموش چہرے پر پتے آنسوؤں کو دیکھا پھر ہاتھوں کو۔ وہ بہت بار روٹی کھئی۔ اس کے رونے کا ان پر بھی اثر نہ ہوا۔ وہ خاموشی سے روٹی شور نہ مچاتی۔ اسے تنگ کرنا بے حد آسان تھا۔

مگر آج نہ جانے کیا ہوا؟  
وہ مڑا۔۔۔ سارا پانی گرا کر پانی دویارہ بھر دی۔ اور خاموشی سے چلا گیا۔ آنسو ہانسی کے گالوں پر جم گئے۔ وہ حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔



”کون ہے؟“ زین نے ٹیٹ کر پوچھا۔ وہ جو جالی سے ناک ٹکائے اندر بھاٹک رہی تھی بدک کر پیچھے ہٹی۔

”اندر آؤ۔“ اس کے تھکمانہ لہجے پر وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ ان دونوں اس نے نیا نیا دھپہ اوڑھنا شروع کیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ زین نے خود ہی سوال اور خود ہی جواب دیا۔ ہانسی نے آنکھوں سے نفی میں گردن ہلا دی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ جانتا تھا وہ اب پورے گھر میں لور پھرے گی۔ اس کی اجازت یا کر وہ سائیڈ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ زین دویارہ سے انگلیوں کے ٹیٹ پیپر میں م ہو گیا۔ ہانسی نے مرعوب ہو کر موٹے نازے ٹیٹ پیپر کو دیکھا اور سوچا۔

”زین بھیا کتنی مولی مولی کتابیں پڑھتے ہیں۔ بالکل اسفند بھیا جی۔“

اس نے لائٹ نہیں جلائی تھی۔ کھلی کھڑکی سے آتی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ بڑھ کیا رہا تھا گو نگہ رہا تھا۔ ”تمہیں انگریزی پڑھنا آتی ہے؟“ زین نے جھانکی روکتے ہوئے پوچھا۔

ہانسی نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے ٹیٹ پیپر سامنے رکھ کر ایک لفظ برا لنگی رکھی۔ ہانسی نے ذرا جھک کر اسپیلنگ کرنے کی کوشش کی۔

”A - C - h“ لفظ اتنا بڑا اور مشکل تھا کہ نظروں کے سامنے اسپیلنگ بھی دھندلا گئی۔ اس نے شرمندہ سی ہو کر گردن جھکا لی۔

”ڈفر۔“ وہ ناک چڑھا کر لولا اور کرسی آگے پیچھے جھلاتے ہوئے سہمی یاد کرنے لگا۔ ہانسی نے جیکے چیلے کرسی جھلانے والی حرکت کو دیکھا۔ اور خود ہی وہی کوشش کی، وہ خود چھوٹی سی تھی اور کرسی بڑی۔

تیسری کوشش میں کرسی الٹی۔ سر زمین پر لگا، ٹانگیں اوپر سے مڑ کر قلابازی کھا گئیں۔

اس کے حلق سے جھج جھج نہ لگی۔

”اؤئے! ابھی تو اوڑھ لیتی تھی۔“ ہانسی کے زمین و آسمان لالے تھے اور وہ تھا کہ اٹھانے کے بجائے حلق بھاڑ بھاڑ کر ہٹنے لگا۔ ہانسی خود ہی کرسی سے الجھتی، سبھلتی اٹھی، چکراتے سر کو سنبھالتے ہوئے باہر نکلی۔ زین آواز ہی دتا نہ کیا۔

ہانسی جو پچھلے دنوں زین کے اچھے دوست کی وجہ سے خاصی خوش گماں تھی، کمرے میں جا کر خوب روٹی بات بیٹھیں ختم نہ ہوئی، اس نے مزے لے لے کر سب کو تیار اور بہت دن تک چھیڑ تاریا۔

”ہانسی! آؤ تمہیں کرسی جھلانا سکھاؤں۔“ وہ منہ چھپا لیتی یا وہاں سے بھاگ جاتی۔



سیاہ بادل آندھی کے ساتھ دیوانہ وار بھاگے چلے آئے۔ آج واحد میں آسمان سیاہ پڑ گیا۔

”ابا! بارش۔“

بچوں کے الفاظ اور زمین کی دوڑ درمیان میں رہ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مولی مولی بوندیں گریں اور موسلا دھار بارش میں ڈھل گئیں۔ انگلی پر دھلے کپڑے پونسی پڑے رہ گئے۔ سکھ چھین کے پیلے پڑتے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر صحن میں برسنے لگے۔ بچوں نے نمو

مستانہ بلند کیا۔ اور صحن میں کود گئے۔  
نفسیہ کی ڈانٹ قدسیہ کی پکار۔ کچھ کام نہ آیا۔  
”رہنے دو مگر میوں کی بارش ہے۔“  
وہ دونوں بچن میں چلی گئیں۔

زمین تو بھیک ہی گئی تھی۔ اسفند بھیا نازو آبی کو بھی سمجھنے لائے۔ سب مٹی کے صحن میں موسلا دھار بارش کے نیچے دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔

”گانا سنائیں۔ اسفند بھیا گانا۔“  
بچوں کے شور پر وہ دونوں بانڈ بھیا کر شروع ہو گئے۔

یہ بھیا بھیا کا موسم یہ بھیا سال۔  
یہ بارش چلی ہے جان جہاں۔

نازو آبی کے چہرے پر رنگ بارش کے ساتھ بنے لگے۔ نمو آبی کی گئی بار بار انہیں پھور رہی تھی۔  
”اب نازو کی باری۔“ وہ گھوم کر نازو کے سامنے آئے۔ وہ سٹائٹ گئیں۔

”پیچھے تو ہمیں۔“ زین اور جنید نے انہیں پیچھے تھکیٹ کیا۔  
نمو نے ٹانگیں پیٹ کر گانا شروع کیا نازو آبی بھی اس کا ساتھ دینے لگیں۔

چھارے ہیں بادلوں کے سائے  
رنگ آنکھوں میں آسمانے  
دیکھ کے یہ آسمان سوچتی ہوں میں یہاں  
تم ہو کہاں میں کہاں

بادل زور سے گرے۔ سب کی ایک ساتھ چیخیں نکل گئیں۔ ہانسی بھاگ کر نمو کی گود میں چھپی۔ علیحدہ کو اسفند نے اٹھالیا۔ فضہ تو ڈرتی ہی نہ تھی۔

بچن میں پوٹوں کے لیے آٹا کھوٹی نفسیہ یہ شور کن کر رہی تھیں تو سر پیٹ کر رہ گئیں۔

”نانہ۔“  
ان کی قفل کرتی ہنسی بارش کا حصہ بن گئی۔  
دونوں آگے پیچھے بھاگتی ہوئی برآمدے تک آئیں۔  
نفسیہ نے نازو کا بازو دوچا۔

”بے شرموں۔۔۔ بے غیروں۔۔۔! باپ آجائے تو

کیا سوچے۔۔۔ بے حیا جوان جہاں لڑکے کے سامنے لگے گا رہی ہو۔“  
”جوان جہاں۔“ نمو نے مڑ کر حیرت سے دیکھا۔  
سب سے نگاہ پھسل کر اسفند پر رکی۔ گھٹنوں تک پینٹ چڑھائے بنیان پہنے۔ لبقا مضبوط جسم اس پر وحید مراد اسٹائل۔

”ارے۔۔۔ وہ تو اسفند بھیا ہیں۔“  
جولیا! ایک ہی دھب نے اسے بچن میں دھکیل دیا۔ نازو آبی کپڑے بدلتے کمرے میں گھس گئیں۔  
اب اسفند بھیا کا دل کیا لگتا۔ انہوں نے باہر کاٹ لیا۔  
انہیں بارش میں مڑکوں پر چلنے پر گونچا اونچا لگائے کا شوق تھا۔

تھالی درختوں سے پھسلتی بارش، لمبی سڑک۔  
اک خوب صورت گانا۔  
”آہ! زندگی یہی ہے۔“  
نفسیہ نے باقی لڑکیوں کو بھی بلالیا۔

”ہانسی! آؤ! لیوں توڑنے چلیں۔“ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ وہ تو تھی ہی صدا کی بو گئی بمبھٹ ان کی باتوں میں آجاتی۔  
”اسکے جبین بنا کر بچیں گے۔ بارش میں مڑا آئے گا۔“

وہ آگے پیچھے بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔ ان کے کپڑے کچھ دیر کت پت ہو چکے تھے۔ ہانسی کے پیروں میں چپل ہی نہ تھی۔ لیوں کی ترش مکھ آموں کی خوشبو سے گلے ملنے لگی۔ لیوں کے چار پانچ پودے جھنڈ کی شکل میں تھے۔ اور لیوں لدے ہوئے اتنے بڑے بڑے۔ جنید نے اپنی شرٹ اتار کر لیوں اس میں اکٹھے کیے۔

”وہ اندر ہیں جو موٹے موٹے رہے ہوئے لیوں۔“  
زین نے ذرا جھک کر شاخوں کے نیچے اشارہ کیا۔  
شاخیں پیچی اور گھنی تھیں۔ زین یا جنید اندر نہ جاسکتے تھے۔

”میں لے آتی ہوں۔“ ہانسی نے جھٹ کہا۔ وہ دونوں جانتے تھے اندر شد کی کھیلوں کا چھتر ہے۔



وہ معصوم بے خبر ہے۔  
 ”ہاں۔۔۔ ہاں اسی لیے تو تمہیں لائے ہیں۔“  
 دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر رہے۔ بارش ذرا ختم کر چھوڑ کر  
 شکل میں برس رہی تھی اور وہ تینوں کچھڑیں لت پت  
 بھوت بنے کھڑے تھے۔ وہ جھک کر احتیاط سے اندر  
 آئی۔۔۔ چھوٹے چھوٹے کانٹے ہاتھوں اور بازو پر  
 خراشیں ڈال گئے۔۔۔ مای نے وہ ککے ککے کیوں  
 توڑنے شروع کیے۔۔۔ تب ہی ہاتھ لگایا گیا ہوا کھیاں  
 ایک دم پل پڑیں۔

مای کی چیخوں نے آسمان ہلا دیا۔ وہ اندھوں کی طرح  
 باہر بھاگی۔

وہ جو دیوانوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ ایک دم  
 بوکھا گئے۔ اتنی لمبیوں کا تو سوچا بھی نہ تھا۔ دونوں  
 نے اس کے ساتھ چیخنا شروع کر دیا پھر زین نے ایک  
 جینے مای کا دوسرا بازو دبوچا اور کھر کی طرف دوڑ لگا  
 دی۔

کھیاں ان کے تعاقب میں تھیں۔  
 ان کی چیخوں پر گھروالے بھی بھاگ آئے۔ کن  
 جتنوں سے انہیں پچایا۔۔۔ لمبیوں نے کانٹوں دونوں  
 کو بھی نگر جو چھترول ہوئی وہ الگ مای تو سوج کر کیا ہو  
 گئی، ٹاک، آنکھ سب برابر تین دن نیم بے ہوشی کی  
 حالت رہی۔ پل ہلا کر بخار جو چھاتو سارے کھر کو ہلا کر  
 رکھ دیا۔ قدسیہ اس کے سرہانے بیٹھی روئی جاتیں۔  
 ”ہائے میں اپنے بھائی کو کیا جواب دوں گی اس کی  
 امانت نہ سنبھال سکی۔“

وہ دونوں چوروں کی طرح چپے پھرتے، ندامت  
 بے حد گہری تھی مای کو تکلیف میں دیکھتے تو خود بھی دکھی  
 ہوتے، فائدہ یہ ہوا کہ اس حادثے کے بعد دونوں نے  
 مای کو تنگ کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ بلکہ کسی حد تک اس کا  
 خیال رکھنے لگے۔

یونہی تین سال کا عرصہ گزر گیا۔

ماہین ساتویں گلاس میں تھی۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔

دسمبر کی اک تاریک رات، جب ماہین نے اس

فحص کو دوبارہ دیکھا۔  
 جسے لوگ اس کا باپ کہتے تھے۔

\*\*\*

وہ دسمبر کی اک تاریک شب تھی۔ باہر مائل  
 بے حد خاموشی سے نرم چھوڑ کی صورت پرستے جاتے۔  
 ہوا سردی کی شدت میں اضافہ کر رہی تھی۔ بلب  
 کی زرد روشنی میں بوندوں کا رقص کیسا دل بھاتا۔  
 اس کا دل چاہتا۔۔۔ وہ کھلے آسمان تلے جا کھڑی ہو۔  
 ”اؤ۔۔۔ اوائی سردی ہے نازو کھر کی تو بند کرو۔“

نازو آپنی نے بے دلی سے کھر کی بند کی اور ان سب  
 کے درمیان آ بیٹھیں۔۔۔ جو درمی پر لحاف اوڑھے  
 مونگ پھلی کھا رہے تھے۔ نیوی برٹائٹ رائڈر چلنے  
 لگی۔ سب اپنی اپنی جگہ الرٹ ہو کر بیٹھ گئے۔ کیا بچے  
 کیا بڑے سب ہی کی فیورٹ فلم تھی۔ حتیٰ کہ خواتین  
 بھی جواب تک اپنی ہی باتوں میں مگن تھیں اسکرین کی  
 طرف متوجہ ہو گئیں۔

اسفند ذرا سا جھکے۔ اپنے حصے کی مونگ پھلی میں  
 سے مٹھی بھر کر نازو آپنی کی گود میں ڈال دی۔ انہوں نے  
 چونک کر سر اٹھایا پھر سر جھکا کر مسکرانے لگی انگلیٹھی  
 میں چلتے انگاروں کی حدت نازو کے چہرے پر رقصاں  
 تھی اور اس حدت میں ان کے چہرے کی مدھم مسکان  
 کیسی بھلی لگتی تھی۔ وہ بہت دیر تک نظریں نہ ہٹا سکے۔

فلم ختم ہونے تک اکرم اور ناصر صاحب بھی آگئے۔

”بھئی۔ چائے پلاؤ۔۔۔ بہت سردی ہے۔“

”نازو اس بی کے لیے بناؤ۔“

باہر اندھیرا، بارش اور پگن برآمدے میں نازو نے  
 زمین کا کندھا ہلایا۔ وہ وہیں درمی پر کھٹے سکوڑے سو  
 گئی تھی۔

”اب کیا کروں امی!“ سب جانتے تھے،

اندھیرے سے ڈرتی ہیں۔

”افو! ایک تو تم ڈر پوک بہت ہو۔“ اسفند نے

جھنجھلا کر ہاتھ میں پکڑی عمران سیر، ایک طرف پٹی اور  
 کھڑے ہو گئے۔ ”ایک کپ چائے پینے کے لیے  
 ٹھنڈے فٹیں کرنی پڑیں گی۔ چلو۔“ دونوں آگے پیچھے  
 کمرے سے نکل گئے برآمدے میں اسفند نے ان کی  
 کلائی تھام کر روکا۔

”نازو! بارش اور رات کا میل کیسا خوب صورت  
 لگتا ہے۔“

نازو نے رات کے سینے پر رقصاں بارش کی بوندوں  
 کو دیکھا۔

”میں رات ہوں۔۔۔ مجھ پر برس جاؤ۔“ وہ ذرا سا  
 جھکے۔ اپنی عجیب سی خواہش کا اظہار کیا۔ نازو کا چہرہ  
 سرخ ہو گیا۔ انہوں نے کلائی چھڑائی اور پگن میں  
 گھس گھس۔۔۔ لچ کی آواز کے ساتھ پگن میں روشنی  
 پھیل گئی۔

”افو! گندے برتن۔۔۔ کھانے کے بعد دھو نہیں  
 سکتیں۔“ وہ اپنے جذبے کی بے اختیاری پر پردے  
 ڈالنے لگے۔

”آپ اندر چلیں اسفند بھیا! میں چائے بنا لاتی  
 ہوں۔“ نازو کی پلکیں جھل جھل ہوئی اور آواز مدھم تھی۔  
 ”جو تمہیں ڈر لگا۔ پھر۔“

”نہیں ڈروں گی۔“

اسفند نے فریج کھول کر سارے انڈے نکال لیے  
 ۔۔۔ وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔

”سردی بہت ہے۔ انڈے بھی ابل لو۔“

چائے اور انڈے لے کر اندر گئے تو زین اور جیند  
 تھمک لے رہے تھے۔ انڈے دیکھ کر جوتنے ہو گئے۔  
 اسفند انگلیٹھی کے پاس بیٹھ کر انڈے پھیلنے لگے۔

مای تو ایک ہی آواز پر اٹھ بیٹھی۔ ابلا ہوا انڈا اس کا  
 فیورٹ تھا۔ فضا نے انڈا مٹھی میں دبوچا اور دوبارہ  
 سو گئی۔ نازو نے اپنے حصے کا انڈا اسی اسفند کے سامنے  
 رکھ دیا۔

”بدل۔“ انہوں نے چمکتی آنکھوں سے نازو کو

دیکھا۔

”میں انڈا نہیں کھاتی۔“

وہ کیتلی سے چائے نیلی کناری والی پیالیہ میں  
 ڈالنے لگیں۔۔۔ تب ہی بیرونی دروازہ زور زور سے دھڑ  
 دھڑایا گیا۔ اکرم صاحب نے اسفند کو اشارہ کیا۔ وہ  
 کچھ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے جس وقت مای سوئی ہوئی  
 فضا کی مٹھی سے انڈا نکالنے کی کوشش کر رہی تھی  
 ۔۔۔ اسفند کے ساتھ وہ اندر چلا آیا۔۔۔ مای نے  
 دروازے میں اہستہ دھبے پٹے، لیے شخص کو دیکھا  
 جس کے گلے سے لگی قدسیہ زار زار رو رہی تھیں۔  
 مای نے اسے پہچان لیا۔۔۔ لوگ اسے مایین کا باپ  
 کہتے تھے۔

”اب آئے ہو ۴۰ سنے برسوں کے بعد۔ بہن کے  
 لیے نہ سہی مٹی کے لیے ہی چکر لگاتے۔“ مٹی کے ذکر  
 پر اس نے نظریں گھما کر سب کو دیکھا۔ پھر اس کی  
 نگاہیں مای پر جم گئیں۔ وہ جو انڈا بھول کر لحاف میں  
 گھسے کے چکر میں بھی ٹھنک گئی۔

”باپ سے تلو۔“ نفسہ نے اسے کھینچ کر سامنے  
 کیا۔ انہوں نے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا  
 اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔

”بس۔۔۔ سب کی نگاہوں میں استعجاب اتر آیا۔  
 مای جان چھوٹنے کے انداز میں دوبارہ لحاف میں گھس  
 گئی۔

”کھانا لگاؤ۔“ اکرم صاحب نے کہا۔

”نہیں کھا کر آیا ہوں۔“ انہوں نے لب بھینچ کر  
 کہا پھر کیتلی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”صرف چائے  
 لوں گا۔“

”سارے کے سارے بھیک گئے ہو۔ کپڑے بدل  
 لو۔“

کپڑے بدل کر وہ انگلیٹھی کے پاس بیٹھ گئے۔ ہاتھ  
 پھیلا کر آگ تاتے ہوئے انہوں نے دیکھا، مای  
 علیحدہ کے ساتھ لیٹی تھی۔ اس کا ایک بازو علیحدہ کے  
 وجود کے گرد تھا اور آنکھ کنارے نیند اتر گئی تھی، بالکل  
 زور سے گرجے وہ سمٹ کر علیحدہ کے مزید قریب ہوئی  
 اور لحاف سر تک تن لیا۔ وہ طویل سانس لے کر اس  
 نرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ جس میں ابلے ہوئے



انڈے، مونگ پھلی کے دانے، مگر گرم مین کے  
ملوے کے ساتھ بڑا سا دھڑکی کاگ رکھا تھا۔

”کہاں رہے میاں! سنا تھا ہر چلے گئے ہو۔“  
ناصر صاحب نے ٹی وی آف کرتے ہوئے پوچھا۔  
”ہوں۔ ایک سال بعد واپس آ گیا تھا۔“ وہ مین  
کا جلوہ و غربت سے کھارہے تھے۔

مختصر سے سوال جواب کے بعد جب سب لوگ  
اپنے کمروں میں چلے گئے۔ نرے خالی ہوئی اور  
کمرے میں بس دونوں بہن بھائی رہ گئے۔ تب  
انگلیشی میں جھجھکتے کوئلوں اور برقی راگ پر نظریں  
جساتے ہوئے اعجاز نے آہستگی سے بتایا۔

”میں نے شادی کر لی ہے۔“  
قدسیہ بس بھائی کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ یہ شکوہ  
بھی نہ کر سکیں کہ شادی کر لی اور بہن کو جبر بھی نہ دی  
بس پٹکیں نم ہو گئیں۔ عورت کو میکے کا کیسا مان ہوتا  
ہے۔ ہاں باب ختم ہو گئے۔ بھائی در بدر پھرتا ان کا تو  
میکہ ہی تھا ہو گیا تھا۔  
”کب؟“ قدسیہ نے محسوس اپنے اندر مارے ہوئے  
پوچھا۔

”سال۔ ڈیڑھ سال ہو گیا۔“  
شکوہ یوں پرچل چل گیا۔ مگر لب خاموش رہے  
جب احساس ہی مر جائے تو شکوے شکایتوں کی کیا  
حیثیت۔

”اچھا۔ اللہ مبارک کرے۔ بیوی کیسی ہے؟“  
”بس عورت ہے۔“

قدسیہ جڑ جڑی ہو گئیں۔ یہ کیسا جواب تھا۔  
تھوڑی دیر خاموشی سی چھا گئی۔ جس میں بارش کی ٹپ  
ٹپ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اعجاز نے سر اٹھا کر بہن کو  
دیکھا اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”میں ماہین کو لینے آیا ہوں۔“  
”ماہین؟“ قدسیہ کو لگا ان کا سانس بند ہو گیا ہے۔



رودو کر قدسیہ نے اپنی حالت خراب کر لی۔ سب

سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ اعجاز شرمندہ شرمندہ گردن  
جھکائے بیٹھے رہے۔ مگر اپنے متوقف سے ایک انچ نہ  
ہٹے سب نے سمجھا لیا۔ ”وہ یہاں سیٹ ہے خوش  
ہے۔ اللہ تمہیں اور اولاد دے گا۔ یہ وہ۔“

لیکن انہوں نے چپ ہی سا دھلی۔  
”کیوں بلکان ہوتی ہو۔ اس کی بیٹی ہے ہم جبر  
نہیں کر سکتے۔“ ناصر صاحب نے سمجھا لیا۔

”اٹی سی تھی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر پلا۔  
اولاد سے زیادہ اس کا خیال رکھا۔ اب بھی مجھ سے پٹ  
کر سوتی ہے۔ کوئی حق نہیں اس کا۔ میں نے پالا ہے  
پھوپھی میں مل بن کر۔“

”پھوپھا نہ رو میں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“ ملانی  
نے ان کے آنسو صاف کیے تو وہ اسے سینے میں بھجھ کر  
پھپھک پھپھک کر روئیں۔ سب ہی آبدیدہ ہو  
گئے۔

”شام تک اس کا سامان سیٹ وٹا۔ مجھے جانا ہے۔“

اعجاز نظریں جڑا کر ہر نکل گئے۔ پیچھے صرف ان کا  
داؤلدارہ گیا۔

”اس طرح رونے کا فائدہ ایک کام رو سیٹ کر بھی  
کرنا ہے اور خوشی خوشی بھی۔ کیوں بیٹی کو پریشان  
رہی ہو۔“ تنگ آ کر ناصر صاحب نے ڈانٹ دیا پھر ان  
کا چہرہ دیکھا تو قدسیہ نے نرم لہجے میں بولے۔

”اس کا بیاہ بھی تو کرنا تھا۔ یوں سمجھو۔ آج تم بیٹی  
رخصت کر رہی ہو۔“

قدسیہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ شوہر کو دیکھا۔ نظر  
پیچھے کھڑے زمین پر ٹھہری۔ لگا ہوں میں اک چمک سی  
ابھری۔

”ہاں۔ بیٹی کو رخصت تو کرنا ہی ہے۔ مگر بیٹی اس کی  
ہے۔ اس لیے رخصت بھی وہی کرے گا۔“

”مطلب؟“ ناصر صاحب نے الجھ کر بیوی کو دیکھا۔  
”وہ میرے زمین کی دہن بنے گی۔“

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں؟“ بھی بی بیات اس کے  
کلن میں ڈال دیتے ہیں۔ دونوں کی تعلیم مکمل ہو



جائے تو۔۔۔ انہوں نے خوش دلی سے اجازت دی کہ مایہن کے بارے میں بیوی کے جذبات اچھی طرح جانتے تھے۔ قدسیہ نے اتنی توجہ زین اور علیہ کو نہ دی تھی جتنی مایہن کو۔ اسفند تو خیر یوں بھی برا ہو چکا تھا۔

”تب میں ابھی۔۔۔“ انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں مایہن کو اسی صورت جانے دلی کی۔ جب اعجاز مایہن کا نکاح زین سے کرے گا۔“

سب ایک دم چپ ہو گئے پھر سب کے سب ایک بولی بولنے لگے۔ اعجاز کی سیلابی طبیعت کو سب ہی جانتے تھے۔ اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ مایہن کی زندگی بھی رول دیتا۔ کم از کم اس طرح مایہن کا مستقبل تو محفوظ ہو ہی سکتا تھا اور مایہن سب ہی کو پیاری تھی۔

آنا فانا! ناز اور نمونے اسے چھپلی عید والا جوڑا پہنایا۔ سہن چوڑی دار باستجاہ اور کرنا۔۔۔ دوپٹے پر شہری کرن لٹکی تھی۔ ویسا ہی تلے والا کھس۔۔۔

چھوٹی سی دلہن۔۔۔ لبا تو نگا دو لہا۔۔۔ جس کی سس ابھی جھپک رہی تھیں۔

اپنی بابا کار میں زین کے احساسات کوئی نہ جان سکا۔ جو نکاح کے بعد یوں فرار ہوا کہ رات گئے تک نہ ملا۔۔۔ آخر اسفند اسے ڈھونڈ کر لائے۔

وہ کس قدر خفا ہو رہا تھا۔

”کسی کو مت بتائیے گا۔ میرے دوست مذاق اڑائیں گے۔ بھلا یوں ہوتی ہے شادی۔“

”اچھا بابا! نہیں بتائیں گے حالانکہ تم تو خوش قسمت ہو جو۔۔۔“

”یہ خوش قسمتی جینہ کے حصے میں لکھ دیتے۔ وہ بھی تو میری ہی اتج کا ہے۔“

”امی صرف اپنے بیٹے کے بارے میں فیصلہ سنا سکتی تھیں۔۔۔ اور امی کے بیٹے تم ہو جینہ نہیں۔۔۔ اب کیا ماں کو دکھ دو گے۔“

انہوں نے ڈانٹ کر کہا تو زین کو چپ ہونا پڑا۔

برآمدے میں مٹھالی کے خالی ڈبوں، بکھری پتیوں اور چوٹیوں کی قطاروں کے سوا کچھ نہ تھا۔

مایہن جا چکی تھی۔

\*\*\*

آنکھ کھلی تو سردی کے احساس نے مخفے سمیٹ کر لہاف سر تک تانے کی ترغیب دی۔ مگر لہاف اوڑھتے اوڑھتے کلاک تک نظر گئی تو وہ ہڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اسے کالج سے دیر ہو گئی تھی۔ ساتھ والی چارپائی خالی تھی سر پانے پر پیسیا شمال اوڑھ کر پاتھ روم میں گھس گئی۔ ٹھنڈی ہوئی پانی تو چھوٹا سا برآمدہ آباد تھا۔

تخت پر رنگ برنگے کپڑے، مشین کی گھر گھر۔۔۔ سامنے نم صحن پتا تھا کہ رات بھر کن من کن من ہوتی رہی ہے۔

مشین پر جھکی عورت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دوبارہ سے مصروف ہو گئی۔ وہ کچن میں آئی تو باٹھاٹ میں گرما گرم پراٹھے اور ٹھوس میں چائے موجود تھی۔

جابر سے اچھا نکال کر وہ بیٹھی کھینچ کر نیچے بیٹھی اور رغبت سے ناشتہ کرنے لگی۔ چائے کے دوسرے کپ کی طلب شدید تھی مگر اس نے ہاتھ کھینچ لیا کہ جاتی تھی کہ صبح دوپہ کی کسی کی وجہ سے ٹھوس میں کپ ناپ کر ڈالے گئے ہوں گے۔

یونیفارم پہن کر کندھوں تک سیدھے بالوں کو پیٹڈ میں جکڑتے ہوئے وہ ٹھکی ڈرا کی ذرا رک کر خود کو دیکھا اور سوچا۔

”وقت کتنا گزر گیا ہے۔“

کبھی وہ اس آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر گھٹٹیوں رویا کرتی۔ مشین پر جھکی وہ عورت اسے روتے دیکھتی اور دوبارہ سے گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی اس نے خود ہی چپ ہونا اور بھلنا سیکھ لیا۔ دو سال صرف دو سال اسے یہاں لانے کے بعد صرف دو سال لایا اس گھر میں لگے پھرو پڑا لگا کر مل ایسٹ سدا ہار گئے۔ وہاں وہی حال ہوا جو بے ہنر آدمی کا ہوتا ہے۔ کبھی کام مل گیا تو چار پیسے گھر بھجوا دیتے ورنہ فالتے تب اس عورت نے جسے لبا نکاح کر کے لائے تھے۔ گھر کا چھلا پورشن کرائے پر چڑھایا، سلائی مشین خریدی اور مزدوری

میں جت گئی۔ کبھی کبھار آنے والے ریل اس کے بچوں کا پیٹ نہ پال سکتے تھے۔

مایہن کے ساتھ ان کا رویہ بس ایسا ہی تھا، وہ کبھی اس کے کسی معاملے میں دخل دیتیں۔ کبھی کسی معاملے میں مجبور نہ کرتیں۔ مایہن کو بڑھنے کا شوق تھا۔ وہ اس کے اسکول کالج کا خرچا خاموشی سے اٹھاتی چلی گئیں۔ لایا سال دو سال بعد چکر لگاتے اور بس۔

مایہن جس کی شدت سے خواہش تھی کہ یہاں سے بھاگ کر دوبارہ سے پھپھو کی مویان آغوش میں جا چھوے اس عورت کے صبر خاموشی اور محنت سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ سمجھوٹا کر بیٹھی جسے وہ فرزانہ بانی کہتی تھی۔

قربیب ہی دونوں ماموں کے گھر تھے، ٹھکریوں، لا تعلق گویا مایہن کے ساتھ کوئی خون کا رشتہ ہے ہی نہیں۔

مایہن نے عزت نفس کا سبق فرزانہ بانی سے سیکھا تھا۔ سو خود بھی ادھر کم ہی جاتی۔

اس نے بال بنائے۔ مگر سر پانے کے نیچے سے علیہ کا خط نکال کر سنجال کر دراز میں رکھا۔ یہ اس کا آخری خط تھا۔ اگلا خط آئے تک مایہن اس خط کی عبارت کو ہر روز سونے سے قبل پڑھتی۔

اس سارے عرصے میں اس کا ہاں سے رابطہ ان ہی خطوط کے ذریعے رہا۔

شروع شروع میں کبھی کوئی چکر لگاتا تھا۔ پھر اس سے بھی گئے۔ مگر آج بھی قدسیہ عید شب برائت پر اس کے لیے جو ڈرامہ مندی چوڑیاں بھجوانا نہ بھولتیں۔

پہلے قدسیہ خط لکھتی تھیں۔ پھر یہ ڈیوٹی علیہ نے سنبھال لی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں، روزمرہ کی مصروفیات کی تفصیل مایہن کو اس ماحول کے ساتھ جوڑے ہوئے تھی۔

بیگ اور فائل لے کر برآمدے سے گزرتے ہوئے مایہن کی نگاہ دوسرے کمرے کے کھلے دروازے تک گئی۔ وہ دونوں اب بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

وہ کلس کر بیڑھیاں اتر آئی۔ تنگ چھوٹی چھوٹی

گھبوں سے گزرتے ہوئے اس نے روز جیسی خواہش کی۔

”کاش! ان میں سے کوئی اسے کالج چھوڑ آیا کرے۔“

\*\*\*

تیز تیز پڑھیاں چڑھتے مایہن کی سانس پھول گئی۔ ”السلام علیکم۔“

اس نے تخت پر بیٹھی فرزانہ سے کہا جو نئے آنے والوں سوئوں میں سے کسی ایک کی کنگ کر رہی تھیں۔

”برا بیار پر نٹ ہے۔“ اس نے دوپٹہ اور چادر وچیں ڈھیر کیا اور ستائشی نظروں سے پنک شیفلوں کے سوٹ کو دیکھا۔

”ارم کا ہے۔۔۔“

”اس کا شوہر کیا باہر گیا۔۔۔ یہ تو کپڑے سلواتے نہیں تھکتی، دیکھ بیچے گا۔ کچھ دنوں تک۔ اپنے کپڑے آپ سے سلوانے کے بجائے ٹیلر سے سلوائے گی۔

باہر والوں کی کمائیاں اتنی ہی ہوتی ہیں۔ ایک ہمارے ابا گئے ہیں۔ لگتا ہے وہاں جا کر جھک ہی مار رہے ہیں۔ کھانے میں کیا ہے۔“

وہ خود ہی بولتی کچن میں گھس گئی۔ فرزانہ نے سر اٹھا کر اسے کچن میں جاتے دیکھا۔ ایک مایہن کی آواز تھی۔ جو اس تھالی میں دسر اہٹ کا احساس پیدا کرتی کہ لڑکے تو اس گھر میں صرف سونے کے لیے آتے یا کھانے کے لیے اور شاید اسی وحشت ناک تھالی سے بچنے کے لیے مایہن نے بولنا شروع کر دیا ورنہ جب آئی تھی تو کیسی چپ چاپ رہتی۔ گویا منہ میں زبان ہی نہیں۔ سب سے پہلے تو وہ ان کے دونوں بیٹوں کو دیکھ کر خائف ہوتی تھی۔

دو بیٹے۔ ان کے پہلے شوہر کی اولاد۔ جو انہیں کسی بھی طرح اپنے بیٹے کا سارا نہ لگتے۔۔۔

زبانے بھر کے کھتے اور آواز۔ بالکل ان کے پہلے شوہر کی طرح جس نے نشے میں انہیں مار مار کر گھر سے



نکال دیا یہ کہہ کر وہ انہیں اور ان کے بچوں کو نہیں پال سکتا اور پھر طلاق بھی دے دی۔ عمران اور رحمان مایوس سے بڑے ہی تھے۔

ثابت مسور، لیوں کا اچار اور تھوڑی سی پیاز وہ ٹرے لے کر وہیں چلی آئی۔  
”تمہارا خط آیا ہے۔“ جب وہ آجھی روٹی کھا چکی تو فرزانہ نے کپڑوں کے ڈھیر میں سے خط نکال کر پھاڑا۔ اس نے فوراً ”کھٹنے کے نیچے دایا اور جلدی جلدی روٹی کھانے لگی۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے اور خط لے کر کمرے میں گھس گئی۔ پتکھا چلا کر اطمینان سے بستر پر بیٹھ کر خط کھولا۔

ابتدائی رسمی کلمات کے بعد علیحدہ لکھا تھا۔  
”زمین آبی کی شادی طے ہوئی ہے۔۔۔ امی کی خاص مالک ہے کہ تمہیں ضرور آتا ہے۔۔۔ ورنہ وہ خفا ہو جائیں گی۔ تم تو اسفند بھیا اور نازو آبی کی شادی میں بھی نہیں آئی تھیں۔۔۔ اب کے مہینے پہلے ہی آ جاؤ۔ رفیعہ بھابھی بہت اچھی ہیں۔۔۔ خوش مزاج اور کھلی ملی طبیعت کی مالک لیکن مجھے لگتا ہے اسفند بھابھال کے خوش نہیں۔۔۔ وہ شادی کے بعد سے مجھ سے گئے ہیں۔ نہ کسی محفل میں بیٹھتے ہیں۔۔۔ نہ بھابھی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔۔۔ نازو آبی کا فون آیا تھا۔۔۔ وہ جدہ میں بہت خوش ہیں۔ اور آج کل نئے مہمان کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔“

پچھونے اسے پہلی دونوں شادیوں پر بھی بھید اصرار ملایا تھا۔ یہ بھی کہا کہ وہ اسے خود لینے آئیں گی۔ لیکن ماموں لوگوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ یوں اپنی ہونے والی سسرال جانے۔۔۔ یہ ان کے گھر کی روایت نہ تھی اور یہ کہ رخصتی سے قبل وہ وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔ مایوس دل مسوس کر رہی تھی۔

وہ چکا تو اسے اس وقت بھی لگا تھا جب معلوم ہوا کہ نازو آبی کے لیے جدہ سے آئے انجینئر کا رشتہ قبول کر لیا گیا۔ جب سے اس کا شعور پختہ ہوا تھا اس نے نازو آبی کو ہمیشہ اسفند کے ساتھ سوچا تھا۔ اس کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ نازو آبی کی شادی عاشر سے اور اسفند

کی رفیعہ سے ہو سکتی ہے۔ وہ بہت دنوں تک الجھی رہی۔ اس نے پچھونے سے انکار کا بیان کر دیا تھا اور اب۔۔۔ اب واقعی ایک ماہ کے بعد اس کے ایف ایس سی کے انگریز امتحان تھے۔

”اور نہ بھی ہوتے۔ تب بھی مجھے کہاں کسی نے جانے دیتا تھا۔“ اس نے بے حد دل گرفتگی سے سوچا۔ اس سے آگے زمین کے سسرال والوں کی تفصیل تھی۔

”ایک اہم خبر اور بھی دیتا ہے۔۔۔ فضلہ بی بی کے تیور ٹھیک نہیں۔ آج کل دل و جان سے زمین بھالی پر فدا ہو رہی ہیں ہمہ وقت انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں سرگرداں۔۔۔ میرا تو مارے غصے کے برا حال ہو جاتا ہے۔ ایسی ایسی چھوری حرکتیں کرتی ہے کہ بس۔۔۔“

مایوس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔  
”کیا اسے معلوم نہیں۔۔۔ وہ تو کب کا میرا ہو چکا۔“ یہ منحوس کالی دال پکائی ہے۔ مجال ہے جو اس گھر میں کبھی ڈھنگ کا کھانا نصیب ہو۔“ مایوس نے کوئی برتن پھینکنے کی گواہی آئی۔ ساتھ ہی عمران چیخا۔ مایوس نے زور کر خط لکھنے کے نیچے گھس دیا۔  
”گوشت لادیتے۔ میں وہ چڑھا دیتی۔“ فرزانہ کے ٹھنڈے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔  
”گوشت کھانے کی اوقات ہے تم لوگوں کی۔۔۔ وہ جو تمہارا کچھ لگتا باہر بیٹھا ہے۔ اس سے کھو رہا لیجئے۔ میرے باپ کو چھوڑ کر جس سے نکاح پڑھوایا ہے۔

مایوس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا بد زبان تھا کہ لگتا ہی نہ ماں سے بات کر رہا ہے۔  
”تمہارے باپ نے کتے کے بچے کی طرح گھر سے باہر نکالا تھا۔ نکاح نہ پڑھوائی تو کتے ہاتھ پر پڑے فقیروں کی طرح جھپک مانگ رہے ہوتے۔“  
”اب بڑے محل میں بیٹھے ہیں۔“  
”چھت کا آسرا تو ہے۔“  
”منہ بھل کر رکھے اپنی چھت کا۔“

”زیادہ یک یک کرنے کی ضرورت نہیں۔ کھانا کھانا ہے تو کھا، نہیں تو وہاں جا جہاں سے مرغ مسلم ملتے ہیں۔“

جواباً ”ایک برتن اور دیوار سے لکرایا۔ وہ بکنا جھکتا دھڑ دھڑ میڑھیاں اترتا چلا گیا۔ مایوس نے ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا۔ کچن میں روٹیاں اور سالن بکھرا تھا۔ غالباً فرزانہ نے اسے کھانا لاکر دیا تھا۔

”روٹیاں لپیٹ کر دسترخوان میں رکھ دو۔ رحمان کھالے گا۔ آٹا ختم ہو گیا ہے۔ سالن صاف کر دو۔“

مایوس فرزانہ کے کہنے پر سب سیٹھ لگی۔ عمران کی نسبت رحمان پھر بھی کچھ بہتر تھا۔ ماں سے زیادہ بد زبانی نہ کرتا۔۔۔ اور وہ چھوٹا موٹا کلام بھی کر لیتا جس کا اندازہ اس کے کمرے سے نکلنے والوں کے چٹکوں کی چکنائی لگے لفافوں اور لیوں پر قش پنجابی گانوں کی گنگناہٹ سے ہوتا۔ جب میں پیسے نہ ہوتے تو آرام سے گھر کی دال روٹی کھا لیتا، پیسے ہوتے تو نکلے کباب اڑاتا، مگر خود غرض اتنا کہ خیال ہے کبھی کوئی چیز ماں کے لیے ہی لایا ہو۔ مایوس تو خیر کسی کتنی ہی نہ تھی۔

کانچ سے دایا پکی پر وہ کھانا کھاتی پھر فرزانہ کی مدد کرانے لگتی۔ تپائی گرد پتی شلوار کاٹ کر سیدھی سلانیاں لگا دیتی اور جن دنوں وہ یہ سب کر رہی ہوتی۔ فرزانہ جان لیتیں اس کے کانچ کی فیس جاتی ہے۔ آج کل بھی یہی روایت تھی۔

”تمہاری فیس کتنی ہے؟“ فرزانہ کمر سیدھی کرنے کے لیے وہیں لیٹ گئیں۔

”جی داخلہ فیس جاتی ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار۔“ اس نے چور لہجے میں بتایا۔

”تمہارے باپ نے کچھ پیسے بھیجے ہیں، لے لیتا۔“ وہ دھیرے دھیرے اپنا ماتھا سسراری تھیں جیسے سر میں درد ہو۔ مایوس نے حیرت سے انہیں دیکھا اور بے اختیار پوچھا۔

”تو آپ نے ان پیسوں میں سے تھوڑا راشن کیوں نہ منگو لیا۔“

”پھر تم فیس کہاں سے دیتیں؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ جانتی تھی کہ آج گھر میں پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔

”کیا اتنے کم پیسے بھجوائے ہیں؟“ وہ جانتی تھی۔ باپ کے ہاتھ میں نہ تو کوئی ہنر ہے نہ ہی اسے ٹیک کر کام کرنے کی عادت، مزدور پیشہ بندہ جتنا کما سکتا ہے۔ اتنا ہی وہ کما رہا ہے۔ اس پر پردیس کے خرچے۔

”اتنے کم بھی نہیں۔ لیکن میں سوچ رہی ہوں۔ نئی واشنگ مشین لے لوں۔ پرانی بالکل بے کار ہو گئی ہے۔ کلا پیوں میں درد رہتا ہے۔ ہاتھ سے کپڑے دھوئے ہی نہیں جاتے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ مایوس دعا کی کہ خدا ان کے لیے کچھ بہت ہی اچھا کرے اور علیحدہ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس حوالے سے کیا لکھے۔ اگر زمین کو بد لانا ہو تو علیحدہ یا پچھونے کیا کر سکیں گی اس نے غم کر رکھا دیا اور اٹھ کر روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

\*\*\*

وہ ماموں کے گھر سے لوٹی۔ ماموں تو گھر نہ تھے۔ یوں بھی اسے اپنی ماموں زاد بہین سے نوٹس لینے تھے۔ بہین نے فوراً ہی نوٹس اٹھا کر رخانے والی بات کی۔ جھوٹے منہ بیٹھنے کو بھی نہ کما پتا چلا اس کا منہ گھیر آنے والا ہے۔ وہ اس کے روتے سے دل گرفتہ سی لوٹی تو میڑھیاں اترتے رحمان سے ٹکرائی۔

”بے تھے بیل کی طرح چلتی ہو۔“ سر کے بل ٹکی میڑھیاں نیچے گرتی۔ مگر اس نے تھام لیا اور بہت دیر تک نہ چھوڑا۔ خود کو چھڑا کر دو میڑھیاں نیچے ہوئی اور یہاں وہاں بکھرے نوٹس اکٹھے کرنے لگی۔ جب دوبارہ کھڑی ہوئی تو رحمان اب بھی وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ مایوس نے تیزی سے دوپٹہ مزید پھیلا دیا اور قدرے تنگ کر لوٹی۔

”اب رستہ بھی دیں۔“



وہ چونکا سیڑھیاں عبور کر کے عین اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اس کی سر ناپا ٹوٹتی ہوئی نظریں مابین خانف سی ہو گئی۔  
”رستہ تو۔۔۔“ اس نے کچھ کہتے کہتے لب بھینچ لیے۔

”ریحان بھائی۔۔۔!“ اس نے ریحان کی نظروں میں بہت واضح تبدیلی محسوس کی۔  
ریحان نے رستہ چھوڑ دیا۔۔۔ مابین تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ ریحان نے اسے تب تک دیکھا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔  
”کمال ہے۔۔۔ ایسی قیامت نظروں کے سامنے ہے اور میں ہی بے خبر رہا۔ اس سڑی ہوئی ہری مرچ سے تو اچھی ہے جو روز کوٹھے سے نظروں کے پیغام بچھاؤ کرتی ہے۔ اس نے وہیں دوبارہ سے ٹیک لگائی اور جیب سے سگریٹ نکال کر سیلا گئی۔ یہ سگریٹ اور لڑکیوں کی لت اسے نئی نئی لگی تھی۔ اسی لیے اپنی ہی ترنگ میں تھا۔

توچہ بڑی ہے مست مست۔۔۔  
سگریٹ کے مرغولے اس کے سامنے اک نئی شبیہ بنانے لگے۔

”ریحان بھائی کو کیا ہوا ہے؟“ وہ نوٹس گود میں رکھے کچھ خانف سی بیٹھی تھی۔

”ابھی جاتی ہوں ارم کے گھر، سلائی کے پیسے مل جائیں گے تو آتے ہوئے راشن لے آؤں گی۔“  
فرزانہ نے کہا تو وہ قدرے مطمئن سی ہو کر تپائی کرنے لگی۔

پھر بہت سے دن یونہی گزر گئے۔ اس کے امتحان ہو گئے اور نرمن کی شادی۔ مابین کا وہ بیان بھٹک بھٹک کر اسی آگن میں کھوتا رہا۔

”کاش! میں بھی ان سب کے درمیان موجود ہوتی۔“

\*\*\*

جھانڈو دیتے دیتے جلوہ پوری کی خوشبو نے اپنی

پلیٹ میں لے لیا۔ اس نے گردن جھماکدہ کھلا کر کمرے کے کھلے دروازے سے ریحان بھائی نظر آ رہا تھا۔ ”عالیا“ آج اس کی جیب میں کچھ پیسے تھے۔ وہ جھانڈو چھوڑ کر دروازے میں آ گئی۔

”ریحان بھائی! آپ کے پاس پیسے تھے تو گھر کا کچھ سلائی لے آتے۔“ فرزانہ کو چارپانچ دن سے بخار تھا، سلائی بھی نہ ہو سکی۔ آج انہوں نے دوبارہ سے مشین سنبھالی تھی۔ حالانکہ کمزوری بے حد تھی۔  
ریحان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر اطمینان سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”اب اتنے بھی نہیں ہوتے کیوں تمہارا دل چاہ رہا تھا۔“  
”میں ناشتہ کر چکی ہوں۔“ اس نے چڑ کر کہا اور پلیٹی۔

”یہ برتن لے جاؤ۔“  
ریحان نے کہا تو وہ برتن اٹھانے لگی۔  
”یہ کل تمہارا خط بھی آیا تھا۔ میں دیکھ بھول گیا۔“  
اس نے سائیڈ سے لفافہ اٹھا کر دیا۔ مابین نے دوسرے ہاتھ میں لفافہ لیا پھر کھول کر دیکھی۔  
”یہ آپ نے کھولا تھا۔“

”بہت بھاری تھا۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔“  
”آپ میرے خطوں کو ہاتھ مت لگایا کریں۔“ وہ غصے سے کہہ کر ہار لگی۔

”ہونہ۔۔۔ مجھے ہوں گے خط میں روپے ہیں۔“  
فرزانہ نے اشارے سے پاس بلایا۔ پلیٹ میں بچے تھوڑے سے پنے اور پوری کا ٹکڑا انہوں نے دو تقوں میں پلیٹ صاف کی۔ مابین نے بے حد تاسف سے انہیں دیکھا۔

”کیسے بے حس بیٹے ہیں۔ ہاں کا ذرا جو خیال ہو۔“  
وہ جلتی کر حتی برتن بچن میں رکھ کر کمرے میں آ گئی۔  
لفافے میں نرمن کی شادی کی چند تصاویر تھیں۔ نرمن و لہن بن کر کیسی پیاری لگ رہی تھی۔ اس نے سب کو دیکھا۔ پچھوا اسفند مانا تو لیکن پوری کی پوری توجہ اس نے کھینچ لی۔ جو روح میں بستا تھا۔ علیحدہ

چُن کر وہی تصویریں بھیجی تھیں۔ جن میں زمین نمایاں تھا۔

دروازے کے نیچوں بچ کوئی سایہ آ رہا۔  
”تم ناراض ہو گئی ہو؟“

مابین نے جیت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ریحان بھائی کو اس کی ناراضی کی پروا کیوں ہونے لگی۔  
”دوسروں کے خط پڑھنا خلاف تہذیب بات ہے۔“

”اچھا اصغری بی بی! ایسے اس میں وہ کون سا ہے۔“  
”آپ کو کیا؟“ آپ جائیں یہاں سے۔۔۔ مابین کے چہرے پر سرخی سی چھا گئی۔ تو وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ مابین نے دوبارہ سے تصویریں اٹھائیں۔ دل دھڑک دھڑک کر پائل ہو رہا تھا۔ کتنے عرصے کے بعد اس نے زین کو دیکھا تھا۔

سجیدہ پر متانت چہرہ لٹاؤ، وہ کمرے کی آنکھ میں دیکھ رہا تھا۔ مابین کو لگا اسی کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر تصویر اٹھ دی اور خط اٹھالیا۔ سارا خط نرمن کی شادی کی تفصیلات سے بھرا تھا۔ اس پر علیحدہ کا اندازہ ہوا۔ وہ کسی مسکراتی تو کبھی ہنستی۔

”فضہ کا حال دیکھنے والا تھا۔ پوری شادی میں بھائی کے گرد منڈلائی رہی۔ بھائی نے ایک دوبار ڈانٹ بھی دیا۔۔۔ میں تو کڑھ کڑھ کر آؤں گی۔۔۔ کچھ میں نہیں آتا۔ یہ سب کسی اور کو نظر کیوں نہ آیا۔“

مابین پہلی بار تشویش کا شکار ہوئی۔ اس نے دوبارہ تصویریں اٹھائیں۔ جہاں جہاں زین تھا۔ وہیں فضہ کی موجودگی ضروری تھی۔ رائل بلیو سوٹ میں چمکتی دھنکی، نفی خوب صورت اور جاذب نظر تھی۔

مابین کا دل ڈوب سا گیا۔  
وہ یہاں بھی اور فضہ، زین کی نظروں کے سامنے، کہیں زین کا زاویہ نظر بدل جائے تو۔۔۔

وہ ساری رات بے حد مضطرب رہی۔ آج کی بات نہیں۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے ریحان بھائی بد کے لیے تیور اور نگاہیں محسوس کر رہی تھی۔

پچھلے ایک سال میں بہت کچھ تبدیل ہونے لگا تھا۔۔۔ مابین کا رزلٹ آیا تو اس نے نی ایس سی میں ایڈمیشن لے لیا کچھ ٹیوشنز بھی ڈھونڈ لیں۔ اس علاقے میں تو وہی سو پچاس والی ٹیوشنز تھیں۔ لیکن اسے کالج کے قریب ہی ایسا گھر مل گیا۔ جس کے دو بچوں کو پڑھانے کے ڈھائی ہزار مل جاتے تھے۔ وہ چھٹی کے بعد سیدھا وہیں چلی جاتی۔

اس عرصے میں لایا پاکستان آئے لیکن صرف تین دن رُک کر چلے گئے۔ ان کے انداز میں وہی لا تعلقی و بیگانگی تھی اور مابین ان سے وہ سوال پوچھتے پوچھتے رہ گئی جو ہمیشہ اس کے اندر کلبلاتا تھا کہ اگر انہیں خود گھر میں نہیں رہنا تھا تو وہ اسے سایہ وال سے کیوں لائے تھے۔ وہ آئے اور چلے گئے۔ سارے سوال اندر ہی اندر دم توڑ گئے۔ زین آج کل تعلیم مکمل کر کے ملازمت کی تلاش میں تھا۔ مابین ہر نماز کے بعد اس کے لیے دعا کرتی۔

عمران کو کوئی لڑکی پسند آئی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ فرزانہ باجی مان کر نہ دیں۔

”نہ کوئی کام دھندا نہ عقل و شعور کیسے بیاہ دوں۔۔۔ پھر لڑکی کوئی اچھی لڑکی نہیں۔“

عمران نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تھی۔ علیحدہ کے وہی قصے۔

فضہ کی دیوانگی، زین کی لا تعلقی۔  
مابین کبھی پریشان ہوتی تو کبھی ہنس دیتی۔

اب ریحان میں آتی تبدیلیاں۔  
”کیا زندگی یونہی بے یقینی میں گزر جائے گی۔“ وہ بے حد دل گرفتگی سے سوچا کرتی۔

\*\*\*

ہلکی پھلکی ریم جھم نے پورا صحن بھگو ڈالا تھا۔۔۔ بدلتا موسم تھا یا کچھ اور۔۔۔ لیکن مابین خوش تھی اور یہ خوشی اس کے انگ انگ سے چھلک رہی تھی۔  
”باجی! کچھ بیٹھنا بیٹھنا؟“

مابین نے بوندوں کو پھیلی میں سینٹے ہوئے فرمائش



**FREE MAKE OVER**

**کھانسی کی خواہش**

**Nikhaaar**

Help Line: 0800 00028

www.pkdigest.com

Free Make Over: کھانسی کی خواہش کے لیے مفت میک اپ سیشن۔  
موقع: پتہ: کلاں، لاہور۔  
پتہ: کلاں، لاہور۔  
پتہ: کلاں، لاہور۔

**BIO Nikhaaar**

Herbal, Fairness, Cream

خود فرزانہ اپنی جگہ سن سی ہو گئیں مابین پھٹ پڑی۔  
”دیکھا آپ نے کیا کدہ گیا ہے۔ بہت دنوں سے  
برداشت کر رہی ہوں اس کی بد تمیزیاں۔ ڈاکٹر بھی  
سات گھر چھوڑ دیتی ہے اور یہ۔۔۔“  
مابین کا گلہ اوندھ گیا۔ فرزانہ سے آہستگی سے اس کا  
کندھا دیا اور ساتھ لگا لیا۔ خود فرزانہ کے اندر  
خطرے کی گھنٹی بہت زور سے بجنے لگی تھی۔



”تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ تمہارے شوہر کی  
نوکری لگ گئی ہے۔ دو چار ماہ کی بات ہے۔ تمہاری  
لی ایس سی پوری ہو جائے گی۔ تو تمہاری رخصتی کر دیں  
گے۔ خواجہ اس بات کو سرسوار نہ کرو۔“  
فرزانہ نے اسے سمجھایا تو وہ بھی ذرا ریلیکس ہو گئی۔  
واقعی اب وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ یہاں سے مئی تو  
کبھی لوٹ کر نہ آؤں گی۔  
اس نے مسموم ارہ کیا۔ لیکن کچھ لوگوں کو خوشیاں  
آسانی سے نہیں ملتیں۔  
زندگی کے رستے اتنے آسان اور سیدھے نہیں۔  
علینہ کا خط آئے بہت دن ہو گئے تھے۔ مابین کے  
خط کا جواب بھی نہیں آیا۔ وہ ہر روز منتظر رہتی۔ کالج  
سے واپسی پر فرزانہ سے بھی پوچھتی۔  
”تم خود خط لکھ لو۔“

”دیکھا تھا جواب ہی نہیں آیا۔“ اس کے لیے میں  
مایوسی سی در آئی۔ پھر ایک نہیں اس نے کئی خط لکھے مگر  
جواب نہ آیا۔  
”ہلے تو کبھی اتنی دیر نہیں ہوتی۔“  
”دیکھ لو کہیں اس کا ارادہ تو نہیں بدل گیا۔ اچھی  
بات ہے ہم غریبوں کا بھلا ہو جائے گا۔“  
وہ فرزانہ سے پوچھ رہی تھی۔ جب واش بیسن پر  
منہ دھو تارحمان خیانت سے ہنس۔  
”کہیں تم تو خط کے جواب نہیں اڑا رہے؟“ مابین  
کو شک گزرا۔  
”ہاں۔ ہاں! ایسا شان دار خیال میرے ذہن میں پہلے

کی۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی فرمائش نہیں کی  
تھی۔  
”ہنالو۔“ آج کوئی کام نہ تھا۔ وہ تخت پر گھٹنوں  
کے گرد بازو پیٹے بہت آرام سے بیٹھی تھیں۔ بارش  
سے پہلے ہی وہ پہلے ہوئے کپڑے مطلوبہ گھروں میں  
دے آئی تھیں۔  
”کیا ہانوں۔۔۔؟“ وہ بڑی مست سی تھی۔  
”بیسن کا حلوہ بنالو۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ وہ فوراً ”یکن میں گھس گئی۔  
کفایت شعاری کے چکر میں ایسی عیاشیاں کبھی بھار  
ہی نصیب ہوتی تھیں۔  
آدھی پالی بیسن کا حلوہ بننے میں پانچ منٹ لگے تھے۔  
اس نے دو کپ چائے بھی رکھ دی اور حلوہ ایک ہی  
پلیٹ میں نکال کر دو چچ رکھ دیے۔ ہولے ہولے  
گنگناٹے ہوئے چائے کے لیے کپ نکالنے لگی۔  
”آج بڑے خوش ہو سو بیٹو۔“

رحمان کی آواز پر حلق تک گڑوا ہو گیا۔ اس کے  
حساب سے تو وہ دونوں گھر میں اکیلی ہی تھیں نہ جانے  
یہ کہاں سے آڑکا۔

”میں نے کہا۔ کوئی خاص بات ہے۔ یہ  
گنگناٹا نہیں یہ خوشی۔“ مابین کچھ سوچ کر بٹٹی۔  
”ہاں۔ آج میں واقعی بہت خوش ہوں۔ کیونکہ  
زین کو بہت اچھی جا ب مل گئی ہے۔“

”کون زین۔؟“ رحمان نے بے نیازی کا مظاہرہ  
کیا۔  
”تم اچھی طرح جانتے ہو زین کون ہے۔“ وہ چبا  
چبا کر بولی۔

”اچھا تمہارا وہ کزن۔۔۔“  
”صرف کزن نہیں اس کا شوہر بھی ہے۔“ اندر  
آتی فرزانہ نے تصحیح کی۔ مابین نے جنائی نظموں سے  
رحمان کو دیکھا۔  
”بہت ظلم کیا تمہارے باپ نے۔ تم پر بھی اور  
مجھ پر بھی۔“  
وہ کہہ کر چلا گیا۔ سامنے کھڑی ماں کا لحاظ بھی نہ کیا۔



نہ آیا۔" وہ اس پر پانی کے جھینے اڑا کر چلا گیا۔  
 "مجھے یقین ہے باجی! یہ اسی نے کیا ہے۔" ماہین مڑ کر فرزانہ سے کہنے لگی۔ فرزانہ نے کچھ نہ کہا لیکن پُرسوج انداز میں سبزی لگنے تب ہی عمران چلا آیا۔ اس کے اپنے ہی مسئلے تھے۔ ماہین چڑ کر کمرے میں ٹھس گئی۔  
 ڈھائی ماہ گزر گئے۔ ہر گزرتا دن اس کی پریشانی اور دوسروں میں اضافہ ہی کرنا گیا۔

"ماموں کے گھر سے فون کرلو۔"  
 فرزانہ اس کی بے تابیوں کی گواہ تھیں۔ ماہین نے کبھی ماموں کے گھر سے فون نہیں کیا تھا۔ اس کے ایک ایک عمل کے وہاں سوسو مطلب نکلتے تھے۔ لیکن آج کرتا پڑا۔ بڑی ممانی نے لمبی چوڑی تفتیش کے بعد فون کی اجازت دی۔ کال ریفیہ نے ریسویو کی اور جو خبر اسے دی وہ آسمان سے زمین پر گری پے یقینی سے ریسویو کان سے لگائے سنتی رہی ایک لفظ بھی نہ کہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟

میرا زین۔ میرا زین۔  
 اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریسویو کریڈل پر ڈال دیا۔ مامی پوچھتی رہ گئیں۔ وہ لوکھڑاتے قدموں سے غائب دماغی کے ساتھ ان کے گھر سے نکلی۔ سیدھیاں کیسے عبور کیں، صحن تک کیسے پہنچی۔  
 "کیا ہوا؟" فرزانہ اس کا پیلا چٹک چھو دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ ماہین ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے؟ تم رو کیوں رہی ہو؟"  
 "باجی! زین۔" وہ تڑپ کر روئی رہی۔  
 "ارے کچھ تو بتاؤ۔ کیوں جان نکال رہی ہو۔"  
 فرزانہ نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔  
 "زین کا ایک سیڈنٹ ہو گیا۔ اس کا ہاتھ۔ اس کا بایاں ہاتھ کاٹا پڑ گیا ہے۔" ماہین نے ہچکچوں میں بتایا۔  
 فرزانہ ششدر رہی رہ گئیں۔ پھر سمجھ کر پوچھنے لگیں۔  
 "وہ تو بیچ گیا ہے نا؟"

"جی وہ ٹھیک ہے۔"  
 "تو پھر تم رو کیوں رہی ہو؟" فرزانہ نے کہا تو ماہین رونے بھول کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ ایسی ہی تھیں بڑے سے بڑے حادثے کو سکون سے جھیل جانے والی۔  
 فرزانہ نے آہستگی سے اس کے آنسو صاف کیے۔  
 "زندگی اہم ہے باقی سب نقصان قاتل تلافی ہیں۔"  
 انہوں نے مدھم لہجے میں کہا اور مڑ کر قیص کاٹنے لگیں۔

علینہ کے خطوں میں پھر سے تسلسل آ گیا۔ لیکن اس کا ہر خط بہت پریشانی اور اداسی لیے ہوئے ہوتا۔  
 "زین بالکل بدل گیا ہے۔ کسی کے ساتھ بیٹھ کر بات تک نہیں کرتا۔ کوئی بات کرے تو پھاڑ کھلنے کو دوڑتا ہے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ اس نے ابھی تک اس حادثے کو قبول نہیں کیا۔ امی ہر وقت روئی رہتی ہیں۔ کاش آپ یہاں ہوتیں۔ ماہین آپ آجائیں۔"

بے خواب راتیں آوا اس دن۔  
 وقت گزرتا نہ تھا۔ لمحے گھبرے گئے۔  
 اس کے انگوٹھ آئے اور ختم بھی ہو گئے۔  
 "زین! تمہیں کیسے بتاؤں کہ تمہارا دکھ میرے دل میں گزرا ہے۔ کاش میں وہاں ہوتی تو تمہارے سارے آنسو اپنی پلکوں سے چن لیتی۔ کاش میں وہاں جاسکتی۔"

آنکھ کھلتی تو بہت دیر تک نیند نہ آتی۔ وہ چاند میں اس کا عکس دیکھتے خود سے باتیں کرتی رہتی۔  
 وہ ایسی ہی اک رات تھی۔ جب چاند اور اس کے درمیان اک سایہ آکر ٹھہر گیا۔ ماہین ڈر گئی۔  
 "کب تک اس کو یاد کرو گی؟" وہ پھر سے سامنے آ گیا۔  
 "وہ لپانچ تمہیں کیا دے گا۔ عورت کو مرد کے مضبوط بازوؤں کا سہارا چاہیے۔ کیوں خود کو فروغ دیتی ہو۔"

"میرا رستہ چھوڑ دو۔" وہ بھنکاری۔  
 "اب تو سارے رستے مجھ تک آتے ہیں جانم۔"  
 "رحمان بھائی! میں چیخنے لگوں گی۔" وہ بری طرح سے ڈر گئی۔  
 "کیوں؟ غور سے دیکھو۔" اس نے دونوں بازو پھیلائے۔  
 "کیا کمی ہے مجھ میں۔ تمہارے اس ایک بازو والے سے تو بہتر ہوں۔ تم کو تو کمانے بھی لگوں گا۔ مت دور بھاگو۔ بڑا مہر کیا ہے میں نے۔ اب۔"

رحمان نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔  
 ماہین نے اسے دھکا دیا اور تیزی سے بھاگتی کمرے میں ٹھس گئی۔ اس نے اندر سے جتنی لگائی تھی۔

☆ ☆ ☆  
 "فضہ زین بھائی کے ساتھ نہ جانے کس جنم کی دشمنی نکال رہی ہے۔۔۔ ہر وقت طنز کرتی ہے۔ پہلے ان کی محبت میں مری جا رہی تھی۔ اب بالکل ہی بدل گئی ہے۔۔۔ خدا کے لیے ماہین! آپ مت بدلے گا ورنہ زین بھائی بالکل ختم ہو جائیں گے۔ آپ واحد امید ہیں ہماری۔ صرف آپ ہیں جو ان کا کھویا ہوا اعتبار و اعتماد بحال کر سکتی ہیں۔"

ماہین یہ کیا ہو گیا۔ ہم تو بہت خوش تھے۔ زین بھائی کی جانب ہو گئی تھی ہم تو ان کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تاکہ جلد سے جلد آپ کو رخصت کروا کر لے آئیں۔ ان واحد میں سب کچھ بدل گیا۔۔۔ بتائیں نا ماہین! آپ کو میرا بھائی اب بھی قبول ہے؟ آپ اب بھی ان سے وہی ہی محبت کرتی ہیں نا؟  
 آگ طویل سانس لے کر ماہین نے خط ایک طرف رکھ دیا۔

"تم تو خود بے یقین ہو رہی ہو علینہ!"  
 جی چاہتا تھا اڑ کر وہاں پہنچ جائے۔  
 وہ ست روی سے چلتی پگھل میں آگئی۔ فرزانہ ہنسیا بھون رہی تھیں۔  
 "باجی! میں ماموں کے گھر جا رہی ہوں۔ فون کرنا

ہے۔"  
 وہ بتا کر پلٹی۔ میٹرھیوں کے پاس رحمان نے روک لیا۔  
 "میں نے کہا۔ کہاں جا رہی ہو چند؟"  
 اس کے انداز روز بروز ٹھٹھٹے جا رہے تھے۔ راستہ روکنا، ہاتھ پکڑنا تو کبھی ڈوب نہ کھینچ لینا۔۔۔ نجانے وہ اتنا بے باک کیوں ہوتا جا رہا تھا۔  
 "رحمان بھائی! آپ کے اندر اتنی سی شرم بھی نہیں ہے۔"  
 "شرم کیسی؟" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔  
 "میرا اور آپ کا ایک رشتہ ہے۔"  
 "کون سا رشتہ؟"

"میں آپ کو بھائی کہتی ہوں۔" ماہین اب بھی ضبط سے کام لے رہی تھی۔  
 "کہنے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔ نہ ہمارا باپ ایک اور نہ ماں۔ تو پھر تمہیں بہن کیسے مان لوں۔"  
 "آپ واقعی بے غیرت ہو چکے ہیں۔" وہ میڑھیاں اتر گئی۔۔۔ ممانی بہت دیر تک زین کے حوالے پر اس سے افسوس کرتی رہیں اور وہ میرے سنتی رہی۔  
 "شکر کرو تمہارے شوہر کی جان بچ گئی۔ آج کل تو کنواریوں کو رشتے نہیں ملتے۔ بیوہ بچاری کس کھاتے میں۔"  
 ماہین کا منہ کھل گیا۔

"میں فون کر لوں۔" وہ ہانسنے اٹھ گئی۔  
 پھپھو اس کی آواز سن کر رو پڑیں۔  
 "مجھ سے اپنے بیٹے کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ ماہین! جنید کو تمہیں لینے کے لیے بھیج دوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"  
 "پھپھو! ایسے کیسے آسکتی ہوں۔ سب اعتراض کریں گے۔" اس نے دبے دبے الفاظ میں بتایا۔  
 "ابھی تک وہ اس شاک سے نہیں نکلا۔ اس سے رخصتی کی بات کروں بھی تو کیسے! امی سامنے ہی بیٹھی گھڑی دیکھ رہی تھیں۔ ماہین کو بات جلدی ختم کرنا پڑی۔



وہ بہت بوجھل دل کے ساتھ گھر لوٹی تھی۔

\*\*\*

ایک تو زین کی پریشانی دوسرے ریحان کی بڑھتی گستاخیاں وہ لاکھ خود کو مضبوط ظاہر کرتی۔ اندر سے خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ اس دن فرزانہ کے سامنے رو پڑی۔

”آپ اس کو روک کئی کیوں نہیں؟“

فرزانہ نے مشین روک کر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ سے مشین پر جھک گئیں۔ اس ایک نگاہ سے جو بے بسی مترشح تھی اس سے ماہین، بخوبی واقف تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ لڑنے نہ صرف گستاخ تھے بلکہ ماں کے کہنے میں بھی نہیں تھے۔ وہ صرف احتیاط کر سکتی تھیں۔ کہیں تھوڑی سی دیر کے لیے بھی جانا پڑتا تو ماہین کو اس کے ساموں کے گھر جانے کا کہہ دیتیں۔ اس کا یوں روز روز آنا ممانیوں کے لیے تشویش ناک تھا۔ اگرچہ اس کا نکاح ہو چکا تھا پھر بھی بچپن کے نکاح کا کیا بھروسہ۔ حادثے کے بعد سے وہ اپنے لڑکوں کو اس سے یوں چھپاتیں۔ گویا وہ ملی کی طرح دیوچ لے گی۔

”ماہین! اپنی پیچھو سے کہو رخصتی کروالیں۔“

فرزانہ باجی نے فحشی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ابھی نہیں کروا سکتیں۔“ ماہین نے بے بسی سے ہاتھ مسلے۔

”تو یہاں سے چلی جاؤ۔“

ماہین ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر اندر چلی آئی۔ فیصلہ مشکل تھا۔ مگر اس نے کر لیا۔ ساموں نے نواویلا بھجایا۔

”یوں رخصتی کے بغیر سسرال جاؤ گی۔ ناک کئے گی۔ یہ۔۔۔۔۔۔“

ماہین کو کم از کم ان کی ناک کٹنے کی فکر نہ تھی۔ جنہوں نے دو قدم کے فاصلے پر رہتے ہوئے بھانجی کا دکھ محسوس نہ کیا۔ وہ ان کی کیا فکر کرتی۔

اس نے قدسیہ کو لکھ دیا۔

باجی فرزانہ نے اس کے جانے کی خبر ریحان اور

عمران سے چھپائی تھی۔  
جنید اسے لینے آیا تھا۔

\*\*\*

سفر لہا تھا مگر جنید کی ہر لطف باتوں میں کٹ گیا۔  
”تم تو بہت بولنے لگی ہو مائی۔“ اس کے بار بار پوچھے گئے سوالوں پر جنید نے حیران ہو کر کہا۔ وہ ہنس کر چپ ہو گئی۔

گھاڑی نہر کا پل عبور کر چکی تھی اور اب وہاں باغات نہ تھے۔ کچھ قیر شدہ۔ کچھ زیر تعمیر مکان جن کے کین انہیں گھر بنانے کے لیے بے تاب تھے۔ کہیں ٹیلیڈیں رکھی گئی تھیں۔ کہیں مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر۔

”یہ سب کیا ہے جنید؟“ بالوں کی باہر نکلی اٹ بیڑ میں اڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”وہ سب باغات کہاں گئے؟“

”ہمارے بچپن کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔ یہ ساری زمین بسکٹ فیکٹری کے مالک شیخ رمضان نے خرید کر کالونی بنادی۔ جب دھڑا دھڑا گھر بنائے ہیں۔ گھاڑی جانے پہچانے گھر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جدید طرز تعمیر کے حامل گھروں کے درمیان سبز جلی دار دروازوں والا گھر خاصا پرانا لگتا تھا۔ مگر ماہین کے اندر سرشاری سی بھر گیا۔ جنید سلمان اٹھائے اس کے پیچھے تھا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ٹانکوں والا صحن سرسبز گھلوں سے بھر آکر سنسان تھا۔ اس کی نگاہ محوم کر مخصوص جگہ تک گئی اور ٹھک گئی۔

سکھ چین کا پتھر نہیں تھا۔  
ساری چیزیں اڑ گئیں۔ محض چھایا کا احساس ٹاپید ہو گیا۔

”واک بابو۔ واک بابو۔ میرا خط لے جاؤ۔“  
میرے ابو کو دے آؤ۔ پر سوں میری گڑیا کی سا لگ رہے۔

بیڑ کے نیچے ڈکانوں جن کرپٹے کی جیب میں بھرتی مائی بھی غائب ہو گئی۔

”نن۔۔۔۔۔۔ نن۔۔۔۔۔۔“ میرا نوٹ گیا مائیں  
امی ماریں گی۔۔۔۔۔۔ ابو ڈانٹیں گے۔  
ساری آوازیں غائب ہو گئیں۔

وہ کم مسمی کھڑی رہ گئی۔ پھر سب چلے آئے۔  
وہ جو اس کے اپنے تھے۔ وہ برسوں کے بعد ان سے مل رہی تھی مگر محبت اپنا سیت کا احساس بہت گہرا تھا۔  
قدسیہ کے سینے سے لگی وہ محبت کی گرمی جذب کرتی رہی۔

قدسیہ رونے لگیں۔ ماہین نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے چپکے سے کہا۔  
”میں آگئی ہوں نا۔“

”ہاں تم آگئی ہو۔“ وہ آسرا کر پھر سے جی اٹھیں۔  
آنسوؤں کے درمیان مسکرائیں تو ماہین کو یہاں آنے کا فیصلہ غلط نہ لگا۔

\*\*\*

رفیعہ نے پانی کا پائپ کھولا اور صحن میں چھو ڈیا۔  
پانی سارے صحن کو بھگونے لگا۔ صحن سے ایک دم چش اٹھی۔ پھر ٹھٹھا اڑ گیا۔ زین نے باپ اٹھایا اور پورے دھونے لگا۔ علیحدہ نہوانہ لگا کر صحن خشک کر کے چار پائیاں بچھا دیں۔ زین نے پائپ سمیٹ کر رکھا اور دونوں اینٹوں کو لچکا دیے۔

صحن میں گرمی کی شدت کم ہونے لگی۔ تو تمام نفوس کمروں کے جس سے گھبرا کر صحن کا رخ کرنے لگے۔

ماہین نے بچن سے جھانکا۔ علیحدہ شیشے کے گلاس ٹرے میں رکھ رہی تھی۔ رفیعہ نیچے بیٹھی اسٹیل کی باٹی میں سوں نچوڑ رہی تھی۔

”اوہ! اب تک روئین نہیں بدلی۔ میری مدد کی ضرورت ہے؟“ ماہین نے خوش دلی سے کہا۔

”نہیں سبکچین تو تیار رہی ہے۔“ رفیعہ نے کہا تو ماہین نے آگے بڑھ کر ٹرے اٹھالی۔ صحن میں قدسیہ نے کچھ کر ڈانٹا شروع کر دیا۔  
”تم نے ابھی سے کام شروع کر دیا۔“

”بالکل۔۔۔۔۔۔ بہت کام کیا ہے۔ سارے گھر میں پونچھائیں نے تو لگایا تھا۔“ ماہین ہنسی۔  
”بھئی مت ڈانٹو ہماری بچی کو۔۔۔۔۔۔ اس کے آنے سے تو گھر کی رونق بڑھ گئی ہے۔“ ناصر صاحب نما کر وہیں آ گئے۔

”ماں میری تو کچھ لگتی ہی نہیں۔“ وہ خفا ہوئیں۔  
”تم تو بن جاؤ گی ساس۔۔۔۔۔۔ بیٹی تو میری بنے گی۔“

انہوں نے علیحدہ نے ہاتھ سے سبکچین کا گلاس لیتے ہوئے کہا۔ ماہین ذرا سا شرما کر اس چار پائی پر بیٹھ گئی جہاں رفیعہ بچوں کو ہوم ورک کروا رہی تھی۔ پاس ہی فضا بیٹھی پرانا سنڈے میگزین دیکھ رہی تھی۔ اچھی سی نظر ماہین پر ڈالی اور بے نیاز بن گئی۔

تب ہی اسفند بھیا آ گئے۔ وہ کل سے ملکن گئے ہوئے تھے۔ ماہین کا دل چاہا۔ منہ پی کی طرح بھاگ کر ان کے گلے میں دونوں بازو ڈال کر لٹک جائے۔ مگر جھجک کر رک گئی۔

”ارے یہ مائی ہے؟ اتنی بڑی ہو گئی۔“ انہوں نے خوش دلی سے کہتے ہوئے بزرگانہ انداز میں اس کے سر پر ہار دیا۔ ایک دو باتیں پوچھیں اور اندر چلے گئے۔  
”نہیں دیکھ کر ماہین کو دھچکا سا لگا۔ وہ ایک دم بوڑھے سے لگنے لگے تھے۔“

”اللہ! وہ چلنے سے اسفند بھیا کہاں چلے گئے۔“  
وہ بھی بیٹھی سی دوبارہ بیٹھ گئی۔ قدسیہ غلطی سے کہہ رہی تھیں۔

”ماہین کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سوچتی تھی۔ سوچتی ہی نہ جانے کیسی تربیت کرے۔ مگر وہ تو بدل گئی ہے بولنے بھی گئی ہے اور بیٹنے بھی۔“

ساری دوپہر پیچھو پیچھو بیٹھی نے ایک ہی پٹنگ پریٹ کر باتیں ہی تو کی تھیں۔

ماہین نے دل میں سوچا۔ یہ تو اس کے رب کا خاص کرم ہی تھا کہ جن حالات سے وہ گزری بالکل ختم ہونے کے بجائے کنڈن بن گئی۔ کوئی ہاتھ پکڑنے والا تھا نہ رست دکھانے والا اگر کر کر سنبھلی بھوکھا کھا کر خود پر اعتماد کرنا سیکھ لیا۔ جب اپنی ہی انگلی پکڑ کر چلنا



ہے تو انتظار کس کا؟  
”زن کہاں ہوتے ہیں؟“ اس نے ہنسنے سے دریافت کیا۔ اسے آئے دو سرا دن تھا اور ابھی تک زن سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔

”بھائی تو زیادہ تر زمینوں پر ہوتے ہیں۔“ علیہ نے افسردگی سے بتایا۔

”جواب نہیں گئے؟“  
”نہیں۔“

”انہیں پتا ہے میرے آنے کا؟“ ماہین نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”اسی نے بتایا تو تھا۔“  
”شاید تمہارا سامنا کرنے سے کتراتا ہو۔ بچارہ۔“

فضہ نے میگزین فولڈ کرتے ہوئے کہا۔  
”بچارہ کیوں کہتی ہو۔“ علیہ کو برا لگا۔

”تو کیا کہوں۔“ فضہ نے بھنوس اچکا نہیں۔  
”تمہیں تو موقع مل گیا ہے بدلہ لینے کا۔“ فضہ کا انداز علیہ کو تاؤ لگا گیا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے۔۔۔ اللہ نے خود ہی اس کا غور تو فرمایا۔“

”کیا ہو گیا ہے؟“ رفیعہ نے دے لے لے میں سرزنش کی۔ تو فضہ نے ہونہار کر میگزین کھول لیا۔

علیہ ہنٹ چاپاٹنے لگی۔ ماہین خاموشی سے دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے علیہ کی خط میں لکھی باتیں سچ لگنے لگیں۔ فضہ کا انداز ایسے ہی تھے گویا انتقام پر اترتی ہو۔

☆ ☆ ☆

زمین اور اس کے بچوں کی آمد نے گھر میں بھونچال اٹھا رکھا تھا۔ وہ کچھ دیر تو ماہین سے حال احوال دریافت کرتی رہی پھر جو اس کی سسرال کے قصبے شروع ہوئے تو جتنے بھتے پیٹ میں بل پڑنے لگے بھری پڑی سسرال متوجع مزاج لوگ اس پر زمین کا انداز بیان۔

”کاش نازو آتی بھی مائیں ہوتیں۔“  
”وہ نہیں جلدی آنے والی۔ اس کا دل اپنے گھر

میں ہی لگتا ہے۔“ نمونے ہاتھ لہرایا۔ ”اب تو تمہاری شادی کا کارڈ پا کر ہی آئے گی۔“

موضوع بدل گیا۔ سب کا رخ اس کی اور زن کی شادی کی طرف ہو گیا۔ تو وہ چپکے سے اٹھ کر قد سیدھی چارپائی پر اٹھی۔

”اسفند بھیا اب ایسی محفلوں میں نہیں بیٹھے۔“ بیٹھے بیٹھے ذہن میں خیال آیا۔ تو ایسی محفلوں کے روح رواں سمجھے جاتے تھے اب تو اس سے آتے تو کمرے میں گھس جاتے۔ نہ بیوی پر دھیان نہ بچوں سے لگاؤ۔ عجیب بے رنگ زندگی جی رہے تھے کم از کم ماہین کو تو یہی لگتا۔

”چھپو! آپ نے اسفند بھیا کی شادی نازو آپلی سے کیوں نہ کی۔“ زن میں خیال آیا تو حسب عادت رو نہ سکی۔ چپکے سے پوچھ بیٹھی۔

”میری تو بڑی خواہش تھی پر ان دنوں اسفند پڑھ رہا تھا۔ جدہ والا رشتہ اتنا اچھا تھا کہ نفیسہ کو جلدی پڑ گئی۔ میں کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ میرا بچہ کتنا چپ سا ہو گیا ہے۔“ انہوں نے آہ بھری تو ماہین نے چونک کر انہیں دیکھا۔ تو کیا وہ بھی بیٹے کے دل کا حال جانتی تھیں۔

”رفیعہ بھابھی بھی اچھی ہیں۔“  
”نیک بچی ہے۔۔۔ پر اسفند۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رکیں۔ پھر موضوع بدل دیا۔

”زن بھی تو سب سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اپنی ہی ذات میں کم۔ بالکل تنہا دگھڑی ماں کے پاس بھی نہیں بیٹھتا۔ ماہی! بیسری بچی مجھ سے وعدہ کرو۔ مجھے میرا زن واپس لا دو گی۔ اس کے ہونٹوں کی ہنسی آنکھوں کی چمک اس حادثے نے میرے بیٹے سے ساری خوشیاں چھین لیں۔ ماہین میرے بیٹے کا بہت خیال رکھتا۔ صرف تم ہو جو اسے پھر سے جینا سیکھا سکتی ہو۔“

وہ دل گیر لہجے میں کہتے کہتے چو نکلیں۔ بغور ماہین کو دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر خوف زدہ لہجے میں پوچھنے لگیں۔

”تم تو خوش ہو نا۔ کہیں تمہارے اندر کوئی۔“  
”کیسی باتیں کر رہی ہیں چھپو! ماہین نے دوسرا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میں تو زن کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“  
”وہ تم سے ملا؟“

”شاید وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔“ ماہین نے شکوہ کیا۔

”اندر سے ڈرا ہوا ہے مجھ سے کہنے لگا۔ ماہین کو مت بلائیں۔ وہ واپس جائے گی تو آپ کو دکھ ہو گا۔ لیکن میں جانتی ہوں وہ اپنے دکھ کی بات کر رہا تھا۔“

ماہین کا دل بوجھل سا ہونے لگا تو کھڑی ہو گئی۔ قد سیدھے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”گرمی لگ رہی ہے۔ نما کر آتی ہوں۔“  
”سب کو چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ اسے کمرے سے کپڑے لے کر استری اسٹینڈ تک آئی تو تھک کر کمر گئی

اس نے زن کو کہتے پرسوں کے بعد دیکھا تھا اور نہیں سوچا تھا کہ جب زن کو اس حالت میں دیکھے گی تو اس کا ہنارہ عمل کیا ہو گا۔ وہ اپنی شرٹ استری کر رہا تھا۔ ایک ہی ہاتھ سے یہ کام انجام دینے میں اسے کس وقت کا سامنا ہے۔ نظر آ رہا تھا اور ابھی تو وہ سیکھنے کے مراحل میں تھا۔

وہ ساکت سی کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کا کہنی سے اوپر کٹا ہوا بازو سامنے تھا اور وہ ساکت تھی تب ہی ایک طرف سے فضہ نکلی۔

”افو! کیوں مشکل میں پڑتے ہو کسی سے کہہ دیا کرو۔“  
”اس نے استری لینے کے لیے ہاتھ برہنایا۔ زن نے ہاتھ جھٹک دیا اور رکھائی سے بولا۔

”میں اپنا کام خود کر سکتا ہوں۔“  
”تو بے اکڑ نہ گئی۔“

”تم اپنی ہمدردی سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“  
”تم سے ہمدردی کر کون رہا ہے۔“

وہ کہہ کر پلٹی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی۔  
”تم کیوں ساکت کھڑی ہو شک لگا۔“ ماہین کچھ نہیں بولی۔

زن نے چونک کر گردن گھمائی۔ ایک لمحے کو نگاہیں رک سی گئیں پھر دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”مل لو اپنے زن سے۔“ فضہ تمسخرانہ انداز میں کہتی چلی گئی۔ ماہین زن کے قریب آئی اور رشاش سے لہجے میں پوچھنے لگی۔

”پچھانیا تعارف کرواؤں؟“  
”کیسی ہو؟“ زن کا لہجہ نارمل سا تھا۔

”فیسٹ کلاس۔ میں اتنے دنوں سے آئی ہوئی ہوں۔ تم تو گھری نہیں آتے۔“  
”واپس کب جا رہی ہو؟“

ماہین سٹپٹا گئی۔  
”واپس کیوں جاؤں گی؟“

زن نے اک اپنی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ پھر جیسی الٹی سیدھی شرٹ استری کی تھی۔ اٹھا کر چلا گیا۔ ماہین حیران سی کھڑی اب چپاٹنے لگی۔ اس رات وہ بہت روٹی گئی۔ کچھ بھی تھا۔ اسے اوجھڑے سے زن کو دیکھ کر دکھ تو ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے بہت سے دنوں میں اگر ماہین کا رویہ زن کے ساتھ بے تکلفانہ تھا تو زن کا رکھائی لے ہوئے۔

ماہین نے محسوس کیا۔ وہ سارے گھر سے کٹ گیا ہے۔ گھر میں ہوتا تب بھی گھروالوں کے ساتھ نہ بیٹھتا۔

ماہین نے ایک بار بھی زن سے اس کی معذوری کے حوالے سے بات کی نہ ہمدردی میں اس کے ہاتھ سے کام لینے کی۔

”اچھی بات ہے اسے یہ سب خود سیکھنا چاہیے۔“

زن کا رویہ اگر حوصلہ شکن تھا تو یہاں ماہین کی بہت بندھ جانے کو بھی بہت لوگ تھے۔



لبی بند لے کر اٹھی تو شام دھرتی پر اتر آئی تھی۔  
رفیعہ واشگبک مشین لگائے کپڑے دھو رہی تھیں۔  
”رفیعہ بھابھی! آپ دھوپ میں سوئی نہیں۔“  
”لیٹی تھی پھر سوچا“ بچے سو رہے ہیں تو کام ہی  
نہاںوں۔ ”وہ چونکیں پھر مسکرا کر جواب دیا۔  
”میری پھیپھو اتنی غلام ساس تو نہیں ہیں۔“ ماہین  
بھی ساتھ لگ گئی۔ رفیعہ نے منع بھی کیا۔ وہ خاموشی  
سے کپڑے نچوڑ کر پھیلائے گی۔  
”اپنا خیال بھی رکھا کریں بھابھی! جب سے میں  
آئی ہوں آپ کو خود سے بے نیاز۔ ہی دیکھا ہے۔“  
ماہین نے دیکھا۔ وہ ابھی تک کل والے کپڑے پہنے  
ہوئے تھیں۔

”شوہر کی اک ستانہ لگا بیوی کو بننے سنورنے پر  
اک ساتی ہے۔ لیکن اگر کوئی دیکھنا ہی نہ چاہے تو فائدہ۔“  
رفیعہ نے کہتے کہتے لب بچھینچ لیے۔ ماہین طبیعت  
کی اچھی ہے۔ یہ اندازہ لگتے دنوں میں ہوئی گیا تھا۔  
مگر رفیعہ طبیعتاً محتاط تھیں۔ کام ختم ہونے کو تھا۔  
جب اندر چل پل شروع ہو گئی۔ ماہین نے زین کو  
دیکھا۔ وہ نما کر فریش جلیے میں غالباً باہر جانے کے  
ارادے سے نکلا تھا۔ ماہین نے کچھ سوچ کر ہاتھ میں  
پکڑا کپڑا میں پٹا اور اسے پکار لیا۔  
زین نے مڑ کر سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا جو  
دو ستانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”کہیں جارہے ہو؟“  
”تم سے مطلب؟“ اس کی تیوری جڑھ گئی۔  
”ہاں نا۔“ وہ جلدی سے ہاتھ صاف کرتی قریب  
آئی۔ ”تم مجھے کہیں گھما نے نہیں لے کر گئے۔“  
زین کی آنکھوں میں حیرت و اشتعال بتدریج  
ابھرے۔ وہ ماہین سے جتنی بے اعتنائی برتا۔ وہ اتنی  
ہی بے تکلف نظر آتی۔  
”تم میری مسمان نہیں ہو۔“  
”مسمان نہیں۔ تمہاری تو زمہ داری ہوں۔“  
ماہین نے آرام سے ہتھ کی۔  
”ہو نہ۔ زبردستی۔“ وہ جانے کے لیے مڑا۔

”اچھا۔“ ماہین تیزی سے سامنے آئی اور دونوں  
ہاتھ اٹھا کر صلح جو انداز میں گویا ہوئی۔  
”میرا الزامی کامو نہیں ہے۔ کسی اور رشتے کے  
حوالے سے نہ سہی کزن ہونے کی حیثیت سے مجھے  
اسی بلغ میں لے چلو جہاں بچپن میں لے جایا کرتے  
تھے۔“  
”وہاں نہ لے جاؤں جہاں تمہیں شد کی کھیلوں  
نے کانا تھا۔“ زین کے منہ سے پھسلا۔  
ماہین کے چہرے پر خوشگوار سے تاثرات بکھرے۔  
”تمہیں تو کچھ بھی نہیں بھولا زین۔“ زین نے  
لب بچھینچ لیے پھر کچھ سوچ کر بولا۔  
”چلو۔“

ماہین نے مڑ کر دیکھا اور رفیعہ کو اپنے جانے کا  
بتایا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کوکری کا نشان بتا دیا۔  
پھل اتر چکا تھا۔ لیکن آموں کی میٹھی مکارا اب  
بھی درختوں کی گھنیری چھایا میں دم ساوھے موجود تھی۔  
۔۔۔ اوچی لبی کھاس بیروں سے لپٹ جاتی جن پر ٹیڑھے  
رگ رہے تھے۔ طوطوں کی میں میں رنگ  
برنگی چڑیوں کی چکار۔  
ماہین نے آنکھیں بند کر کے ان سب آوازوں کو  
محسوس کیا۔

”پرانے لاہور کی تنگ گلیوں میں رہتے رہتے میں  
ان آوازوں منظوروں کو کتنا ترسی ہوں۔“  
زین نے مڑ کر دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے دونوں بازو  
پھیلائے کمرے کمرے سانس لے رہی تھی۔ اس کا  
چہرہ سوچ کی دم توڑتی شعاعوں کی زد میں تھا۔  
وہ نظریں چڑا گیا۔  
”یہاں کیوں آئی ہو؟“  
ماہین نے آنکھیں کھول کر حیرت سے زین کو دیکھا۔  
پھر بڑی ہی سادگی سے جواب دیا۔  
”تم لائے ہو۔“

وہ اس کے لہجے کی معنی خیزی کو بھانپ گیا تب ہی  
مزید جھنجھالایا۔  
”میرا تماشا دیکھنے آئی ہو۔ یہ دیکھنے کہ کتے ہوئے

بازو کے ساتھ زین کیسا لگتا ہے؟“  
”اتنا ہی پیارا اتنا ہی خوب صورت۔“ ماہین نے  
برکت کہا۔ وہ بے باک نہ تھی۔ خود اعتماد تھی مگر اب  
اس کی سب باکی حالات کا تقاضا تھی۔  
”بہت بولنے لگی ہو۔“ زین اس کی خود اعتمادی  
سے خائف ہوا۔  
”جب ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا تو آپ اپنا  
سارا اپنا برا۔۔۔ خود کو سبق پڑھاتے پڑھاتے کب خود  
اعتمادی گپ چپ سی ماہی کی شخصیت کا حصہ بنی۔ وہ  
خود بھی نہیں جانتی۔“  
”ماہین! واپس چلی جاؤ۔“

”میرے سارے رستے تم تک آ کر رک گئے ہیں  
۔۔۔ ساری کشتیاں جلا کر آئی ہوں۔ اب کہاں جاؤں  
گی۔“

”ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔۔۔ ان لوگوں کو  
مت دیکھو۔ حقیقت پسند بن کر فیصلہ کرو۔ زندگی  
تمہاری ہے۔“

”میرا اور تمہارا رشتہ دکھ سکھ کی سانجھ کا رشتہ ہے  
۔۔۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔“  
”مدر تیرا سمت بنو۔ یہ چیرٹی کسی اور کے ساتھ  
نہاؤ۔“ وہ زہر بھرے لہجے میں بولا۔

”میری محبت تمہیں چیرٹی نظر آتی ہے۔ بہت کور  
چشم ہو زین۔“

”محبت بابا! چار دن میں دم دیا کر بھاگ جائے گی  
تمہاری یہ پام نہاد محبت۔“

”آزادو۔“ ماہین نے چیلنج کیا۔  
”محبت کے دعوے فضا نے بھی کیے تھے۔“

ماہین نے غور سے اسے دیکھا۔ درخت سے پتا  
توڑ کر تکی بنانے لگی۔  
”میں صرف خود کو جانتی ہوں۔“

”چلی جاؤ دفع ہو جاؤ۔ تمہیں مجھ سے کچھ نہیں  
ملے گا۔“ وہ جج کر بولا۔ ماہین نے سیٹی بجائی۔ پتا پاس  
بہتے پانی میں پھینکا پھر اس کی طرف مڑی۔  
”جارہی ہوں۔ لیکن تمہاری زندگی سے ہرگز

نہیں۔“  
”آئی وارن یو ماہین۔۔۔ تم بچھتاؤ گی۔“  
”یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔“ وہ اطمینان سے ہاتھ جھاڑ  
کر چلی آئی۔  
گھر وہ اکیلی آئی تھی۔ صحن میں بیٹھے نفوس اپنے  
تاثرات چھپانے کو خواہ مخواہ مسکراتے لگے۔ وہ علیحدہ  
کے کپاس پنجن میں چلی گئی۔  
”بہیں اب رخصتی کی بات کر لینی چاہیے۔“  
قدیرہ نے سرگوشی میں غصہ سے کہا۔

\*\*\*

وہ کب سے اکیلی صحن میں بیٹھی گھر کی فضا میں  
پھیلی پر اسرار بے چینی کو محسوس کر رہی تھی۔ اسفند  
بھائی کے دونوں بچے ساتھ والی چارپالی پر کتابیں  
پھیلائے لڑ زیادہ رہے تھے۔ ہوا کے زور پر کتابوں  
کے صفحے پھرن پھرتے تو وہ چونک جاتی۔ دھیان  
سارے کا سارا بھٹک کی طرف تھا۔ جہاں سب بڑے  
موجود تھے۔ زین کو وہ بار بار دیکھا۔ وہ دونوں بارتن فٹن  
کرنا کمرے سے نکلا۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنے کمرے  
میں جا گھسا پھر حید اس کے پاس آ بیٹھا۔ علیحدہ اپنا  
جرنل اور رفیعہ سبزی کی نوکری لے کر وہیں آ گئیں۔  
وہ رفیعہ کے ساتھ سبزی بناتے ہوئے مسلسل اندر  
ہونے والی بات چیت کے متعلق سوچ رہی تھی جو کچھ  
اس دن زین نے اس سے بلغ میں کہا اس کے بعد سے  
دل کو دھڑکا سا لگ گیا تھا۔

تب ہی فضا چلی آئی۔ اس کے لبوں پر وہی  
استہزائی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”تم لوگوں کو پتا چلا۔“ اس نے پر اسرار سے انداز  
میں سب کے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔ سب ہی اپنا  
اپنا کام چھوڑ کر فضا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”زین نے ماہین کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا  
ہے۔“ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ماہین گم صم سی  
فضا کی شکل دیکھنے لگی۔  
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ دونوں کا نکاح ہو چکا ہے



اور دونوں۔۔۔ ریفہ انگلی۔  
”میری نافرمانی ہے میں بچپن کے نکاح کو بالکل نہیں  
مانتا۔“ قضاہ ہنسی۔

”تو اس میں دانت نکالنے والی کون سی بات ہے۔“  
جنید کو سن کے انداز پر غصہ آیا۔ قضاہ سہل گئی۔

”میں تو صرف تیار رہی تھی۔“  
”ماہین اپنی! زین بھائی کے کہنے کا مطلب ہے کہ  
۔۔۔“ علینہ نے اپنی طرف سے کچھ کنا چاہا۔ ماہین  
نے بات گت دی۔

”میں اس کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“  
اس کے اندر اشتعال کی لہر ابھری۔

”ماہی! وہ اس وقت ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے  
۔۔۔ بے حد جذباتی اور حساس ہو چکا ہے۔ بہت دکھ میں  
ہے اس لیے۔“

”اس لیے دوسروں کو دکھ دینا نا حق سمجھنے لگا ہے۔“  
وہ سختی سے بولی۔

جنید نے بے بسی سے اسے دیکھا۔  
”تم بھی اس طرح کرو گی تو معاملہ کیسے سلجھے گا۔“

”بھائی یہ نہیں چاہتے کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہو  
۔۔۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ہر قسم کے دباؤ سے آڑ ہو کر  
اپنے متعلق فیصلہ کریں۔“ علینہ نے آہستگی سے  
کہا۔

”میں تو اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔“ ماہین کا غصہ اور  
بروز گیا۔

”ماہین! وہ بہت بے اعتدال ہو گیا ہے۔ محبتوں پر  
اعتبار نہیں کرتا۔ تم نرمی اور سجاوٹ کے ساتھ اس کے  
اندراجے یہ زہریلے کانٹے چن لو۔ اسے پھر سے محبتوں  
پر اعتبار کرنا سکھاؤ اور یقین جانو یہ کام صرف تم کر سکتی  
ہو۔“

جنید نے رساتیت سے سمجھایا۔  
ماہین خاموش ہو گئی۔

کوئی بھی ماہین کی خاموشی سے کچھ بھی اخذ کرنے  
سے قاصر تھا۔



زندگی ہم نے بھی ایک چابی تھی  
پھول تھے ہر سو اور تیری ہمراہی تھی  
انجمن راہوں کا بن گیا تھا مسافر میں  
سفر تو مشکل تھا مگر منزل من چابی تھی

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بچپن سے نہ سہی لڑکھن سے  
جو نام اس کے نام کے ساتھ لکھ دیا گیا ہو وہ اس سے  
کوئی تعلق محسوس نہ کرتا۔ جب جب یاد دست  
محبت یا لاکھ پار نر کا ذکر کرتے۔ اس کا وہ بیان ماہین  
کی طرف چلا جاتا۔ اس نے کئی برسوں تک ماہین کو  
دیکھا نہ تھا نہ اسے نہ اس کی تصویر کو مگر گھر میں اسے  
ہر حوالے سے یاد کیا جاتا۔ جس میں سب سے مضبوط  
حوالہ خود زین کا تھا۔

قدید عید پر اس کے لیے جو کپڑے تیار کروائیں  
بیچنگ کی چور لری جو تے لیں تو خاص طور پر اسے بلا  
کر دکھائیں۔

”دیکھو ماہین نے ماہین کے لیے یہ سب لیا ہے۔“  
”تو میں کیا کروں؟“ وہ بے نیاز زین جاتا۔

”اس پر اچھا لگے گا۔“ وہ دیکھ پھیلا۔  
”مجھے تو کیوں کی چیزوں کا کیا پتا۔“

وہ دانستہ ماہین ذکر کیے رکھتیں کہ زین کا ذہن کسی  
اور سمت نہ جائے۔

”کاش۔۔۔ کاش وہ جاوے نہ ہو اہوتا تو میں۔“ اس  
نے اپنے معذور بازو پر ہاتھ پھیرا اور اذیت سے لب  
بھینچ لیے۔

دروازے میں کوئی سایہ سا آرا۔ زین نے سر اٹھا  
کر دیکھا۔ وہ تول تول کر قدم اٹھاتی اندر آئی دونوں ہاتھ  
میزر نکا کر جھکی۔

”شیریت؟“  
”تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟“

وہ اس کے طرز خطاب پر حیران ہوا۔ حیران تو اس  
دن سے تھا جس دن سے ماہین آئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ ماہین کے پر تیش لہجے کے  
برعکس زین کا لہجہ ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔

”ٹھیک سمجھتے ہو؟“ ماہین نے تسخرانہ انداز میں کہا۔

”ایک ایسا ج کے ساتھ زندگی گزار سکو گی؟“ اس  
نے اک تلخ چٹائی ماہین کے سامنے رکھی۔ زین کا خیال  
تھا کہ یہ وہ سچائی تھی جسے وہ اپنی جذباتیت میں نظر انداز  
کر رہی تھی۔ ماہین کے لبوں پر خوشی مسکراہٹ پھیلی۔

”اس کی پیشانی پر سلوٹیں  
پڑ گئیں۔“  
”میں مجھ سے شادی ختم کرنا چاہتے ہو۔“  
”ہاں۔۔۔“  
”کیوں؟“

”میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔“  
زین نے روکھے لہجے میں کہہ کر دوبارہ سے کتاب پر  
نظریں جمادیں۔

ماہین نے کتاب کھینچ کر ریڈ پر پھینک دی۔  
”تم جواب دہ ہو۔“  
”بدبینی مت کرو۔“ زین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔  
”کروں گی۔“ وہ چلائی۔  
”چلاؤ مت۔“  
”چلاؤں گی۔“ وہ پہلے سے زیادہ جیتی۔  
”تم پاگل ہو گئی ہو۔“ زین نے منظر سے ہٹا چاہا۔  
مگر ماہین نے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کے جھٹکے  
سے شرشکے اوپری دو بٹن ٹوٹ گئے۔  
”ماہی۔“ وہ خلق کے بل دھاڑا۔  
”تم مجھ سے تھپڑ کھاؤ گی۔“  
زین کا ہاتھ جھج جھج اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔  
”مار سکتے ہو تو مارو مگر میں اپنی بات کا جواب لیے بغیر  
نہیں جاؤں گی۔“ اس کا انداز جارحانہ اور لہجہ سختی  
تھا۔

زین اسے کھا جانے والی نظموں سے گھوڑتا رہا پھر  
کندھے سے نیچے مٹی شرت کا زاویہ ایک جھٹکے سے  
ٹھیک کیا اور بیٹھ گیا۔  
”ہاں میں یہ رشتہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔“  
”کیوں؟“

”یہ سوال انکار سے سلے کیوں نہ کیا؟“  
”ماہی! نہیں گزار سکو گی۔“  
”تم میرے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔“

”تم جذباتی ہو رہی ہو۔“  
کمرے کے دروازے پر اک سایہ سار کا پھر دونوں کو  
دیکھ کر گھٹ بھاگ گیا۔

”تم مجھے اپنی زندگی سے نکالنا چاہتے ہو زین۔“  
زین نے ذرا سا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے  
بے حد قریب جھکی ہوئی تھی۔ وہ سیاہ گھوڑ آکھیں  
اپنے اندر غصہ اور دکھ سمونے رستہ روکے کھڑی تھیں۔

وہ نظریں نہ چڑا سکا۔ وہ نظریں چڑا ہی نہ سکتا تھا۔  
وہ کوئی غیر تو نہ تھی۔ اس کی اپنی تھی۔  
بارہا سوچا تھا۔ ماہی کو یوں اپنے کمرے میں اپنے  
قریب۔

اس کی ہنسی کی کھنک اس کمرے کی تنہائی بکھیر دیتی۔  
چوڑیوں کی چھٹک حل کے اس پاس چھینچاتی۔  
”ماہی کو اپنی زندگی سے نکال سکتے ہو؟“  
دل باغی ہو گیا۔  
”نکالنا ہو گا۔“ یہ فیصلہ دل کا تھا۔  
ماہین اس کے چہرے کے اندر چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔  
اندروں جھلکاتی تھی۔

”میں نے کبھی تمہارے سنے نہیں دیکھے۔ کبھی  
تمہارا نام درختوں پر نہیں لکھا۔ کبھی تمہاری تصویر  
کتابوں کے اوراق میں نہیں رکھی۔ کھلتی کلیوں کی  
آہٹوں میں۔ کوئی پیغام خوشبو بھری ہواؤں کے سپرد  
نہیں کیا۔  
کیونکہ۔۔۔!

مجھے کبھی لگا ہی نہیں کہ تم دور ہو اور میں تنہا  
دیکھ نہیں سکتی۔  
تم تو ہمیشہ سے میرے ساتھ تھے۔ دھڑکن بن کر۔  
سانس بن کر۔

خواجہ زین و انجمن 124 اکتوبر 2008

خواجہ زین و انجمن 125 اکتوبر 2008



ہمیشہ یہ یقین میرے ساتھ رہا کہ تم میرے ہو۔  
زین! اب کیوں جدائی مقدر کرتے ہو۔ اب تو  
ملن رت آئی ہے۔ موسم انتظار رخصت ہونے کو  
ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ تم نے مجھے میرا انتظار ہی  
نہیں کیا۔

آؤ زین! بادلوں کے رتھ پہ ہوا کا ہاتھ تھامیں۔  
اور غیلے آکاش کو چھوئے نکلیں۔ محبتوں کی سبز وادیوں  
ہماری منتظر ہیں۔ تمہیں کیا غم ہے؟ میں تمہارے  
ساتھ ہوں۔ سارے دکھ چن لوں گی۔ تمہارا ہاتھ بن  
جاؤں گی۔ ساری محرومیاں ساری تنہائیاں دے دو  
۔۔۔ تمہیں مالا مال کروں گی۔۔۔ سودا کرو زین! ابھی  
گھائے میں نہ رہو گے۔

مجھے اپنے دکھ دو میں تمہیں اپنی ہنسی دیتی ہوں۔  
دونوں کے اندر بھنور بننے لگے جو اربھائے اٹھتے  
تھے۔ باہر دونوں اپنی اپنی انا کا ہاتھ تھامے آنکھوں  
میں آنکھیں ڈالے گھوڑ رہے تھے۔

”اگر یہ سب شادی کے بعد ہوتا تو۔۔۔؟“  
”تب تمہارے پاس کوئی چواکس نہ ہوتی۔  
معاشرتی و خاندانی جبر تمہیں ساری زندگی اک لپاچ کے  
ساتھ رہنے پر مجبور کر دیتا۔ اب کیوں جبر کی زندگی جینا  
چاہتی ہو۔“

”مشر زین العابدین۔۔۔!“ اس نے اک جھٹکے سے  
ماتھے پر گرے بالوں کو پیچھے ہٹایا اور چبا چبا کر بولی۔  
”ماہین کو اپنی زندگی سے اتنی آسانی سے بے دخل کر دو  
گے یہ ممکن ہی نہیں۔ ماہند اس۔“

میز پر ہاتھ مار کر وارننگ دیتی وہ کمرے سے نکلتی چلی  
گئی۔ وہ سب جو دروازے سے چپکے کھڑے تھے۔  
بگٹ بھاگے۔ اگلے دروازے پر فضا کھڑی تھی ہلکی  
سی تسخرا۔ مسکراہٹ لبوں پر سجائے۔

”کہاں بھاگی جاتی ہو ماہی۔“ وہ ذرا آگے نکل گئی تو  
پکارا ”ذرا میرے پاس بھی بیٹھ جاؤ۔“

فالتو کاموں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔  
ماہین رکھائی سے بولی۔

”اوہو! سنا تھا بڑی ناک والی ہو۔ میں بھی یہی

سمجھتی تھی لیکن آج۔۔۔ چہرے محبتوں کی بھیکسگامتی ماہی  
کو دیکھ کر شرم سی آگئی۔“

ماہین کی ملیلی نے ہم قدموں سے اس کے سامنے  
آئی۔ دو ستانہ انداز میں فضا کے کندھے پر ہاتھ دکھا  
”جو لوگ دوسروں کی چیز پر نظر رکھتے ہیں انہیں  
شرم آنی بھی چاہیے۔ میں تو اپنی ہی چیز مانگ رہی تھی  
اس میں کیسی شرم؟“

وہ دل جلانے والی مسکراہٹ اچھاتی چلی گئی۔  
فضا تھملا اٹھی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے۔۔۔ میں اس لپاچ زین میں  
انتر سٹھ ہوں۔ مائی فٹ۔ کوئی تم جیسی بے وقوف  
ہی اس ٹھڈے کے ساتھ زندگی گزارے گی۔“  
اس کی چیخ نما آواز آگ کی طرح زین کے کمرے کی  
طرف لپکی۔

زین نے دروازہ حائر سے بند کیا تھا۔



بہت کم ہرے بادل تھے اور بہت تیز بارش۔ پودوں کی  
نازک ٹہنیاں جھکی جا رہی تھیں گھلی پھول ٹٹل سے  
لوٹ کر بارش کے ساتھ برس رہے تھے۔

وہ سب پر آمدے میں پیٹھے آم کھا رہے تھے۔ بائیں  
کے نزدیک چٹکلوں کی پھولوں کی ڈھیری لگ گئی۔

”اب کے سلاون سے پہلے ہی سلاون کا مزا آگیا۔“  
ماہین بائیں سے ہاتھ دھو کر کھڑی ہو گئی۔

”کیوں بھئی۔ تم نے میدان کیوں چھوڑ دیا؟“  
”بس۔“ وہ ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی

بارش اسے بھگونے لگی۔  
”ماہی! یاد ہے جب ایسی بارش میں تمہیں کھیلوں  
نے کاٹا تھا۔“ جنید نے پکار کر کہا تو وہ مسکرا دی۔

اسفند کے دونوں بچے جانیے پنے آگے پیچھے بھاگتے  
ہوئے آئے اور بارش میں گول گول گھومنے لگے۔

رفیع پوڑے، پکوڑے، املی کی چٹنی کے ساتھ لے  
آئیں۔

”آج آؤ ماہی۔“ علی نے پکارا۔

وہ دلچسپی سے بچوں کو دیکھتی رہی۔ اس کا دل چاہا وہ  
بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائے تب ہی اسفند بچوں کو  
ڈانٹنے لگے تو وہ بے اختیار بول اٹھی۔

”کھینے دیں۔ کتنا اچھا ہے کر رہے ہیں۔“  
”خواتین اچھا پیار ہوں گے تو مصیبت۔“

”آپ کے لیے کیسی مصیبت۔ منہا لے تو مجھے  
ہیں۔“ رفیعہ قدرے تنگ کر بولیں۔

”خدا انخواستہ کیوں بیمار ہوں گے۔ گرمیوں کی  
بارش میں کون بیمار ہوتا ہے۔“

ماہین ان کے کورمیان آ بیٹھی۔ پوڑا ہاتھ میں لے کر  
آپ کے اچار کے ساتھ مزے سے کھانے لگی۔

”بہت مزے کے ہیں بھابی!“  
رفیعہ خاموشی سے بچوں کو دیکھنے لگیں۔ جو ایک  
دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑا رہے تھے۔

”اسفند بھیا! دونوں بالکل آپ پر گئے ہیں۔ یاد  
ہے آپ بارش کیسے انجوائے کرتے تھے۔ بالکل  
بہوانے ہو جاتے۔ اتنا بھٹے اتنا بھٹے سرکوں پر اونچی اونچی  
گائے گاتے مست ہو جاتے۔ بھیا! اب آپ کو بارش  
اچھی نہیں لگتی؟“

وہ واقعی پہلے والی ماہی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے بول  
اٹھی۔

اسفند جڑبڑ ہو کر اوپر اوپر دیکھنے لگے۔  
”اچھا! یہ بھٹتے بھی تھے۔“ رفیعہ کے لمحے میں  
حسرت تھی یا طنز سب ایک مل کو چپ سے ہو گئے۔

رفیعہ اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔ جس کی مسکراہٹ  
لماؤس کی رات میں چمکتی کرن جیسی تھی۔ نہ لماؤس  
میں چاند نکلنے نہ کرن جگمگانے۔

اور ماہین رفیعہ کو دیکھ کر افسوس سے سوچ رہی تھی۔  
”نازو آئی! آپ کو جانا تھا تو اسفند بھیا کی مسکراہٹ  
ہی چھوڑ جائیں اس عورت کو کیا ملا؟ محض بے  
اعتمادی، بے زاری۔ لیکن کون جانے وہ بھی کبھی  
کھل کر مسکرائی ہوں گی یا نہیں۔ شاید ان کا شوہر  
بھی اسی تعجب سے دیکھتا ہو گا جو رفیعہ کی آنکھوں سے

جھانکتا ہے۔

”ایسا کیوں ہوتا ہے؟“  
اس نے ارد گرد مسکراتے چہروں کو دیکھا۔  
”ہم محبت کسی سے کرتے ہیں۔ بے کیف اور بے  
رنگ زندگی کسی اور کے ساتھ گزارتے ہیں۔  
مسکراہٹ کسی کو دان کر کے آنکھوں کی بے زاری دل  
کا خلی بن کسی اور کو تحفہ دیتے ہیں ایسی منافقت۔  
یہ منافقت مجھ سے نہیں ہوتی۔  
محبت تم سے کی ہے زین العابدین! زندگی بھی  
تمہارے ساتھ گزارنی ہے۔  
بیٹل کا فیصلہ ہے۔  
تو سو دو زبان کا سوال کیا؟“

اس نے باقی پوڑا علیحدہ کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ اس  
کی بے توجہی و دیکھ کر جنید نے توجہ پٹائی۔  
”تم کل زین سے لڑنے لگی تھیں یا منانے؟“  
”تو کیا کروں قدموں میں گر جاؤں۔“ ماہین کو غصہ  
آ گیا۔

”ایا! تھوڑا پیار اور ہمدردی سے۔ وہ اس وقت  
جس جذباتی کشمکش سے گزر رہا ہے اس میں تمہاری  
محبت توجہ۔“

”مجھ سے اس سے زیادہ کی توقع مت کرنا۔ اسے  
یوں بھی یہ سب ترس اور رحم لگتا ہے۔“  
”تم اس کی محرومی کا اندازہ نہیں کر سکتیں؟“ اسفند  
نے آہستہ سے کہا۔  
”جانتی ہوں لیکن اسفند بھیا! زین نا شکر ہے۔  
اگر اس حادثے میں اس کے دونوں ہاتھ چلے جاتے تو  
اسے شکر کرنا چاہیے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔  
لوگ تو بڑی بڑی محرومیوں کے ساتھ شان دار زندگی جی  
جاتے ہیں اور مجھے اس کی محذوری سے زیادہ اس کی کم  
ہمتی پر دکھ اور افسوس ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے زین کی  
زندگی میں ایک کی ہے وہ اسے بھول نہیں سکتا۔ اس  
کے ساتھ ایڈجسٹ ہو کر رہے۔“

”تم تو سیانی ہو گئی ہو۔“ جنید نے مٹاڑ ہو کر کہا۔  
”کاش تھوڑا سیانا پن تمہارے کزن میں بھی آجاتا



”وہ جل کر بولی۔“

”کل تم فضع سے کس بات پر ابھی تھیں۔ وہ اب تک بگڑی ہوئی ہے۔“ رفیعہ نے آہستہ سے پوچھا۔  
”میں کہاں فضع ابھی تھی ہے وہ بھی خواجہ خواجہ۔“ مایین نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے تب ہی فضع آگئی۔  
اس نے بے حد روکھے لہجے میں کہا۔

”تمہیں کیا بلایا رہے ہیں۔“  
”میرے لیے پکڑے رکھ لیتا۔“ وہ بے تکلفی سے کہتی اٹھ گئی۔

”ہونہ۔“ فضع نے اس کی سیٹ سنبھال لی۔  
کاریڈور میں زین سے ملے بھیڑ ہو گئی۔ وہ غالباً باہر جا رہا تھا۔  
”کہاں جا رہے ہو؟“ وہ رستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہیں سوال جواب کرنے کا حق کس نے دیا ہے۔“

”تم نے۔“ مایین نے اک خوب صورت مسکن لبوں پر سجا کر بوجھت کہا۔ زین نے اک طنز سی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور جگہ اور سفید پرٹ والے قیص دوپٹے میں ملبوس دوپٹہ سلیپ سے پھیلائے۔ بائیں کوساؤں سے باندھے۔ وہ دل کے کہیں آس پاس کھڑی نظر آئی۔ وہ خوب صورت نہیں تھی۔ مگر صرف خوب صورتی ہی دل میں اترنے کا حق نہیں رکھتی۔ یہ تو رب کا کرم ہے کہ عام سی صورت بھی دل کھینچ لے۔

زین نے جھنجھلا کر اسے بے دھکیلا اور چلا گیا۔  
وہ لڑکھائی پھر سنبھل کر قس دی۔

”کب تک تعافل برتو گے۔“  
کمرے میں قدسیہ اور ناصر متشکر چہرے لیے اس کے منہ پر تھے۔

مایین کا ہاتھ ٹکا۔ ناصر صاحب کے اشارے پر وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم گھروالوں کی اجازت کے بغیر آئی ہو۔“  
قدسیہ سے رہانہ گیا۔ چھوٹے ہی پوچھ لیا۔

”کون سے گھروالے؟“ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر خاموشی سے سر جھکا لیا۔

”ہمارے خاندان کی لڑکیاں اتنی بے لگام تو نہیں ہوتیں۔“ ناصر صاحب نے سختی سے کہا۔ مایین نے سوچا تھا، چپ رہے گی۔ پھر خیال آیا۔ سارا الزام تو اسی پر آئے گا۔ اس نے دھیرے دھیرے سب حالات بتا دیے۔

”دیکھا میں نہ کہتی تھی مایین ایسی خود سر نہیں۔“  
قدسیہ نے جلدی سے کہا۔

”تم وہاں سے کچھ۔“ ناصر صاحب اک بل کو رک سے گئے۔ ”کوئی نقدی یا زیور۔“

مایین کا دل غمبھک سے اڑ گیا۔ اس نے بے حد صدمے سے پچھسی کو دیکھا۔ گلارندہ گیا۔

”انہوں نے ایسا کہا۔“  
”جانتی ہوں۔ نیٹوں میں فٹورے۔ کہتے ہوں گے، چیز کے نام پر کچھ نہ دینا پڑے۔“

”اگ لگے ایسے چیز کو۔۔۔ شکر ہے تب بروقت دونوں کے نکاح کا فیصلہ کر لیا۔ بس اب آپ ولیمہ کا فکشن رکھ کر یہ قصہ بکا میں۔“

”آپ سے یہ فرزانہ باجی نے کہا۔“ مایین کی آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی۔

”اس کے بیٹے سے بات ہوئی تھی۔ تمہارے ماسوں کو بھی فون کیا تھا کہ اب رخصتی ہو جائے۔

انہوں نے صاف کہہ دیا تم ان کی اجازت کے بغیر آئی ہو۔ سمجھیں رخصتی ہو گئی۔ ہونہ کہتے ہوں گے۔

باپ تو یہاں ہے نہیں۔ کہیں پیسہ دھیلا خرچ نہ کرنا پڑ جائے۔“

”پھر بھی اعجاز سے رابطہ ضروری ہے۔“  
دونوں آپس میں بات کرنے لگیں مایین رو جھل دل کے ساتھ باہر نکل آئی۔ برآمدہ خالی تھا۔ ایک کرسی پر

تک کر خوب روٹی۔ زین نے اسے دھواں دھار روٹے دیکھا اور پلٹ گیا۔ مایین نے اسے پلٹتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

سنگدل، کھوڑے بے موت۔



فضع نے زین کو آتے دیکھا تھا۔ اندر کہیں اگ سی لگ گئی۔ تب ہی سرخ بدل کر لسن چھیلی رفیعہ سے بولی۔

”چہ۔۔۔ چہ بچاری مایین! میں بھی کہوں ایسی کیا بات ہے جو مایین زین جیسے اوصوے شخص کا ساتھ قبول کرنے کے لیے مری جا رہی ہے۔ ظاہر ہے جس

لڑکی کا کوئی گھر نہ رہے۔ رشتے دار منہ پھیر لیں۔ سو تیل بھالی عزت کے ورے ہوں تو وہ کرے۔ کیا خالی ہاتھ۔ ایسے تو کوئی رشتہ ملنے سے رہا لے دے کر رہی رہ جاتا ہے۔ ادھورا زین۔“

رفیعہ نے چھری ہاتھ سے رکھ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

”تم سے یہ سب کس نے کہا؟“  
”آپ کی طرح آنکھ کان بند کر کے نہیں رہتی۔“

”مجبوری کے سواے ہیں سارے کے سارے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”خیر زین میں کس چیز کی کمی ہے۔ پڑھا لکھا۔ اچھی شکل و صورت کا مالک۔ زمینوں کا سارا کاروبار اسی نے سنبھال رکھا ہے۔“

”خیر، کمی تو خاصی بڑی ہے۔ اب آپ نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں تو۔“

زین نے پانی کی بوتل مٹی ایک دم مڑا اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کھینچ لیا۔

”کیا بکواس کر رہی تھیں؟“ وہ غریبا۔  
فضع ایک بل کو گھبرائی، تکلیف کی شدت سے آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ مگر کمال جرات سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”حقیقت بیان کر رہی تھی۔ کون اک معذور شخص کا ساتھ خوشی سے قبول کر سکتا ہے۔ مجبوری کے۔“

”جانتا ہوں، کس بات کا بدلہ لے رہی ہو۔“  
فضع سلگ اٹھی، تشدد سی کھڑی رفیعہ گھبرا کر

”خود کو معذور مت کہا کرو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔“

آگے بڑھیں۔

”کیا اگل پن ہے زین۔ چھوڑو اسے۔“  
”رہے دیں بھابھی! مردہ ہوتا ہے جس کے مضبوط بازو عورت کی حفاظت کر سکیں جبکہ یہ تو۔“ اس نے

ایک جھٹکے سے خود کو زین کے اکلوتے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کرایا اور دوپٹ چلی گئی۔

زین کے اندر باہر بھانیز جل اٹھے۔ انداز ایسا تھا گویا ابھی جھپٹ پڑے گا مگر مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ برآمدہ میں چارپائی پر بیٹھی بلکے بندھے پر تیل ٹانگ رہی تھی۔ زین نے دوپٹہ کھینچ کر دوڑ بھینکا۔ اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ گھسیٹا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا۔ ایک جھٹکے سے چھوڑ کر غریبا۔

”یہ کیا تمنا ہے۔“  
”توبہ ہے زین۔ میرا بازو توڑ ڈالا۔ ایسی بھی کیا بے مائی۔ شادی کی ڈسٹ فکس ہو تو گئی ہے۔“

”بکواس کرنے میں مایین کا کافی کوئی نہ تھا۔ بے سوچے سمجھے بولی۔“

”شٹ اپ۔“ وہ حلق کے بل دھاڑا۔  
”تم تو ابھی سے شوہر بننے کی پریکٹس کرنے لگے۔“

زین جارحانہ انداز میں آگے بڑھا۔ مایین ڈر کر دیوار سے جا لگی۔

”مسئلہ کیا ہے؟“  
”تم انکار کیوں نہیں کر رہیں؟“

”میں انکار کیوں کروں؟“ سوال کے بدلے سوال حاضر تھا۔

زین آگے بڑھا۔ وہ دیوار میں سوراخ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے چھپکی کی طرح دیوار سے چپک گئی۔

زین نے ایک ہاتھ دیوار پر ٹکایا۔ معذور بازو اس کے کندھے پر۔

”غور سے دیکھو اک معذور کے ساتھ ساری عمر گزار لو گی۔“

مایین نے ذرا سا نظروں کا زاویہ بدل کر اس کا بازو دیکھا۔ پھر آہستہ سے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”خود کو معذور مت کہا کرو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔“



”انتہائی ڈھیٹ مٹی کی بنی ہو۔ کچھ نہیں ملے گا تمہیں۔ سسک سسک کر مروگی میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔“ اسے اعتبار نہ آتا تھا۔

”یہ سب اپنے باپ سے کہو یا اپنی ماں سے۔ اعتراض تمہیں ہے اس لیے انکار بھی خود ہی کرو۔ میرے کندھے پر بندوق رکھنے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے جھٹ آٹکھیں مارتے ہوئے رکھ لیں۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ پیچھے ہٹ کر دھاڑا۔

”یہاں سے دفع ہو جاؤں گی۔ تمہاری زندگی سے نہیں۔“

وہ آہستگی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

وہ واقعی ڈھیٹ مٹی سے بنی تھی۔



شادی کی مخصوص گماگمھی شروع ہو گئی۔ سبازوں کے چکر لگنے لگے۔ نمونہ آئی بھی اکثر وقت نکال کر آجائیں۔ جدہ سے نانڈو آئی کے آنے کا غلطہ اٹھا۔ ناصر صاحب نے بھائی کے مشورہ سے اک مناسب تاریخ رکھ کر مہمانوں کو فون کر کا دیے۔ کیس دفعہ درزن کو بٹھا کر ڈرائیون سمجھا دیں۔ انیس علیہما بین کو بازار گھسیٹ لیتی۔ رنگ برنگے ریشمی پیرا بن یہاں وہاں دکھائی دیتے۔ زین غصے میں پھول پھول کر نا پھرنا گھر سب نے آنکھیں کلن بند کر لیے تھے۔ قدسیہ شوہر کی ممنون تھیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے وہ ان کی بیٹی کے لیے اتنا کچھ کر رہے تھے۔ شاید وہ اتنا کچھ نہ کرتے۔ مگر بیٹی کی معذوری سامنے تھی۔

”زین! اپنا بند دوم سیٹ تو پسند کرو۔“ قدسیہ نے بیٹے کو پکارا۔ وہ زین کا کمرہ خفی طرز سے سجانا چاہتی تھیں۔ تاکہ ماہین کے دل میں کوئی بات نہ آئے اور زین کو بھی زندگی میں نیا پن محسوس ہو۔ اس نے کیٹلاگ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

”تمہیں تمیز نہیں رہی۔“ نفیسہ بھی بیٹھی تھیں۔

”دیواری کے سامنے بیٹے کی اس بد تمیزی پر غصہ آ گیا۔

”میں نے کہا تھا یہ سب کرنے کو۔“

”تمہارے باپ نے کیا ہے۔ اسی سے سوال جواب کرو۔“ انہوں نے کیٹلاگ اٹھا کر علیحدہ کودیا۔

”ماہین کو دکھاؤ۔ جو وہ پسند کرے۔“

زین کچھ اور سلگ گیا۔

”میں شادی کے دن گھر ہی نہیں آؤں گا۔“

”نکاح کے لیے دہما کی ضرورت ہوتی ہے۔ رخصتی اس کے بغیر بھی ہو جاتی ہے۔“ نفیسہ نے ہنس کر ماحول کی کٹی دور کرنا چاہی۔

”ٹھیک ہے چچی جان۔۔۔ رخصتی میرے بغیر ہی ہو گی۔“

وہ تن فن کر تباہر نکل گیا۔

”اب کیا ہو گا۔ زین کے طور اچھے نہیں ہیں۔“

نفیسہ نے کچھ گہرا کر جھٹائی کود کھلا۔

”کچھ نہیں ہو گا۔ سارے غصے میرے لیے ہیں۔ باپ کے سامنے بیٹگی ملی بن جاتا ہے۔“ انہوں نے لاپرواہی سے کہا۔



وہ آہ کے درخت کے نیچے بیٹے پانی کے کٹے تالے کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنی گہری سوچ تھی کہ کسی گے گے کی آہٹ بھی محسوس نہ ہوئی۔

”کیوں خود کو الجھا رہے ہو۔“

جنید کی آواز پر وہ چونکا لیکن پلٹا نہیں۔ خاموشی سے نکلا دانتوں میں چپاتے ہوئے کراس ہو پر کو یہاں وہاں جھد کتے دیکھنے لگا۔ بچپن میں اس گھاس کے جھاڑ کو چڑنے کے لیے پورے باغ میں آگے پیچھے بھاگا کرتے تھے۔

جنید اس کے پاس آ بیٹھا۔

”نانڈو آئی اور اشعر بھائی آئے ہیں۔“

”یہ لوگ میری بات نہیں سمجھ رہے۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

”تم جیسے بیچپور شخص کے منہ سے بچوں جیسی باتیں سن کر کون سمجھے گا۔“

”شٹ اپ!“ زین بگڑا۔

”یار! کیوں کر رہے ہو ایسا۔ ماہین میں کیا کمی ہے؟“

”کی اس میں نہیں سمجھ میں ہے۔ تم لوگوں کو کیوں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“

”دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں بھی اور ماہین کو بھی۔ اس کے باوجود وہ خوش ہے تو تم کیوں معترض ہو۔“

”خوش نہیں مجبور ہے۔“

”بدگمان مت ہو۔ زین! محبتوں کی قدر کرنا سیکھو۔ وہ لڑکی تمہارے لیے بہت کچھ چھوڑ آئی ہے۔“

جنید نے اس کا کندھا ہولے سے دبا یا۔

”میرے لیے نہیں وہ وہاں مشکل میں تھی اس لیے۔“

”اس لیے۔“ جنید نے حیزی سے اس کی بات کاٹ لی۔

”اس لیے تم پر زہم داری اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ تمہاری منکوحہ ہے۔ اب سے نہیں کئی برسوں سے۔ اب اگر وہ کسی مشکل میں ہے تو مدد کے لیے تمہاری طرف ہی دیکھے گی۔ تم کیا اسے ایک لپچھوڑو گے، ایسے مرد ہو یا را! تمہاری بیوی کو تمہاری ضرورت ہے اور تم ہو کہ جان چھڑا رہے ہو۔“

”میں اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔“ وہ متذبذب سا ہوا۔

”کیوں۔؟“ جنید کو اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔

”حفاظت کے لیے بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”نہیں۔۔۔ بازوؤں سے زیادہ ہمت، حوصلے اور مرواگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا بازو کے ساتھ ان عقائد سے بھی محروم ہو چکے ہو۔“

جنید نے برا کا رکی وار کیا تھا۔ وہ ہلکا اٹھا۔

”جنید! تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”جارا ہوں۔ گھر آ جانا۔۔۔ نانڈو آئی اور اشعر بھائی تمہارا پوچھ رہے ہیں۔ آئی کی تو خیر ہے لیکن اشعر ہمارا بسوئی ہے۔ خیال رہے۔“

وہ کہہ کر چلا گیا۔

زین نے دونوں ہاتھوں میں سر قہام لیا۔



”نانڈو آئی! آپ تو گوشت کا سہاڑن گئی ہیں۔“

ماہین تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ دلی کی نانڈو پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ گوشت سے بڑی مونی کھائیوں میں خوب صورت سونے کے کنگن، ہتھکے میں مونی چین، کانوں میں آویزے۔۔۔ بے حد قیمتی اور نفیس سوٹ سفید رنگت میں چھلکتی سرخیاں پات کرنے کا بے فکر انداز، قہقہے وہ اک انتہائی خوشحال خاتون خانہ دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے بچے خرگوش کی طرح پورے صحن میں بھاگتے پھر رہے تھے اور وہ اونچی آواز میں ایک کے بعد دوسری بات نکال لیتیں۔

”امی! میرے پاس بیٹھیں۔“

”تائی امی! بچپن میں کیا کر رہی ہیں عموکیاں ہیں نا!“

”رفیعہ بھابھی! عاشر چکن نہیں کھاتے۔“

”یہ اسفند بھیا اور زین کیارات بھی گھر سے باہر گزرتے ہیں؟“

بیٹھک سے بھی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے بار بار رخام لے کر آ جاتے۔

”سکینین کا جگہ ہنادیں۔“

”چائے کے اتنے کپ۔“

نمونہ آئی کو بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ ان کے اندر باہر چکر لگتے ہی رہتے۔ کبھی بچن میں جا کر رفیعہ اور فضلہ کی مدد کروانے لگتیں، کبھی ان کے درمیان آ بیٹھتیں۔

”نمونہ! عاشر چائے نہیں پیتے۔ بس دودھ میں ذرا کیٹی۔“

”تو! تمہارے میان کتنے نخرے لیے ہیں۔“ نمونہ بچن سے نکلیں۔

”اے کون سے نخرے دکھا دیے۔ خجور اور میرے میاں کو کچھ کہا ہو۔“ نانڈو آئی خفا ہوئے لگیں۔

وہ یہ جملہ با آواز بلند کہہ رہی تھیں۔ جب اسفند نے گھر میں قدم رکھا۔ ایک پل کو ان کے قدم چوٹ پر ٹھک سے گئے۔ ماہین نے بغور ان کے



چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔ پھر وہ سنبھل کر آگے بڑھے۔

”کس نے تمہارے میاں کی شان میں گستاخی کر دی۔“

”کس کی جرات ہے۔“ وہ نہیں۔

”ٹھیک تو ہے۔۔۔ بچے اشعر کہاں بیٹھک میں ہے؟“ وہ ایک سی سانس میں گتے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

”آئی! آپ تو اتنی دلی تکی ہوا کرتی تھیں۔“ مایہن ابھی تنگ سوپیں اٹکی تھی۔

”لو۔ بچوں کے بعد کون دیکھتا رہا ہے۔ تمہیں بھی پتا چلے گا جب۔“

”نمو آئی بھی تو ہیں۔“ علیہ نے اس کی بات قطع کی۔

”اے نموی بات چھوڑو۔“

زمین جو تھال میں آلو بخارے اور آڑو لے کر آ رہی تھی۔ قدرے جل کر بولی۔ ”ہمیں تو اماں نے دھکا دیا۔ بھرے پرے سسرال میں۔ ناشتہ کروانے کھڑی ہوں تو دوڑتے دوڑتے گیارہ بج جاتے ہیں۔

آخری بندے کو چائے دے کر فارغ ہو تو پہلا پھر سے پینے کو تیار ہوتا ہے، کبھی جو ایک منٹ کی فرصت ملتی ہو۔

غیش تو نازو کے ہیں بس میاں اور بچے بدل چاہا تو کام کر لیا ورنہ اگر کنڈیشنڈ روم میں بیٹھ کر بیوی دیکھتے رہو۔“

زمین نے رشک سے نازمین کو دیکھا۔

وہ خمرے مسکراتی آلو بخارے کھانے لگیں۔

مغرب کا وقت زیادہ دور نہ تھا۔ جب زمین گھر میں داخل ہوا۔

”آؤ دو لہاراج! ہم دیدہ و دل فرش راہ کے بیٹھے ہیں اور تم ہو کہ غائب۔ اب روئین بدلو۔ بیوی گھر آ رہی ہے۔“

نازو نے اٹھ کر اسے بہت سا بار کیا۔ بالکل جیندی طرح عزیز تھا وہ۔ دل میں آنسو گرنے لگے۔ مگر لہجہ ہشاش بشاش تھا۔

”بیوی نے کہاں سے آتا ہے۔۔۔ وہ تل ریڈی گھر

میں موجود ہے۔“ فضا نے انٹری دی اور طنزیہ انداز سے مایہن کو دیکھا۔

”تو کیا ہوا؟ یہ مایہن کامیاب بھی ہے اور سسرال بھی آخر اتنی امی نے اسے پالا ہے۔“

زمین نے تسبیہی انداز میں بہن کو گھورا، مایہن کے لبوں پر دل چلانے والی مسکراہٹ ابھری۔ فضا جل کر دوبارہ سے بچن میں جا گئی۔ زمین نے اک

سر سری نگاہ مایہن کے مسکراتے چہرے پر ڈالی۔ آنکھوں میں ابھرتی فاتحانہ چمک کو دیکھا اور مڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔

نازو آئی تیزی سے استری شدہ کپڑوں کی تہ لگاتے اوپر اوپر کی باتیں کیے جاری تھیں۔ اسفند بھیا کب سے الماری میں سرگھسائے کچھ ایسا ڈھونڈ رہے تھے جو

مل کر ہی نہ دیتا۔ مایہن نے بے حد کوفت سے انہیں دیکھا۔ وہ بوکی نازو آئی کے اس لباس پہانے ہمارے

سے چکر اٹھتا تھا نازو کا وہی معمول کا لہجہ ہوا۔ ”میں فکر تھی تو صرف یہ کہ عاشر کی خدمت گزار میں کوئی گی

نہ رہ جائے۔ بچوں کا وزن کم نہ ہو کہ وہ کھانے سے زیادہ کھینے پر توجہ دیتے تھے۔

”ارے آپ اب بھی عمران سیریز پڑھتے ہیں۔“

اسفند کے ہاتھ میں عمران سیریز دیکھ کر نازو نے ایک قہقہے سے ٹکٹا دھاگا دانٹوں سے توڑتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

یہ کمرواب اسفند کا اسٹڈی روم کہلاتا تھا۔ کون جانے وہ یہاں اسٹڈی کرنے آتے تھے یا پچھری محبت کا

نوج پڑھنے۔

”نہیں بھئی۔ یہ تو یونی۔۔۔“ انہوں نے بوکھا کر ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ الماری میں ٹھوسا۔ پھر ذرا

رک کر بولے۔

”تم بھی تو خواتین کے بہانے بہت شوق سے پڑھا کرتی تھیں۔“

”ہائے۔۔۔ اب کہاں وقت ملتا ہے۔“ وہ قہقہے کو

تہہ لگانے لگیں۔

”اور وہ۔۔۔ وہ یاد ہے بارش میں جب تم گانا سنایا کرتی تھیں۔“

”نہیں۔۔۔ اتنی پرانی اور فضول باتیں کس کو یاد رہتی ہیں۔“

اسفند نے حیرت سے نازو کو دیکھا اور بڑبڑائے۔

”پرانی اور فضول۔“

جن باتوں اور باتوں کے پیچھے وہ زندگی گزار آئے وہ نازو کے لیے فضول اور پرانی ہو گئیں۔ کیسے بھگتی تھی

’روٹی تھی کہ اسے شارچہ والے سے بیاہ نہیں کرنا اور اب شارچہ والے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

مایہن کو دونوں پر غصہ آنے لگا۔

”نازو آئی! کیا نئے رشتے استوار کرنے سے پرانی محبتیں بھول جاتی ہیں۔“

دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھا گئے۔

”جو محبتیں کچھ دے نہیں سکتیں۔ انہیں بھول جاتا ہی اچھا۔ جو محبت دوسرے بہت سے رشتوں کی

حق تلفی کرتے لگے۔ اے زندہ رکھنے کا فائدہ۔ ماضی میں جی کر حالیہ رشتوں کو نظر انداز کرنے والے صرف

ان رشتوں کے ہی نہیں خدا کے بھی گناہگار ہوتے ہیں کہ خدا ان کے حوالے سے ہم سے جواب طلبی کرے گا۔“

نازو آئی کا لہجہ مضبوط اور مخصوص سی لاہروائی لیے ہوئے تھا۔ وہ خوشبو کے جھوٹے کی طرح کمرے سے

نکل گئیں۔ مایہن نے گم صم کھڑے اسفند کو دیکھا ذرا کی ذرا ان کے پاس رکی۔

”غور کرنے کی بات ہے بھیا! کہیں آپ بھی خدا کے گناہگار تو نہیں۔“

وہ کمرے کی تھالی میں گم صم سے کھڑے رہ گئے۔

بو جھل سا تھا۔۔۔ رات سے ابابے حد یاد آرہے تھے۔

علیہ کام چھوڑ کر اس کے پاس آئی، دونوں ہاتھ پکڑ کر بے اختیار بولی۔

”اللہ! مایہن آئی آپ کی ساس آپ کو کتنا چاہتی ہیں۔“

”کو نہ! فضا نے برتنوں کی ٹرے سک میں بچی۔

”اس میں کیا شک ہے۔“ مایہن نے دل سے کہا۔

”یہ ابھر جیسی مہندی ہے جس کے ہاتھ میں لگے گی اتنا ہی رنگ لائے گی۔“ فضا چائے کی ٹرے لے کر باہر نکل گئی۔

”ہونہ جھلس۔“ علیہ نے آہستگی سے کہا۔

”اس کی باتوں پر زیادہ توجہ نہ دیا کرو۔“ رفیعہ نے مایہن کو تسلی دی اور شہرت کا جگ علیہ کے ہاتھ میں

تھمایا۔

”یہ فردوس خالہ کو دے آؤ۔“

”تو یہ فردوس خالہ اور ان کی فرمائشیں۔“ علیہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

رفیعہ سک صاف کرنے لگیں۔ مایہن مڑی لیکن اسفند کو دیکھ کر رک گئی۔ اسفند نے ایک نظر مایہن کو

دیکھا، پھر رفیعہ کو، وہ صبح سے کاموں میں جتی ہوئی تھیں۔ رفیعہ نے بھی انہیں دیکھ لیا پھر مصروف سے انداز میں پوچھا۔

”آپ کو کچھ چاہیے؟“

”نہیں میں تو پوچھنے آیا تھا کہ۔۔۔“

مایہن نے سوچا اسے یہاں سے جانا چاہیے۔ مگر دروازے میں وہ ایستادہ تھے۔

”تم نے کپڑے بنوائے؟“

جواباً رفیعہ نے مڑ کر جن حیرت زدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

”بنوانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میرے پاس بہت سے نئے کپڑے پڑے تھے۔ یوں بھی میں نے

ج سنور کر کس کو دکھانا ہے۔“

”بچوں کے۔“

”اس گھر میں آپ کے علاوہ بھی کچھ میواں ہیں۔“



بن گئے تھے۔ ”رفیعہ کے لمبے میں تخی ہی تخی تھی سو کچھ اور شرمندہ ہو کر واپس مڑ گئے۔  
”ان کو کج کیا ہوا؟“

ماہین نے جوش سے رفیعہ کو کندھوں سے پکڑا۔  
”چلی دستک ہے۔ غور سے سینس مگلی دستک پر درجہ کھول دیتے گا۔ باہر آپ اور بچوں کی خوشیاں منتظر کھڑی ہوں گی۔ میں پچھو سے مل کر آئی ہوں۔“  
وہ ہکا بکا کھڑی رفیعہ کو چھوڑ کر بڑے کمرے میں آ گئی۔  
جہاں ساری خواتین جمع تھیں۔

”لو لو! من کو دیکھو، ایسے من گشت کرتی پھر رہی ہے۔“  
نجانے کس نے کہا۔ وہ ابھی تک ماہوں کے جوڑے پیلا چوڑی دار پانچواںہہ ”کرتا“ جس پر سبز گونے کا کام تھا اور بڑا سا بیلا دیشہ اوڑھے تھی۔  
اسے قدسیہ کو نے میں اک بڑے سے ایٹمی پر جھکی نظر آئیں۔  
”پچھو!“

”اس! آخر یہاں کیا کر رہی ہو؟“ پچھو نے سراٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔  
”پچھو! اب اسے رابطہ ہوا۔“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”لو، تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔“ قدسیہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اسی کی اجازت سے تو سب ہو رہا ہے بلکہ اس نے چیک بھی بھیجا ہے اسی سے تو سارا سامان بنوایا ہے۔“

”یہ ساس ہو میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔“ کسی نے دور سے پوچھا۔ قدسیہ منگربانی کی تفصیل کرے میں موجود تمام خواتین کو دینے لگیں۔

ماہین چپکے سے باہر برآمدے کی طرف نکل آئی۔  
صحن میں رات کا بکھرا ہوا تھا۔ ٹولی سبز و پیلی لڑیاں بچھے ہوئے لوندھے پڑے دیے۔ جن میں بچا مچھا تیل بہہ گیا تھا وہ جی سجا کی کرسی پر ماہین کو بٹھا کر رسمی کی گئی تھی دیواروں پر جی پتیاں، ہوا ب بھی جل رہی تھیں۔  
نازو آبی نے شور مچایا تھا۔

”مند ہی ضرور ہے گی۔“

وہ خود ہی جا کر سارا سامان لائیں۔ جی جان سے مندی کی پلیٹیں سجا کیں۔ جو لوگوں کے ہاتھ کم اور بچوں کے ہاتھ زیادہ آئیں۔ جلتی ہوئی موسم تیلوں سے انہوں نے ایک دوسرے کے بالوں اور مندی کی لڑیوں کو خوب خوب آگ لگائی۔۔۔ علیحدہ بولائی ہوئی ایک ایک کی آگ بجھاتی پھر رہی تھی۔ مندی کمرے سے صحن میں آئی تو نازو آبی آگے آگے بھگڑاؤ الٹی آ رہی تھیں۔ ان کا ڈانس بھگڑے ہی سے مشابہ تھا۔  
۔۔۔ جنید ہاتھ ملتا رہ گیا۔  
”یہ تو میرا آٹم تھا۔“

خوب رونق رہی۔ تمام شادی شدہ خواتین نے گدا ڈالا۔۔۔ ڈھولک پر مناز اور تہید اختر کے فلمی اور مسرت نذیر کے شادی کے گانے گائے۔ پھر زن کو لایا گیا۔ وہ لب بچھے یوں بیٹھا رہا گویا ابھی اٹھ کر کسی گدا دے گا۔

خواتین کے حق با۔۔۔ بچارہ جیسے الفاظ کالوں میں سیدہ بچھلاتے رہے۔ وہ گویا جان چھڑا کر بھاگا تھا۔  
ماہین سر جھکائے مسکراتی رہی اور اب۔

اس نے ہونٹ کھلتے ہوئے صحن میں کھیلے بچوں کو دیکھا۔ رات اچانک آجائے والی بارش نے لکھن کا انتقام کر دیا۔ اب بھی دھوپ غائب تھی۔ بادلوں کی ٹکڑیاں آسمان پر جمع ہو رہی تھیں۔ گویا رات کو کسی بھی مل بارش متوقع تھی۔ اس کا تبادلہ بھرے بدل سا بوجھ اٹھائے تھا۔ آنکھیں برسنے کو تیار اس کے بس میں ہو تا تو وہ لپا کا چیکہ جوں کالوں واپس بھیجتی۔

آج اس کی شادی تھی۔ اگر وہ سر پر ہاتھ رکھ کر دعا نہ دے سکتے تھے تو یہ رقم بھی بے کار ہی تھی۔

”اب! آپ نے مجھے بیش فالتوشے سمجھا۔ جب نظر بڑی اٹھا کر کسی میز پر رکھ دیا۔ پھر بھول گئے۔ وہ چتر لڑھکی، بید کے نیچے پچ گئی۔ یا الماری کے نیچے اس بات کی جھٹک کر دوبارہ نظر کب پڑے گی۔

جن لوگوں میں گھر بنانے کی خونہ ہو۔ انہیں شادی نہیں کرنا چاہیے۔ آوارہ مزاج پرندوں کا گھونسلے سے



کیا تعلق۔ آپ نے وہ شادیاں کیں۔ گھر ایک بھی نہ بنا سکے۔ وہ بکلی ہوئی ہاتھ روم میں جا بھسی۔ ہلکے سبز اور پینک کنٹراسٹ کالنگا ہم رنگ موتیوں والا جزاؤ سیٹ، کنکشن، پھولوں سی تار والی ننھے، میکا۔ ساری ہی لوازمات پورے تھے۔ اسے نازو اور نمونے گھر پر ہی تیار کیا۔ خود مابین کی ضد بھی کہ پارلر نہیں جائے گی۔

”پہلے ہی بڑی اچھی صورت ہے۔ اس پر گھر کی تیاری سوئے پر ساگا۔“  
”موسم سلسل بڑھاتی رہی۔ اب پتا نہیں انہوں نے جی جان سے تیار کی تھی۔ یا دلہن اپنے کا قدرتی روپ۔ وہ خوب ہی پیاری لگی جس کسی نے دیکھا۔ کھل کر تعریف کی۔“

باہر جب دیگوں کے منہ کھلے۔ فضا رنگ برنگے کھانوں کی منک سے بھر گئی۔ عورتیں بے قرار ہوئیں۔ بچے باہر کو بھاگے۔ جنید اور اسفند جلدی جلدی ویٹروں کی مدد سے صحن میں خواتین کے لیے ٹیبل سیٹ کرنے لگے۔ تب ہی کسی نے اچانک آکر بتایا۔  
”ماہین کے اپا آئے ہیں۔“  
وہ بے قرار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھ جاؤ۔ وہ اوھر ہی آرہے ہیں۔“ نازو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر واپس دھکیلا۔ اس کی منتظر نگاہیں چمچ چمچ بریس جب اس نے اپا کو اندر آتے دیکھا۔ کھانا لگنے کی وجہ سے کمرہ خالی ہو گیا تھا۔  
نرمین جلدی جلدی بھر اسلمان سمیٹ رہی تھی۔ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو وہ ان سے لپٹ کر خوب خوب روئی۔

نرمین نے سر پیٹ لیا۔ بمشکل ان سے الگ کیا۔  
”ابا! آپ اب آئے ہیں۔“ اس نے ہچکیوں سے شکوہ کیا۔

”کاش تم وہاں سے نہ آتیں۔ تو میں تمہیں اس سے زیادہ دھوم دھام سے رخصت کرتا۔ تم نے خود اپنے آپ کو اڑا لیا کیا ہے ماہین!“

”یہ کیا۔ یہ کیا کہہ دیا ابانے۔“ وہ دھواں دھواں

چہرے کے ساتھ انھیں جانا دیکھنے لگی۔

”ٹوکیا۔ ٹوکیا اب بھی اسی کو قصور وار سمجھتے ہیں۔ کیا پھپھو نے انہیں کچھ بھی نہ بتایا ہو گا؟ کیا پھپھو ٹھیک کہتی ہیں۔ کیا مجھے یہاں آنے سے پہلے اباسے بات کرنا چاہیے تھی مگر وہ تھے کہاں؟“  
نرمین نے اسے بٹھا کر پانی کا گلاس لیوں سے لگا دیا۔ وہ کسی پتھر کی طرح ساکت تھی۔

رخصتی کا سفر نیچے سے اوپر کے کمرے تک کا تھا۔ ساری رات جنید اور اس کے دوستوں نے گلاب کی لڑیوں سے کمرے کی سجاوٹ کی پھر نئے فرنیچر کی وجہ سے کمرہ یوں بھی چمک اٹھا تھا۔ نازو گلابوں کی منک اور ایئر فرنیچر کی خوشبو نے اعصاب پر کچھ اچھا اثر ڈالا۔ وہ تھوڑا پرسکون ہو کر بیٹھ گئی۔

”ٹھیک ہے مابانے پہلے کون سامیرے ساتھ اچھا سلوک روار کھائے۔ جو آج رکھتے۔“  
وہ خود کو پرسکون کرتی زین کے کمرے میں سوچنے لگی۔ ابھی بچانے اس کا کون سا رویہ سامنے آتا تھا۔ آج سارا دن وہ ایک بل کے لیے بھی نظر نہ آیا تھا۔ بند کھڑکی کی درازوں سے آتی غم ہوائے بارش کا شدیدہ سنایا۔

باہر بڑھ رہی تھی۔  
پھر دھیرے دھیرے وہ ساری آوازیں دم توڑ گئیں۔  
”بلی رہی تو بارش کی کھڑکی پر دستک۔“

”بارش کو سننا بھی اچھا لگتا ہے۔“ اس نے اپنا دھیان پٹانا چاہا اور سنبھل کر کھسکی، کیسے پر سر رکھ کر نیم دراز ہو گئی۔ جسم کو ذرا آرام ملا تو پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔

”پتا نہیں۔۔۔ آج وہ کمرے میں آئے گا بھی یا نہیں۔“

یہ آخری خیال تھا۔ پھر تو ہوا کی تان پر بارش کا رقص تھا اور وہ۔۔۔

وہ کھنے جگلوں میں مورن کرنا چتی تھی۔  
اپنے بد صورت پاؤں پر نگاہ پڑتی تو روئے لگتی۔  
کتنا وقت بیتا۔ پیروں میں بھیجی بارش کی پازناب

نئی نیا ہوا کی تال۔  
وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ کچھ لمحے خود پر جھکے زین کو دیکھتی رہی۔

نیم خوابیدہ آنکھوں میں سرخی کے ساتھ کچھ تو ایسا تھا۔ جس نے زین کو سرخ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس کی پشت کو دیکھتی سیدھی ہو بیٹھی۔ وہ سادہ سے شلوار ٹیس میں ملبوس تھا۔

”ہو گئی تمہاری خواہش پوری۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا تولیہ بیڈ پر پھینکا۔ سرخ نرم و نازک پتیوں پر وہ بیٹا تولیہ کس قدر فضول لگ رہا تھا۔

”کون سی خواہش؟“ مابین نے تولیے سے نظریں ہٹا کر پھر سے زین کو دیکھا۔

”اس کمرے میں آنے کی خواہش میری زندگی میں شامل ہونے کی خواہش۔“

اس نے اضطرابی انداز میں سائڈ ٹیبل پر پڑا سکرٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ ایک ہی ہاتھ سے سکرٹ نکال کر پیکٹ دوبارہ ٹیبل پر پٹا پھر ٹھک گیا۔

مابین لائینر اٹھا چکی تھی۔  
”کیا بہت بڑی خواہش تھی۔“ اس نے لائینر جلا کر ہاتھ اونچا کیا۔

زین نے اس کی کھائی دیو جلی۔ پھر غرایا۔  
”کچھ نہیں ملے گا نہیں۔۔۔ نہ زین۔۔۔ نہ زین کے دل میں جگہ۔“

کالج کی چوڑی ٹوٹی۔ کھائی میں پیوست ہو گئی۔  
مابین کے لبوں سے سسکی سی نکلی۔

”میں نے کہا تھا تم سے۔ تم اپنے سارے رحم اور ہمدردیاں سمیٹ کر یہاں سے چلی جاؤ۔ مگر تمہیں شوق تھا۔ انسانیت کی علم بردار بننے کا تو ہونے۔“ اس نے کھائی کو جھٹکا دیا۔ مابین نے سسکی روکنے کو لب چبا لیا۔

”معصوم و مظلوم بن کر دنیا کو بتایا کرتا۔ یہ معذور نفس میرے مقدر میں لکھا تھا تاکہ وہ تم سے ہمدردی کریں کب تک یہ کھیل کھیلو گی۔ آگیا جاؤ گی۔“

اس نے جھٹکے سے کھائی چھوڑی۔ وہ بیڈ کراؤن

# دکھن

اکتوبر 2008 کے شمارے کی ایک جھلک

- ☆ ”میری چکی روزہ کشائی“ میسرورے،
- ☆ ”مشہور اکاؤنٹ“ سمرین ”سائی“ سے شاپن رشید کی ملاقات،
- ☆ ”فائزہ الفجار“ ”دو کے پھاڑنے“ کے ساتھ،
- ☆ ”چاکا کھانا رانگے“ میں ”وجیرہ شامل خان“ سے گھر کی باتیں،
- ☆ ”ماں جی“ صدف جاوید قریشی کے قلم سے،
- ☆ ”میں سادول“ آمنہ ریاض کا سلسلہ وار ناول،
- ☆ ”خواب خواہش اور زندگی“ راجہ رزاق کا سلسلہ وار ناول،
- ☆ فوزیہ یامین کا کھل ناول،
- ☆ ”کتنی حسین ہے زندگی“ ریحانہ علی کا ناول،
- ☆ ”وہ ایک ستارہ میرا“ میوش افکار کا ناول،
- ☆ ”کسی لاکھی یار“ سائرہ عارف کا ناول و لچسپ موز پر،
- ☆ ”محبت یوں نہیں اچھی“ آمنہ رشید سندھو،
- ☆ ”تھوڑے“ رقصانہ گارڈن کا دلچسپ ناول،
- ☆ ”آزاد ہے وہ ساحل پر“ لطفی جیدون کا ناول،
- ☆ ”تم سے کہا تھا“ شامیلہ بٹ کا دلچسپ ناول،
- ☆ نزہت جمیل شیاہ، رضوان ارشاد احمد ممتاز کنول، روحیلہ خان اور

ایک شمارے کے ساتھ کرن کتاب

”روپ سنگھار، عید اور شادیاں کی تیاریاں“

کرن کے برسات کے ساتھ لکھنے سے فائن خدمت ہے، استفادہ کیجئے۔



سے جاگلی۔ زین کمرے میں چکراتا آگ برساتا رہا۔ بدگمانیوں کی کوئی حد بھی تھی۔ بجائے کس کس کاغصہ اس پر نکل رہا تھا۔ ماہین جانتی تھی میسا ہو گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ زین کے لبوں سے کوئی محبت بھری بات سننے کے بجائے کچھ ایسا ہی سنے گی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ برداشت نہ کر سکے گی۔ جل تو وہ پہلے ہی رہی تھی۔ اب تو لگتا تھا کسی الاؤ میں کھڑی ہے کمرے میں تیش اور ٹھن ایک ساتھ بڑھ آئی۔ اسے لگا وہ منٹ بھی بیٹھی رہی تو سانس گھٹ جائے گی۔

وہ لنگا سیٹ کراٹھی۔ چوڑی، نکلن، پازرب ایک ساتھ بچ اٹھے۔

زین کچھ حیرت سے پلٹ کر دیکھنے لگا۔

ماہین کھڑکی کھول رہی تھی۔

نم ہوا، خوشبو، بارش کی آواز کمرے کے کونے کونے میں گھس آئی۔ اور گلابوں کی مہک سے ہم آغوش ہونے لگی۔ کچھ بوندیں اس کی جلتی پیشانی پر گریں۔

اس نے دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکت پر رکھے اور ذرا سا آگے ہوئی۔ بارش اس کے چہرے پر برسی، آنکھ کا کاہل بہہ نکلا۔

”ہاں یونہی مظلومیت کا ڈھونگ رچانا۔ لیکن میں تمہارے بھانسنے میں نہیں آؤں گا۔ تمہارا جب دل چاہے۔ یہاں سے جاسکتی ہو۔ میری زندگی میں تمہاری کوئی گنجائش نہیں۔“

اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ کس قدر کٹھور بن رہا تھا۔

برآمدے سے اک سایہ سا نکلا۔

ماہین تھوڑا اور جھکی۔

بجلی چمکی۔

”با“ ماہین کے لبوں سے چیخ سی نکلی۔ وہ پٹی۔ زین سامنے ہی کھڑا تھا۔ اسے دھکا دے کر مٹاتے ہوئے بھاگی۔ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ زین ششدر سا رہ گیا۔

گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ کون سا تماشا کرنے جا رہی تھی۔ سارا غصہ دھڑے کا دھڑا رہ گیا۔

وہ بوکھلا کر پیچھے لپکا۔ پانی چھابوں چھانج برس رہا تھا۔ اور بیڑھیوں پانی سے بھری ہوئی۔ اس کا رنگ پیچھے گھٹ رہا تھا۔ کئی بار بھٹکے بھٹکے پکی۔ لیکن جب تک وہ پیچھے پچی۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ جانے والا چلا گیا۔ حسب معمول بنا دیکھے، بنا جانے کے کمرے نے صدا دی۔ کون پیچھے لپکا۔ وہ صحن میں گھٹنوں کے تل گر کر بکلتی رہی۔

”بابا بابا!“

بند دروازے کے دوسری طرف آواز نہ جاتی تھی۔ بارش اس پر برسی رہی۔ وہ ایک پاؤں آخری بیڑھی پر اور دوسرا پیچھے رکھے متذبذب سا ماہین کو دیکھنے لگا۔ وہ روتے روتے ایک دم ٹھیک کر چیخ اٹھی۔

”کیوں۔۔۔ اب کیوں؟ کیوں ساری زندگی آپ چوروں کی طرح آتے اور چوروں کی طرح جاتے رہے۔ لوگ اولاد پیدا کر کے اس کی چھایا بن جاتے ہیں۔ آپ نے مجھے دوسروں کے در پر ڈال دیا۔ میرا قصور تھا کہ میری پیدائش کے وقت میری ماں مر گئی۔ میرا قصور تھا کہ آپ کو ان سے محبت نہیں عشق تھا۔ جو جنون بنا کر آپ کو در بدر بھٹکاتا رہا اور میں، میں حرام نصیب، میرے نصیب میں کوئی گھر ہی نہیں۔ میں کہاں جاؤں کہاں دھکے کھاؤں؟“

وہ جسے بچپن سے اپنا جانا۔ وہ جس کا نام ایک بار دل کے کورے کانڈ پر لکھا تو کسی اور کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔

وہ میرا شوہر، مجھے قبولے کو تیار نہیں۔ وہ میری محبت کو ڈھونگ مٹاتا ہے۔

میں کیا کروں، میں کہاں جاؤں۔ مجھے ساتھ لے جائیں اب۔“

بہت زور کی چوٹ پڑی تھی، تمام نماؤں داخل کھڑے کھڑے ہو گیا۔ وہ سر ہلکا بارش کے پانی میں نہ بیگا تھا۔ عرق ندامت تھا جو شرابور کر گیا۔ کیسی کیسی

بدگمانیاں تھیں جو دھل گئیں۔ فصد کا اتفاقات، پھر بے رخی، استغناء، انداز، لوگوں کی ترس بھری نگاہیں۔ اسے اپنا آپ کتنا کمتر لگنے لگا تھا۔ ایک اچھی بھلی لڑکی اک معذور شخص کا ساتھ کیوں قبول کرے گی۔ ان ہی فضول سوچوں میں الجھتے کڑھتے وہ اپنی ہی محبت کو بے اختیار کر گیا۔

یقین، بس ایک لمحہ جو خاموشی سے آکر دل میں جاگزیں ہو گیا۔ برآمدے میں کئی کھڑکیاں کھلیں۔ روشنیوں کے دائرے پانی میں رقص کرنے لگے۔ وہ یونہی روٹھے بچے کی طرح پانی میں ہاتھ مار مار کر روتی، بکلتی رہی۔

”ماہی۔“ زین اس کے سامنے بیٹھا۔

”اب کیوں آئے ہو؟“ ماہین نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ ”تمہیں میں گوارا نہیں، ٹھیک ہے چلی جاؤں گی۔ کبھی نہیں آؤں گی۔ چھوڑ دو تم مجھے۔ تمہیں کیا لگتا ہے تم چھوڑ دو گے۔ تو کوئی اور بھی نہ ملے گا۔“ وہ ہوش میں نہ تھی۔

”تمہیں تو بہت مل جائیں گے۔ زین کو ماہین جیسی کوئی نہ ملے گی۔“ اس نے بازو پھیلا کر ماہین کو ساتھ لگا لیا۔ اس نے چمڑے کی سسی نہیں کی۔ بس رونے لگی۔

ایک ایک کر کے ساری کھڑکیاں بند ہو گئیں۔ ”تم نے ہمیشہ میرا مذاق اڑایا۔“

”میں احمق تھا۔“ زین نے فراخ دلی سے تسلیم کیا۔

”میری محبت کی تذلیل کی۔“

”یا گل اور ناشکر تھا۔“

”تم نے مجھے نکل جانے کو کہا۔“ شکووں کا کوئی انت نہ تھا۔

”تمہارا جب دل چاہے، مجھے کک آؤٹ کر دینا۔“

”ابا مجھے چھوڑ کر چلے گئے زین۔“ اس کا نیکہ زین کے سینے پر جیسے لگا۔

”یہ پہلی بار تو نہیں ہوا۔ ہم کوشش کریں گے، وہ

واپس آجائیں۔“

”تم نے۔۔۔ تم نے مجھے بہت رولایا ہے۔“ لہجے میں مکمل یسائی تھی۔

”یہ آخری بار ہے۔ اب ان لبوں پر صرف ہنسی کھلے گی۔“ اس نے ماہین کا چہرہ اونچا کیا اور جھٹکا۔

ماہین نے اسے بہت زور سے دھکا دیا۔ وہ پھسل گیا۔ ”تم کیا ہنسناؤ گے۔ تم نے تو سب ستیا ناس کر دیا۔ میرا رنگ کتنا مزگ اور خوب صورت تھا۔ سارا برہاد ہو گیا اور نازو آبی کا تاتی محنت سے کیا گیا میک اپ۔“

وہ غفلت سی مسکراہٹ لبوں میں دبائے اسے دیکھتا رہا لیکن منظر دھندلا سا تھا۔

بارش دونوں پر برس رہی تھی۔ زین کا جی چاہا۔ اسے ہاتھ بڑھا کر کھینچ لے، لیکن خیال آیا۔ ہند کھڑکیوں کی کسی نہ کسی دروازے روشنی کی لکیر باہر آ رہی تھی۔

بجلی ایک دم کڑکی۔ وہ ڈر کر چپ ہوئی۔ زین سرعت سے اٹھا۔ اسے بازو سے پھینچتے ہوئے بیڑھیوں کی سمت چل دیا۔

انہیں پانی لڑائی کمرے میں کرنا تھی۔ یونہی ہوتا ہے۔ ہم اپنی ہی بدگمانیوں کے ہاتھوں جس زور موسم مقتدر کر لیتے ہیں۔

خوشبو آواز دے یا بارش صدا سنیں۔ ہم درپچوں پر بے اعتباریوں کے قفل ڈالے رکھتے ہیں۔

لیکن اس نے درپچ کھول دیا تھا۔ بارش کی خوشبو، گلابوں کی خوشبو سے ہم آغوش ہونے لگی۔





# اے شہرِ دل کے شہر



”اچھا یہ کس شاعر نے کہا ہے؟“ صدف باجی نے گھورا۔  
”یہ کچھ تو میں نے کہا ہے اور کچھ غالباً“ فیض نے کہا ہے۔  
”انتہائی افسوس ناک کہا ہے جس نے بھی کہا۔“ وہ تڑپے ہوئیں۔

رضا اچھا سامنے لے کر رہ گیا۔ غالباً اسے راولی توقع تھی۔ مگر صدف باجی سے ایسی توقعات کرنا ہی فضول تھا۔ کوئی ان سے پوچھتا کہ جون جولائی میں کراچی آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لوڈ شیڈنگ گرمی اور بس۔ موسم اچھا ہوا تو بارش ہو گئی اور مصیبت۔ سڑکیں خراب۔ آنے جانے کا راستہ نہیں ایسے میں لوگوں کا غصے میں آجانا فطری تھا۔ مگر باجی کا اصرار تھا کہ گرمی تو اس موسم میں ہر جگہ ہوتی ہے۔ یہ شہر تو پھر بھی غنیمت ہے کہ درجہ حرارت نسبتاً کم ہے۔ چنانچہ وہ شہریوں پر تنقید شروع کر دیتیں۔ وہ لوگ سکتے رہ جاتے۔ اب بھی یہی ہو رہا تھا۔ لیکن پھر کیا یک انہوں نے پینترا بدلا۔

”لیکن بہر حال تم لوگوں نے شاپنگ پیچھڑ کے معاملے میں انقلاب بلا کے کمال کر دیا۔“ وہ چونکی۔

”کون سا انقلاب؟“  
”یہی شاپنگ پیچھڑ کی جگہ کاغذ کے لفافے یا باسک استعمال کرنے کا۔ سچی جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ

گھنٹے بھر سے ان کی بحث جاری تھی۔ کوئی بھی ہار مان لینے کو تیار نہیں تھا۔ موضوع بحث وہی میرا شہر تیرا شہر صدف باجی پر دہی تھیں۔ اپنے شہر کی تعریف میں رطب اللسان کو ہر لوگ مسلسل دفاع کر رہے تھے۔ مگر وہ بھی لگتا تھا۔ پوری چارج شیٹ تیار کر کے لائی تھیں۔

”ذرا صبر تو ہے نہیں تم لوگوں میں۔ بجلی جاتی ہے تو سڑکوں پر ناگزیر جلانا شروع کر دیتے ہو۔ گرمی کوئی بھرے کوئی۔ غلطی کے ای ایس سی والوں کی ہے۔ سڑا خود اپنے لوگوں کو دی جا رہی ہے۔ سڑکیں بلاک کی جائیں گی تو کے ای ایس سی والوں کو کیا فرق پڑے گا۔ بے چارے راہ گیر آفس آنے جانے والے ہی پریشانی اٹھا میں گے نا۔“

”آپ نہیں جانتیں یہ سب کوئی ہوش میں رہ کر تھوڑا ہی کرتا ہے۔ غصے میں سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ اس لیے ایسی حرکتیں ہوتی ہیں۔“ شامہ نے جواب دیا۔

”جی اسی لیے تو شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔“

رضانے باقاعدہ ترنم سے پڑھنا شروع کر دیا۔

”گرمی سے جو گھبرا میں

تو لوگ کہاں جا میں

آجاتے ہیں سڑکوں پر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر“

”کون کرے؟“ یہ وہ سستی بھری سوچ تھی جو ہر علم و عقل کو دستی چلی جا رہی تھی۔ اس سوچ کے حامل شہری بھی تھے اور غالباً انتظامیہ بھی جو شروع شروع میں تو کافی سختی کرتی رہی۔ پھر کسی اور طرف متوجہ ہو گئی اور سب دوبارہ نریک پر آ گئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ ٹاشٹے کا کافی سامان بیکری سے لے کر آئی تھی۔ ہر چیز کے لیے علیحدہ پھیلی دی گئی تھی۔ اول تو اتنی بھر بار غیر ضروری تھی۔ دوسرے بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں کسی پھیلی میں رکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی ہاتھ میں بھی لایا جاسکتا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں تاکہ برا سا لگتا ہے۔ تو بس اس شویازی کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا ضروری تھا۔ خواہ اس طریقے سے پیدا ہونے والی خرابی کسی بھی طریقے سے ختم نہ ہو سکے۔

صدف باجی جہاں سے آئی تھیں۔ وہاں شاید انہیں یہی اطلاع ملی تھی کہ کراچی والوں نے شاپنگ پیچھڑ کا استعمال چھوڑ کر آلودگی کے خلاف جدوجہد کا

اب تو کراچی کے شہری خود منع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی انہیں پلاسٹک کی تھیلیوں میں سودا دے۔ اسے کہتے ہیں شعور۔ آخر کو یہاں کی زیادہ آبادی بڑھی لکھی ہے۔ ایسی چیزوں کے مضراثرات سے آگاہی تو ہونی ہی تھی۔

صدف باجی کچھ زیادہ ہی فدا ہو رہی تھیں۔ اور وہ چکی بیٹھی مسلسل اس کوشش میں تھی کہ ان کی نظر کسی طرح بھی اس پھیلی کی طرف نہ جانے پائے جس میں بچوں کے لیے بسکٹ اور پیس کے پکٹ تھے۔ کون سا انقلاب؟ کہاں کا شعور؟ بس چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔ والا حال تھا۔ بے شک یہ قانون لاگو ہوا تھا اور کچھ مہینے اس پر سمجیدگی سے عمل بھی ہوا جس کے بعد پھر سب لوگ بھول بھال گئے۔ رہ گئے شہری اور ان کا شعور تو نہ تو تعلیم یافتہ ہونے میں کوئی شک تھا نہ حالات سے آگاہی میں۔ مگر ایک عنصر اور تھا جو ان سب خصوصیات پر حاوی ہو گیا تھا اور وہ تھا لا پرواہی۔



آغاز کر دیا ہے۔ اب شاملہ حقیقت سے پرہ اشاکر خواجہ اپنے شہر کا بیج کیوں خراب کرتی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ کم از کم وہ ان کے سامنے کسی غیر معیاری شاپنگ بیگ کا استعمال نہیں کرے گی۔

یہ فیصلہ کرنا تو آسان تھا۔ اس پر عمل درآمد خاصا مشکل۔ اس نے بازار جانے کے لیے تین باسکٹ خریدی تھیں۔ ایک سودا سلف کے لیے، دوسری سبزی گوشت کے لیے، تیسری کپڑوں اور دیگر اشیاء کے لیے۔ عام طور پر خریداری کی یہی تین قسمیں تھیں۔ اسے بس یاد رکھنا ہوتا تھا کہ کس وقت کون سی باسکٹ استعمال میں لانی ہے۔ ایسا کرنا بالکل بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن مشکل پھر بھی تھی اور یہ مشکل تھی لوگوں کا رویہ۔ دکان دار حیران ہو کر پہلے باسکٹ کو دیکھتا۔ پھر خاطر میں نہ لاتے ہوئے تھیلی میں سودا پکڑا دیتا۔ وہ شکریہ ادا کر کے اپنی چیزیں نکال کر باسکٹ میں ڈال لیتی اور تھیلی واپس کر دیتی۔ دکان دار سمجھ نہ پاتا اور اپنے تئیں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

”ارے باجی! کچھ نہیں ہوتا۔ سب استعمال کر رہے ہیں۔ وہ تو بس شروع شروع کا جوش تھا۔ اب تو کوئی پروا بھی نہیں کرتا۔“

”وہ تو صحیح ہے بھائی صاحب۔ مگر آخر کب تک؟ کبھی تو پروا کرنی ہی پڑے گی۔ آج ہی کر لوں تو کیا برا ہے؟“ وہ مسکرا کر جواب دیتی آگے بڑھ جاتی۔

”مگر کہاں تک؟ ہر جگہ یہی ہوتا۔ لوگ النفاق اڑانے پر اتر آتے۔ اسے حیرت ہوتی تھی سب کے روئے پر۔ یعنی اگر ہم ایک صحیح کام خود نہیں کیا رہے تو کیا ضروری ہے کہ دوسرے کو بھی نہ کرنے دیں۔ اسے اتنا بے حوصلہ کر دیں کہ وہ تنگ آکر توبہ کر لے۔ اس نے یہ خیال ناصر کے سامنے ظاہر کیا تو وہ ہنس دیا۔

”بات یہ ہے بیگم صاحبہ! کہ ہم سب کے اندر ایک شیطان چھپا رہا ہے۔ یہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ہم کسی کو نیک کام کرتا دیکھتے ہیں وہ ہمیں اکسلنے لگتا ہے۔ اسی سے مجبور ہو کر ہم ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں تاکہ یا تو وہ کام مکمل ہی نہ ہونے پائے یا اس کی تقلید نہ ہو سکے۔“ یہ شیطان آپ کے لیے میں اور میرے لیے آپ بھی ہو سکتی ہیں۔ تو بہتر یہ ہے کہ آپ بھی ٹریک پر آجائیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ الناکو نہیں کی سب میں۔“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”جی نہیں۔ کم از کم صدف باجی کے قیام تک تو میں یہ ٹریک نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کو دھچکا لگے گا اگر۔“

”ارے جاؤ جاؤ۔ بڑے آئیں نہانے بھر کی ہمدرد۔ انہیں یہاں آئے دس دن سے اوپر ہو چلے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے اس عرصے میں انہیں ایک تم ہی ملی ہو گی پورے شہر میں۔ جہاں وہ رہ رہی ہیں۔ ان کے گھر خود شاپنگ ہیڈ کوارٹر کا بے دریغ استعمال ہونا ہو گا۔ انہیں سب پتہ چل چکا ہو گا انقلابات شہر کا۔“

”جی نہیں۔“ اس نے بے حد برہان کر کہا۔ ”وہ میری بہن کا گھر ہے۔ ہمارا آپس میں سمجھوتا ہے۔“

”اوہو۔ تو یوں کہو کہ ذیل چل رہی ہے۔ مطلب برابری ہونے تک۔“

”جیسا آپ سمجھیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی پھر بے اختیار چیخ پڑی۔

”ارے ناصر پلیز، پلیز یہ جوس کا کین باہر نہ پھینکیں۔ مجھے دے دیں ایسے۔ شاباش گڈ بوائے۔“

اس نے کہتے کہتے آرام سے خالی کین اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ناصر اسے گھورنے لگا۔

”اب یہ کیا ہے؟“

”یہ آلودگی کا ایک اور ذریعہ ہے۔“ اس نے مزے سے جواب دیا۔ ناصر جھٹکا اٹھا۔

”سنو بہت ہو گئی۔ بھاڑ میں جائے آلودگی تمہارا مشن۔ میں اپنی کار کو ڈسٹ بن نہیں بنا سکتا۔“

”واہ پورا شہر ڈسٹ بن بنایا جا سکتا ہے؟ مگر اپنی کار صاف رکھنی ہے خوب۔“ اس نے سوچا تو مگر کہا نہیں کیونکہ ناصر کو غصہ چڑھ جاتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ

اسے کین سمیت سڑک پر اتار کر چلا جاتا اور اس کی اچھی خاصی عزت افزائی ہو جاتی۔ اس نے پیار محبت سے رام کرنے کی ٹھانی۔

”دیکھیں ناصر! کم از کم کچھ عرصے تو مجھے اپنے پلان پر عمل کرنے دیں۔ مجھے حسرت تو نہ رہ جائے گی کہ زندگی میں کبھی بھی آلودگی کے خلاف کچھ نہ کر سکی۔“

یہ بات اس نے اتنے درد بھرے انداز میں کہی کہ ناصر کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس نے شکر ادا کیا اور

ادھر ادھر کی باتوں میں ناصر کا دھیان پٹانے لگی۔ کین اس نے دوپٹے کی اوٹ میں چھپا لیا تھا۔ ارادہ تھا کہ جو بھی کوئی ڈسٹ بن نظر آیا پھینک دے گی۔ مگر

پورے پندرہ منٹ گزر گئے۔ کوئی ڈسٹ بن نظر نہ آیا البتہ اس سے ملتی جلتی جگہیں بہت نظر آئیں۔

جنہیں لوگوں نے کچرے کے ڈھیر لگا لگا کے ڈسٹ بن کی شکل دے دی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بلدیہ کی خیریت پوچھنے لگی۔ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں ناصر کی نظر پڑ گئی تو نئے برے سے خفا ہونے لگیں گے۔ بالآخر سفر ختم ہوا اور اس نے گھر پہنچ کر چیک سے کین کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی لیکن ناصر کی نظر پڑی تھی۔

”لے لی آئیں تال تم ارے عقل مند کہاں تک جمع کرتی پھوکی۔ سارا شہر بھر پڑا ہے رپیز اور کینز سے۔“

وہ چپکی ہو کر اپنا کام کیے گئی۔ بعض اوقات خاموش رہنا ہی مناسب رہتا ہے۔

صدف باجی پلاسٹک ہیڈ کوارٹر کے راز سے تو جلد ہی واقف ہو گئی تھیں لیکن اب انہیں ایک اور چیز نے متاثر کر ڈالا تھا۔ جس کی وجہ سے شاملہ خاصی مطمئن تھی۔ ساتھ میں وہ اس کو بھی دعا میں دے رہی تھی۔

جس نے ان کی توجہ پلاسٹک ہیڈ کوارٹر کی طرف سے ہٹائی تھی اور یہ چیز بھی شکایتی مراکز۔

”یہ کام بہت اچھا کیا ہے۔ کتنی ہی مراکز میری نظر میں آئے۔ اس طرح لوگ اپنی پریشائیاں بروقت درج تو کرالکیں گے۔“ وہ تعریف کرتے ہوئے کہہ رہی

تھیں اور شاملہ سر ہلا کر تائید کر رہی تھی۔

”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

انہوں نے وضاحت طلب انداز میں کہا۔ ”اتنے خوب صورت ٹائیکلوں سے آراستہ نمایاں شکایتی مراکز اور رپورٹ درج کرانے والا کوئی نہیں۔ ایک جگہ تو میں نے یہ دیکھا کہ سامنے گوشت بک رہا ہے۔ اس پر کھیاں بھینٹا رہی ہیں اور دکان دار اطمینان سے قیمت مقررہ کر رہے ہیں۔ ہمیں زیادہ وصول کر رہا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔ کیوں بھی؟ دو قدم پہ

شکایتی مرکز موجود۔ پکڑو اسے۔ تاکہ دوسروں کو بھی عبرت ہو۔“

دیکھی میں چچہ ہلاتے وہ اب بھی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ مگر تھا کہ صدف باجی نے گاڑی میں آتے جاتے ایسے مراکز دیکھے۔ جو قریب سے گزرتیں تو ان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ اندر جھانک کر بھی دیکھ لیتیں۔

اور پھر ان پر یہ راز منکشف ہو جاتا کہ اندر تو کوئی موجود ہی نہیں۔ شکایت کریں تو کس سے؟

ویسے یہ بات خود اسے بھی الجھن میں ڈال رہی تھی۔ اس روز رات کے کھانے کے بعد اس نے ناصر سے بھی یہی تذکرہ چھیڑا۔

”ارے بھی کس کی ہمت ہے کہ ان مراکز کے اندر جا بیٹھے۔“ ناصر نے وی کی آواز تیز کرتے ہوئے

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

ایئر پوسٹس

اب دو حصوں میں شائع ہو گئی ہے

مکالمے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 2216361



کہا۔

”ذرا دیکھو کیا حشر کیا ہے کے ای ایس سی والوں کا۔ عوام نے۔“ اس نے لی دی پر پیش ہونے والی رپورٹ پر غور کیا اور فوراً ”ناصر کی بات سمجھ میں آئی۔“ ”بھئی لوگوں کو اتنی شکایتیں ہیں کہ بار بار غصے سے بے قابو ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی ذمہ دار یا ان سے تعلق رکھنے والا شخص بھی نظر آجائے تو مار پیٹ کر اس کا برا حال کر دیا جاتا ہے۔ اب ایسے میں کون شیر دل ان مراکز میں موجود رہ کر اپنی جان پر کھیلے۔“ ”تو پھر مسائل کس طرح حل ہوں گے؟“

”مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ صرف اپنی شکل تبدیل کر لیتے ہیں۔“ ناصر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن بہر حال اگر انتظامیہ تھوڑی محنت سے اور لوگ کچھ عقل سے کام لیں تو شاید کچھ مسائل حل ہو ہی جائیں۔“

”واقعی اصل مسئلہ تو عدم توازن ہی ہے۔ نہ لوگ تعاون کرتے ہیں نہ انتظامیہ۔ حد یہ ہے کہ تین سرکاری محکمے ہیں تو ان کا آپس میں ہی تعاون نہیں۔ ایک محکمہ سڑک کھودتا ہے تو مہینوں اسے تعمیر کرنے کا نام نہیں لیتا۔ اس دوران باقی کئے گئے سڑکوں پر رستے ہیں۔ جو نئی سڑک دوبارہ تعمیر ہوتی ہے۔ دوسرے محکموں کو جوش چڑھتا ہے اور وہ اپنے کسی دیرینہ مقصد کے لیے اسے کھود ڈالتے ہیں۔ چنانچہ بعض سڑکوں پر تو مسلسل ”سڑک زیر تعمیر“ کا بورڈ ہی نظر آتا ہے۔ اگر یہ سب آپس میں ملے کر کے ایک ہی کھدائی میں اپنے تمام کام نمٹالیں تو کتنا اچھا ہو۔ وقت بھی بچے کام بھی پائیے اور ہو اور پیسے کا ضیاع بھی نہ ہو۔ لیکن۔“

☆ ☆ ☆

آج وہ لوگ بی ایف میوزیم کی سیر کو نکلے تھے۔ بچوں نے شور مچا رکھا تھا۔ اس لیے شامک نے چھٹی موٹی پکنک کا اہتمام کر لیا تھا۔ چکن تیار کر لیا تھا اور راستے سے روٹیاں لے لینے کا ارادہ تھا۔

شہر کے اس طرف فلاحی اور رزکی ہمار تھی۔ کشادہ سڑکیں لائسنس دیکھ کر واقعی خوشی ہو رہی تھی۔ ”ان فلاحی اور رزکی وجہ سے راستے بہت سست گئے ہیں۔“ شامک نے صدف باجی کو سمجھا رہی تھی۔ ”پہلے ہمیں یہ راستہ طے کرنے میں خاصا وقت لگتا تھا۔ اب تو فوراً ہی پہنچ گئے ہیں۔“

”بس اللہ کرے ٹریفک جام نہ ہو۔“ ناصر نے کہا تو وہ پر زور تردید کرنے لگی۔ ”بھلا اوھر کیسے ٹریفک جام ہو سکتا ہے۔ اتنی کشادہ سڑکوں پر اور وہ بھی۔۔۔ دن دے ٹریفک۔“ ابھی اس کی بات پوری ہوئی ہی نہیں ہوئی تھی کہ گاڑی جھٹکے سے رگ گئی۔ آگے رش تھا۔

”دیکھا آپ نے۔۔۔“ ناصر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اوھر ایسے ٹریفک جام ہوتا ہے۔“ ”مگر کیوں؟“ یہ سوال صدف باجی کے چہرے پر بھی تحریر تھا۔ ”اس لیے کہ فلاحی اور ختم ہوتے ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موڑ موجود ہیں۔ جب مسولت ہے ہی تو کون لباٹن لینے کی زحمت کرے۔ بس ہر گاڑی اپنے لحاظ سے موڑ کا انتخاب کرتی جاتی ہے۔ پیچھے رش ہو مارے اس کے بلا سے۔“

”یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے بڑے بڑے منصوبوں کو اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں کیوں متاثر کر رہی ہیں۔ ان کا تدارک تو بہت آسان ہے۔ غیر ضروری موڑ ختم کر دیے جائیں۔“

”ہاں۔ ہمیں تو یہ آسان ہی لگتا ہے۔ آگے اس میں کیا قیامت ہے۔ یہ کے ڈی اے ہی صحیح سے بتا سکے گی۔“ ناصر نے کندھے اچکائے۔ رش اب قدرے کم ہوا تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

صدف باجی اب کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی تھیں۔ اس نے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مبادا پھر بحث چھڑ جائے۔

”وہ تو صحیح ہے۔ لیکن جیسا دس ویسا بھیس (وہ بھی کم نہیں تھیں) جب یہاں کے شہری ہی ایسا کر رہے

ہیں۔ تو آؤٹ سائیڈر کیوں قانون کا احترام کریں گے؟“ ”باجی! کیا پتہ یہ سب آؤٹ سائیڈر ہی ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ باجی نے تھوڑا غور کیا۔ پھر اندر سے ہنس پڑیں۔

”اچھا بچو! تم نے بھی خوب حکومتی پالیسی اپنائی۔ جو اچھا ہو رہا ہے۔ وہ سب ہمارا کریڈٹ ہے۔ اور برائی تمام کی تمام آؤٹ سائیڈرز کے کھاتے میں۔“ یہ وہی ہاتھ ملوث ہے۔ ”انہوں نے نقل اتاری اور شامک کو بھی ہنسی آ گئی۔“

”قربان جاؤں آپ کی حاضر جوابی پہ لیکن اس وقت نہ آپ خود کو آؤٹ سائیڈر سمجھیں نہ کچھ اور بس میری بہن سمجھیں اور یہ یقین رکھیں کہ میں ایسا نہیں کرتی۔“

اس کے محبت بھرے اصرار پر صدف باجی کو اتنا ہی پڑا اور وہ پل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔

اور پل پر چڑھتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہی نہیں، کئی لوگ اس راستے کو استعمال کر رہے تھے۔ ”اور کچھ نہیں، بس ہم سوچ لیتے ہیں کہ یہ کام نہیں کرنا اور پھر اس کے حق میں دلائل دے دے کر اپنے اس فیصلے کو صحیح بھی ثابت کر دیتے ہیں۔ جو ذرا چٹک اور برداشت سے کام لیں تو سمجھ میں آجائے گا کہ دنیا اتنی بھی بری نہیں جتنا ہم نے سمجھ رکھا ہے۔“ وہ قدم در قدم سڑک پار کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

بات اب صدف باجی کو متاثر کرنے تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیے۔ اپنے ملک، اپنے شہر، اپنے بچوں اور اپنی قوم کی خاطر تھوڑا صبر سے کام لینا ضروری ہے۔ ہر مقام پر، خواہ وہ ٹریفک کا معاملہ ہو یا بجلی کا یا شاپنگ سیکڑ کا۔

کچھ اور ہونہ ہو، اتنا تو ہو گا کہ آنے والے کل کے سامنے ہم سر اٹھا کر نہیں سکیں گے کہ۔

”یہ ہم نہیں۔“

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

اکتوبر 2008 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

Email: id@khawateendigest.com

☆ ”آتش زاہد“ ایک نوجوان کی حیرت انگیز داستان جو بھی عمر میں ہی دشمنوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ پرتیس سلسلہ۔

☆ ”اندھیری ساقین“ معاشرتی برائیوں کے خلاف آٹھ کھڑے ہونے والے ایک نوجوان کی عظیم نیر داستان۔ ایم اے راحت کے قلم سے،

☆ ”کرچیاں“ آخری صفحات پر ایم اے راحت کی معاشرتی تحریر،

☆ ”شیطان کے گماشتے“ مسلم راہی کے قلم سے تاریخ کے اوراق،

☆ ملکی و غیر ملکی ادب سے انتخاب،

☆ زندگی کے صحافتی سے منتخب ”جی داستانیں“

☆

تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں



## سچا ہنگامی اور سنا

”لگتا ہے آج پھر کاکی اور منھی ایک دوسرے کے بال نوچ رہی ہیں؟“  
فرخندہ نے واش بین میں ہاتھ دھوئے دھوئے کان لگا کر سنا۔

”ہیں؟“ گچی۔ ”میں دیکھ کے آؤں؟“  
نانی نے پوچھا لگاتے لگاتے رک کروانت نکالتے ہوئے کہا تو فرخندہ نے ڈپٹ کر دکھ دیا۔  
”ایک تو دن چڑھے پارہ بچے آئی ہے صفائی کرنے اور ہر منٹ بعد پلو جھاڑنی باہر کو لپکتی ہے، دھیان سے

تکڑو لپٹ



لگا پوچھا۔ فہنا نکل ڈالی۔“  
”ہاں جی۔ پورے چار قطرے من کے۔“  
نانی نے بچے من کے ساتھ جٹایا۔ فرخندہ کی سنجوسی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ کپڑے دھونے کے لیے چٹکیوں میں سرف دیتی، پوچھا لگانے کے لیے قطروں کی صورت فہنا نکل۔ برتن خود دھوتی اور خدا گواہ ہے کہ کبھی میکسی کی پوری مکہ سنک نہ رکھی تھی۔ چھری سے کٹ کٹ کر دو دو انچ کے ٹکڑے رکھتی۔ ہر ٹکڑا ہشت ہشت چلاتی۔ ہر ماسی اس سے عاجز آکر مینے بعد کام چھوڑ جاتی۔ ایک نانی دھنالی میں اپنی مثال آپ تھی جو چھ مینے سے نکلی ہوئی تھی۔  
”مویسے آپ! کیا خیال ہے اس بار کس کا پلڑا بھاری رہے گا۔“ نانی نے بیڑھیاں رگڑتے رگڑتے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”اسی کا۔ جس کپڑوں بھاری ہو گا۔“  
فرخندہ نے ٹھٹھا لگایا اور نانی منہ پہ دوپٹہ رکھ کے ہنس پڑی۔ اسی وقت بیڑہوم سے فرخندہ کے شوہر شاہد کی فریاد سنائی دی۔

”فرخندہ میرا رومال۔۔۔“  
”آئے ہائے ایک تو ان کا سدا بہار نزلہ۔ سارے رومال گلا کے رکھ دیے ہیں۔ اب تو اپنے دوپٹے پھاڑ پھاڑ کے بھی تھک گئی ہوں۔“  
فرخندہ ہنسنے لگی ہوئی اندر گئی۔

پرانے جوڑے کٹ کر تیزی سے قد نکالتی تیرہ سالہ بیٹی کو پستانہ سینے کے بعد بڑے بڑے بارڈر والے دوپٹوں





کے وہ درجنوں رومال ہالتی تھی۔ کیوں کہ تیرہ سال کی دھان پان سی بیٹی ان بھدرے رنٹ کے جوڑوں کے ساتھ یہ بارڈروالے دوپٹے لپیٹ کر بالکل بڑی املا لگتی تھی۔ اس لیے اس کے لیے ساری ملل کے دوپٹے ہر وقت رنگ کے رکھے جاتے۔ ایک کالا ایک سفید ہر سوٹ کے ساتھ چل جاتا اور وہ رنگ برنگے دوپٹے شاپر کے نزلہ زکام کو نمٹانے کے کام آجاتے۔

”یہ لیس رومال۔ اور دکان پر جاتے جاتے ذرا ایک نظر کاکی کے گھر پہ تو ڈال لینا۔ بڑی مارا ماری جیسی آوازیں آ رہی ہیں۔“

”کب نہیں آتیں۔“

”پھر بھی ذرا دیکھنا تو۔“

”میں کیا کروں گا دیکھ کے۔“ وہ زنج ہوا اٹھل۔

”کرنا کیا ہے گھر کے نمبر پر ایک تیل مارو۔ مس کال۔“

”نہ کہ تم جسکے لینے وہاں جا پہنچو۔“ وہ بیڑا ہوا باہر نکلا۔

”ہاں تو کیا کروں۔ جب اپنے گھر میں جسکے لینے والی کوئی چیز نہ ہو تو بندہ اس پاس بھی نہ جھانکے۔“

اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

سے فرخندہ تھی اور اس کی اداسی۔ اس کا اکیلا پن۔ زندگی کا یہ سوتا پن اسے ماری ڈالتا اگر چار گھر پر سے منہ کی اور کاکی نہ لیتیں۔

”پتا نہیں کیا دشمنی نکالی ہے اس توری کی شکل والے پر اپنی ڈیلر نے۔ کہ ہر لاپرواہیہ۔“

کلوٹم نے اٹھا اٹھا کے پٹیش پٹیش۔

”سب آپ کی غلطی ہے۔ بس مکان دیکھ لیا۔ ہمسائے نہ دیکھے۔“

”کرائے کے مکان دھونڈنے نکلا تھا کلوٹم! بیٹی یا بیٹے کا رشتہ دھونڈنے نہیں جو محلے بھر کے دروازے کھٹکھٹاتا۔“

تصدق نے ہاتھ میں پکڑا اخبار گول مول کر کے نیپل پہ پھینکا۔ برابر سے اٹھتے وہابیات شور نے ایک خبر تک بڑھنا محال کر دیا تھا۔

”ویسے بھی اس ایک برائی کے علاوہ اس مکان میں برائی ہے کون سی؟ اتنے صاف تھپے علاقے میں کیا بنا ہوا لوگ پورشن اور کہیں مل سکتا تھا کہیں؟ اس سے دگنے کرائے میں اپر پورشن مل رہے تھے۔ تم سے چیز ہی جاتی تھیں بیڑھیاں؟ اس ڈھالی من کے وجود کے ساتھ اور سب سے بڑی بات مالک مکان کے ساتھ رہنے کا بھی کوئی غنا نہیں۔ ورنہ تمہاری کبھی بی بی ہے کسی مالک مکان کے ساتھ؟ وہ بھلے لوگ اپنے پورشن میں تالا لگا کے شہر کے دوسرے کونے میں رہتے ہیں۔ کرایہ تک سگنے نہیں آتے۔“

”بھلے کیسے؟ کائیاں کہو۔ اپنے سر سے بلا اتار کے ہمارے سرمندہ گئے مکار کہیں گے۔ ان بلاؤں کے ہمسائے میں رہنے کا حوصلہ نہیں ہو گا ان میں ہم ہی پاگل ہیں جو شام ان کو بھگتے خوش خوش آگئے۔“

”ہمیں پاگل نہیں۔ ضرورت مند ہیں اور وہ عقل مند ہو سکتے ہیں کائیاں ہو سکتے ہیں اور مکار بھی۔ کیونکہ وہ یہ سب ہونا افورڈ کر سکتے ہیں۔ پیسہ ہے ان کے پاس۔ اچھا بھلا سات مرلے کا نیا بنا گھر۔ جسے انہوں نے اپنی سہولت اور مرضی کے مطابق بنایا ہو گا۔ ان ہامعقول لوگوں کی وجہ سے کرائے پر چڑھا کے دوسرے مکان میں چلے گئے۔ وہ لے سکتے ہیں ایک کے بعد ایک مکان۔ ان پہ یہ نخرہ جتا بھی ہے۔ ہمیں کہاں سے ملے گا آٹھ ہزار میں سات مرلے کا دو بیڈ روم، لاؤنج، ڈرائنگ، ڈرائنگ، والا پورشن۔ گیارہ ہزار پچھلے گھر کے دیتے تھے تھا تو وہ بھی سات مرلے کا مگر بندہ سولہ سال پرانا بنا ہوا۔ اپنا گھر ہو تو بیس سال تک بھی اینٹ نہیں ملتی پاتی۔ مگر سولہ سالوں میں آٹھ دس کرائے دار بدلنے کے بعد گھر میں رہتا کیا ہے۔ اوپر سے اپر پورشن گرمیوں میں تندور، سردیوں میں فریژ، مالک مکان کی پیوی سے تمہاری ہر دوسرے دن کھٹ پٹ رہتی تھی۔ کبھی پانی والی موٹر، کبھی بیڑھیوں پہ کچر والی چپل لانے سے، کبھی مل کے مسئلے پہ، کبھی بچوں کے شور مچانے پہ، اور پورے چار مہینے جوتے چٹکائے تھے۔ میں نے پر اپنی ڈیلر کے پاس کوئی بارہ ہزار میں پانچ مرلے کا ڈوب نما پورشن دکھا رہا تھا کوئی چودہ ہزار میں تین مرلے کا ڈوب اسٹوری گھر جیسے دو ماچس کی ڈیال اوپر تلے رکھ دی ہوں۔ کوئی سترہ ہزار میں نسبتاً کھلا پورشن۔ مگر ایک تو کرایہ اوقات سے زیادہ اوپر سے دروازے دیکھ کھائے فرش کے پلستر اور پاتھروں کی ٹائلیں اکھڑی ہوئی۔ غنیمت سمجھو اس کو جو آٹھ ہزار میں مل گیا۔ پہلے کرائے دار ہیں ہم یہاں اینٹ اینٹ چمک رہی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی منہ کی اور کاکی نے اپنے آوازیں روکنے اور کونے دینے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ تصدیق کے طویل بیان کو بریک لگا۔ اس کے ہاتھ پہ کیا پورے چرے پہ ناگوار قسم کی شکلیں نمودار ہوئیں اور وہ زرب زرب بولنے لگا۔

کلوٹم سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

”اس عورت کی نحوست اس کے اپنے گھر کے ساتھ ساتھ ہمارے گھر کو بھی کھا جائے گی۔ ہر وقت دوتا دھوتا۔ ہر وقت بد دعائیں اور کوسنے نرا غرض۔“

اس کے ساتھ ہی منہ کی اور کاکی نے اپنے آوازیں روکنے اور کونے دینے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ تصدیق کے طویل بیان کو بریک لگا۔ اس کے ہاتھ پہ کیا پورے چرے پہ ناگوار قسم کی شکلیں نمودار ہوئیں اور وہ زرب زرب بولنے لگا۔

کلوٹم سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

”اس عورت کی نحوست اس کے اپنے گھر کے ساتھ ساتھ ہمارے گھر کو بھی کھا جائے گی۔ ہر وقت دوتا دھوتا۔ ہر وقت بد دعائیں اور کوسنے نرا غرض۔“

اس کے ساتھ ہی منہ کی اور کاکی نے اپنے آوازیں روکنے اور کونے دینے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ تصدیق کے طویل بیان کو بریک لگا۔ اس کے ہاتھ پہ کیا پورے چرے پہ ناگوار قسم کی شکلیں نمودار ہوئیں اور وہ زرب زرب بولنے لگا۔

کلوٹم سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

”اس عورت کی نحوست اس کے اپنے گھر کے ساتھ ساتھ ہمارے گھر کو بھی کھا جائے گی۔ ہر وقت دوتا دھوتا۔ ہر وقت بد دعائیں اور کوسنے نرا غرض۔“

اس کے ساتھ ہی منہ کی اور کاکی نے اپنے آوازیں روکنے اور کونے دینے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ تصدیق کے طویل بیان کو بریک لگا۔ اس کے ہاتھ پہ کیا پورے چرے پہ ناگوار قسم کی شکلیں نمودار ہوئیں اور وہ زرب زرب بولنے لگا۔



”یار! یہ اچھی رونق ہے۔ چھٹی کا دن مڑے سے گزر رہا ہے۔“ عیم نے بالکونی سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔

چھٹی والے دن بھی عادت سے مجبور وہ جلدی اٹھ جاتا تھا جبکہ کاشف کا ارادہ دیر تک سونے کا ہوتا تھا اور اس کے اس ارادے پہ پانی پھرنے میں سامنے والے گھر کی منہ کی اور کاکی پیش پیش ہوتیں۔

دونوں شادی شدہ تھے مگر اس پورشن میں رہتے کنواریوں کی طرح تھے۔ کاشف میاؤلی سے جبکہ عیم فیصل آباد سے لاہور آئے تھے۔ روزگار کے سلسلے میں چونکہ دونوں کا تعلق اچھے خاندان سے تھا اور سے بال بچے دار بھی تھے۔ بیویوں سے ناز نخرے اٹھوا لینے کے بعد کہاں عادت رہتی ہے ہاشولیا کی زندگی کی۔ ویسے بھی ایک تیس سال کا دوسرا چوبیس سال کا اوپر سے چھوٹے شہر کے (لاہور سے نسبتاً) رہائشی۔ ہاسٹل میں رہنے والے لاہوری چھو کروں سے دونوں کی بی بی نہیں۔

ایک ہی فرم میں ملازمت کرنے کی وجہ سے تھوڑی بہت دوستی تو شروع سے تھی مل کے یہ پورشن کرائے پہ لے لیا۔ علاقہ صاف ستھرا بھی تھا۔ فرم کی سائٹ سے دس بارہ منٹ کی ڈرائیو پہ اور کنوینس بھی سامنے ہی سے مل جاتی تھی۔ یہاں رہتے دونوں کو ڈیڑھ ماہ ہوا تھا۔ دوستی اب دن رات کے ساتھ کی وجہ سے خاصی پروان چڑھ چکی تھی۔

اس محلے میں وہ واحد مکان نہیں تھا جس کا ایک حصہ کرائے پہ دیا گیا ہو۔ نئی بنی ہاؤسنگ اسکیم تھی۔ تین مرلے، پانچ مرلے اور سات مرلے پہ مشتمل مکان تھے۔ زیادہ تر افراد نے قسطوں پہ پلاٹ لیے تھے۔ بعض نے پلاٹ خرید لینے کے بعد بیٹوں سے قرضہ لے کر تعمیر کرائی تھی اس لیے سب سے بہتر طریقہ یہی تھا کہ چند سال کے لیے ٹک رہ لیا جائے مگر مکان کا ایک حصہ کرائے پہ دے کر کرائے کی رقم سے



وقت گزار دی کا ایک بہانہ تھا۔ کسی نہ کسی بات کو لے کر دونوں شرطیں لگاتے رہتے۔

\*\*\*

”ہائے ہائے میری جوانی کھائی یہ منحوس شکل والی۔“ منشی نے ہاتھ لہرا لہرا کرے فریادیں کی۔

”کون سی جوانی؟“ نام منشی ہو جانے سے تو منشی نہیں بن جاؤ گی باپ شریف۔ مونچھیں بھی سفید ہو گئی تھیں تمہاری تو سیکے میں بیٹھے بیٹھے رشتوں کا انتظار کرتے ہوئے۔

”مونچھیں ہوں گی تمہاری اس تھانہ اپنی بہن کی۔“ منشی نے تڑپ کے کاکی کو اس کی چھوٹی بہن کا طعنہ دیا جو انٹر کرتے ہی ٹریفک پولیس میں بھرتی ہو گئی تھی اور اب مونٹر سائیکل دوڑاتی پھرتی تھی سگنل توڑنے والوں کے پیچھے۔

”تھانہ اپنی نہیں ٹریفک لڈی کا نیپیل۔ ریتا تم جاہل کی جاہل۔“ کاکی نے بلک کر کہا۔

”تو تو بڑی عالم فاضل ہے ناں۔ چلی دیواروں والے اسکول سے رو رو کے آٹھویں کی ہے۔“

”ہاں تو تو استانی تھی وہاں۔ اسی لیے پتا ہے ناں۔ استانی وہ بھی خانہ داری کی جو بچیوں کے پٹائے کھانے ڈالوں میں باندھ باندھ کے گھر لے جاتی تھی اور ان سے اپنے گھر کے سارے ٹیکوں کے غلافوں پہ کڑھائی کروایا کرتی تھی۔“

”ساری دنیا جانتی ہے کون استانی ہے اور کون ہاشنی۔ جب تمہاری شادی ہوئی تھی میں تو گلیوں میں کھیلتی پھرتی تھی۔ نو دس برس کا سن تھا۔“

”اسی لیے تو صحیح نام رکھا ہے میں نے تمہارا۔ منشی۔“ کاکی نے دانت چکچکیائے کہا اور ایسا کہتے ہوئے وہ اپنا وہ نام بھول گئی جو منشی نے اس کا رکھا تھا۔ کاکی۔

”مٹے نے سر پہ ہاتھ رکھ کے دونوں کو ایک دوسرے کے بیچے ادھیڑے دیکھا اور سر دھو کر بھر کے اٹھ گیا۔ اب وہ کمرے میں جا کے اپنے گم گشت ماضی کو یاد

بنک کی قسط نکال دی جائے مگر منظور صاحب کے مکان کا یہ پورشن کوئی کراہے لینے پہ تیار نہ ہوتا۔ ہو بھی جاتا تو چند ہفتوں بعد مکان خالی کر جاتا۔ وجہ بالکل سامنے رہنے والے منشی کاکی اور مناتھ۔

آخر کار انہوں نے وہ قدم اٹھایا جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا یعنی دو چھترے چھانٹ کر اپنے دار رکھ لیے انہیں اس تکلیف وہ ہسائیکلی سے زیادہ شکایت اس لیے نہیں تھی کہ سارا دن تو وہ گھر سے باہر ہوتے تھے رات کو آتے تو تھک ہار کے لمبی ٹان کے سو جاتے البتہ چھٹی کے دن ہونے والا کوئی معرکہ وہ مٹ نہیں کرتے تھے۔

”یار اکیا مصیبت ہے۔ بند کرو کھڑکی۔ ابھی تو نوبے ہیں۔“ کاشف نے تکیہ منہ پہ رکھا۔

”دیکھ تو سہی۔ منے میاں کے ماتھے پہ گوڑا نظر آ رہا ہے۔ اللہ جانے ییلن لگا ہے یا اس دن کی طرح ریوٹ اٹھا کے مارا ہے منشی کی بی بی نے۔“

”تم کیا عورتوں کی طرح کن سونیاں لیتے رہتے ہو۔ میری بلا سے ریوٹ اٹھا کے مارا ہو یا پھر پورے کا پورا ٹی وی دے مارا ہو۔ مجھے نہ بلانا اب۔ میں سوئے لگا ہوں۔“ اس نے چڑکے کر دھمکی دے لی۔

”دیکھ تو سہ تمہاری مظلوم خاتون۔ کاکی۔ رو کے اس نے آنکھیں سجا رکھی ہیں اور چپ چپ سی بھی ہے۔ منشی اکیلی ہی بھڑاس نکال رہی ہے۔“

”ہوئی نہیں سکتا۔“ اب کاشف بھی کبیل پھیٹک کر بالکونی میں آ گیا۔

”ضرور اس کی داڑھ میں درد ہو گا ورنہ کاکی اور چپ رہیں۔“

”نہیں نہیں کاکی جی پھر بھی منشی صاحبہ کی نسبت ٹھیک ہی ہیں۔ صبر کر لیا ہو گا۔“

”نا ممکن۔ لگا تا ہے پانچ کے دس۔؟“

”لگ گئی۔“ کاشف نے فوراً شرط لگال۔

کاکی منشی اور منے کے معرکوں سے پورا محظہ بھلے ہی کتنا تک ہو مگر تعلیم اور کاشف جیسے گھر اور گھر والوں سے دور رہنے والوں کے لیے یہ بھی دل بھلانے اور

کرتے ہوئے مزید آئیں بھرنے والا تھا۔

\*\*\*

مناتھ یعنی منور کریم کی زندگی ایسی عبرت ناک نہیں تھی جیسی اب گزرے ڈھائی سالوں میں ہو گئی تھی۔

مناتھ اور کاکی جو پہلے کاکی نہیں ہو کب کھلاتی تھی۔ بری بھلی گزارتے ہی آرہے تھے آٹھ برس سے۔ بس یہ تھا کہ آٹھ سالوں میں ان کے ہاں اولاد نہ ہو سکی تھی۔ کاکی کی ماس نے تو تیسرے ہی سال شور مچا دیا تھا منے کی دو سری شادی کا۔ مگر مناتھ ایک تو کاکی کے آنسوؤں سے کھراتا تھا دو سرا خرچہ بڑھنے سے۔ معمولی سا ٹھیکے دار تھا۔ گھرا ہوا تھا۔ ذاتی سیکنڈ ہینڈ کار بھی تھی لیکن دو دو بیویوں کی ذمہ داری اس کا حل بھی مل سکے پاس تھا۔

”کو کب کو طلاق دے دے۔“

”نہیں اماں۔ ایسے کیسے۔“ وہ گھر آ گیا۔

بدو عاقل سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ اسے پچھلے سال اس کے ایک جاننے والے نے بغیر کسی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دے کر دو سری شادی چلا لی۔ پہلی بیوی نے نو لکھ والے دن قلمی انداز میں بھرے پنڈال میں جھولی اٹھا اٹھا کے وہ بد دعا میں دس کہ ہنی مون سے واپسی۔ ان کی گاڑی ٹرک سے ٹکرائی۔ نئی نوٹی بیوی کو تو معمولی چوٹیں آئیں مگر خود بے چارے کی ٹانگ کٹ گئی۔ نئی بیوی نے دو مہینے بھی لنگڑے دو لہنگی تیار داری نہ کی اور خلع کا نوٹس بھجوا کے اپنے اس کزن کو معافی کا خط لکھ مارا جس سے بچپن کی مٹنی توڑ کے یہ شادی کی تھی۔

اس خوف نے اسے طلاق دینے سے باز رکھا اور اغراجات بڑھنے کے ڈرنے دو دو بیویاں بینک وقت رکھنے کے اقدام سے دور رکھا اگرچہ اس گفتگو میں روزی اماں سے سو سو باتیں سننے کو ملتی تھیں۔

”میں تو پوتے کی شکل دیکھے بغیر مچاؤں گی۔“

”تو کس نے کہا ہے ترسے کو۔“ کاکی یعنی اس وقت کی کو کب زیر لب برہنہ کے کہتی۔

بیوٹی کس کا تیار کر دو۔

سوتھی ہیرا آئل

SOHNI HAIR OIL



جڑ جڑتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔  
سنے بال لگاتا ہے۔  
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔  
جڑ جڑتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔  
بیکساں بناتا ہے۔  
بہتر ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سوتھی ہیرا آئل

قیمت = 70/- روپے

12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ قدرتی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ قدرتی خریدنا چاہیے کہ ایک بوتل کی قیمت صرف 70/- روپے ہے۔ دوسرے شہروں والے ٹی آر جی کر جڑی بوٹیوں سے منگوائیں اور جڑی بوٹیوں سے منگوائے والے ٹی آر جی اس حساب سے بچھا سکیں۔

- 1 بوتل کے لئے ----- 90/- روپے
- 2 بوتلوں کے لئے ----- 160/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 240/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچہ اور پیکیج چارجز شامل ہیں۔

نئی آرڈر جیسے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی کس 53 اورنگریب مارکیٹ، پیکٹ فورڈ، ایچ اے جٹان روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات مقامی پتہ پر آکر ان بوتلوں سے حاصل کریں

بیوٹی کس 53 اورنگریب مارکیٹ، پیکٹ فورڈ، ایچ اے جٹان روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2735021



”جاؤ۔ جا کے چھوٹے والے کے پاس ڈیرے ڈالو۔ جس کے ایک چھوڑ تین تین بیٹے ہیں۔ دن رات بوتوں کی شکل دیکھو بھی اور چانو بھی۔ یہاں کیا کرنے چھٹی ہیں۔“

اسے بڑی تکلیف ہوتی تھی اس بات کی کہ ساس دو دو بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی بڑے والے یعنی منور کے پاس ہی کیوں رہتی ہے اور اس نے کئی بار منور سے دبے گفتگوں میں کہا بھی تھا۔

”ہاں کا یہاں دل نہیں لگتا۔ اکیلا گھر ہے ناں۔ انہیں قصور کے ہاں بھیج دو۔ پوتے پوتیوں میں دل بہلا رہے گا۔“

”اور میں۔۔۔ میرا کیا ہو گا؟“ وہ گہرا جانتا۔  
”کیا مطلب؟ میں کیا تمہارا خیال نہیں رکھتی۔ کیا یہ گھر صرف تمہاری اماں کے سارے چل رہا ہے؟“ وہ غضب ناک ہوتی تو منور ہلکا کے وضاحت دیتا۔

”نہیں کو کب۔! میرا مطلب تھا، گھر اور بھی سونا سونا لگے گا۔ ویسے بھی میرا یقین ہے کہ میرے گھر میں برکت اماں کے دم سے ہے۔ وہ چلی گئیں تو میرا کاروبار ڈوب جائے گا۔“

کو کب تملاک رہ جاتی۔ اس سے زیادہ کرنے کی فی الحال پوزیشن میں نہیں تھی۔ شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ فقط تین سال۔۔۔

اور تین سالوں میں گو بھی اب تک سونی تھی ورنہ قدم اتنے تو جھلپے ہوتے کہ ڈنگے کی چوٹ۔ اپنی من مانی کر سکتی۔ ابھی تو بے چاری دل مسوس گئے رہ جاتی تھی۔ کہیں ساس کو نکالتے نکالتے خود نہ نکل جائے۔

سونار کی۔ ایک لوبار کی۔

اوھر شادی کے چوتھے برس منور کی ماں اللہ کو پیاری ہوئی۔ اوھر منور کی ٹھیکے داری چمک اٹھی۔ کاروبار دن و رات چوٹی ترقی کرنے لگا اور اب صحیح معنوں میں کو کب کو موقع ملا اسے ایک کی دس منانے کا۔

”لو اب بتاؤ کون کس کے لیے مبارک ہے اور کس کے دم سے برکت ہے اس گھر کی۔ جب تک

ساری کمائی اماں کے ہاتھ لاکر رکھتے تھے، روتے ہی روتے تھے خیر چوں سے۔ اب میرے ہاتھ میں لاکے رکھتے ہو تو دیکھو۔ کیسے دو کے چار اور چار کے آٹھ بنائے دیتا ہے اللہ۔“

منور لاجواب ہو جاتا۔ مگر دل میں کو کب کی قدر اور بڑھ جاتی۔ جیسے جیسے خوشحالی بڑھتی گئی اس کے دل میں کو کب کے لیے ممنونیت اور مروتیت بڑھ گئی اور کو کب کے دل میں اولاد کے لیے حسرت۔ اگرچہ اب اس معاملے کو ہوا دینے والی۔

ساس نہیں رہی تھی لیکن یکے اور سسرال کی اور بہتری خواتین تھیں جو آئے دن یہ ذکر چھڑتی رہتیں۔ جو کس تھی وہ نکلے والیاں پوری کردتیں اب تو کو کب کو خود بھی یہ خالی آنکھن چھینے لگا تھا۔ بنوہ بھر کے بازار نکلتی۔ مگر خالی ہاتھ واپس آتی۔

کب تک کپڑے، زیور خریدتی۔ کبھی جھنجھنا خریدنے کو من کرتا۔ کبھی ڈاکریا لائی سائیکل۔ کبھی نیکریں دل کھینچتے۔ کبھی گلابی فراک۔ کبھی فڈرنے نئے زیوارتوں کے لئے کبھی اسٹینڈل ٹائپ سیل فون کی دیکھ کر جی چل جاتا۔ گھر کی آرائشی چیزیں بھی کتنی خریدتی؟ جو تھیں ویسی کی ویسی تھیں۔ نہ کوئی توڑنے والا نہ خراب کرنے والا۔

اسے زندگی کے اس خلی بن کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ وہ اٹھتے بیٹھے منور کے سامنے دکھڑا رونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کی بہن۔۔۔ چھوٹی بہن نے ٹوک دیا۔

”ماگل ہوئی ہو باجی۔! اپنے منہ سے بھی کوئی اپنے پیروں کھاڑا مارا ہے؟“

”منہ سے تو کوئی بھی نہیں مارتا۔ ہاتھوں سے ہی مارتے ہیں۔ ایک تو تمہیں بھی مل چکیا۔ ایک محلوہ ٹھیک سے بولنا نہیں آتا۔“

”اور تمہیں تو خیر سے کچھ بھی ٹھیک سے بولنا نہیں آتا۔“ شکیلہ نے ناست سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ کو کب سے ایک نہ دو پورے نو برس چھوٹی تھی۔ غیر شادی شدہ تھی مگر عقل بلکہ یوں کہو کہ چالاکی اور

مکاری میں نوباتھ آگے تھی۔  
”تم خود بڑھ چڑھ کے میاں کے سامنے بے اولادی کا رونا روو گی تو وہ جو ابھی اس معاملے کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا وہ بھی سنجیدگی سے سوچنے لگ جائے گا۔“

”ہاں تو سوچو۔ یہی تو میں چاہتی ہوں کہ اسے بھی احساس ہو ہماری زندگی کتنی پھٹی ہے۔“

”یہ احساس دلانے سے کیا ہو گا؟ وہ تمہاری پھٹی زندگی۔ نمک مرچ یا چاٹ مسالہ۔ جھڑکے گا؟ کیوں نہ چوڑے گا؟“ شکیلہ اپنا آدھا لٹچ چوڑا ہاتھ پٹینے بیٹھ گئی۔

”وہ میرا کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرائے گا۔“  
”اور اگر ڈاکٹر نے تمہیں لا علاج قرار دے دیا تو؟“

شکیلہ کے سوال نے اسے گم سم کر دیا۔  
”ویسے بھی اس کے پاس پیسہ آیا ہے مگر پیسہ خرچ کرنے کا جگر نہیں آیا۔ ابھی تک اسی پرانے ماڈل کے کیری ڈبے پہ صبر شکر کر کے بیٹھا ہے۔ یہ نہ ہو ڈاکٹر کے علاج کے بجائے وہ کم خرچے والے کام پہ راضی ہو جائے۔“

”کم خرچہ والا کام؟“  
”ہاں۔۔۔ دوسری شادی۔ ڈاکٹروں کی فیس سے تو کم ہی خرچہ ہوتا ہے۔ اس کے بجائے میرے پاس زیادہ اچھا مل جائے۔“

”وہ کیا؟“ وہ بڑے اشتیاق سے شکیلہ کے پاس کھسکی۔  
”دوسری شادی؟“

”ورنہ منہ۔“ کو کب براسا منہ بنا کے اسی تیزی سے چبچبے کھسکی۔  
”لیکن یہ وہ اولی شادی نہیں جو منور بھائی خود کرے گا۔ یہ وہ اولی شادی ہوگی جو تو کرے گی۔“

”فلت جویگے۔۔۔ میں کیوں کرنے لگی دوسری شادی۔ یہی کچھ سکھاتے ہیں مجھے کالج والے میں بھی کموں۔ کالج جاتے ہی تیری شکل پہلے سے زیادہ لعنتی کیوں ہو گئی ہے۔ شرم نہیں آتی بہن کو شادی پہ شادی کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے۔“

”ہو۔۔۔ میں کون سا تمہاری دوسری شادی کر رہی ہوں باجی! میں تو منور بھائی کی دوسری شادی کی بات کر رہی ہوں۔ مگر یہ شادی ان کے کرنے سے پہلے پہلے تم نے کر لی ہے۔“

”ہائے ہائے۔ پاگل ہوئی ہے۔ میں کیوں اپنے مو کی دوسری بیوی لاؤں۔“

”گلابی تو پڑے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ خود لے آئیں، تم ہی لے آؤ۔ وہ لے آئے تو چن کر کوئی خوب صورت لڑکی ہی لائیں گے۔ آخر نیا نیا پیسہ آیا ہے لیکن اگر تم لاؤ گی تو ایک تو منور بھائی تمہارے احسان مند ہو جائیں گے، ساری عمر تمہارے پیرو دھو دھو کر بیٹیں گے اور دوسرا یہ کہ تم ایسی سوتن ڈھونڈ کے لاتا جس سے منور بھائی کی شادی وہ دن بھی نہ چل سکے نہ بچہ ہو سکے۔“

”تو کیا کسی خسرے سے نکال پرہو ادوں اپنے میاں کا۔“ وہ تڑپ اٹھی۔ ”کیسے کیسے مشورے دیتی ہے تو شکیلہ۔“

”بالکل ٹھیک مشورہ دیتی ہوں اور یہ ڈاکٹروں کے پاس جانے کا خیال چھوڑ دے۔ یہ نہ ہو ڈاکٹر تمہارا معائنہ کرنے کے بعد صاف جواب دے دیں اور منور بھائی جو کسی آسرنے پہ تمہارے ساتھ بٹھاتے آرہے ہیں مایوس ہو کر دوسری شادی کر لیں۔ تم ایسی لڑکی لاؤ جو بانیجہ ہونے کی وجہ سے طلاق نہ ہو۔ بس اتنا دھیان رہے کہ اس کی خیر منور بھائی کو نہ ہو اور ہو بھی وہ بد شکل سی۔ غریب گھر کی۔ اولاد نہیں ہوگی تب بھی ترس کھا کے بھی وہ اسے پاس رکھنا پسند نہ کریں۔ ایسی بد صورت ہو اور پتا ہے دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہونے سے مشہور ہو جائے گا۔ نقص تم میں نہیں خود منور بھائی میں ہے۔“

”ہائے ہائے۔“ کو کب کو کنواری بہن کے منہ سے ایسی کھلی بات سن کر حیا سی آئی۔

”جی کہہ رہی ہوں۔ اس کے بعد ایسی تو بہ ہوگی کہ وہ دوبارہ دوسری شادی کا سوچیں گے بھی نہیں۔ رہا بچہ۔ تو گود لے کر پال لیتا۔ سوتن کا بچہ پالنے سے تو اچھا



”ہاں۔ یہ تو ہے۔ مانا پڑے گا شکلیہ تائی امی ٹھیک کستی ہے۔ نورے خاندان میں سات نسلوں تک تیرے جیسی عقل مند لڑکی پیدا نہیں ہوگی۔“ وہ ”ضیث“ کہتے کہتے رکی اور اسے ”عقل مند“ میں تبدیل کر دیا۔ تائی لال کا اصل بیان تو یہی تھا۔

\*\*\*

پھر شکلیہ ہی کی کوششوں سے اس نے منور کے لیے رشتہ تلاش شروع کیا۔ پھر کئی بستی میں گئی۔ جھونپڑیوں تک کے اندر جھانکا۔ تقریباً سب ہی جاننے والوں کی ماسیاں ماسیوں کی صاحب زادیاں چیک کیں۔

”خبردار باجی! جھونپڑی اور ماسیوں کے ہاں سے لڑکی نہ لانا۔ ان سے تو خدا کا خاص فضل ہے۔ سال میں تین تین بچے پیدا کرتی ہیں۔“ وہ حیران ہوئی۔ مبالغہ

آرائی کی حد تھی۔

”لیکن شکلیہ بانجھ عورت کی حقیقت چھپائے بغیر اسے کیسے منور کی دلہن بنا دوں؟ یہ نہ ہو کہ بعد میں بات کھلے کہ مجھے سب کچھ پتا تھا پھر بھی میں نے جان بوجھ کر نہ بابا۔ مجھے میکے آکے نہیں بیٹھنا۔“ پہلی بار اس نے اپنی عقل سے کوئی بات کی۔

”اچھا۔ سوچتی ہوں کچھ“ شکلیہ کے چہرے پہ کچھ اور خباثت نظر آئی جو اس کے گرمی سوچ میں جانے کا اشارہ تھا۔

\*\*\*

اور پھر شکلیہ نے اپنی ایک دوست کے توسط سے نورین کو ڈھونڈ نکالا۔

”واہ شکلیہ کیا پس ہے۔ کسی قبولیت کے وقت میرے منہ سے نکلا تھا کہ کیا اپنے میاں کی شادی خسرے سے کرادوں؟ اور دیکھ تو سو ہی کروا رہی ہوں۔“ انہی کوکب کے انگ انگ سے پھولی پڑ رہی تھی۔

نورین سوکھے بدن کی، پھسکی سی رنگت والی چھپیں ستائیس سالہ لڑکی تھی۔ چہرے کی ساخت کچھ کچھ ابوالمول سے ملتی جلتی۔ پھیریں گھٹی۔ درمیان سے جڑی ہوئی۔ آنکھیں بھی ایک دوسرے سے بے حد قریب جیسے مصافحہ بلکہ معافہ کرنے کو بے تاب ہوں۔ ناک لمبی ٹھکڑی ہرگز نہیں جتنی لمبائی اپنی چوڑائی کا لپٹے ہوئے مگر جڑوں کی ہڈیاں نمایاں۔ ہونٹ بے حد باریک، دہانہ پڑا۔ آواز بھاری، لہجہ کرخت۔ چوڑے چوڑے کھردرے ہاتھ پیر لہجے ڈگ بھر کے چلتی چلی نظریں وہ کوکب کے دل کو بھانپتی۔

”باجی! سوتن ہو تو ایسی کہ ساتھ بیٹھی ہو تو اپنا آپ خواہ مخواہ لشکارے مارنے لگ جائے“ شکلیہ نے اس کی پسند کی داد دی۔

”خاص طور پہ اس کی مونچھوں کا کچھا۔ سبحان اللہ۔“ کوکب جھوم جھوم کر اس کے قصیدے پڑھنے لگی جس چیز نے اسے گرویدہ کر دیا تھا۔

درحقیقت یہ مونچھیں نہیں ”اوری“ ہونٹ اور ناک کے عین درمیان نورین کے ایک بڑا سا پیدانسی مسد تھا جس پہ بال اگے ہوئے تھے۔ لمبے لمبے اور موٹے۔ اب اللہ جانے صرف اس سے کہ بال ہی قدر ترقی طور پہ سفید تھے یا سر کے بھی تھے جو کھر سے چھپا لیے گئے تھے اور نہ جانے منے کے بالوں کو کھر سے محروم رکھنے میں کون سی مصلحت تھی۔

”میں لکھ کے دینے کو تیار ہوں۔ یہ بچہ تو کیا چوڑے بھی پیدا نہیں کر سکتی۔“

اسی ماں اور بھروسے کے سہارے وہ نورین کو منور کے لیے لے آئی۔

منور کیسے مانا۔ یہ الگ کہانی ہے۔ ”ہائے اللہ منور! ایسے انکار نہ کرے۔ میں کوئی بچہ سکو لے کر بھی پال سکتی ہوں لیکن وہ بچہ تمہارا اپنا ہوگا تو میں اس سے زیادہ پیار کر سکوں گی۔ اسے گود میں لے کر میرے کلیجے میں زیادہ ٹھنڈ پڑے گی۔“ منور متاثر کم حیران پریشان زیادہ تھا۔

”اور سوتن۔ اسے برداشت کر لوگی؟“ ”تمہاری خوشی کے لیے سب برداشت کر لوں گی۔“

”میری ماں تو کبھی برداشت نہ ہوئی تھی۔“ وہ دل ہی دل میں کڑھ کے رہ گیا۔

اسے کوکب کا یہ شوٹہ مزاج لگ رہا تھا لیکن جب وہ واقعی اس معاملے میں سرگرم نظر آئی تو اسے اس کی شجیدگی کا احساس ہوا۔ تھوڑے سے مزید پس و پیش کے بعد وہ مان گیا۔

اولاد کی خواہش کے نہیں ہوتی اور عمر کی چالیسویں دہائی کی جانب تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے تو یہ کئی اور بھی کھلنے لگتی ہے۔ اسے بھی یہ خواہش تھی۔ مگر کوکب کی دل آزاری کے خیال سے ہیش اسے دبا کے رکھا۔ اب جب وہ خود دل سے راضی تھی تو منور کو کسی دویہویوں سے پرہیز تھوڑا ہی بتایا تھا۔

اس کے باوجود وہ لہا بننے تک نکاح نہ ہے۔ دستخط کرتے تک۔ حتیٰ کہ نورین کو رخصت کرا کے گھر تک لانے کے باوجود اسے دھڑکا سا لگا تھا ابھی کوکب بچھاڑ مار کے گر جائے گی اور دوسرے یہ شادی رکاوٹ کی لیکن اس کے برعکس کچھ بھی نہ ہوا۔ اس نے بڑے ہاتھ سے مقدور بھر بری بھی تیار کی۔ ایک چھلکا سا سونے کا سیٹ بھی دینا دکھلوانے کو لے لیا۔

عروسی جوڑا البتہ اپنا ہی دے دیا کہ اتنے سال پہلے ہزاروں کا آیا تھا اب پتا نہیں نیا کتنا منگالے اور کون سا بچہ نہیں کر گھسا لیا ہے۔ ایک پارہی تو پنا تھا چند گھنٹوں کے لیے اور وہ نورین۔ پھر یہ وہ کون سا بڑی انڈیاں ملی ہے۔ جب اس کا مرنہی خوشی قبول کر سکتی ہے تو اس کی آرتن کیوں نہیں۔

مگر وہ بھی اس کے لیے خود سیٹ کیا۔ چیز کی سب سے تاپندیدہ بیڈ شیٹ جو اس کی بھالی کے میکے میں سے اس کے مارے نے کھنے میں دی تھی۔ نکال۔ کمرے نسواری رنگ کی بوت کی ہینڈ شیٹ۔ جس پہ لہا بھلا گندی شخص بیٹھ کر کالا بھوت لگنے لگے۔

فنا کی بو سے بھری رضائیاں۔ ان پہ چڑھے پروکید کے تخت چھنے والے غلاف۔ انہیں بھرے گاؤں تلے۔ گھرے سبز رنگ کی روشنی دیتا ٹائٹ بلب، جس کی روشنی میں اچھا بھلا انسان ڈراؤنا دکھائی دے۔

دل سے سب کچھ کرنے کے باوجود عین شادی والے دن اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اگرچہ خاص تیاری کر رکھی تھی۔ منگنا جوڑا سلوا یا تھا۔ جینز بری کے سارے زیورات پالش کروائے تھے منور سے فرمائش کر کے نئے کنگن بھی بنوائے تھے جو اس نے خوشی خوشی بنوائے۔ جو نئی بیوی لاکے دے رہی ہو وہ نئے کنگن کی حق دار تو ہو سکتی ہے۔

تین دن سے بلا تھک بیوی پار لے کے پھیرے بھی لگ رہے تھے۔ یہ سارا تردد اس لیے تھا کہ منور کو پہلو میں بیٹھی دلہن کے ہوتے ہوئے بھی ساری کشش اسی میں محسوس ہو لیکن پتا نہیں کیوں عین موقع پر دل بیٹھ سا گیا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے اسے اپنا تماشا بنوانا منظور نہیں تھا اس لیے بارات کے ساتھ نہ گئی۔

بارات بھی تکی۔ لگتی کے بارہ تیرہ لوگ تھے جو شغل میلہ دیکھنے۔ جھپٹنے۔ جھپٹنے۔ سے منور کے ساتھ ہو لیے تھے۔ پونے دو گھنٹے بعد ان کی واپسی بھی ہو گئی۔ حالانکہ آنے جانے کا راستہ ہی کل ملا کے چالیس پچاس منٹ کا بننا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے نورین کے ماں باپ اسے سجا سنوار کے دلہن بنانے کے دہلیز پہ بٹھاکے راہ تک رہے تھے کہ بارات آئے اور وہ اس کا ہاتھ منور کے ہاتھ میں تھامیں۔

کوکب ہاتھ میں پھولوں کی پتیوں سے بھرا تھا لے کر دروازے پہ کھڑی ہو گئی۔ منور کے تایا زاد بھائی کی بیوی جو حسب عادت اور حسب معمول امید سے تھی۔ بلکہ بھرپور امید سے تھی۔ اپنی حالت کے پیش نظر بارات کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ بڑے تعجب اور رشک کے ساتھ بولی۔

”بڑا جگرا ہے تیرا کوکب۔“ ”جگہ؟ دل تو کر رہا ہے ان پھولوں کی پتیوں کے بجائے پسی ہوئی لال مرچیں مٹی بھر بھر کے پھیکوں



اس بارات تھی۔ ”یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ مگر وہ  
مناجات سے ہٹ کر اوی۔  
”دلن آگئی۔ آگئی۔ دلن آگئی۔“ بچوں کا شور سا  
مچ جانے لگا۔ کو کب کو اندر ہی اندر مڑا آیا۔  
”کھوٹ کھٹ اٹھنے کی دیر ہے پھر کی بچے ”بھوؤ آگیا“  
بھوؤ آگیا“ چلائے پھر س گئے۔ ”اس نے پھرا کیلے اکیلے  
لطف اٹھایا۔ مگر اس لطف کو پہلا دھچکا تب لگا جب اس  
نے گاڑی سے اترتے منور اور اس کے ساتھ ساتھ  
چلتی دلن کو دیکھا۔  
منور اپنی بے ساختہ خوشی کو چھپانے کی ناکام  
کوشش کرنا اور خود ساختہ سنجیدگی طاری کرنا حد درجہ  
ہوتی لگ رہا تھا۔  
کریم کھر کے بو سکی کے شلوار سوٹ میں اس کی  
سانولی رنگت خاصی پکی لگ رہی تھی مگولڈن براؤن  
وسٹ کوٹ نے بھی منی سی ٹونڈ کو خاصا ڈھک لیا  
تھا۔ کپڑوں کے پاس سے ذرا زرا سفید ہوتے بالوں کو  
والی سے چھپایا گیا تھا اور اسے ایسا کرتے دیکھ کر تب  
بھی کو کب دل ہی دل میں ہنسی تھی۔  
”کرلو کالے بال۔ جب اس سفید موٹھوں والی پہ  
نظر پڑے گی تب نہ بھی کالا کرنے کو مئی چاہے گا۔“  
ان سب کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح ٹھوڑا سب  
مذہر اور معتبر نظر آنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ البتہ  
کو کب کو دھچکا اسے نہیں اس کے برابر چلتی نورین کو  
دیکھ کر لگا تھا جو اس کی شادی کے میون غرارے کے  
بجائے ایک نئے نوپے بھر کیلے اور خاصے منگنے نظر  
آنے والے شرارے میں لبوس تھی۔ آج کل کا جدید  
کنڑا سٹ تھا۔  
”یہ“ اس نے تعجب سے بارات کے ساتھ  
واپس آنے والی خالہ ساس سے اوہور اسما سوال کیا، جس  
کا جواب اس خاتون نے اس تفصیل سے دیا جیسے کب  
سے کسی کو جواب دینے کو ترسی ہو۔  
”ہاں یہ شرارہ وہ جو تم نے بری میں چڑھایا تھا ناں  
غرارہ وہ اس دیدہ ہوائی دلن نے ناک پہ ہاتھ رکھ کے  
پرے پھینک دیا کہ اس میں سے لینا کتنی کی گولیوں اور

چوہہ بار دہائی کی بدد آ رہی ہے۔ ویسے بھی ان کے ہاں رواج ہے دلن رخصتی کے وقت جہاز کا جوڑا پہننے سے اور وہ پتیاں سی سونے کی جوڑ چھائی تھیں تھیں وہ بھی اس نے نہیں پہنیں۔ کہ میری گردن چھل جائے گی اتنی باریک سونے کی پتیری چھینے سے۔ اس لیے سونا بھی ادھر کا پی پنا ہے۔

کو کب نے غور سے آنکھیں سکوڑ کے دیکھا چاہا لے گھوٹ گھٹ کی آڑی وجہ سے ان زیورات کافی اخل کچھ پتا نہیں چل رہا تھا جس کے بارے میں خالہ بتا رہی تھیں۔

”بڑی کھلی زبان ہے تیری سوتن کی۔ بڑھ چڑھ کے نقص نکال رہی تھی ہر چیز میں۔ راستے میں بھی بک بک بند نہیں ہوئی۔“

”ساری بک بک چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔ جب منور گھوٹ گھٹ اٹھنے ہی لے قدموں میرے کمرے کی جانب بھاگے گا تب بولتی بند ہو جائے گی۔“

کو کب گر جو شئی سے آگے بڑھی اور دہلیز پار کرتی نورین کے پیروں کے قریب تل پڑ گیا۔

”ایسا ہی تل تمہارے سارے راستے میں پڑا ہے بنو۔ پہلے قدم میں ہی رہٹ جاؤ گی۔ سنبھلنے کی کوشش کرو گی بھی تو اگلے قدم پہ پھر سے پھسلو گی۔“ اور خود ہی اس کا بازو کتہے سے تھام کر اندر تک لے گئی۔ بند پے بٹھانے کے بعد اس نے لپسا گھوٹ گھٹ اٹھا چاہا۔

”ارے کیا کر رہی ہو کو کب۔ یہ کام تو منور کے کرنے کا ہے۔“ کسی نے نوکاتو وہ بمشکل مسکرائی۔

”ایک ہی بات ہے۔ وہ اور میں الگ تو نہیں۔“

زبان یہ شہد نکار رہی تھی اور دل الگ الپ رہا تھا۔

”بے چارے منور۔! انہیں زحمت نہ کرنی پڑے“

اس لیے تو یہ اہتمام کیا ہے۔ بے چارے آئیں گے چل آئیں گے۔ انہیں گے پھر گھوٹ گھٹ اٹھائیں گے اور پھر دل پہ ہاتھ رکھتے میری جانب بھاگتے آئیں گے۔ اس سے اچھا ہے میں یہ گھوٹ گھٹ پہلے ہی اٹھا کے رکھ دوں۔ پہلے قدم سے ہی پلٹ آئیں۔“

”کمرے میں گرمی بھی تو ہو رہی ہے۔ ذرا سا

گھوٹ گھٹ اٹھاؤں بے چاری سانس تو کھل کے لے۔“ اور آخر گھوٹ گھٹ اٹھ ہی دیا۔

”مگر یہ کیا۔“ سانس تو خود کو کب کی بند ہونے لگی۔

”وہ مردار بے کشش چہرے اور سوکھے اچھوڑے بدن کی نورین تو نہ تھی۔“

”دلن۔ دلن بدل گئی۔“ وہ بوکھلا کے کھڑی ہو گئی۔

نورین نے بھی مسکراے سے لپی پلکیں اٹھا کے کڑی نظروں سے گھورا۔ جیسے دو لگانے کا ارادہ ہو۔

”ناگل ہو گئی ہو کو کب۔؟“ خالہ نے ٹوکا۔

”نہیں۔ خالہ۔ یہ نورین نہیں ہے۔“ وہ گھور گھور کے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اے ہے تو کیا نید ہے؟“ انہوں نے ٹھٹھا لگایا۔

”یہ وہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کی مونچھیں کہاں تھیں؟“

”مونچھیں؟“ دو تین حیرت میں ڈوبی آوازیں سنائی دیں۔

”تو کیا تم نے مونچھوں والی سوتن ڈھونڈ لی تھی؟“ کسی نے بڑے طنز سے پوچھا اور پس منظر میں دبے ابے قہقہے ابھرنے لگے۔

”نہیں۔ مونچھیں نہیں۔ وہ کچھالہ سفید کچھالہ۔“

”اے کو۔ یہ تو آوازیں تو آئی جتنے گئی۔“

”نہیں بولو۔! لگتا ہے صدے سے داغ الٹ گیا۔“

”ہاں نہیں تو کیا۔ کب سے ضبط کر رہی تھی۔ آخر ہے تو عورت کہاں تک برداشت کرتی۔“

”کبھی کبھی زیادہ برداشت کرنے سے کیجہ بھی تو پٹ جاتا ہے۔“

”خالہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کوئی میری بھی تو نے؟“ یہ نورین نہیں ہے۔ وہ تو خراسا وہ خراسا کہاں کیچہ؟

”یہ کس خسرے کی بات کر رہی ہے خالہ؟“

”کہہ تو رہی ہوں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“



آنکھیں اپنی جگہ موجود تھیں۔ انہیں تراش کے پرے نہیں سرکایا جاسکتا تھا۔ رات کو ماہر پوئیشن نے اس انداز میں آئی شیڈول لگائے تھے کہ آنکھوں کا یہ نقص چھپ سائے گا لیکن اب کوکب صاف پہچان رہی تھی یہ وہی ایک دوسرے کے اندر کھینے کو بے تاب خیمات تھے۔

اب اسٹک اس انداز میں لگائی گئی تھی کہ لب بھرے بھرے لگ رہے تھے بلش ان اس اسٹاکل سے لگایا گیا تھا کہ اندر کو دھسے گال اور باہر کو نکلی رخساروں کی بندوبست کا بھرم رہ گیا تھا۔

”جھپٹ چائے بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ نئی دلہن ہو۔“ کوکب نے اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد یہ سمجھایا خود کو کہ مجھوتہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔

”تو متور بھی تو ایک رات پرانے دو لہا ہیں۔ چائے بناتے تو وہ بھی اچھے نہیں لگتے۔“ اس نے دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور کوکب تپ کے رہ گئی۔

”خفیث کو رش۔! اسی نے بتایا ہوگا کہ بیٹی ہمیشہ متور بناتا ہے۔“ وہ وانت کچکچا کے سوچتی رہ گئی اور نورین چائے لے کر پاس سے گزر گئی۔ اسے پتا تب چلا جب ان کے کمرے کا دروازہ ٹھک سے بند ہوا۔



نورین وہی تھی۔ یعنی دلہن نہیں بدلی تھی۔ صرف اس کی جون بدلی تھی۔ تیور بدلے تھے۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی اس کی ایک خیر خواہ کزن نے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک مشہور کلینک لے گئی جہاں بذریعہ لیزر سرجری چہرے کے داغ دھبوں اور بالوں کا خاتمہ کیا جاتا تھا۔ وہاں اس کا مشہور زمانہ مشہر بھی عاتب ہوا، بھنوں کے بال، رخساروں کے دھبے، ٹھوڑی کے بھدے مل، سب عاتب۔ پھر میک اپ کے لیے لپ اسٹ منٹ بھی شہر کے

حیران رہ گئی۔ لوگوں کے عمر بلی ریمارکس نے بالکل ہی کلیا پٹ دی۔ اب وہ دل سے چاہنے لگی کہ ہمیشہ ایسی ہی نظر آئے۔

پھر کیا تھا تک سب سے درست رہنے کی وجہ سے وہ حسین تر نہ سہی۔ مگر ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی۔ اور کوکب کے ٹھیک رہنے کے دن لگ گئے۔

چار دن سے زیادہ لحاظ کرنے والی وہ تھی نہیں۔ پانچویں دن پھٹ پڑی۔

”بس بس رہنے دے یہ چونچلے، صبح ایک کپ چائے کا بیانیہ ہے اور سارا دن پیرینک سے نیچے نہیں امارتی۔“

پانچویں دن تک لب سی کر رکھنے والی کوکب کا خیال تھا کہ اب وہ پھٹی ہے تو پانچ دن تک تو کھل کے بولے گی۔ کہ نئی بیانیہ آئی نورین اتنا لحاظ تو کرے گی مگر نورین نے پانچ دن تو کیا پانچ سینکڑ بھی لحاظ کرنا گوارا نہیں کیا۔ ”پیرینک سے اس لیے نہیں امارتی کہ نیچے دو دو اچھ مٹی ترہ مٹی کی ہوتی ہے۔“

”کیا؟ خود کیا محل سے اتر کے آرہی ہو سیدھی؟“

”دو کمروں کا گھر سہی۔ مگر کتنا صاف ستھرا تھا۔ یہ تم نے بھی دیکھا تھا پاپ۔“ جیسی تو ڈیلے گھما گھما کے جائزے لے رہی تھیں۔

”تپا کس خوشی میں کہہ رہی ہو؟“

”تمہارے بارہ سال بڑے ہونے کی خوشی میں۔“

”تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں تم سے بارہ سال بڑی ہوں۔“ کوکب کے تو کمروں میں آگ لگ گئی۔

”آٹھ سال پرانی شادی شدہ بھی تو ہو۔“

”آٹھ سال سے تم بھی تو رشتوں کے انتظار میں ہو۔“

میری شادی عمر کے سولہویں سال میں ہو گئی اور تم سولہ سال سے اپنے ماں باپ کی چھائی پہ مونگ دی رہی ہو۔ شادی چالیسویں سال میں ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم کوئی نصی ہو۔“

یادہ سال بڑی ہے چلو اس کا لحاظ کر کے میں اس کی عزت کر سکتی ہوں لیکن میں کسی کی چودہراہٹ نہیں برداشت کر سکتی گی۔“

”بالکل صحیح اور یہ تو تمہارا کہنا ہے کہ پلڑا برا ہے۔ اور تمہاری گود بھری۔ اور کوکب غر سے جا گئی۔“

”کوکب نہیں کالگی۔“ نورین نے چبا چبا کر کہا۔

”جس طرح اسے اپنی عمر چھپانے کے کالگی بننے کا شوق ہے اس پر یہی نام بجاتا ہے۔“

اور یہ نام کسی تبرک کی طرح فرخندہ نے بھلے بھر میں بانٹ دیا۔ اگلے روز کلثوم چلی آئی۔ اس کی تو دیوار سے دیوار ملی تھی۔ اسے اس مکان میں کرائے وار ہو کر آئے ایک آدھ ہفتہ ہی ہوا تھا اور ہمسائیگی نبھانے کے لیے اسے اس گھر سے زیادہ دلچسپی کیسے نظر نہیں آئی۔

”مجھے تو آپ دیکھنے میں ہی بھلے لکھری لگتی ہیں بس۔! کلثوم نے عقیدت سے کالگی کا ہاتھ دبایا۔ جو مندی سر پہ تھوپے بدینت سی لگ رہی تھی۔

”نیک ماں باپ کی اولاد ہو تب ہی تو میاں کو اولاد کا سکھ دینے کے لیے اپنے گلے میں یہ بلا ڈالی۔“ توبہ توبہ شکل سے ہی قصائن لگتی ہے۔“

”صحیح پچانا بس! شکل سے ہی نہیں، عادتیں بھی قصائیوں والی ہیں اور کمر اتنے کرتی ہے کہ حد نہیں۔“

ناشتے میں سوکھا تو س چائے میں ڈبو ڈبو کے کھاتی ہے اور منور کے نکتے ہی حلوہ پوری منکواتی ہے۔ دوپہر کے کھانے میں اللہ جھوٹ نہ بلوائے، چار چھ پھلکے کھا جاتی ہے پھر شام کو منور کو فون کر کے روٹی ہے کہ دوپہر ساکن میں مرچیں زیادہ تھیں، کھایا نہیں گیا، سموتے لیتے آتا۔ اب بھلا بتاؤ۔ کون سا اس کا لالما حلوئی کی دکان کھول کے بیٹھا ہے جو خاص اس کے لیے کم نمک مرچ والے سموتے بناتا ہے۔“

”اور تم چپ چاپ دیکھتی رہتی ہو، بتایا کرو اپنے میاں کو۔“ کلثوم نے جھٹ مشورہ دیا۔

”ہاں۔ بہت چپ رہ کے تمہارے دیکھ لی۔ اب

”کیا بتاؤں میں فرخندہ۔“ بنا دھوکا ہوا ہے میرے ساتھ۔“ کوکب نے پرانی ہمسائیگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرخندہ سے ہمدردی حاصل کرنا چاہی۔

”شکل تو کئی گزری ہے ہی۔ کروت اس سے بھی برے۔“

”کل کچھ آواز اس آتوری تھیں کیا ہوا تھا؟“ آخر فرخندہ نے گھر سے نکلنے کا وقت اس لیے تو نکالا تھا ان آوازوں کی تفصیل جاننے کے لیے۔

”ہونا کیا ہے۔ تم تو جانتی ہو بلکہ سارا زمانہ گواہ ہے کہ کیسے میں نے دل نکال کر منور کی دوسری شادی اپنے ہاتھوں کروائی ہے۔ بھلا کوئی خود بھی لاتا ہے اپنی سوتن۔ مگر میں نے یہ کیا، بری تیار کی۔ زیور ڈالا۔ کمرہ سجایا، بالکل بڑی بسن بن کے دکھایا۔“

”کس کی ہمتور کی؟“

”ہائے نہیں۔ اسی چپے منہ والی کی۔ میں نے سوچا نئی دلہن ہے یہ نہ کہے کہ سسرال میں نہ ماس نہ مند اسی لیے کسی نے چار دن فخرے نہ اٹھائے چائے بنانے لگی تو میں نے پیار سے منع کر دیا۔ کہ لاؤ میں بنا دیتی ہوں تم مجھو مزے سے۔ لیکن سچ کہا ہے کسی نے عزت ہر ایک کو اس نہیں آئی۔ وہ تو مجھ پہ الٹ پڑی۔ کہ ہاں ہاں تو ہوتی کون ہے مجھے چائے بنانے سے روکنے والی۔ اب یہ گھر بھی میرا گھر والا بھی میرا اور گھر کا ایک ایک چپے میرا۔ دیکھ لو فرخندہ! کیا دن دسڑا ہے ڈاکہ پڑا ہے میرے گھر۔ کل کی آئی مجھے کونے سے لگا رہی ہے۔“ فرخندہ نے اس کے آنسو پونچھے اور پھر ہانستے جاتے رک کر نورین کے کمرے میں جھانکا۔





بتاؤں گی۔" کاکی نے تہیہ کر لیا۔

"میرا تو ابھی تک سارا سامان بھی نہیں کھلا۔ کڑھی بیٹھی تھی آج۔ لیکن نہ بیسن مل رہا ہے نہ انار دانہ۔ اگر گھر میں پڑا ہے تو پاؤ بھر بیسن اور ایک دو چمچے انار دانے کے دے دتا۔ میرا مارکیٹ تک کا چکر کچ جانے لگا۔"

"کیوں نہیں بیسن۔ کیوں نہیں بیسن۔" کاکی اپنی ہمدردی ہمسائی کے لیے بیسن نکالنے فوراً "چکن میں جا بھی۔ اس سے بیسن اور انار دانہ پکڑ کے بڑی محبت سے کھٹے مٹنے اور گرم خوشی سے خدا حافظ کہنے کے بعد جیسے ہی کاکی نے برآمدے کے تخت پہ ظہر کی بیت پاندھی۔ باہر نکلتی کلثوم نے چپکے سے رخ بدلا اور گئی تھی کمرے میں۔

"کیسے ماں باپ ہیں تمہارے۔ اس ڈائن کے ہوتے ہوئے تمہیں یہاں بھیج دیا۔ یہ تو تمہیں کھانپ کے ڈکار جائے گی۔"

"ارے نہیں کیا۔ ایسا ہاتھ نہیں ہے اس کا جو مجھے ڈکار سکے۔ میں تو حلق میں پھنس جانے والی تھی ہوں۔"

"شباباش۔" کلثوم نے پیٹھ تھوٹ کر داد دی۔  
"اسی سوتوں سے گھٹنے کے لیے ایسا ہی حوصلہ اور بے جگری چاہیے۔ ویسے میں تو تھی ہوں گھٹنے میں لیکن اور برائی ہمسائیوں سے بڑی دوستی ہے اس کی۔ ہر جگہ یہی پھیلا رہی ہے کہ یتیم مسکین سمجھ کے لائی ہوں اسے۔ ترس کھا کے پھاری کا نہ کوئی آگے منہ پیچھے۔"

"خود کون سا کسی کر ل۔ مجھ کے گھرانے سے ہے۔ چھوٹی بہن چوک۔ کھڑی ہو کر سیدھا مارتی ہے۔"

"تو بہ تو بسے چوک پہ سیدھا؟ اتنی لکٹی اور توارہ ہے؟"

"نہیں نہیں۔ وہ ہے ہاں کیا کہتے ہیں اسے۔ ٹنک سار جٹ اور یہ کاکی سمجھتی ہے جیسے بڑی افسر لگ گئی ہے اس کی بہن۔"

"ارے اس کے تو سات خاندانوں میں کوئی افسر نہ

پیدا ہوا ہو گا۔ یہ ڈی ڈی ڈی پلیئر تمہارے جینز کا ہے؟"

کلثوم نے بات کرتے کرتے سوال دانا۔  
"ہاں۔" منھی نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔  
جینز میں اسے ایک سوٹ کیس سے زیادہ کچھ نہ ملا تھا لیکن وہ اپنی ٹاک سنی کیوں کرتی یہ بتا کر کہ یہ ڈی ڈی ڈی پلیئر منور نے اس کی فرمائش پر لاکے دیا تھا۔  
"ہمارے پاس بھی ہے مگر سی ڈی پلیئر۔ ڈی ڈی نہیں لگتی اس میں۔ میرا بیٹا بڑی اچھی کارٹون فلم کی ڈی ڈی ڈی خرید لایا مگر بے چارہ ابھی تک دیکھ نہیں سکا۔ اگر ایک آدھ دن کے لیے تم یہ دے دو تو۔"

منھی تذبذب میں رہ گئی۔  
نئی ہمسائی۔ پہلی ملاقات۔ کیسے فوراً اٹھا کے دے دے۔

"تمہارا بیٹا ہے اس لیے مانگ لیا۔ ورنہ کاکی کا ہوتا تو توبہ کرو۔ میں کبھی نہ مانگتی۔ شکل سے ہی وہ اتنی کھینچی اور تھڑکی ہے۔ اس کا کہاں حوصلہ ہوتا کچھ دینے لگا۔"

"اور کیا لے جاؤ تم۔ ایک آدھ دن کیا۔ ہفتہ بھر رکھو۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ بچے مڑے سے قلمیں دیکھیں۔" اور کلثوم خوش خوشی ڈی ڈی پلیئر اٹھا کے چلتی گئی۔

اسی طرح لوگ آتے گئے اپنے اپنے مطلب نکالتے گئے اور دونوں کے جھگڑے کو ہوا دیتے رہے اور جب بات حد سے بڑھ گئی، منھی اور کاکی کے معرکے اب ہفتہ وار ہونے کے بجائے دن میں دو دو، تین تین بار ہونے لگے تب یہی بڑوسیں ٹاک تک عاجز آ گئیں۔ ویسے بھی اب انہیں ملتا خاک بھی نہیں تھا۔ ان کی لگائی بھائی کی اب نہ منھی کو ضرورت تھی نہ کاکی کو۔

جھگڑوں کے معاملے میں وہ خود کفیل ہو گئی تھیں۔ کلثوم یا فرخندہ کے سارے ایک دوسرے تک بات پہنچانے کی محتاجی نہیں رہی تھی۔ اب تو صرف ایک دوسرے کو کھلم کھلا سنایا جاتا بلکہ آس پاس کے دس گھر



بھی مستفید ہوتے۔

\*\*\*

”میں کہتی ہوں آپ منے کو سمجھاتے کیوں نہیں۔“ کلثوم نے ماش کی وال چٹتے ہوئے تصدق کو مشورہ دیا۔

”اب وہ منا نہیں رہا۔ کانچ جانے لگا ہے اور میرا خیال ہے ایسا کچھ نہیں کرتا میرا بیٹا کہ مجھے اسے سمجھانے کی ضرورت پیش آئے۔“

”اوہو۔ میں اپنے بیٹے کی بات نہیں کر رہی۔ منا آپ کا دوست بھی اور کانچی کامیاب۔“

”منور کہتا ہے اسے منور اب۔ اس کی بیویاں تک تو اسے منا کہتی ہیں۔ میں تو کہتی ہوں آپ کو اور محلے کے دیگر لوگوں کو اسے سمجھانا چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں پہ کنٹرول رکھے۔“

”میں اور محلے کے دیگر لوگ۔۔۔“ وہ استغناء سے ہنسا۔

”ہم ایک ایک بیوی پہ کنٹرول پانے میں ناکام ہیں۔ اسے کیا مشورہ دوسرے۔“

”داف۔ یہ اچھی کمی۔ آپ نے اور کس کی بیوی ہے جو محلے بھر میں گھر کی بدنامی کے اشتہار لگوانی پھر رہی ہے۔“

”لیکن وہ ہم میں سے ہی کس ایک کی بیوی ہے جس نے انہیں یہ اشتہار بنا کے دیا ہے۔“

”تصدق کے گھرے انداز میں کہنے پہ کلثوم چپ کر گئی اور وال کا تسلسلہ اٹھا کے کچن کی جانب چل دی۔

\*\*\*

”تصدق بھائی کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔“ شاہد نے ردال سے ناک کو رگڑتے ہوئے کہا۔

”جھگڑا کس گھر میں نہیں ہوتا۔ ساس بوس میں ہوتا ہے۔ منہ بھلا نہیں ہوتا ہے۔ دیو رانی جیٹھانی میں ہوتا ہے یہ تو پھر سوتیں ہیں۔ ان کے درمیان چپقلش رہتا ایک فطری عمل ہے لیکن یہاں بات معمول سے بڑھ کے اس لیے ہے کہ ان کے سر پہ کوئی بزرگ نہیں۔

کوئی سمجھانے والا، ٹوکنے والا، سرزنش کرنے والا، اچھا برا سمجھانے والا ہوتا تو بات قابو میں رہتی، لیکن یہاں تو صرف تیل کو آگ اور شعلوں کو ہوا دینے والے لوگ تھے۔ محلے کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔ ہر وقت لڑائی جھگڑا کا کالم گونج رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے کسی پسماندہ بستی میں آنکے ہیں۔“

تصدق نے سنجیدگی سے اپنا موقف ان چاروں کے سامنے بیان کیا۔

”تصدق صاحب! آپ تو پھر فائدے میں ہیں۔ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں، جب چاہا بدل لیا۔ مصیبت تو ہمارے جیسوں کی ہے جنہوں نے پانی پانی جوڑے کے قرضہ لے کر زیور بچ کر بھیت بنائی ہے، ہم کہاں جائیں اس ماحول سے بچ کر۔“

”بھائی میرے جب گھر میں کچھ بھر جائے تو گھر نہیں چھوڑا جاتا۔ کچھ صاف کی جاتی ہے۔ منا میرا مطلب ہے منور ہم میں سے ایک ہے۔ بھلا آدمی ہے۔ شریف النفس۔ ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔“

”بیویوں سے چھٹکارا پانے میں۔۔۔؟“

”میں سنجیدہ ہوں ملک صاحب۔ ہمیں اسے سمجھانا چاہیے کہ ہر معاملے میں شرافت نہیں چلتی، کہیں کہیں انسان کو اننگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔“

”میں تصدق بھائی سے متفق ہوں۔“ نعیم نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

”لیکن میں نہیں سمجھتا کہ صرف بڑوسی ہونے کے ناتے ہمیں ان کی گھریلو اور ذاتی زندگی میں دخل دینے کا حق ہے۔“ کاشف نے اعتراض کیا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ شاہد نے چھینک مارنے کے دوران تائید کی۔

”آج کل کون پرانے پھندوں میں ٹانگ اڑاتا ہے۔“

”میں کہتے کہ مفت کا تماشا ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔“

لیتی تو اس کے بردباری کے اس طویل مظاہرے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہی ہو جاتی۔ لیکن اب وہ بھی صبر کھو بیٹھا اور عادت کے مطابق گرم مزاج ہو گیا۔

”آرام سے تصدق بھائی!۔“ نعیم نے گھر کے اس کا ہاتھ دیا۔ سب سے زیادہ تماشے تو دی شوق سے دیکھا کرتا تھا۔ بالکونی سے لڑک کر۔

شاہد نے بھی سر جھکا لیا۔ فرخندہ کی عادت سے وہ واقف تھا۔ دل بسلانے کے لیے بی وی وغیرہ کے بجائے وہ منہ کی اور کانچی کا لالچہ شوق کھانا زیادہ پسند کرتی تھی۔

”جب جھگڑوں کو ہوا دینے کے لیے رائے معاملے کو اپنا مانا جاسکتا ہے تو جھگڑا ختم کرانے کے لیے کیوں نہیں۔ میں آج ہی منور سے بات کروں گا اور آپ سب کو میرا ساتھ دینا ہو گا۔“

منور کو گھر جاتے ہوئے راستے میں ہی دھریا لیا۔ باقی سب کے ہاں ان کی بیویوں کی صورت مخبر موجود تھے اس لیے منور کو بحفاظت نعیم اور کاشف کے پورشن میں پہنچایا گیا۔

”تصدیق بھائی! مجھے گھر جانے دیں۔ افطار کا وقت ہونے والا ہے۔ بھرے پیٹ وہ دونوں اتنی خطرناک ہوتی ہیں۔ بھوکے پیٹ تو ایک دوسرے کو بھاڑ کھا میں گی۔ کوکب سمجھے گی میں نورین کے لیے کچوریاں لانے رک گیا ہوں اور نورین سمجھے گی کوکب کی فرمائش پر قہر جاری اتار ڈھونڈ رہا ہوں۔“

اس نے بہتر بے ہاتھ پیر جوڑے گھر وہ سب اسے جانے دینے پہ تیار نہیں تھے۔

”سمجھئے۔ وہ دونوں کو۔ تم ہماری بات سنو اور سمجھو۔“

\*\*\*

”ہائے اللہ! منور نے تو اپنا فون بھی بند کر رکھا ہے۔ خیر ہو۔“ کوکب نے آنکھیں بار بار نمبر ملا تے ہوئے مایوسی سے کہا۔

”تم کبھی منور کو منے سے منور نہ بننے دینا۔ مرزوات

ہے۔ دیر سویر ہو ہی جاتی ہے عجب کیا پلو سے بندھ کر بیٹھا رہے۔“

”سب سمجھتی ہوں۔ یہ جو اتنی بے فکری چھائی ہوئی ہے اس کے دو ہی مطلب ہیں۔ یا تو تمہاری جوتی کو بھی پروا نہیں، منور کہیں بھی ہو، کسی حال میں بھی ہو۔ یا پھر تمہیں بتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ تمہاری ہی کوئی فرمائش پوری کرنے کے لیے بے چارہ روزے کی حالت میں دھکے کھا رہا ہو گا۔“

”زیادہ کانچ نہ بن۔ جیسے مجھے پتا نہیں۔ وہ تمہارے میکے حاضری لگاتا ہے، صبح شام اب بھی دے دیتا گیا ہو گا۔ افطاری کا سالن۔ کیسے کیسے لوگ ہیں۔ دالہ کے ترمل پہ آس لگا کر بیٹھے رہتے ہیں۔“

”نہیں! زیادہ زبان نہ کھول۔ میری کھل گئی تو سنا نہیں جائے گا تیرے سے۔“

”پہلے کون سا سنا جاتا ہے۔ آواز ہے کہ پھٹا ڈھول۔“

”اور تو کیا ہے۔ خروں کا وارڈن۔۔۔“

عصر کے ذرا بعد شروع ہوا یہ ہنگامہ اب رات دیر تک جاری رہنے والا تھا۔ جب تک کہ دونوں تھک کر بے دم نہ ہو جائیں۔

\*\*\*

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں گھر نہ جاؤں۔ وہ دونوں پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ منور نے منتنا کر کہا۔

”ہو نہیں رہی ہوں گی۔ ایک دوسرے کو کر رہی ہوں گی۔ ذرا انور سے سنو۔“

شاہد کے کہنے پہ منور نے کان لگا کر سنا۔ دونوں کا ایک دوسرے کے خاندان کو موتوں میں ٹولنے کا مقابلہ جاری تھا۔ منور نے جمل ہو کر نظریں چرائیں۔

”نظریں چرائینے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔“

”تو کیسے ہو گا تصدق بھائی؟“

”تم خود چوری ہو جاؤ۔“

”مجھے کون چرائے گا۔“

”تم خود۔۔۔ تم چند دن کے لیے کہیں روپوش



ہو جاؤ۔  
 ”لیکن پیچھے یہ دونوں اکیلی۔“ وہ متذبذب تھا۔  
 ”اکیلی کیسے؟ وہ وہ ہیں۔ دو لوگ اکیلے نہیں ہوتے  
 اور پھر ہم سب ہیں ناں۔ باری باری محلے کا ہر ایک گھر  
 ان کا خیال رکھے گا۔“

”لیکن اس سے فائدہ کیا ہو گا؟“  
 ”اس سے انہیں تمہاری قدر محسوس ہوگی۔ اندازہ  
 ہو گا ان کو کہ تمہارا ہونا کتنا ضروری ہے۔ جب انہیں  
 تمہاری اہمیت کا احساس ہو گا تو یہ بات بھی سمجھ جائیں  
 گی کہ تمہارا ہونا زیادہ اہم ہے، کس کا ہونا ہے یہ زیادہ  
 اہم نہیں ہے۔ تمہاری جدائی انہیں یہ سکھائے گی کہ  
 کیسے دونوں کو جنہیں شیر کرنا ہے۔“

”شیر بن جاؤں گا میں؟“ منور نے اچانک خوش  
 ہوتے ہوئے چھاتی پھلائی۔  
 تصدق نے ایک آہ بھری اور شیر کا مطلب واضح  
 کرنے کے بجائے اس پر سر ہلادیا۔  
 ”لیکن میں جاؤں کہاں؟“  
 ”کسی دوست کے گھر۔“

”میرے دوست تو آپ ہی ہو تصدق بھائی۔“  
 تصدق کے روٹنے کھڑے ہو گئے، اس نے چشم  
 تصور میں منہ کی اور کاک کی فوجیں اپنے گھر اترتے  
 دیکھیں۔  
 ”میں اتنے قریب نہیں۔ کسی دور کی جگہ جاؤ۔  
 یہاں تو انہیں پتا چل جائے گا۔ دیوار سے دیوار ملی  
 ہے۔“

”ویسے بھی ہم یہ پلان عورتوں سے مخفی رکھنا  
 چاہتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو ان عورتوں کی عادت۔ ذرا  
 تمہاری بیویوں نے چار سوے ہمارے اوہر انہوں نے  
 راز اگلا۔ جبکہ اس معاملے میں دل پتھر کرنا بڑے گا۔“  
 ”میری ایک خالہ ہیں۔ پہلے بھی کھار کا ملنا ملنا تھا  
 مگر منہ کی کے آنے کے بعد تو انہوں نے اوہر کام بھی  
 نہیں کیا۔ وہاں چلا جاؤں؟ وہاں کا خیال بھی نہ آئے  
 گا دونوں کو۔“  
 منور شاید ان کے دلائل سے پوری طرح متفق تھا،

اس لیے خود جانے کے لیے آمیز یا پیش کرنے لگا۔  
 ”بس پھر وہ دن۔“  
 ”وہ دن تو دن دن۔“ نعیم اور کاشف چلائے۔

رات آدھی گزر گئی۔ ابھی تک منور نہیں  
 لوٹے۔ منہ کی فون پہ دو رو کے اپنی بھلون کو سناری  
 تھی۔

”ہائے امل! سارے دوستوں کو فون کر لیا۔ کچھ پتا  
 نہیں چلا۔“ دوسرے فون پہ کاک اپنی ماں سے بات  
 کر رہی تھی۔ رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔  
 ”یہی باتیں کر رہی ہیں بھائی! وہ کوئی بیچے ہیں  
 جو۔“ زیادہ تیز اور سخت بات کہتے کہتے وہ رکی۔ کن  
 اکھیوں سے کاک کو دکھا۔ پھر آواز دیا کے غرائی۔

”سیدھی طرح کو بھائی! کہ میری فکر تمہاری فکر  
 نہیں ہے۔ میرا میاں آئے نہ آئے تمہاری بلا سے۔  
 تمہیں اپنی نیند زیادہ پاری ہے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت  
 ہے کہ فون بند کر دوں۔ وہ نمبر مارا ہے ہوں گے  
 ہونہ۔“ دوسری جانب کاک سرگوشیوں میں ماں پہ  
 غصہ نکال رہی تھی۔

”بہت اچھے۔ میری باتیں سن کر آپ کا بلڈ پریشر  
 بڑھ رہا ہے۔ ٹینشن دے رہی ہوں میں؟ ٹھیک  
 ہے۔ آپ مزے لوٹیں۔ میں جانوں میرا گھر۔“ اس  
 نے بھی فون کھٹاک سے رکھ دیا اور مڑی تو منہ کی  
 آنکھوں میں آنسو لیے سامنے کھڑی تھی۔

”کچھ پتا چلا؟“ روکھے لہجے میں پوچھا۔  
 ”نہیں۔۔۔ تمہیں کوئی اطلاع آئی۔“ اس نے بھی  
 نفی میں سر ہلادیا۔  
 اور دونوں پشیمک کے رو دیں۔

یہ پہلا دن نہیں تھا جب دونوں نے مل کے آنسو  
 بہائے۔ آنے والے گیارہ کے گیارہ دن دونوں ایک  
 ساتھ آس کے سارے دن گزاریں۔ شام آتے  
 آتے یہ آپ بھر سے ٹوٹ جاتی۔ پہلے دن دونوں پیٹھ  
 موڑ کے روئیں۔ دوسرے دن ایک دوسرے کے

چہرے کو دکھ سے تکتے ہوئے تیسرے دن ایک  
 دوسرے کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے چوتھے دن شانہ  
 سلاتے ہوئے پھر پانچویں۔ چھٹے ساتویں آخر  
 گیارہویں دن دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو  
 دیں۔

”کیا بات ہے، آج تم دورے پہ نہیں نکلیں؟“  
 شانہ نے فرخندہ سے پوچھا جو بڑی بے رعیتی سے  
 اگلے ہوئے آلودہ بیوں کے لیے کٹ رہی تھی۔  
 ”پچھلے گیارہ روز سے اس کا معمول تھا۔ دن میں دو  
 پھیرے تو منہ کی اور کاک کے ہاں لگتے۔ کبھی منہ کی کے  
 آنسو پونچھتی کبھی کاک کو دلا سے دیتی۔ یہی حال آس  
 پاس کی دیگر خواتین کا تھا۔“

”کیا کروں جاگے اب کہنے سننے کے لیے دونوں  
 خود کافی ہیں ایک دوسرے کو۔“  
 ”کیا مطلب؟“

”کہاں تو اینٹ کتے کا بیر تھارہ دونوں میں۔ کہاں اب  
 بنایا ہوتا گاٹھ لیا ہے۔“  
 فرخندہ کے انداز میں مایوسی تھی مگر شاید کا دل  
 دھڑک اٹھا۔ وہ بے تابی سے اٹھ کر تصدق کا نمبر مانے  
 لگا۔

”ہاں۔ مل گئی ہے مجھے بھی اطلاع۔ یہ نعیم بیٹھا  
 ہے میرے سامنے اس کے پاس تازہ ترین خبریں  
 ہے۔“

”تو پھر؟“ گلا نمکس کا وقت آن پہنچا؟“  
 ”ہنڈرڈ پرسنٹ۔ آج آخری روز ہے۔ دھند  
 چھنے گی اور ہمارا چاند منور ہو کر نکلے گا۔ کاشف گیا ہے  
 لینے۔“

اور پھر تصدق سے کٹھوم تک، کٹھوم سے فرخندہ،  
 فرخندہ سے ثانی اور ثانی سے باقی محلے میں یہ خبر پھیل  
 گئی کہ منا آ رہا ہے۔ بھلا منہ کی اور کاک سے یہ خبر کیسے  
 چھپی رہتی۔ اپنے اندر امنڈتے سوالوں کو ”پھر سسی“  
 کہہ کر ناشی وہ دونوں اس کے استقبال کی تیاریاں

کرنے لگیں۔  
 ایک تیاری وہ تھی جو بچن میں ہو رہی تھی۔  
 برکلف افطاری کے طور پر۔  
 دوسری تیاری وہ تھی جو آئینے کے سامنے ہو رہی  
 تھی۔

اور تیسری تیاری بھی تھی۔ جو اندر ہی اندر پکائی  
 جارہی تھی۔ کہ ایک بار منا ہاتھ آئے تو سسی۔ پھر تو وہ  
 کچھ کرنا ہے اس کے ساتھ کہ دوبارہ دو منٹ کے لیے  
 بھی نظروں سے غائب ہونے سے پہلے دو ہزار مرتبہ  
 سوچے گا۔  
 ”لگتا ہے منا آیا۔“

منور کی 88 ماڈل کی سونڈ کی کاٹھکا ہوا ہارن سننے  
 ہی دونوں باہر کی جانب بھاگیں۔  
 پہلے کاشف برآمد ہوا۔ رنگ اڑا ہوا۔ ہوائیاں اڑی  
 ہوئیں۔ ہاتھوں کے کیوٹر، طوطے سب اڑے  
 ہوئے۔

اس کے بعد جھینپا جھینپا سامتور یا ہر نکلا۔ وہی کریم  
 کلر کا بوسکی کاشلور سوٹ۔ گولڈن براؤن کلر کا وِسٹ  
 کوٹ۔ اور اس کے پیچھے پیچھے نکلی۔ خالہ امل کی بیوہ  
 بیٹی۔

ہرے رنگ کے کام دار سوٹ میں ملبوس، زمرہ کے  
 گلوبند اور سونے کی چوڑیوں سے لدی۔  
 منہ کی اور کاک نے ایک نظر اس کے میک اپ سے  
 لپے چہرے پہ ڈالی اور دوسری نظر ایک دوسرے کے  
 چہرے پہ ڈالی۔

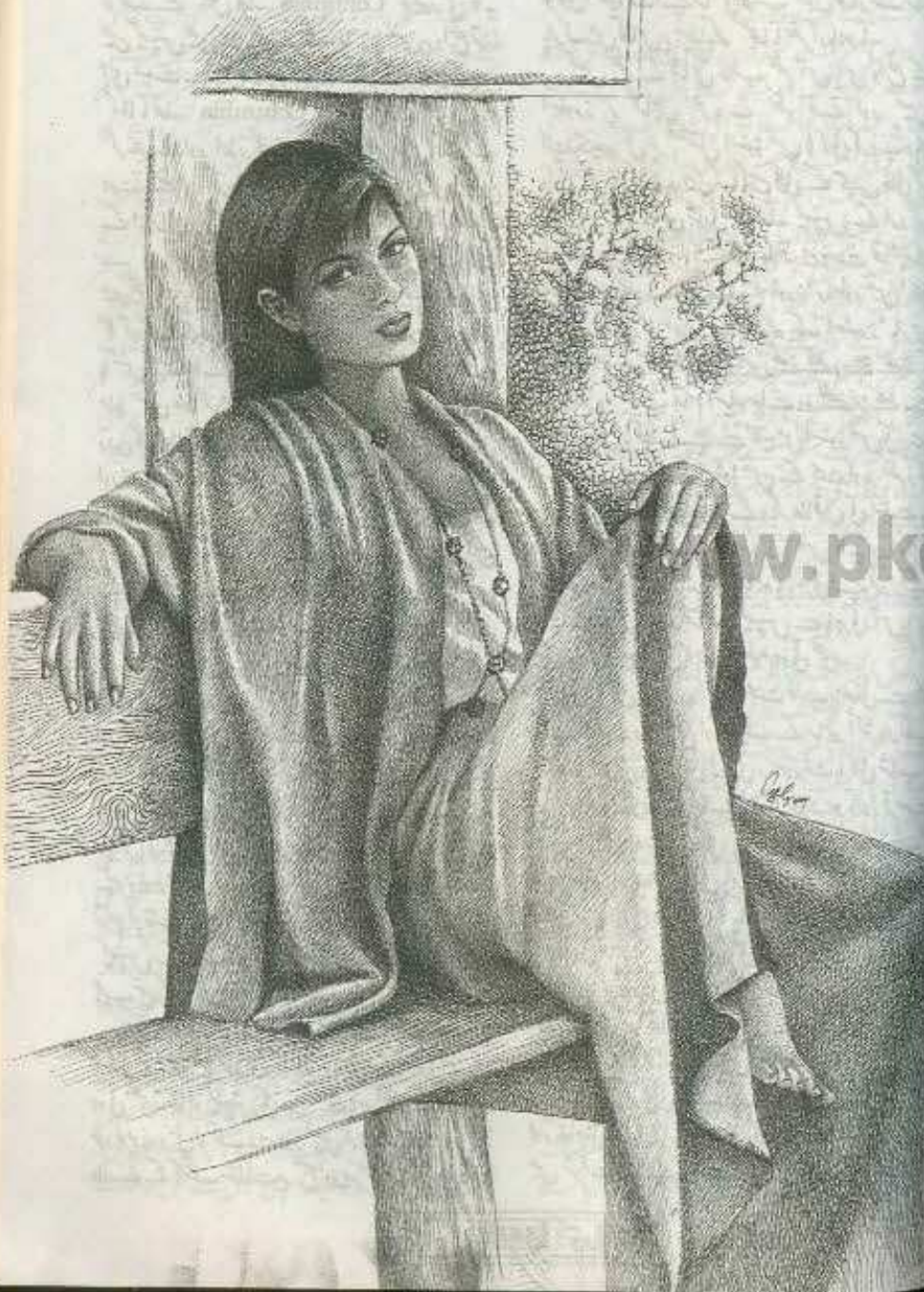
منور اب پچھلا دروازہ کھول رہا تھا اور ایک لمحے بعد  
 ایک ایک کر کے ہرے رنگ کے جوڑے میں ملبوس  
 خالہ امل کی گئے وقتوں کی بیوہ۔ اور حالیہ سماں بنی  
 کے کپاچوں پہنے برآمد ہو رہے تھے۔



## سناج حال ہے

ہنیہ سجاد ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی ہے۔ غیر معمولی اعتماد اسے والدین سے ورثے میں ملا ہے اس کی ساری زندگی امریکہ میں گزری ہے۔ بہترین تربیت اور کولمبیا یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری نے اس کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا کیا ہے۔ اس کے والد وکیل جبکہ والدہ اکٹاسٹ تھیں۔ دو بھائی اور ایک بہن شادی کے بعد اپنی اپنی زندگی میں مشغول ہیں۔ والدین کے انتقال کے بعد ہنیہ امریکہ کی ہنگامہ پرور فضا سے گھر آکر پاکستان آجاتی ہے اور جاب کے سلسلے میں فاروق ایسوسی ایٹس آتی ہے۔ جہاں فرم کے مالک عذیر فاروق اس کے پر اعتماد اور سادہ انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ اسے ٹرائل پر نوکری دے دیتے ہیں۔ جہاں چند ہی دنوں میں وہ متاثر کن کارکردگی دکھاتی ہے۔ پاکستان میں وہ فیاض ماموں، شمس ماما کے ساتھ رہتی ہے۔ جاب کے سلسلے میں عذیر ہمدانی خاص معاونت کرتے ہیں جس سے اسے اپنے جسٹس میں آسانی ہوتی ہے۔ ان کی اہلیہ ہاجرہ عذیر سے مل کر ہنیہ بہت متاثر ہوتی ہے۔ وہ عذیر فاروق کی طرح غلسماتی شخصیت کی حامل ہیں۔ وہ ہاجرہ عذیر کی طبیعت کی خرابی پر ہنیہ ذاتی طور پر ان سے ملنے اسپتال جاتی ہے۔ وہ ہنیہ میں ایک ان دیکھی کشش محسوس کرتی ہیں۔ ہنیہ بھی عذیر فاروق اور ہاجرہ عذیر کے لیے خاص جذبات رکھتی ہے۔ اچانک ایک روز وہ دونوں ہنیہ سے ملنے گھر آجاتے ہیں جس پر وہ حواس باختہ ہو جاتی ہے ان کے جانے کے بعد وہ فیاض ماموں اور شمس ماما کو بتاتی ہے کہ یہ عباد کے والدین ہیں۔ جس پر وہ دونوں حق رہ جاتے ہیں۔ انجینئرنگ میں ایم ایس کر رہا تھا۔ عالی یعنی عباد عذیر سے اس کی ملاقات کولمبیا یونیورسٹی میں اتفاقاً ہوئی جو وہیں سے انجینئرنگ میں ایم ایس کر رہی تھی۔ ہنیہ کا پر اعتماد انداز اسے بھی چونکا تا ہے اور بے ساختہ اس کی جانب کھینچنے لگتا ہے لیکن ہنیہ اسے بالکل لٹ نہیں کراتی۔ (اب آگے پڑھیے)

## مکمل ناول





یہ اس کا سول انجینئرنگ میں بی ایس کا ساتواں سمسٹر تھا، جو آج کل گرچہ کچھ اگلا سمسٹر یعنی آٹھواں سمسٹر اس کا آخری سمسٹر تھا، لہذا اس کے سول انجینئر بننے میں بس اب کچھ ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ اسے اپنے کیپس اور کیپس لائف سے عشق تھا۔ Columbia یونیورسٹی کا یہ مین کیپس مین ہن میں مارنگ سائڈ ہائٹس پر واقع تھا۔ اسی نسبت سے مین کیپس زیادہ تر مارنگ سائڈ کیپس کہلاتا تھا۔ Columbia یونیورسٹی کے تقریباً تمام گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ پروگرامز میں کنڈکٹ ہوتے تھے اور تقریباً تمام گریجویٹ اسکولز اسی مین کیپس کے اندر ہی واقع تھے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر تمام پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ شعبہ جات سب کی الگ الگ عمارتیں اسی ایک کیپس میں واقع تھیں۔ کیپس اور اس کا آرکیٹیکچر ہی کم و قریب نہ تھا کہ مارنگ سائڈ ہائٹس جیسے علاقے سے تھک چکے کیپس اور کیپس لائف کو مزید حسن عطا کر دیا کرتے تھے۔ مارنگ سائڈ ہائٹس مین ہن کا وہ علاقہ تھا جہاں تین خوب صورت ترین پارکس اور امریکہ کے سب سے بڑے اسکولز واقع تھے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے ساتھ ان دیگر تعلیمی اداروں کے بھی زیادہ تر فیکلٹی ممبرز مارنگ سائڈ ہائٹس اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں واقع گھر ہیں اور اپارٹمنٹس میں رہائش رکھتے تھے۔ مارنگ سائڈ ہائٹس پر واقع بیشتر اپارٹمنٹس، کولمبیا یونیورسٹی کی اپنی ملکیت تھے جن میں یونیورسٹی کے پروفیسرز، پیمپرز اور دیگر فیکلٹی ممبرز اور اسٹاف رہائش رکھتے تھے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے سب سے گریجویٹ اسٹوڈنٹس اسکاٹلرڈ اور ڈاکٹرٹ ڈگری کے حصول کے لیے کوشاں طالب علم بھی اسی علاقے میں رہائش رکھنے کو قابل ترجیح سمجھتے تھے تاکہ اپنی ریسرچ کے لیے یونیورسٹی کی لیب اور لائبریری سے دن اور رات کے تمام اوقات میں آسانی سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ کیپس کے قریب و جوار کا یہ تمام علاقہ اپنے اندر ایک عجیب سی کشش رکھتا تھا۔

یہ سارا علاقہ ہمہ وقت اسٹوڈنٹس سے گھرا رہتا تھا۔ ان اسٹوڈنٹس میں کثیر تعداد کولمبیا یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کی ہوتی تھی۔ وہ جو کیپس کی حدود سے باہر نکلنے کے بعد بھی خود کو یونیورسٹی لائف سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے وہ اس علاقے کے مختلف مقامات پر صبح دہر شام یہاں تک کہ

رات کے اوقات میں بھی ہر وقت دیکھے جاسکتے تھے۔ اسٹوڈنٹس کا کوئی گروپ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد آس پاس کے کسی اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر اپنے کسی پروفیسر کے گھر کچھ پوچھنے سمجھنے، ڈسکشن کرنے جانا نظر آتا تو کوئی اسٹوڈنٹ اپنے ساتھی طالب علموں کو مارنگ سائڈ پارک میں گھاس پر بیٹھا کچھ سمجھا کر نظر آ رہا ہوتا۔

کیپس علم کے شائق طالب علم آس پاس واقع بک اسٹورز پر کتابیں خریدتے نظر آتے اور کیپس انٹیلکچوئل پر مشتمل اسٹوڈنٹس کا کوئی گروپ وہاں واقع کسی کافی شاپ میں گہرا گرم کافی کے کیپس خالی کرنا لمبی لمبی علمی بحثیں کرنا نظر آتا۔ کیپس کے ارد گرد مارنگ سائڈ ہائٹس کا یہ تمام علاقہ زبردست تھا یہاں بہت سے چھوٹے بڑے بک اسٹورز، ریسٹورنٹس، کافی شاپس اور بازار موجود تھے۔ کچھ بک اسٹورز، ہارس ریسٹورنٹس اور کافی شاپس جو ہیں گھٹنے پھلتے رہتے تھے۔ یہاں دستیاب تمام اشیاء چاہے وہ لکھنے پڑھنے سے متعلق ہوں یا کھانے پینے کے، ان میں اسٹوڈنٹس کی پسند ناپسند سب سے بڑھ کر اسٹوڈنٹس کے بحث کوئی نظر رکھا جاتا تھا۔ اسی لیے نیویارک کے دیگر علاقوں کی نسبت یہ قدرے کم مہنگا تھا۔ مارنگ سائڈ ہائٹس کا یہ پورا علاقہ چاہے وہ کیپس کے اندر کی دنیا ہو یا باہر کی اپنے اندر ایک انٹیلکچوئل نیچ رکھتا تھا۔ کیپس سے باہر کی آس پاس کی دنیا بھی کیپس ہی کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

اپنی مشکل ترین اور انتہائی محنت طلب رہائی سے کچھ وقت نکال کر وہ کیتھی اور مائیک کے ساتھ اکثر مارنگ سائڈ ہائٹس پر واقع کسی نہ کسی ریسٹورنٹ یا کافی شاپ کا رخ کیا کرتی تھی۔ کچھ کھانے پینے کا موزہ نہ ہوا اور فرصت ہوتی تو بھی وہ تینوں کبھی کبھی مارنگ سائڈ پارک ریسٹورنٹ یا سینٹرل پارک کا رخ بھی کر لیا کرتے تھے، گریجویٹ کی دوپہروں کا کچھ وقت یہاں گزار کر گویا پڑھائی کی تمام محنتیں اتر جاتی تھیں۔

کولمبیا یونیورسٹی سے اس کا سہا تعارف ماما جانی کے حوالے سے ہوا تھا۔ وہ بیس کی گریجویٹ تھیں، انہوں نے لیٹ 50 میں بیس سے انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔ ہینسنگٹن "آٹھ سو سال کی ماما جانی کے ڈیپارٹمنٹ کا alumni ورنہ تھا جس میں شرکت کے لیے وہ اسے بھی اپنے ساتھ کیپس لے

آئی تھیں اور تب نیویارک کی مشہور سڑک برڈوے پر واقع کولمبیا یونیورسٹی کے مین کیپس نے اسے باہر سے ہی اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ بڑے بڑے بلند بالا آہنی کیپس اور ان کے اندر دور دور تک نظر آتے ایک جیسے سائز کے بڑے بڑے درخت۔

دونوں اطراف درختوں کی یہ قطاریں باہر سے ہی اسے مبہوت کر گئی تھیں اور جیسے تب ہی دل میں اس نے خود سے یہ عہد کر لیا تھا کہ ماما جانی کی طرح ایک روز میں بھی اس تعلیمی ادارے کا حصہ بنوں گی۔ اس کی دلچسپی چونکہ سول انجینئرنگ کی طرف تھی تو اس کا انتخاب اور اس کی منزل کولمبیا یونیورسٹی کا Fu Foundation انجینئرنگ اسکول جو عرف عام میں Seas یا پھر انجینئرنگ اسکول کہلاتا تھا، ٹھہرا تھا۔ انجینئرنگ اسکول کیپس کے شمالی حصے میں واقع تھا اور یہ کسی خوب صورت بلڈنگ پر مشتمل تھا۔ چھ سات عمارتیں مل کر انجینئرنگ اسکول کہلاتی تھیں۔ مین کیپس کے اندر موجودگی کے سبب انجینئرنگ اسکول کے طلبہ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ یونیورسٹی کی دیگر تمام فیکلٹیز اور وہاں دستیاب سہولتوں جیسے لائبریری وغیرہ سے با آسانی فیض یاب ہو سکتے تھے۔

بجک انجینئرنگ اسکول کی اپنی لائبریری S. W. Mudd بلڈنگ کی چوتھے منزل پر واقع تھی۔

سول انجینئرنگ کا ڈیپارٹمنٹ S. W. Mudd بلڈنگ اور انجینئرنگ ٹیسٹس پر واقع تھا۔ (اسٹریٹ آف مشیونر) ہو یا سول مکیٹنگس یا کی ریسرچ سے متعلق سب ڈیپارٹمنٹ کی لیبز اور تمام ریسرچ سینٹرز شاندار اور ہر طرح کی سہولیات سے آراستہ تھے۔

کیتھی اور مائیک نے وہ لوگ مائیک کہتے تھے۔ اس کے سب سے خاص اور قریبی دوست تھے۔ کیتھی تو اس کے بچپن کی دوست تھی۔ اسکول کے دنوں سے گریڈ دن سے وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہی تھیں، بجک مائیک سے دوستی ہائی اسکول کے دنوں میں ہوئی تھی۔ کیتھی اور مائیک ایک دوسرے کے ساتھ تب سے ہی بہت سنجیدہ تھے۔ سول انجینئرنگ میں پیچیدہ ڈگری لے لینے کے بعد ان دونوں کا پہلا کام ایک اچھی جانب کا حصول اور پھر کام ایک دوسرے کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھنا تھا۔ پڑھائی ہو یا دیگر ایکشنوئیر وہ تینوں ہمیشہ ساتھ رہا کرتے

تھے کیتھی اور مائیک تو خاص دوستوں میں آگئے مگر اس کی کیپس میں اور بھی بہت دوستیاں تھیں۔ انجینئرنگ اسکول کے علاوہ دیگر اسکولز اور ڈیپارٹمنٹس میں بھی اس کے کافی دوست تھے۔

اپنے اسکول اور اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بھی اپنے کلاس فیلو کے علاوہ اس کی دیگر کئی جونیئر اور سینئر اسکول میمنس کے ساتھ بھی اچھی ہائے بیلو تھی۔ سول انجینئرنگ میں ایم ایس اور ڈاکٹرٹ کرنے والے بعض اسٹوڈنٹس سے بھی اس کی کیتھی اور مائیک کی سلام دعا تھی۔

پھر عبادت گاہ سے وہ اس روز سے پہلے تک قطعاً واقف نہ تھی۔ مگر اس روز کے بعد تو جیسے وہ اسے ہر جگہ نظر آنے لگا۔ وہ کسی لیب سے باہر نکل رہی ہے تو پاس ہی کیپس وہ نظر آجائے گا وہ کسی کلاس میں جاری ہے تو راستے میں کیپس نہ کیپس وہ ضرور ٹکرائے گا وہ لائبریری میں جانے کے لیے لفٹ کے پاس سے گزر رہی ہے تو وہیں کیپس وہ بھی کھڑا نظر آئے گا اور تو اور وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ اسکول سے باہر بھی کیپس میں کسی دوسری جگہ موجود ہے تو وہ قطعاً غیر متوقع سے انداز میں اچانک سامنے آجائے گا۔ "ارے آپ؟" کہہ کر حیران ہونا وہ اس سے یوں سلام دعا کرتا جیسے وہ اسے کسی انتہائی غیر متوقع جگہ پر نظر آ چکی ہو۔ پینڈم تو تھا ہی، اوکاں بھی بہت اچھا تھا۔ مگر افسوس وہ نہ اپنی کم عقل تھی نہ نادان جو یہ نہ سمجھ پاتی کہ ان اتفاقیہ ملاقاتوں میں اتفاقیہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔

صرف اس نے کیا کیتھی اور مائیک تک نے اس کی موجودگی کو نوٹس کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ دونوں نوٹس کیوں نہ کرتے؟ صرف ڈیپارٹمنٹ یا انجینئرنگ اسکول کی حدود تک بات ہوتی تو ان "اتفاقیہ" ملاقاتوں کو اتفاقیہ سمجھ بھی لیا جاتا کہ اگر وہ لوگ وہاں سے لی ایس کر رہے تھے وہ ایم ایس جس رفتار سے وہ کیپس میں "اتفاقیہ" طور پر مسلسل اس کے سامنے آ رہا تھا اسے دیکھتے ہی کچھ نہ کچھ ہنساں لیتا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ ان تینوں کے کیپس میں دیگر بھی کئی نیورٹ ایسٹس تھے اور وہ تینوں وہاں بہ کثرت جایا کرتے تھے اور ان تمام جگہوں پر عبادت گاہ سے مل رہا تھا۔ وہ تینوں لاء لائبریری کی سیر میسوں پر بیٹھے کیپس مار رہے ہیں، وہ سامنے آجائے گا۔ وہ اور کیتھی مائیک کا پاسٹ ہال نیم دیکھتے جم آئی ہیں، مائیک کے لیے تالیاں بھاری ہیں، نعرے لگاری ہیں اور وہ ایک دم ہی کیپس سے نکل کر سامنے



بتا تا کہ وہ یہاں سوئمنگ کے لیے آیا تھا یا کسی اور کھیل اور ایکس سائز کے لیے کہ بقول اس کے اسے جب بھی اپنی تعلیمی مصروفیات سے فرصت اور موقع ملتا ہے تو وہ درگ کوٹ کے لیے جم چلا آتا ہے۔

کیمپس میں الگ الگ طرح کی اشیاں خورد و نوش کے لیے ان تینوں کی الگ الگ فوریٹ جگہیں تھیں۔ سوان تمام اسکولز کے کینے وغیرہ میں ان تینوں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی اور ان تمام جگہوں پر وہ انہیں مل رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر رکنا نہیں، بس کھڑے کھڑے سلام دعا کرتا اور وہاں سے چلا جاتا۔

مائیک نے تو کچھ نہ کہا تھا مگر کیتھی نے چند روزہ خاموشی کے بعد اس نازہ ترین صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اسے بڑی گنہگار بنجیدگی سے باور کرایا تھا۔  
”یہ ہنڈ سم بندہ بڑی بنجیدگی اور مستقل مزاجی سے تمہارے پیچھے ہے بنیہ سجاو!“

کیتھی سدا کی حسن پرست اور رومنٹک اسے وہ بہت پسند آگیا تھا۔ کوئی بندہ اتنی مستقبل مزاجی سے آپ کے پیچھے آ رہا ہو اسے تو یہ بات ہی بڑی رومنٹک لگی تھی، جبکہ بنیہ اس ساری صورت حال سے یکسر لائق تھی اس کا اندازہ یہ ہوتا تھا کہ اگر عہدہ دار اسے کہیں نظر آگیا ہے تو ٹھیک ہے اور اگر نہیں تو بھی ٹھیک ہے۔

اس سے یوں ”اتفاقہ“ آنا سامنا ہوتے کوئی ایک صینہ تو ہو ہی گیا تھا جب اس روز وہ لاہوری میں بیٹھی تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح اتفاقہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس روز کیتھی نہیں آئی تھی اور مائیک بھی خدا اجائے کہاں تھا اس کی اگلی کلاس شروع ہونے میں ابھی خاصا ٹائم تھا اور یہ فارغ وقت وہ لاہوری میں بنجیدگی سے پیشہ کر کام کرتے گزارنا چاہتی تھی۔

اسٹرکچرل ڈیزائن یہ پروجیکٹ سب کو اپنا اپنا انفرادی طور پر کرنا تھا مگر کوئی مسئلہ کسی کو درپیش ہوا کرتا تو وہ تینوں سر جوڑ کر ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے اس وقت بھی کچھ چیزیں اسے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں اور وہ کیتھی اور مائیک کی کمی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

پاس ہی اس کالیپ ٹاپ رکھا تھا جس میں اس کا اپنے اس پروجیکٹ کے سلسلے میں اب تک کیا تمام کام محفوظ تھا۔ منہ میں تین دہائے وہ مختلف کتابوں کے صفحے پلٹ رہی تھی

”اسے ہیرے آپ؟ کیسی ہیں؟“ بھرپور حیران ہونے کی اور کاری کرنا وہ اس کی برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔  
”ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ اس کی طرف دیکھ کر اس نے رکھی سے انداز میں پوچھا۔

”اللہ کا کرم ہے۔ مزے میں ہوں۔“ بنیہ نے نظریں دوبارہ اپنے سامنے بکھری کتابوں پر مرکوز کر دیں۔  
”کیا پڑھ رہی ہیں؟“ عہدہ نے پہلے ان ڈیجیٹل ساری کتابوں پر اور پھر اس کے اچھے چہرے پر نظریں دوڑائیں۔  
”پروجیکٹ ہے اسٹرکچرل ڈیزائن کا اسی پر کام کر رہی ہوں۔“ اس نے اپنے سامنے رکھی فائل اور کتابوں کی طرف اشارہ کر کے بنجیدگی سے کہا۔

”آپ کے ایکسپریشن بتا رہے ہیں کہ کچھ مشکل چیز ہے جو حل نہیں ہو رہی۔ لائیں دکھائیں شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔“

اس نے خود ہی قدرے جھک کر اس کی فائل اور لیب ٹاپ کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک آدھ سیکنڈ یوں جھکے رہنے کے بعد اس نے بڑے آرام سے اس کالیپ ٹاپ اور فائل اپنے سامنے کھسکا لی اور سیدھا ہو کر مسئلے کی نوعیت سمجھنے لگا۔ وہ اس بے تکلفی اور دخل در معقولات پر کچھ حیران ہوئی۔

”ہوں۔ تو یہ تیم پریشان کر رہی ہے آپ کو؟“ اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے بنجیدگی سے کہا۔

یہ مسئلہ دریافت کر لینا اتنا مشکل نہ تھا کہ اس کی فائل پر لگے صفحات اور لیب ٹاپ میں کھلی فائل سب فی الوقت اسی ایک مسئلے کے بیچ اٹکے ہوئے تھے۔ وہ چند منٹ غور و فکر کرتا بڑے اطمینان اور بے تکلفی سے اس کے لیب ٹاپ میں کھلی فائل میں صفحہ در صفحہ اوپر نیچے آگے پیچھے جاتا اس کے پروجیکٹ کی تفصیلات سمجھتا رہا۔ چند منٹوں کے بعد اس نے مسکرا کر بنیہ کی طرف دیکھا۔

”یہ ایکویشن انٹیگریشن نہیں ہو پارہی آپ سے؟“

اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سرانبات میں بلانا ہوا۔  
”اس میں کیا مشکل ہے تیم پر لوڈ آپ نکال چکی ہیں۔ تیم کی Length اور Depth آپ کو بتا ہے۔ بس اب صرف یہ ایکویشن اتنی گریٹ کرنی ہے۔ دیکھیں اس کی اتنی گریٹن بڑی آسان ہے۔ میں آپ کو آسان طریقہ



بتاتا ہوں۔"

ہنہ سے بولتے بولتے اس نے اپنی فائل میں لگا قلم نکالا اور ہنہ کی فائل پر اس ایکویٹیشن کو سولو کرنا شروع کر دیا جو اسے کافی دیر سے پریشان کر رہی تھی۔ اس کی لکھائی صاف ستھری اور بہت عمدہ تھی وہ اگلے ہاتھ سے لکھ رہا تھا۔ وہ جس طرح بول رہا تھا اس نے واقعی اسی طرح چٹکیوں میں ساری ایکویٹیشن حل کر کے فائل دوبارہ اس کے آگے کر دی تھی۔

وہ اب مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور مسکراتے ہوئے اس کے بائیں گل پر ڈمبل پڑ رہا تھا۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ ڈمبل کسی لڑکے کے چہرے پر بھی اتنا خوب صورت لگ سکتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ ہنہ کی طرح وہ اسی لاپرواہ طے میں تھا۔ شیوہ بھی ہوتی 'بال لاروائی سے ٹھہرے ہوئے۔ اس نے کولمبیا یونیورسٹی کے لوگوں کی براؤن مگر کی شرٹ 'نیلے جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی۔

"شکریہ" اس کے ڈمبل سے لگا ہوا اس نے سوال حل کرنے پر تنبیہ کی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"You are Always Welcom" ویسے اپنی تعریفیں کرنے کی مجھے عادت نہیں ہے۔ لیکن بہر حال یہ سچ ہے کہ میں خاصا ذہین ہوں اور اسٹرینجریل انجینئرنگ تو میرا خاص سبب تک ہے اس پر تو مجھے پوری کمائڈ حاصل ہے لہذا آپ کو اتنے دیکھ بھی کچھ پوچھنا ہو تو مجھ سے پوچھ سکتی ہیں۔"

اس کی میز کے سامنے اسٹوڈنٹس کا گروپ جو شکلوں ہی سے 'پڑھا کووں' پر مشتمل لگ رہا تھا اس کے ارکان عباد کو اس زور سے بولنے کی وجہ سے گھور گھور کر دیکھنے لگے تب وہ آواز آہستہ کر کے اس سے بولا۔

"یہ پڑھا کو" مستقبل کے پروفیسرز تو سکون سے بات بھی نہیں کرنے دیں گے۔ کیا خیال ہے کہیں باہر نہ چلیں؟ یہاں ہمارے کیس کے پاس ہی ایک نیا ٹائٹین ریسنورنٹ کھلا ہے وہاں کی کپو جینو بہت اچھی ہوتی ہے۔"

اس نے دوسری بار اسے کافی پینے کی دعوت دی جسے اس نے پہلی دفعہ ہی کی طرح ٹھکرا دیا۔

"آپ کا شکریہ" لیکن ابھی میں کافی پڑی ہوں۔ مجھے اپنے پروجیکٹ کا اچھی کافی کام کرنا ہے۔ پھر بھی سی۔"

اس کے جواب سے اس کے چہرے کی مسکراہٹ یک

دہی کچھ ماندی پڑ گئی۔

"چلیں کوئی بات نہیں۔ آپ اپنا کام کریں میں چلتا ہوں۔ بالے۔" وہ اسے خدا حافظ کستا فوراً ہی چلا گیا۔ اسے لائبریری سے باہر نکلتا دیکھ کر اسے کچھ افسوس سا ہوا۔ وہ صرف ایک کپ کافی ساتھ بیٹے ہی کے لیے تو کہہ رہا تھا کوئی اس سے اپنے ساتھ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے لیے تو نہیں کہہ رہا تھا۔

اس نے پہلی بار ڈاکٹر گراہم کے پچھ کے دوران بھی اس کی مدد کی تھی اور آج بھی اس کا ایک پیچہ مسئلہ جو شاید وہ پورا دن لگ کر بھی تھما حل نہ کر پاتی حل کر کے ہی گیا تھا۔ وہ مہذب تھا اس کے پیچھے آتا یا بات کرتا تو بھی بھی کوئی غیر شائستہ بات نہ کرتا نہ وہ خوش شکل تھا 'اعلا تعلیم یافتہ تھا' ذہن تھا اس کے مینڈر اور منطوق کا انداز تھا تا تھا کہ وہ کسی اچھی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔

پھر کیا حرج تھا اگر وہ اس کے ساتھ ایک کپ کافی پی لیتی۔ اس کا یہ افسوس مزید گہرا تب ہونے لگا جب اس روز کے بعد وہ اسے نظر آتا نہ ہو گیا۔ نہ کہیں کسی کو یاد پڑے کہ وہ کسی لیب میں نہ کسی پروفیسر کے آفس میں نہ لائبریری میں نہ کسی کیفے میں نہ جم میں۔ وہ اسے کیس میں سرے سے نہیں نظر آتی تھی۔ آ رہا تھا۔ کیتھی تک نے اس کی غیر موجودگی محسوس کی تھی۔

"وہ تمہارا پیڈم ہیرو نظر نہیں آ رہا آج کل؟ لگتا ہے کوئی اور لڑکی لے آئی ہے اسے۔ ایسے شاندار بندے کو کون لڑکی جیتے گی۔"

اس نے کیتھی کی بات کا نہ نوٹس لیا تھا نہ اسے کوئی جواب دیا تھا۔ ٹھیک ہے وہ نہیں نظر آ رہا تو نہیں آ رہا۔ ہو گا کہیں اسے کیا۔ اس نے سر جھٹک کر اس کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا تھا۔ مگر یہ کیسی بات تھی کہ جب بھی وہ کوئی کلاس لے کر باہر نکل رہی ہوتی اس کی مشاشی نگاہیں کلاس روم سے نکلتی ہی کوریڈور میں یہاں سے وہاں گھومتیں لاء لائبریری کی میز چھوڑ کر بیٹھ کر اپنی عادت کے مطابق سامنے سرسبز لان میں رہتے کبوتروں کے غول کے غول کو دیکھنے کے بجائے وہ گردن گھما گھما کر اپنے دائیں بائیں کچھ دھونڈا کرتی کیتھی کے ساتھ جم آتی کیتھی ان ہی ایسکر سائز میں مصروف ہو جاتی اور وہ بلاوجہ سوشلنگ ہول اور ان ڈور جا لنگ ٹریک پر چلی آتی جہاں مشینوں پر لوگ ایکس سائز کر رہے ہوتے وہاں آ جاتی۔ اس کی ڈمبل والی

خوب صورت مسکراہٹ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتی تھی۔ اس نے کئی بار احمقوں کی طرح اپنی فائل میں اس صفحے کو بغور دیکھا تھا جس پر اس کی خوب صورت پیڈ رائٹنگ موجود تھی۔

وہ اپنے حال میں مگن رہنے والی مست ملنگ کچھ مردانہ سی عادتیں رکھنے والی لاپرواہی لڑکی تھی مردہ جو اسے اپنے وجود کا احساس دلانے کی کوشش کرتا تھا اس کے پیچھے ہر جگہ موجود ہوتا تھا۔ اچانک ہی کہیں غائب ہو کر اس کی جگہ فکری اور خود میں مگن انداز کو ڈگمگایا تھا وہ خود سے بھی کسی قیمت پر یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ اس کی غیر موجودگی کو محسوس کر رہی ہے۔

جو بھی تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا وہ کیوں اس کے متعلق کچھ سوچے ہو گا کہیں چلا گیا ہو گا کہیں۔



وہ یونیورسٹی سے گھر واپس جا رہی تھی۔ ایک تو کیسپس ہی میں دیر ہو گئی تھی 'آج ماما جانی نے اپنی کچھ دوستوں کو شام کی چائے پر انوائٹ کر رکھا تھا اور اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ یونیورسٹی سے گھر جلدی آجائے گی مگر ان کی مدد کر اس کے مگر راہو اس کی گاڑی کا جو کیسپس سے کچھ ہی دور ایک سنسور ڈیم ایونیورسٹی آکر اچانک بند ہو گئی تھی۔

وہ زیادہ تر کیسپس سب وے کے ذریعے آتی جاتی تھی۔ دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے جدید شہر میں رش کے اوقات میں صبح اور شام کے اوقات میں ٹریفک اس طرح جام ہو تا تھا کہ وہ فاصلہ جو آپ سب وے کے ذریعے ٹریفک کی برق رفتاری کے سبب دس منٹ میں طے کر سکتی تھی اب اسے گھنٹوں کی گاڑی میں گھنٹے سے بھی اوپر کا سفر بن جاتا تھا۔ ٹریفک جام کے مسئلے سے اگر منٹ میں تو تینویارک میں دو سیرا مسئلہ گاڑیوں کی بارنگ بن جاتا تھا۔

اسے مین مین سے باہر نہیں جانا ہوتا یا اور کچھ۔ ضروری کام ہوتا کسی کے لیے گاڑی میں جانا لازمی ہوتا وہ تب ہی گاڑی نکالتی تھی۔ آج صبح بھی اسے کچھ کاموں کے سبب ہی اسے گاڑی میں کیسپس آنا پڑا تھا۔

شام چار بجے سے سڑکوں پر ٹریفک جام ہونا شروع ہو جاتا تھا وہ اس لیے گھر جلدی پہنچتا چاہا رہی تھی مگر کسی غولی محبوبہ کی طرح انڈی اس کی گاڑی مزید چلنے سے

صاف انکار کر چکی تھی۔ وہ گاڑی کو دوبارہ اشارت کرنے کے ہزار جتن کر چکی تھی۔

وہ گاڑی کا بونٹ کھول کر کھڑی اس کا نقص دھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی جب ایک گاڑی اس کے پاس سے گزری۔ اس کے قریب سے گزرنے اور آگے بڑھ جانے کے ساتھ ہی وہ فوراً رہ۔ ہوئی اور اس کے قریب روک دی گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس میں بیٹھا عباد عذیر گاڑی سے اتر رہا تھا۔

"مجھے پاس سے گزرتے ہوئے ہی لگا تھا کہ شاید آپ ہیں۔ لگتا ہے آپ کی گاڑی خراب ہو گئی ہے۔"

وہ جس طرح اچانک کہیں غائب ہوا تھا اسی طرح انیسویں دن اچانک ہی دوبارہ نظر بھی آیا تھا۔ یہ اس کی عباد عذیر کے ساتھ وہ پہلی ملاقات تھی جو واقعی اتفاقاً ہو رہی تھی۔ وہ بھی یقیناً کیسپس ہی سے واپس جا رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر پہلے تک شدید آف موڈ کے ساتھ یہاں کھڑی تھی مگر اتنے سارے دنوں بعد اسے ایک بار پھر اپنے سامنے دیکھنا ایسا خوش گوار لگا کہ وہ اپنا سارا آف موڈ بھول گئی۔ وہ اس کی سوچوں سے بے خبر اس کے پاس آ گیا تھا۔

"لا میں میں کچھ مدد کر لوں؟" وہ کچھ دیر ہٹ گئی۔ وہ اپنے ہمیشہ جیسے لاپرواہ چلے میں تھا۔ بہر حال یہ طے تھا کہ بندہ ہفتہ دس دن سے پہلے ریزر ہاتھ میں نہیں لیتا تھا۔ لباس کا بھی وہی انداز تھا۔ اس نے پوری استغیثوں کی گرے فکری جو جری پہن رکھی تھی اس پر بالکل سامنے 'کولمبیا یونیورسٹی' کے الفاظ لکھے تھے 'آج میرے بیس بال کیپ بھی تھی سر جھکا کر وہ پندرہ منٹ تک انجین کے ساتھ مصروف رہا۔

"لگتا ہے معاملہ جنرل فریڈمن سے نہیں چلے گا اسے کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا پڑے گا۔"

گاڑی کا بونٹ بند کرتے اس نے ماپوسی سے یوں سر ہلایا گویا گاڑی کی نہیں کسی انسان کی بات کر رہا ہو۔ یہ تو اسے بھی لگتی رہا تھا کہ مکینک کو دکھانا پڑے گا۔

"اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ڈرائیو کر دیتا ہوں۔ اپنی گاڑی لا کر کے نہیں چھوڑ دیں۔"

اس نے ہنہ کی طرف دیکھتے ہوئے اسے آفر دی۔ سر اثبات میں ہلاتے اس نے جلدی جلدی اپنی گاڑی لا کر کی اور اپنا بیگ اور فونڈر اور فائل جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے لے کر اس کی گاڑی کی طرف آئی۔ وہ گاڑی



میں بیٹھ جاتی تھیں وہ بیٹھا اور گاڑی اشارت کر دی۔  
 "اور آپ کیسی ہیں؟ اسٹیلڈز کیسی چل رہی ہیں؟"  
 اسے کہاں جانا ہے وہ جانتا چلی تھیں اس نے پوچھا۔  
 اس کی نظریں وہ اسکرین پر مرکوز تھیں۔  
 "ٹھیک۔ آپ کیسے ہیں؟ آج بہت دنوں بعد نظر آئے  
 ہیں۔" اس نے پوچھا تو بہت عام سے انداز میں تھا مگر عباد  
 نے وہ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے بغور دیکھا۔  
 "میں بوستون گیا ہوا تھا ایک کام کے سلسلے میں۔"  
 وہ اس کی گہری نگاہوں سے ڈسرب ہوئی۔ اس نے ایسا  
 تو کچھ نہیں پوچھ لیا جس سے یہ لگے کہ اس نے اس کی غیر  
 موجودگی کو محسوس کیا ہے۔  
 "آپ کا ساتواں سمسٹر بہت ہی اچھا ہے؟"  
 "جی ہاں سمسٹر ختم ہی ہونے والا ہے۔ ساتواں سمسٹر  
 اور آپ کا ایم ایس؟" جواب دینے کے ساتھ اس نے  
 سوال بھی کیا۔  
 "ایک سال گزر گیا" ایک سال باقی رہتا ہے۔" وہ  
 مسکرا کر بولا۔  
 "آپ کیسے گاڑی میں آتے ہیں؟" اس نے گفتگو  
 برائے گفتگو کے طور پر سرسری انداز میں پوچھا۔  
 "نہیں میں ٹیوی میں گاڑی وہ ڈرائیو کرے جسے لی ٹی بیسٹ یا  
 ہارٹ بیسٹ بننا ہے۔ نیو جرسی گیا ہوا تھا ایک کام سے  
 وہاں سے واپس میں سیدھا کیسپس آیا اس لیے گاڑی میں  
 ہوں ورنہ سب ویسے زندہ ہادیٹ ٹائٹ نہیں جانا ہو پھر  
 گاڑی ہی میں جانا آتا ہوں۔"  
 عباد نے گاڑی — 71 اسپیڈ پر اس ماڈرن  
 پارٹنر بلڈنگ کے سامنے روکی جس کے پینٹ ہاؤس  
 میں وہ اور ماما جانی رہتے تھے اور جس کے لیوننگ روم کی  
 بڑی بڑی فرنیچر وڈنوز سے با آسانی ایٹ روبر کا نظارہ کیا  
 جاسکتا تھا۔ دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر اترتے ہوئے وہ  
 اس سے بولی۔  
 "آپ اندر نہیں آئیں گے؟"  
 "آپ بلائیں گی؟"  
 "میرا خیال ہے۔ میں آپ کو بلا رہی ہوں۔"  
 اس سوال جواب کے دوران وہ ایک کانڈر تیز رفتاری  
 سے کچھ لکھ رہا تھا۔ لکھ کر فارغ ہوا تو مسکرا کر اس کی سمت  
 دیکھتے وہ کانڈر اس کی طرف بڑھا۔  
 "میرا سیل نمبر اور پارٹنر کا فون نمبر ہے۔ رہا سوال

آپ کے گھر آنے کا تو آپ کے گھر میں ضرور آئیں گے مگر  
 آج نہیں بھی اور۔"  
 اس نے اس سے اس کے کانڈر بکٹ نمبر پانچے تو نہیں  
 تھے لیکن اب وہ دے رہا تھا تو نہ لینا بد تمیزی تھی۔ اس نے  
 وہ چٹ اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور اس کی ڈیمبل والی  
 مسکراہٹ کو دیکھتی وہاں سے اپنی بلڈنگ کی طرف بڑھ گئی  
 تھی۔  
 وہ پہلے ہی گھر لیٹ پہنچی تھی لہذا آتے ہی اس نے ماما  
 جانی کی بچن میں مدد گروائی شروع کر دی تھی۔  
 ماما جانی اس کی دادی تھیں۔ اس کے والدین کے انتقال  
 کے بعد اب گھر میں صرف وہ اور اس کی دادی ہی رہ گئے  
 تھے۔ وہ بھی لاڈ میں ہوتی تو انہیں دادی یا گرینڈ ماسٹی وگر نہ  
 وہ ماما جانی ہی کہلاتیں۔ اسے یہ سوچ کر بڑا مزہ آتا تھا کہ اس  
 کے دادا اور دادی کی پسند کی شادی تھی۔ اس کی دادی پچاس  
 کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں کراچی سے امریکہ  
 پڑھنے کے لیے آئی تھیں۔ اس دور میں جب برصغیر پاک و  
 ہند میں لڑکیوں کی روایتی تعلیم کا بھی زیادہ رواج نہ تھا ان  
 کے والدین نے انہیں پڑھنے کے لیے امریکہ بھیج دیا تھا  
 یقیناً اس کی دادی کی فیملی بہت روشن خیال فیملی تھی۔ یہاں  
 انہیں اس کے دادا نے دو دنوں کے ایک دورے کو پسند کیا  
 اور جھٹ پٹ شادی ہو گئی۔ وہ پچھترہ برس کی تھیں مگر بہت  
 زندہ دل بہت ایکٹو خاتون تھیں۔  
 اس کی اپنی دادی سے بہت اندر اسٹینڈنگ تھی۔ وہ  
 اپنے والدین کی چوہی اور آخری اولاد تھی اور جب وہ پیدا  
 ہوئی تب اس کے باقی بہن بھائی ذرا بڑے ہو چکے تھے۔ اس  
 کی مہی جب زندہ تھیں، بھی بھی بڑے مزے میں کہیں  
 کہ تین بچوں کے بعد ان کی فیملی کمبلٹ ہو چکی تھی کہ  
 اچانک ہی وہ آن وارد ہوئی۔ اس کی مہی جنہوں نے بچوں کی  
 پرورش کی خاطر اپنا کیریئر اور پروفیشن کافی عرصہ چھوڑے  
 رکھا تھا جب تینوں بچے ذرا بڑے اور سمجھ دار ہونے لگے  
 تب دوبارہ چاب کھلی تھی اور بہن ان کے کیئر پر کی اس شیخ  
 پر پیدا ہوئی تھی۔ جب وہ چاب چھوڑ کر گھر میں بیٹھ سکتی  
 تھیں چنانچہ اس کی پرورش ماما جانی نے کی تھی۔  
 وہ ان سے بچپن ہی سے بہت قریب بھی تھی اور مانوس  
 بھی۔ اس سے بڑی اس کی بہن بینہ اس سے نو سال بڑی  
 تھی جبکہ دونوں بھائی جنید اور محاذ بارہ اور گیارہ سال بڑے  
 تھے۔ عمر کا فرق زیادہ تھا چنانچہ اس کی اپنے بہن بھائیوں

سے بہت زیادہ اندر اسٹینڈنگ نہ تھی۔ امریکہ میں رہتے  
 ہوئے بھی ان کے گھر کا ماحول ایک اسلامی اور مشرقی ماحول  
 تھا۔ اس کا خصوصی کڑیٹ یقیناً ماما جانی کو جاتا تھا۔ "تم  
 امریکی شہری ہو مگر ساتھ ہی تم مسلمان بھی ہو۔ اس کلچر کی  
 بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تمہارے لیے ممنوع ہیں۔" ماما  
 جانی نے ان کی جیسے تھی میں یہ چیز شامل کر دی گئی تھی۔  
 ان چاروں بہن بھائیوں کی تربیت میں ماما جانی کا بہت  
 ہاتھ تھا اور اس کو چونکہ بالائی ہی انہوں نے تھا تو اس کی  
 پرورش اور اس کی تربیت میں تو سو فیصد ان ہی کا عمل دخل  
 رہا تھا۔  
 ماما جانی کی بدولت اپنے مسلم امریکن ہونے کو اپنے  
 اسلامی شخص کو اس نے پورے دل کے ساتھ قبول کیا  
 تھا۔ وہ پورے دل و جان سے امریکی شہری تھی اور وہ پورے  
 دل و جان سے مسلمان تھی۔ وہ اپنے مسلم امریکن ہونے پر  
 فخر کرتی تھی۔ اپنی جدا گانہ بیچان اب اسے ہرگز شرمندہ نہ  
 کرتی تھی بلکہ فخر کا احساس دلاتی تھی۔ ہاں پاکستان سے  
 اسے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے آباؤ اجداد کا تعلق  
 چاہے پاکستان سے ہو اور چاہے اس کے بہت سے رشتے دار  
 اب بھی وہاں رہتے ہوں اسے مگر پاکستان سے ہرگز  
 کوئی دلچسپی نہ تھی۔  
 ماما جانی کی دوستوں سے مل ملا کر اور انہیں کچھ سڑکر  
 دینے کے بعد اسے اپنی گاڑی کی فکر لاحق ہوئی۔  
 انہی دن اپنے موٹر کمپنک کے گیراج کا فون نمبر ڈھونڈ  
 ہی رہی تھی کہ کسی گیراج میں کام کرنے والے ایک  
 کمپنک کا اس کے گھر فون آیا۔ وہ ان کی بلڈنگ کے باہر  
 اس کی گاڑی لیے موجود تھا۔ گاڑی ٹھیک ہو کر آچکی تھی  
 وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ نیچے آکر اپنی گاڑی چیک  
 کر لے۔ وہ حیران پریشان ہکا بکا بیٹھے اتری۔  
 موٹر کمپنک نے اس سے گاڑی چیک کروائی کہ وہ  
 اسے اشارت کر کے چلا کر ہر طرح اپنا اطمینان کر لے۔  
 اس نے اپنا ہر طرح کا اطمینان تو خیر کر لیا مگر ساتھ ہی اس  
 سے مل مانگا تو اسے بتایا گیا کہ مل کی ادائیگی ہو چکی ہے وہ  
 ہرگز گاڑی چیک کر لے گاڑی تو ظاہر ہے ٹھیک ہو چکی  
 تھی وہ موٹر کمپنک کو وہاں سے روانہ کر کے اوپر اپنے  
 پارٹنر میں آئی اور آنے کے ساتھ ہی وہ چٹ اپنے  
 بک میں سے نکالی جو اسے گھر پر راپ کرتے وقت تھلائی  
 گئی تھی۔ اس نے اپنے سیل فون سے اس کا سیل نمبر



اس نے جیسے ہوئے کچھ چھیڑنے والے انداز میں اس سے پوچھا۔ اسے عبادت گاہ سے باہر کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ زندہ دل تھا، شائستہ مذاق کیا کرتا تھا۔

”ویسے تو دعوت آپ کی طرف سے ہے۔ لیکن میری رائے تو یہ ہے کہ ریسٹورنٹ مناسب رہے گا۔“ عبادت گاہی دیکر سنجیدگی سے بولا۔

”نکل میری آخری کلاس چار بجے ختم ہوگی میں سوا چار چار میں تک وہاں آ جاؤں گی۔“

وقت طے کر کے اس نے غصہ ختم کر دی تھی۔ اگلے روز وہ صبح سے بے چین تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گھڑی دیکھتی۔ ایسا لگتا تھا آج گھڑی سب کچھ بجائے گی بس چار ہی نہیں بجائے گی۔ اس روز شام کے چار بجے دیر سے بچے تھے۔ وہ کچھ تو کلاس ہی میں خدا حافظ کر کے سب سے پہلے کلاس سے نکل گئی تھی۔

مارٹنگ سائڈ پائٹس پر واقع ڈھیر سارے ریسٹورنٹس اور کیفے میں وہ اٹالین ریسٹورنٹ بھی ایسٹریڈیم ایونیو اور 121 اسٹریٹ کے درمیان واقع تھا۔

وہ اندر داخل ہوئی تو عبادت گاہ پر پہلے سے موجود ملا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی اسے وہ نظر آ گیا۔ وہ دروازے ہی کی طرف نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی تھی، ایسا ناثر ابھرا تھا اس کے چہرے پر جیسے اچانک ہی کوئی بہت بڑی خوشی مل جانے پر کسی شخص کے چہرے پر پھیلا کرتا ہے۔ وہ اس کی میز کے قریب آئی۔ وہ اس کے استقبال کے لیے اپنی کرسی پر سے اٹھ گیا تھا۔ شاید یہ ماما جانی کی تربیت اور ان کی سکھائی باتوں کا اثر تھا کہ وہ مردوں کے مینور کا سب سے پہلے جائزہ لیا کرتی تھی۔

ماما جانی کبھی انھیں مردوں کے اچھا ہونے کی سب سے پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ عورتوں کی عزت کرنے والے ہوں، قطع نظر اس کے کہ ان عورتوں سے ان کا رشتہ کیا ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی اس سے سلام دعا کر سکتا تھا مگر وہ جس طرح فوراً ”گھڑا ہوا تھا وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں سکتی۔

محمان پہلے سے موجود ہے۔ میزبان اب آ رہی ہیں۔“

وہ دونوں میز پر ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اس نے بے ساختہ اپنی ریسٹ وراچ پر نگاہیں

دوڑائیں تو وہ جلدی سے بولا۔

”آپ لیٹ نہیں آئی ہیں، میں ہی ایکسٹنشنٹ میں کچھ جلدی آ گیا ہوں۔“

اس نے اس کے ایکسٹنشنٹ کے لفظ کی نہ وضاحت چاہی نہ اس پر کوئی تبصرہ کیا۔ ویسے اگر وہ یہ نہ بھی بتا کر آج کی اس کلائی کے لیے وہ بہت راجوش اور خوش تھا تب بھی اس کی ایکسٹنشنٹ بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔ اس نے اسے بھی شیو کئے نہیں دیکھا، نہ ہی جینز اور Casual طرز کی شرٹس کے علاوہ کسی اور لباس میں دیکھا تھا۔ جبکہ آج اس نے نہ صرف یہ کہ شیو کیا ہوا تھا بلکہ اس کے بال بھی بڑے سلیقے اور بڑی خوب صورتی سے جھے ہوئے تھے اور لباس بھی آج کاٹن کا بلیک ٹراؤزر اور آسانی رنگ کی کاٹن کی فارمل طرز کی پلین شرٹ تھا۔ جو بندہ ہمیشہ بہت لاپرواہے طبع میں رہتا پسند کرتا ہو اس کے حساب سے یہ تیاری بہت زیادہ تھی۔

”آپ کیا پیش گی؟“

”کیو جینو کے لیے آئے ہیں تو وہی جینی چاہیے۔“

زبردستی بھائی کی سی سہی پر میزبان وہ بھی مگر وہ تو ارڈر دے کر رہا تھا۔ ”دو کپ کیو جینو“ اٹالین کو کیز اور پیسنر رن۔“

”ویسے میں چائے اور کافی زیادہ پیتی نہیں ہوں، لگتا ہے آپ کو کافی بہت پسند ہے۔“ ویٹر ارڈر لے کر چلا گیا تب وہ اس سے بولی۔

”ہاں کافی مجھے بہت پسند ہے۔ ویسے ایک بات کہوں یہ آپ“ کہنا کچھ عجیب نہیں لگ رہا۔ اور ویسے میرے ماما یا اور قریبی دوست مجھے عالی کہتے ہیں، تم بھی اگر چاہو تو مجھے عالی کہہ سکتی ہو۔“

وہ انہی دوست نہیں بنی تھی کہ قریبی دوستوں میں بریکٹ کی جارہی تھی۔

”میں نہیں تم کہہ سکتا ہوں اگر تمہیں ناگوار نہ ہو تو؟“ اس نے سر اثبات میں بلایا تو وہ اس سے بولا۔

”تم مجھے سب سے پہلے اتنی اچھی اردو بولنے کا راز بتاؤ۔“ وہ جواباً ”مسکرائی۔“

”اس کا راز میری داوی ہیں۔ ویسے تو ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ اردو میرے سارے بہن بھائی بہت اچھی بول جیتے ہیں مگر میری ذرا زیادہ اچھی اس لیے ہے کہ میں داوی دادا کے زیادہ نزدیک تھی، خاص طور پر داوی کے اور

وہ گھر کے اندر اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں بات کرنا ہرگز پسند نہیں کرتیں۔“

”اچھا تمہاری داوی بھی ہیں؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”بس صرف وہی ہیں۔ میرے دونوں بڑے بھائیوں اور بڑی بہن کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ سب اپنی جاہز کی وجہ سے الگ الگ شہروں میں رہتے ہیں۔ نیویارک میں صرف میں اور ماما جانی ہیں۔ میں اپنی داوی کو ماما جانی کہتی ہوں۔ داوی سے تم یہ مت سمجھنا کہ وہ کوئی بوڑھی سی ذلیل سی خاتون ہوں گی۔ وہ ماشاء اللہ مجھ سے زیادہ اکیٹو اور اسارت ہیں۔

تم انہیں دیکھو گے تو یقین نہیں کرو گے کہ وہ میری داوی ہیں۔ بہت زندہ دل اور خوش رہنے والی ہیں وہ۔ فیشن کا انہیں مجھ سے زیادہ پتا رہتا ہے۔ ان کے ساتھ وقت گزارو تو ذرا بوریت نہیں ہوتی۔ ان کی کمپنی میں کوئی بیک آڈی بھی بور نہیں ہو سکتا۔ مزے کی بات بتاؤں مجھے پرانی موویز اور برائے گانے پسند آتے ہیں اور انہیں نئی موویز، نئے گانے۔ وہ اسپائیڈر مین اور میری پورٹی کا عاشق ہیں۔“ اس کی باتوں کو دلچسپی سے سنتا وہ مسکرایا۔

”پھر تو تمہیں بہت مزا آتا ہو گا اپنی داوی کے ساتھ؟“

”ہاں بہت۔“

ان کی کافی اور کوکیز وغیرہ ان کی میز پر سر ہو گئے تھے۔ اس نے کیو جینو کے سبب لینے شروع کر دیے تھے جبکہ عبادت گاہ ایک پیسٹری کھا رہا تھا۔

”تم پاکستان سے آئے ہوئے ہو؟“ عبادت نے سر اقرار میں بلایا۔

”وہاں پر کہاں سے؟“

”کراچی۔“

”میرے بھی ایک ماموں وہاں رہتے ہیں۔ میں ایک بار اپنے کزن کی شادی میں وہاں گئی تھی۔ تم یہاں پڑھنے کے لیے آئے ہو؟“

”ہاں۔ ایم ایس کمپلیٹ کرتے ہی میں واپس چلا جاؤں گا۔ وہاں میرے ماما یا ہیں اور میں انہیں بہت مس کرتا ہوں۔“

اس نے ماما یا کا لفظ بڑی محبت سے ادا کیا ایسے جیسے یہ لفظ ادا کرتے اس کی زبان میں ڈھیر ساری محاسن کھل گئی ہو۔

”میں اپنے ماما یا کا کلو تا اور بہت لاڈلا بیٹا ہوں۔ زیادہ

تر سنے یا ماں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں یا باپ کے میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ میں تو دونوں ہی کے خاصا نزدیک ہوں۔ ماما بھی میرے دوست ہیں اور ماما بھی سمجھو میں اپنے ماما ہی کی خواہش پر یہاں آیا ہوا ہوں۔ اے لیول کے بعد جب میں ذرا چھوٹا بھی تھا اور ماما نے مجھے انجینئرنگ کے لیے امریکہ بھجوانے کی بات کی تھی تب میں گئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر دیا تھا۔ میں ماما اور ماما کے بغیر رہنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو پھر انجینئرنگ کرتے کرتے جب ذرا سمجھ آئی تو احساس ہوا کہ میں ماما کا کلو تا بیٹا ہوں۔ انہوں نے بہت خواب دیکھ رکھے ہیں میرے لیے۔ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

تب پھر کراچی میں این ای ڈی یونیورسٹی سے لی ای کرنے کے بعد میں ایم ایس کرنے یہاں چلا آیا۔ میرے ماما یا اپنی کنسلٹنگ فرم ہے اور اگر اسے شوق نہ سمجھو تو میں یہ اضافہ بھی کروں کہ پاکستان کی لینڈنگ سول انجینئرنگ کنسلٹنٹ میں سے ایک۔ فاروق ایسوسی ایٹس کو انٹرنیشنل بنگلہ بنایا جاتا ہے۔ ماما کا خواب ہر ماپ کی طرح ہی ہے کہ میں خوب پڑھ لکھ کر واپس پاکستان آ جاؤں اور ان کی فرم کو مزید آگے لے جانے میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔“

وہ اسے اپنے بارے میں اور اپنے والدین کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ جس والمانہ محبت اور عقیدت سے اپنے ماں باپ کا ذکر کر رہا تھا اس سے وہ متاثر بھی ہو رہی تھی اور حیران بھی۔

”دیکھو گی میرے ماما یا کو؟“ اس سوال پر اس نے تعجب سے اسے دیکھا۔ وہ اس وقت اسے اپنے ماں باپ کہاں سے دکھا سکتا تھا۔ اس نے اپنی ٹراؤزر کی پائنت سے والٹ نکالا اور اس والٹ میں سے دو تصویروں پر۔

”یہ میرے ماما ہیں عذر فاروق اور یہ ماما جہ عذر۔ میں اپنے ماما جہ سا پنڈ سم نہیں دے تو اس اتن میں بھی ڈوشنگ لگتے ہیں۔ بتا ہے اپنے بی ای کے دوران میں ماما کی فرم بہت زیادہ جاتا تھا۔ سمجھو یونیورسٹی کے بعد کا سارا وقت میں ان کے آفس میں ہوتا تھا اور ان کے آفس کی انجینئر اور آرکیٹیکٹ لڑکیاں ان میں کئی ماما پر ذرا اٹھیں۔ میں ماما سے کتنا تھا آپ ذرا تھک سے تیار دیا ہو کر رہا کریں ماما آفس میں سارا وقت حسینوں کے جھرمٹ میں رہتے ہیں۔“



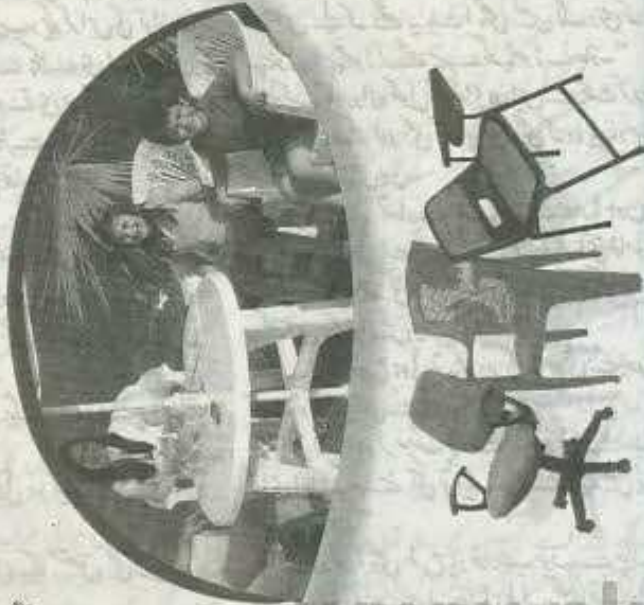


سب کے چہرے پر سہانہ ہے

یہ باس کا سٹائل ہے

An economical and durable  
furnishing solution

Durable economical  
and the best choice available  
Boss Molded Furniture



BUY BACK OFFER

BOSS

اس طرح کی بات کسی لڑکی سے کر رہا تھا اور اسے یہ سمجھ  
میں نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح کی بات کسی کس طرح جانی

وہ اس چوہن کو اس کے لیے ہرگز آسان نہیں بنانا  
چاہتی تھی۔ چنانچہ اس کی چٹکچٹ کے جواب میں خود

”میں تمہیں انکجینڈ لگتی ہوں؟“  
”نہیں۔۔“

”اور کمینڈ؟“

”لگتی تو نہیں ہو۔“

”بس پھر جو نہیں لگتا ہے وہی صحیح ہے۔“ اس نے اپنا  
کپ خالی کر کے ساسر پر رکھ دیا تھا۔

”چلیں؟“ عباد کے چہرے پر لکھا نظر آ رہا تھا کہ وہ ابھی  
اس سے کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے۔ مگر اس کے ”چلیں“  
کہنے پر اس نے سر اثبات میں ہلادیا۔ وہ مل پے کرنے لگا،  
تب وہ احتجاجی انداز میں چلائی۔

”یہ قانون ہے۔ کافی میری طرف سے تھی۔“

”کافی تمہاری ہی طرف سے ہے۔“ وہ دونوں اردو میں  
بات کر رہے تھے اور انہیں دیر ہوئی تھی انہیں باہم بحث و  
تکرار کرنا کچھ رہا تھا۔

”لیکن مل تم پے کر رہے ہو؟“ عباد نے اپنے والٹ  
سے نکالا کریڈٹ کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”تم دے

۔۔“

”لیکن یہ تمہارے پیسے ہیں۔“

”کتنی بحث کرتی ہو۔ انجینئر کے بجائے تمہیں وکیل بننا  
چاہیے تھا۔“

”میں بحث کر رہی ہوں یا تم میل شاؤنزم کا بیٹا جاگتا  
سہیل سے بیٹھو ہو۔“

وہ غلطی سے بولتی میز پر سے اٹھ مئی۔ وہ مل پے کر کے  
اس کے پیچھے پیچھے ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا تھا۔

وہ کچھ غصے اور کچھ غلطی میں باہر نکلی تھی کچھ غلطی اس  
کی تھی اور کچھ سامنے سے آنے والی گاڑی کی۔ وہ گاڑی

اسے ٹکراتی ہوئی گزر جاتی اگر عباد ”بہنہ“ کہہ کر زور سے  
چلاتا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پوری قوت سے اپنی طرف نہ

ٹھینکتا۔ ایک مل کے لیے اس کا ذہن بالکل موقوف سا ہو گیا  
تھا۔ خوف سے ہر تھر کانپتے اس نے خود میں اور موت میں

انچ بھر کا فاصلہ دیکھا تھا۔ وہ اس کی خوف زدہ اور رنگ اڑی

وہ ہنسنے ہوئے اسے تیار رہا تھا۔ نیز کو اس کے ماں باپ  
کے ذکر میں کوئی دلچسپی ہے بھی یا نہیں ”اس کی پروا کیے بناوہ  
بولے جا رہا تھا۔“

وہ حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار  
اس کے عمر کے کسی لڑکے کو اس نے بھی اپنے ماں باپ کا  
اس شدت اور محبت سے ذکر کرتے سنا نہیں تھا۔

”تم اپنے ماما پاپا سے بہت پیار کرتے ہو؟“ اس نے  
ابھنگی سے پوچھا۔

”ہاں بہت۔“ وہ جواب دیتے مسکرایا۔ پھر لمحہ بھر کے  
لیے اس کے چہرے پر اداسی یوں چھائی جیسے وہ اس وقت

بھی اپنے ماما پاپا کو بہت مٹس کرنے لگا تھا۔

”میں ماما پاپا کے پاس پاکستان واپس جانے کے لیے  
یہاں اپنا ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا ہوں۔ مجھے

یہاں نہیں رہنا ہے! مجھے پاکستان واپس جانا ہے۔“

اس نے چونک کر عباد عزیز کو دیکھا۔ اس نے دوسری بار  
یہ بات کہی تھی۔ وہ اسے بار بار یہ بات کیوں تیار رہا تھا کہ وہ

اپنا مستقبل اپنا آئے والا کل امریکہ میں نہیں پاکستان میں  
دیکھتا ہے۔ کچھ مل وہ دونوں خاموشی کافی پیٹے رہے۔ عباد

نے اپنا کپ خالی کر کے میز پر واپس رکھا تب اس کی طرف  
دیکھ کر دھیسے لے لے میں بولا۔

”میں تم سے ایک بات پوچھوں نہ؟“ اس نے گردن  
اقرار میں ہلاتی تب وہ کچھ اچھپکتے ہوئے بولا۔

”دیکھو“ میرا سوال تھوڑا پرستل سا ہے اگر تمہیں برا  
لگے یا تم جواب نہ دینا چاہو تو مت دینا میں مانڈ نہیں کروں

گا۔“

یا اللہ! اتنی لمبی تمہید یا تو وہ بے دھڑک اور  
بے جھجک خود اعتمادی سے ہر بات کرتا تھا یا اس طرح چٹکیا رہا

تھا کچھ کنفیوژڈ سا بھی لگ رہا تھا۔

”تم کہیں پر انکجینڈ ہو یا کوئی کمینڈ یا کوئی۔“

”یا کوئی بوائے فرینڈ جو تمہیں میرے ساتھ میٹھا دیکھ کر  
تمہاری گردن موڑ دے۔“

وہ اچھپکا کر ایک مل کے لیے رکھا تھا اور اس نے اس کی  
بات ایک کر خود مکمل کر دی تھی۔ ایک بہت پر اعتماد  
بندے کو اس طرح چٹکیا تا اور سنبھل سنبھل کر بات کرتا  
دیکھ کر اسے بہت لطف آ رہا تھا۔ اس نے مردوں کی فطرت  
کا کوئی بہت زیادہ جانتا تھا اور نہ ہی مردوں سے متعلق کوئی  
تجربہ۔ پھر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ زندگی میں پہلی بار



شکل کو تشویش سے دیکھ رہا تھا۔  
 ”تم ٹھیک ہو؟“ اس سے کچھ بولا نہیں گیا، اس نے صرف گردن ہلائی۔ زندگی اور موت میں صرف اتنا سا فاصلہ ہوتا ہے، موت کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر اس کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے ہی اسے واپس ریسنورنٹ لے آیا اور داخل ہوتے ہی جو پہلی میز نظر آئی اس کی کرسی پر اسے بٹھا دیا۔ دیر سے پانی لائے کا کہہ کر وہ اب فکر مند ہی اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم ٹھیک ہونا چاہیے؟“  
 اس نے پانی کا گلاس ایک گھونٹ میں خالی کر کے میز پر رکھا اور سر اٹھاتے میں ہلایا۔ وہ ان چند منٹوں میں خود کو سینچال چکی تھی۔ فوری طور پر جس شاک کے زیر اثر آئی تھی اس سے بھی نکل گئی تھی۔  
 ”چلیں؟“ اس نے اپنا ہینڈ بیگ دوبارہ شانے پر ڈالتے

عباد سے پوچھا۔  
 ”تم کیسے جاؤ گی؟ گاڑی لائی ہو کیا؟“ عباد نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے پوچھا۔  
 ”سب ویسے سے۔“ گاڑی کے متعلق نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے اسے بتایا۔

وہ ایک دم ہی اس کے پاس سے اٹھ کر خداجانے کہاں چلا گیا وہ اسے ریسنورنٹ سے باہر نکلتا کچھ تعجب سے دیکھتی رہی۔ اس کے پاس آکر بولا۔  
 ”میں نے کیب روکی ہے، تم اس میں گھر جاؤ۔ اتنے شاک کی حالت میں سب دے میں جانا ٹھیک نہیں۔“

وہ اپنے لیے فکر مند ہوتے اس شخص کو دیکھتی رہ گئی۔ ماما جانی گئے سوا اس کی زندگی میں دور دور تک کہیں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جسے اس کی اس طرح فکر ہو۔ وہ ایک حادثے کا شکار ہوتے بال بال بچ گئی تھی، اسے بہر حال نہ کوئی چوٹ لگی تھی نہ کچھ اور ہوا تھا مگر وہ اس کے لیے یوں فکر مند تھا جیسے پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ اب چونکہ وہ کیب روک چکا تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ اٹھ کر ریسنورنٹ سے نکل گئی۔ مگر باہر نکل کر جب اس نے عباد کا اپنے ساتھ کیب میں بیٹھنے کا ارادہ دیکھا تب وہ فوراً بولی۔

”میں ٹھیک ہوں عباد! تم فکر مت کرو میں آرام سے گھر پہنچ جاؤں گی۔“  
 ”لیکن میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں۔“

”مگر عباد۔“

”تم اتنی بحث کیوں کرتی ہو بنیا عباد؟“ اس نے اس کی بات کاٹ کر ناراضی سے اسے گھورا۔

”اس لیے کہ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی کہ تم اپنے دس کام چھوڑ کر مجھے میرے گھر چھوڑنے جاؤ۔“  
 ٹیویک کا دروازہ کھول کر کھڑی وہ اس سے بحث کر رہی تھی۔ ابھی وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی کہ وہ ایک دم ہی فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔“  
 ”اب میں کوئی بات نہیں سنوں گا“ وہ بار بار پتی خاموشی سے کیب میں بیٹھ گئی تھی، عباد درمیان میں کچھ فاصلہ رکھتے اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

کیب چلنا شروع ہوئی تو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ آہستہ آواز میں اس سے بولا۔

”اتنی لاپرواہی ہو کر سڑک پر مت چلا کرو بنیا! جب وہ گاڑی اچانک سامنے آئی تو ایک لمحے کے لیے میں بڑی طرح ڈر گیا تھا۔“

اسے وہ لمحہ اچھی طرح یاد تھا جب خوف سے چلاتے عباد نے پوری قوت سے اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ اس کا کوئی بھی نہیں تھا مگر اسے اس کی فکر تھی۔ پتا نہیں کیوں مگر اچانک ہی اسے عباد عذیر کے وجود سے اس کی اپنے قریب موجودگی سے تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ وہ ایک دم ہی خود کو سست محفوظ سا محسوس کرنے لگی۔ عباد نے صرف اسے بلڈنگ کے باہر تک ہی نہیں چھوڑا بلکہ کیب ڈرائیور کو چند منٹ وہیں رکھنے کا کہہ کر اس کے ساتھ اندر تک آیا۔ لائی انٹرنس میں آجائے کے بعد اس نے باقاعدہ اسے لفٹ تک چھوڑا۔ وہ اس کے لفٹ میں داخل ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

”اگرچہ کہ مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگ رہی کہ تم صرف مجھے چھوڑنے یہاں آئے ہو اور اب کیب میں واپس وہاں جاؤ گے جہاں اس وقت تمہیں جانا تھا لیکن عباد تمہارا بہت شکریہ۔“

”مجھے دوستوں سے شکریہ وصول کرنے کی عادت نہیں ہے، لہذا اپنا شکریہ فوراً واپس لے لو اور اب گھر جا کر آرام کرو۔ اپنی لاپرواہی سے اپنا بھی خون خشک کیا ہے اور مجھے بھی ڈر آیا ہے۔“

لفٹ اُٹنی تھی وہ اس میں داخل ہو گئی تھی۔ جب تک

لفٹ کے خود کار دروازے بند نہ ہوئے اور جب تک اسے باہر کا منظر نظر آتا رہا وہ تب تک وہیں کھڑا ہوا تھا۔

اور وہ اس کی زندگی کی پہلی رات تھی جب اس نے کبھی اس کے تصور میں اس کی ذمیل دلی خوب صورت مسکراہٹ آنے لگتی تھی، ابھی اسے دیکھتے ہی جو بے ساختہ چمک اس کی آنکھوں میں پیدا ہوئی تھی اسے وہ یاد آنے لگتی۔ کبھی اس کا گھبرائے اور پھپکاتے وہ کہیں انجیجیڈ یا کسی کے ساتھ کھینچتے تو نہیں ہے پوچھنا مسکراتے پر مجبور کر دیتا۔ کبھی اس کے جوہ کا تحفظ دیتا انداز ایک نیا نیا سا احساس دل میں بگائے لگتا۔ اگر یہ حادثہ ہو جاتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا، اس کے دل کو ایک نئے ہی انداز سے دھڑکانے لگتا۔

اس پوری رات وہ عباد عذیر کو سوچتی رہی تھی۔ اس پوری رات وہ اس کے ساتھ رہا تھا۔



اگلے روز اسے کیمپس میں ملا تھا وہ۔ لومبوریل لائبریری میں آئی ہوئی تھی۔ وہاں اس کی ایک دوست رہی جو کولمبیا یونیورسٹی کی آرٹس اسکول میں زیر تعلیم تھی اس کے اور اس کے کلاس فیلوز کی بیسٹ فنکشن کی نمائش تھی اور اس نے بنیا کو نمائش میں آنے کی دعوت دی تھی۔ لائبریری کا کسی زمانے میں مین ریڈنگ روم اب یونیورسٹی کے اسی نوعیت کے ایوٹس اور انٹرنیشنل کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ڈیزیز سینٹرزمیں تھا، دیگر کئی طرح کے انتظامی امور سے متعلق دفاتر بھی اسی عمارت کے اندر قائم تھے۔ ساتھ ہی یہاں مختلف نمائشوں اور دیگر اسی نوعیت کے ایوٹس کا انعقاد بھی ہوتا رہتا تھا۔

لولا لائبریری اپنے منفرد اور کلاسک آرکیٹیکچر کی وجہ سے کولمبیا یونیورسٹی کی پہچان تھی۔ یونانی فن تعمیر اور طرز تعمیر کی یہ ایک خوب صورت مثال تھی۔ قدیم یونانی طرز کی عمارت جس کے سامنے بہت سارے گول ستون بالکل سیدھے میں کھڑے تھے۔ یہ گول ستون عمارت کی Elevation کو ایک خوب صورت رنگ اور تسلسلاتی حسن عطا کیا کرتے تھے۔

لولا لائبریری کی عمارت کافی اونچائی پر واقع تھی اور اس تک پہنچنے کے لیے خوب صورت پتھر سے بنی سیڑھیوں کا

ایک طویل سلسلہ تھا۔ ان سیڑھیوں کے اسٹیپ بہت چوڑے اور بہت کشادہ تھے۔ ان ہی اسٹیپ پر مشہور فرانسیسی مجسمہ ساز ڈیونیل جیسنر کا بنایا۔ ”Alma Mater“ کا مجسمہ نصب تھا۔

کولمبیا یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کے لیے یہ جگہ وہ جگہ تھی جہاں وہ اپنا فارغ وقت گزارنا اور دوستوں سے ملنا ملنا پسند کیا کرتے تھے۔ یہ سیڑھیاں ہر وقت اسٹوڈنٹس سے گھری رہتی تھیں۔ ان کشادہ اور طویل اسٹیپس پر بے فکری سے گھنٹوں بیٹھنا جیسے کولمبیا کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ سیڑھیاں اتنی طویل اتنی چوڑی اور اتنی کشادہ تھیں کہ ان پر ایک وقت میں اسٹوڈنٹس کا ایک جم غفیر یا آسانی سے سلاسا تھا۔

وہ بیسٹ فنکشن دیکھنے اور رہنے سے مل لینے کے بعد مین ریڈنگ روم سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ کوریڈور سے گزر رہی تھی جب اسے عباد پرووٹس کے آفس سے باہر نکلتا نظر آیا۔ اس کی بنیا کی طرف پشت تھی، اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ چہرہ دیکھے بغیر صرف پشت سے ہی اسے پہچان گئی تھی۔ وہ اس کے قریب آگئی تھی۔ ”ہائے عباد۔“ وہ بے ساختہ اور فوراً گھوما۔ اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں وہی چمک ابھری تھی جو اسے اچھی بھی لگتی تھی اور جس کی وہ عادی بھی ہونے لگی تھی۔

”بنیا! کیسی ہو؟“

”ٹھیک۔ کیا ہو رہا ہے؟“  
 ”کچھ نہیں ڈاکٹر الیکزینڈر کے آفس ایک کام سے آیا تھا۔“ اس نے پرووٹس کا نام لیا، وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔  
 ”چلو کہیں چل کر بیٹھیں، ویسے تو مجھے بعد ہمارا گروپ ڈسکشن ہے پروفسر میری کے ساتھ، لیکن اتنی دیر تو ہم بات کر سکتے ہیں نا؟“ عباد اس سے بولا۔ وہ دونوں لو

لائبریری کی عمارت سے نکل کر سیڑھیوں پر آگئے۔ حسب معمول اور حسب دستور اس وقت بھی وہاں اسٹوڈنٹس الگ الگ ٹیولوں کی شکل میں کافی تعداد میں موجود تھے۔

”تم بیٹھو۔ میں ذرا کھانے کے لیے کچھ لے آؤں، لچ نہیں کیا اب بھوک لگ رہی ہے۔“  
 وہ سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی وہ تھوڑی



ہی دیر میں آگیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دو عدد سپوزاہیل گلاز جن میں اسٹریمری شیک تھا اور ایک پیسہ پلیٹ جس میں سینڈویچ تھے موجود تھے۔ اس کا گلاس اسے پکڑا اور سینڈویچ کی پلیٹ ان دونوں کے درمیان رکھ کر وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”تمہاری کیا باہز ہیں دنیا؟ چڑھائی کے بعد کا ٹائم تم کیسے گزارتی ہو؟“

سینڈویچ کھاتے ہوئے عباد نے اس سے پوچھا۔  
”ماما جانی کے ساتھ“ فریڈز کے ساتھ۔ کبھی اور مائیکل جسے ہم لوگ مائیکل کہتے ہیں۔ میرے بہت فریڈز ہیں ان کے ساتھ۔ باہز میں مجھے پرانی فلمیں دیکھنا پسند ہے۔ سمندر کے کنارے واک کرنا پسند ہے۔ ٹھوڑی رومنٹک ٹائپ کی ہوں مجھے چاندنی راتیں، بارش اور آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ جیسے اس وقت بیٹھی ہوں ایسے بیٹھ کر سامنے ان سفید سفید کبوتروں کو دیکھنا اچھا لگتا ہے میں انہیں گھنٹوں بیٹھ کر دیکھ سکتی ہوں اور تم؟“

”مجھے؟ آج کل تو مجھے بنیا بھاد کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔ ویسے مجھے فٹ بال میں بہت انٹرسٹ ہے۔ دیکھنے میں بھی اور کھیلنے میں بھی۔ اس کے علاوہ میوزک کا بھی شوق ہے۔ میں گٹار اچھا خاصا بجالتا ہوں۔ تھوڑا بہت گانے بھی لیتا ہوں۔ آئی مین دوستوں کی فحفل میں۔“

وہ اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے بول رہا تھا۔ اس کے جملے کے ابتدائی حصے کو قصداً نظر انداز کر کے اس نے میوزک والی بات پر اپنے کمنٹس دیے۔  
”پھر تو بھی میں بھی تم سے گٹار سنوں گی۔“

عباد کے گروپ ڈسکشن کا وقت ہوئے لگا تھا وہ کھڑا تو ہو گیا مگر یوں جیسے بحالت مجبوری۔ اٹھ رہا ہو۔  
وگرنہ اس کے پاس سے جانے کا اس کا دل نہ چاہ رہا ہو۔



پھر باقی سارا ہفتہ اس کی عباد کے ساتھ کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی نگاہوں نے کیپس میں آتے جاتے اسے تلاش ضرور تھا مگر وہ نظر کیسے نہیں آیا تھا۔ وہ ایم ایس کرنے کے ساتھ اپنے ایک پروفیسر ڈائریکٹر ہو چل جو یہاں وزٹنگ فیکلٹی ممبر تھے اور ایک کنسلٹنگ فرم میں پارٹنر تھے وہاں ان کی فرم میں جزیقی ملازمت اس انداز میں کر رہا تھا کہ ڈائریکٹر یو اس

اپنے ساتھ اپنے مختلف پروجیکٹس میں بطور مشیر اور معاون شامل کر لیا کرتے تھے۔

وہ ان کا فوری اسٹوڈنٹ تھا اور ان کی خواہش پر ان کے آفس میں ان کے ساتھ کام کر کے اپنا سول انجینئرنگ کا تجربہ وسیع کر رہا تھا۔ یقیناً وہ ان دنوں بہت مصروف رہا تھا۔ تب ہی پورے ہفتے اسے کیسے نظر نہیں آیا تھا۔ ہفتے کی رات جب وہ سوئے لیٹ رہی تھی تب اس کا فون آگیا تھا۔

”تم کہاں تھے؟“ اس نے پوچھنے سے خود کو ہشکل روکا تھا اور ”ہائے“ اور ”کیسے ہو؟“ براگٹھا کیا تھا۔

”کل کیا کر رہی ہو؟ کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟“ اس نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ کیوں؟“

”تم کہہ رہی تھیں ناں تمہیں پرانی فلموں کا شوق ہے۔ Gone with the wind لگی ہوئی ہے سینما میں۔ میں نے دو دن کنکس لے لیے ہیں۔ چلو گی؟“

اس نے فوراً ہی اس کے ساتھ چلنے کی ہائی بھلی تھی۔ اس کے ساتھ وقت طے کر کے عباد نے لکھا کہ وہ اس کے لبار ٹنٹ سے ٹک کر لے گا۔ دو دوستوں کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے، آؤنگٹ اور ڈنر وغیرہ پر جاتی رہتی تھی مگر

اپنے لباس اور تیاری کے متعلق وہ اپنی کونکس اس سے پہلے کبھی نہیں ہوتی تھی۔ اسے تیار ہونے اور تھنے سنورنے کا زیادہ شوق ہی نہیں تھا۔ اسے بالوں کی کنگ کے لیے بھی ماما جانی زبردستی دھکے دے کر بھیجا کرتی تھیں اور اپنی اس بہت مٹکی کنگ کا وہ بالوں کو بیڑ لگا لگا کر ستیا

ناس کر لیا کرتی تھی۔

مگر آج اپنی تیاری کے لیے اس کی فکر دیدنی تھی۔ اس نے بلیک جینز کے ساتھ بلیک گھری انڈین اسٹائل کی کپڑی جو اسے اس کی ایک انڈین فریڈ نے گفٹ کی تھی پہنی تھی۔

فل سیلوز اور ہائی ٹیک والی اس کرتی پر شیشوں اور دھاگوں کا بڑا خوب صورت کام بنا ہوا تھا۔ چہرے سے وہ روز

صرف دھوئے کی زحمت کرتی تھی۔

آج اس کی بڑے اہتمام سے کلبسنگ ہوئی تھی۔ بالوں کو بلورانی کر کے کنگ کو دوبارہ اس کی اصلی حالت میں واپس لایا گیا تھا اور تو اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک بھی لگائی گئی تھی۔

”بتی! یہ تمہارا کوئی خاص دوست ہے؟“ ماما جانی نے اس کی تیاریوں کو بغور دیکھتے آخر پوچھ ہی لیا تھا۔

”خاص تو نہیں بس دوست ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا ماما جانی! عباد عزیز نام ہے اس کا۔ پاکستان سے آیا ہوا ہے یہاں ایم ایس کرنے۔ بہت اچھا ڈیٹ لڑکا ہے۔“ اس نے اپنی ہائی ہیل والی سینڈل بیٹے انہیں جواب دیا۔ ”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ وہ بہت اچھا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے ماما جانی آپ کو؟“ وہ ان کے لمبے کی معنی خیزی پر ہنچا کر بولی۔

”میں کیا اس سے پہلے اپنے دوستوں کے ساتھ کیسے باہر نہیں جاتی؟ ابھی برسوں ہی میں چیک کے ساتھ بیج کرنے لگی تھی۔ آج آپ مجھے ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے میں پہلی بار کسی کے ساتھ نہیں باہر جاتی ہوں۔“

”پہلی بار اپنی عمر کے مطابق لڑکیوں کی طرح تیار ہو کر جا

رہی ہو۔ جینز کے اوپر کوئی سی بھی اوٹ چانگ نی شرٹ اور سوئٹ لاد کر نہیں۔ بہر حال مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے تمہارا یہ روپ اور وہ اچھا لڑکا بھی جس نے بنیا بھاد جیسی

ٹائم ہوائے کو لڑکیوں کی طرح حیار ہوتا تو کھانا دیا۔“

وہ ماما جانی کے ان کمنٹس کو سنی وقت مقررہ پر نیچے اتر آئی تھی۔ جہاں اس کی بلڈنگ کے باہر گاڑی میں عباد اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے سینی بجائے والے انداز میں ہونٹ کھینچے تھے۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

”کونکس۔“ وہ گاڑی چلانا گا ہے گاہے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کبھی بھی ایسی نہیں ہوتی تھیں جن سے وہ ہنچکے۔ اس کی نگاہوں میں اپنائیت

چاہت اور محبت کے سوا کوئی رنگ نہیں ہوا تھا۔

مودی تو اس نے پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی مگر اسے اس کے ساتھ دیکھنا بہر حال بہت اچھا لگا تھا۔ فلم دیکھتے ہوئے اس نے عباد کو بتایا تھا کہ مودی سے بھی زیادہ اسے یہ ناول

پسند ہے اور اس کا ہیرو اس ٹائم فورٹ ہیرو ہے۔ اسے تو پرانی مودی کا شوق تھا۔ وہ پتا نہیں بغیر شوق کے اتنے شوق

سے اس مودی کو کیسے دیکھ رہا تھا۔ مودی تم ہونے کے بعد وہ اسے ایک اٹھے سے انڈین ریسٹورنٹ میں ڈنر کرانے

سے آیا تھا۔

”آج کسی کھانوں کا دل چاہ رہا ہے۔ تمہیں پاکستانی اور انڈین کھانے پسند ہیں؟“

عباد نے پہلے اس سے پوچھا تھا اور جب اس نے اپنی

پسندیدگی کا اظہار کیا تب وہ وہاں آگیا تھا بالک بنیر روغنی نان، زعفرانی پلاؤ، فیٹی اور برنی آرڈر کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس ڈنر کو اس نے بے حد انجوائے کیا تھا۔ بے تکلفی سے کھانا کھاتے ہوئے اس دوران وہ اس سے مختلف موضوعات پر بات کرتی رہی تھی۔ پڑھائی، پروفیسرز، دوست، اپنے گھر والے، ماما جانی، اسی طرح عباد بھی اپنی باتیں اس سے کرتا رہا تھا۔

اس کی باتیں زیادہ تر اس کے ماما اور بابا کے ذکر پر مشتمل تھیں۔ وہ بڑے مزے سے اسے بتا رہا تھا کہ روزانہ تین یا چار بار اس کی اپنے ماما اور بابا سے فون پر بات ہوتی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی بات شروع کرتا یا پڑھائی یا جاب کی کوئی بات بتاتے لگتا اس بات میں کیسے نہ کیسے اپنے

ماما بابا کا ذکر لازمی کرتا۔ اس کی ہر بات میں خواہ وہ کسی بھی موضوع پر ہو، اس کے ماما بابا کا ذکر خود بخود ہی آ جاتا تھا۔

نہیں، بیٹھا اور گرین نی کے بعد ڈنر کھل ہو گیا تب وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔

آج مل پے کرنے کے معاملے پر وہ اس سے ابھی نہیں تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیسے بھی جائے گی، مل، بیشہ وہ پے کرے گا، نیپا کے حساب سے آج

کی یہ شام جو انہوں نے ساتھ گزار دی تھی اس کا اہتمام ہو گیا تھا اب عباد کو اسے اس کے گھر ڈراپ کر دینا تھا مگر وہ

بجائے اس کے گھر جانے والے راستے پر جانے کے، کہیں اور جانے لگا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”بس ہے ایک جگہ۔ ابھی تمہیں بتا چل جائے گا۔“

اس کے دو تین دفعہ کے استفسار کے جواب میں وہ سسپنس پیدا کرنے والے انداز میں بولا۔ اس نے ایک

کیرلیمنٹر لہا کی بلڈنگ کی یاد کنگ میں لا کر گاڑی روک دی تھی۔ وہ حیران اور نا اچھی کے عالم میں اس کے ساتھ

چل رہی تھی۔ وہ اسے کہاں لے کر آیا تھا؟ یہاں کون رہتا تھا؟

لفٹ سے دسویں منزل پر اترنے کے بعد وہ ایک

لبار ٹنٹ کے دروازے پر آکر رک گیا۔ ابھی صرف رات کے آٹھ بجے تھے اور بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ عباد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی جیب سے ایک

کی چین نکال کر جس میں کئی چابیاں لگی ہوئی تھیں، اس میں سے ایک چابی دروازے میں لگانے لگا۔ یہ عباد کا



اپارٹمنٹ تھا؟ وہ اسے اپنے اپارٹمنٹ لے کر آیا تھا؟  
اس نے عباد کی طرف غور سے دیکھا۔ اس نے عباد کی  
مودی اور ڈنر کی آفر قبول کرتے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ  
عباد غزیر کے ساتھ ڈسٹ پر جا رہی ہے اور اس کے ملک میں  
نانوائے فیصد ڈسٹ کا اختتام

"Your place or mine" پر ہی ہوا کرتا  
ہے۔ اس کچر میں یہ بات بری نہیں تھی۔  
یہاں اس کے ملک میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ  
رات گزار لینا ہرگز معیوب نہ تھا، معیوب یا برا اگر سمجھا  
جاتا تھا تو اس بات کو کہ ایک وقت میں آپ کے کئی لوگوں  
سے ایفرز ہیں، اگر ایک ہی بندہ ہے جس کے ساتھ آپ  
کے تعلقات ہیں تب تو آپ بہت اعلا کردار کی حامل خاتون  
ہیں۔

خود اس کی دوست کیتی اور مائیک جو ایک دوسرے کے  
ساتھ سو فیصد مخلص تھے اور آپس میں شادی کا فیصلہ کر چکے  
تھے۔ ایک دوسرے کے اپارٹمنٹس میں اکثر رات گزارا  
کرتے تھے اور وہ انہیں اس بات کے لیے بالکل برا نہیں  
سمجھتی تھی۔ وہ ان کا طرز زندگی تھا ہی اس کا۔ وہ امریکی کچر کا  
حصہ ہوتے ہوئے بھی اس کچر سے مختلف تھی مگر عباد نے  
شاید اسے اس کچر کا حصہ سمجھا تھا۔ وہ عباد کو برا نہیں سمجھ  
رہی تھی، غلط نہیں سمجھ رہی تھی مگر شاید وہ اسے پوری  
طرح سمجھ نہیں سکا تھا۔

وہ اس کی سوچوں سے بے خبر دروازہ کھول چکا تھا۔  
"آؤ نبیا۔۔۔" اس نے مسکرا کر خوش دلی سے اسے اندر  
آنے کی دعوت دی۔

"کم سوری عباد! میں اندر نہیں آسکتی۔ میں امریکن  
ہوں مگر اپنے ملک کے دوسرے لوگوں سے میری  
ڈیوڈ (انداز) بہت مختلف ہیں۔"

اس نے عجیبگی سے عباد سے کہا۔ عباد نے پہلے تو  
خیران ہو کر اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات کا مطلب  
سمجھ نہیں پایا، اس کے چہرے پر اس کی ذمیل والی خوب  
صورت مسکراہٹ کی جگہ پہلے حیرت نے لی اور پھر یک دم  
ہی غصہ سے اس کے لب پہنچ گئے، "اس سے کچھ کے بغیر  
اس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ زور وار دھماکے سے واپس بند  
کیا اور سیدھا لفٹ کی طرف جانے لگا۔

"عباد؟" اس کے پیچھے آتے اس نے اسے آواز دی۔  
وہ لفٹ میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے لفٹ کے اندر

آئی۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، وہ لب پہنچنے، استغاثی  
سجیدہ لفٹ کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو عباد؟"  
لفٹ سے نکل کر وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے تیز  
قدموں کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ اس کی بات کا جواب  
دے بغیر اپنی پارک شدہ گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے  
پہلے ہینا کے لیے دروازہ کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ کا  
دروازہ کھول کر خود گاڑی میں بیٹھ گیا۔

وہ اس کے غصے بھرے چہرے کو گاڑی سے باہر کھڑی  
ہوتی بی بی دیکھ رہی تھی۔ اسے اتنا شدید غصہ بھی افسوس ہے

- "گاڑی میں بیٹھو نبیا۔" اس نے انجین میں چابی  
تھما دی تھی وہ جیسے ہی گاڑی میں بیٹھی، ابھی اس نے  
دروازہ بھی ڈھٹک سے بند نہیں کیا تھا کہ اس نے فوراً  
گاڑی اشارت کر دی۔

"عباد! تم مجھ سے ناراض ہو گئے ہو؟"  
اس نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے اسے جواب نہیں  
دیا۔ وہ طوفانی رفتار سے گاڑی کو دوڑاتا اسے اس کے گھر  
لے آیا تھا۔ اور اب لب پہنچے، اسٹیشنرنگ پر ہاتھ تھامے  
اس کے گاڑی سے اترنے کا حکم تھا۔

"عباد! دیکھو پلیر میرا یہ مطلب۔"  
"تمہارا گھر آگیا ہے نبیا۔" سوچے میں اس کی بات  
کٹ کر اس نے اس سے کہا۔ انداز ایسا تھا کہ اگر وہ خود نہ  
اتری تو وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنی گاڑی سے اتار دے گا۔

اسے ایک دم ہی رونے لگا تھا۔ ایک خوشگوار شام جو  
انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور انداز میں  
انجوائے کرتے تزاری تھی اس کا اختتام کتنے غلط انداز میں  
ہو رہا تھا۔ وہ جتنا غصے میں تھا اس سے کچھ بھی کہنے سننے کی  
کوشش کرنا بے کار تھا۔ وہ مایوس اور افسردہ اس کی گاڑی  
سے اتر گئی تھی۔

اس کے اترتے ہی اس نے گاڑی دوبارہ اشارت کر دی  
اور اسے خدا حافظ کے بغیر فوراً وہاں سے چلا گیا  
اسے وہ کہانی کسی بات پر پہنچتا اور ہاتھ دھو اتنا خوش  
اتنا ایکسائٹڈ اسے اپنے گھر لے جا رہا تھا ایسے جیسے اسے  
کوئی سرور تازہ چاہتا ہو، اس کے لبوں پر اسے اپارٹمنٹ  
کا دروازہ کھولنے کی شرارتی سے مسکراہٹ تھی۔  
امریکی کچر کو ذہن میں رکھتے جوابات اس نے عباد سے کسی

تھی وہ کم از کم اس وجہ سے اسے اپنے اپارٹمنٹ ہرگز  
نہیں لے کر گیا تھا۔ اس پوری شام وہ اس کے ساتھ رہی  
تھی اور اس پوری شام اس نے ایک بار بھی اس کا ہاتھ  
تک نہ پکڑا نہیں تھا، ریسٹورنٹ میں اس کے برابر والی کرسی  
پر بیٹھنے کے بجائے وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا وہ  
آج تک جب بھی کبھی اس کے برابر بیٹھا ہوتا ہے اپنے اور  
اس کے بیچ مناسب قسم کا فاصلہ رکھ کر بیٹھا تھا اور اسے  
اس کی اتنی احتیاط پسندی کے باوجود بھی ایسا لگا کہ وہ اس وجہ  
سے اسے اپنے اپارٹمنٹ لے کر گیا ہے؟

وہ بہت بے چین تھی۔ صبح تک یقیناً اس کا غصہ کم  
ہو چکا ہو گا، وہ اسے صبح فون کر کے سوری کہے گی۔ مگر صبح  
اسے فون کرنے پر اسے پتا چلا وہ اس کی سوری کیا سنتا، وہ تو  
سرسے اس کی کال ہی ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔

وہ اس پورے دن رات گھمے تنک وقتاً فوقتاً اس کے  
سیل اور اپارٹمنٹ کے نمبرز پر کال کرنے کی کوششیں کرتی  
رہی۔ کسی بھی جگہ اس کی کال ریسپونڈ نہیں کی جا رہی تھی۔  
اگلے چار دن بھی یہی تماشا ہوتا رہا تھا۔ مگر نہ وہ اس کی کال  
ریسپونڈ کر رہا تھا اور نہ کیسیس میں کہیں نظر آ رہا تھا۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ کے ان کورڈرز، کلاس رومز اور  
لیبز کے دروازے باندی سے پکڑ کر وہی تھی مگر سوائے  
ماپوں کے کچھ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر پانچویں روز جب وہ  
گزرے چار دنوں کی طرح اسے اپارٹمنٹ میں تلاش  
کرنے کی کوشش پر نکلے ہوئی تھی تب بالآخر وہ اسے اپنے  
دوستوں کے ساتھ کورڈرز میں  
Soil Mechanics کی لیب کے پاس کھڑا نظر  
آ گیا۔

اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کے پاس چلی  
آئی۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ وہ اسے دوستوں کے درمیان مل گیا  
تھا۔ دوستوں کے درمیان کم از کم وہ اس کی بات تو سنے گا  
اکیلا مگر شاید اس کی بات سننے بغیر وہاں سے چلا جاتا ہوتا  
میں مشغول وہ سب لڑکے اسے دیکھ کر جب ہو گئے تھے۔ وہ  
سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ان  
چاروں لڑکوں کو نظر انداز کر کے ان میں کھڑے پانچویں  
شخص کو مخاطب کیا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے عباد۔" اس نے قصداً یہ  
جملہ اس سے انگریزی میں کہا تھا۔ مگر اس کے دوست  
بھی سن سکیں کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

عباد کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اکیلا مگر تو  
کبھی اس کی بات نہ سنتا مگر دوستوں کے بیچ اب وہ کوئی  
سین کر ہی ایٹ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دوستوں سے معذرت  
کرنا اس کی طرف آ گیا۔ ان دونوں نے خاموشی سے چلنا  
شروع کر دیا تھا۔ نیچے اتر کر لان کے ایک الگ تھلک سے  
گوشے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے آگے سامنے آکر  
کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں بہت بڑی ہوں، تمہیں جو بات کرنا ہے جلدی  
کرو۔" وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

"عباد! کم سوری۔ تمہیں اس دن میری بات بری لگی  
تھی۔ میں تم سے۔"

اس نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ اس کی بات کٹ کر  
غصے سے بولا۔

"تمہیں مجھ سے سوری کہنے کی ضرورت نہیں ہے نبیا!  
تم نے مجھے جیسا سمجھا، وہ مجھے بتادیا۔ افسوس مجھے تم پر  
نہیں خود پر ہے کہ میں تم پر اپنا پس بی اثر قائم کر پایا  
ہوں۔"

"عباد۔"

"مجھے لگتا تھا تم بہت ذہین لڑکی ہو اور مجھے اب تک  
بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہو مگر افسوس تم نے مجھے بالکل  
بھی نہیں سمجھا ہوا۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ عجیبگی  
سے ٹھہر کر لب بول رہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے۔ میں تم سے کیوں ملتا ہوں؟ میں  
نے اس روز تمہیں اپنے ساتھ مودی دیکھنے اور ڈنر کی  
دعوت کیوں دی تھی؟ نبیا! عباد! میری گرل فرینڈ نہیں تھی  
جس کے ساتھ میں وقتی افیشر چلا رہا تھا، جسے میں نے

ڈسٹ پر بلایا تھا، اس کے ساتھ ایک شام بھر پور انداز میں  
گزار کر اس ذہن کو پرفیکٹ اینڈ ویسٹ کے لیے اسے  
اپنے اپارٹمنٹ لے گیا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ  
باہر چلنے کی دعوت دی تھی جس سے میں محبت کر رہا ہوں،  
جس کے ساتھ میں اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں، جس  
سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں اور جسے میں اس روز پر پوز کرنا  
چاہتا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ جو لڑکی اتنی رومانٹک ہے جسے  
پرانی فلمیں، چاندنی راتیں، بارش اور آسمان پر چمکتے  
ستارے دیکھنا پسند ہے اسے کسی مختلف اور بہت  
رومانٹک سے انداز میں میں پر پوز کرنا چاہیے۔ میں اس  
موقع کو اس لڑکی کے لیے بہت یادگار اور رومانٹک بنانا



چاہتا تھا۔ میں اس لڑکی کو اپنے اپارٹمنٹ اس مختلف اور رومانٹک انداز میں پرپوز کرنے لے گیا تھا جس سے محبت کی جانی ہے اس کی عزت و محبت سے بھی بڑھ کر کی جاتی ہے۔ میں میں ایسا نظر آیا تھا کہ تم سے محبت تو کر سکتا ہوں مگر تمہاری عزت نہیں کر سکتا؟

جو بات وہ اس روز ریمونٹ میں جب وہ پہلی بار ساتھ بیٹھے کافی پی رہے تھے یا جو کہوشش کے اس سے نہیں کہہ پایا تھا اس وقت مجھے کے عالم میں یا آسانی کہہ گیا تھا۔ وہ اس سے محبت کا اقرار کر رہا تھا مگر مجھے اور رنج کے لیے بچے انداز میں۔

”تم میری بہت ساری گرل فرینڈز میں سے ایک گرل فرینڈ نہیں ہو بنیا میں نے کبھی کسی لڑکی سے دوستی نہیں کی میں نے کبھی کسی لڑکی کو اپنے ساتھ نہیں باہر چلنے کی دعوت نہیں دی میں کبھی کسی لڑکی کو اپنے اپارٹمنٹ لے کر نہیں گیا میں نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کا اظہار نہیں کیا میں نے کبھی کسی لڑکی کو پرپوز نہیں کیا میں نے کبھی کسی لڑکی کو پرپوز کرنے کے لیے چاندنی رات کا انتظار نہیں کیا۔ اس روز فل مون تھا تمہیں یاد ہے؟ میں نے تمہارے لیے اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی کو ڈھیر سارے پھولوں سے سجایا تھا وہاں ایک تھا کینڈل تھیں اور بہت سارے پھول تھے۔ میں تمہیں ان پھولوں کے درمیان اس چاندنی رات میں پرپوز کرنا چاہتا تھا۔“

اب اس کی آواز میں غصہ نہیں صرف رنج اور افسوس تھا۔ وہ ایک ٹیک اس کی طرف دیکھتی خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی۔

”وہ لڑکی جو ڈاکٹر گراہم کے لیجر میں بوکھلائی بوکھلائی میرے برابر میں آکر بیٹھی تھی وہ لڑکی اسی لمحہ میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میرے دل نے اس لمحے کہا تھا کہ یہی ہے وہ جس کے ساتھ میں اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ اس وقت تو مجھے تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں پتا تھا۔ ہمارے بیچ کچھ ہے جو بہت خاص ہے۔ کیا تمہیں بھی ایسا نہیں لگتا؟ میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے ایک خاص چمک، ایک خاص تاثیر پیش دیکھا ہے۔ میں تمہارے لیے جیسا محسوس کرنا ہوں۔“

تم بھی میرے لیے وہی محسوس کرتی ہو۔ میں نے ساری زندگی کبھی کسی کے لیے اس طرح کی فیصلہ کن اپنے دل میں پیدا ہوتی نہیں پائیں جیسے تمہارے لیے اس روز

جب میری آنکھوں کے سامنے تمہارا ایک سیڈنٹ ہوتے ہوئے بچا میں پورا کا پورا کانٹ گیا تھا۔ میں نے اللہ سے اس لمحہ دعا کی تھی ”میں اس لڑکی کو کھونا نہیں چاہتا“ اسے کبھی مجھ سے جدامت کرنا اللہ۔“ تمہارا امریکن بچہ اسے جو نام دیتا ہے دے لو۔ مگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ کسی کے لیے ایسی فیصلہ کن انسان کے دل میں زندگی میں صرف ایک بار پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے اور صرف کسی ایک ہی سے ہوتی ہے۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے وہاں رک گیا تھا۔ وہ اس کی باتوں کے حصار میں وہاں چپ چاپ تما کھڑی تھی۔

\*\*\*

صبح کے دس بج رہے تھے جب اس نے عبادت گاہ کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر تیل کی۔ کل وہ اپنے دل کی سب باتیں بول کر اس کے پاس سے چلا گیا تب وہ اس کے پیچھے نہیں نکلی تھی۔ اس نے اسے فون کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ اسے کسی خاص اور رومانٹک انداز میں پرپوز کرنے اپنے اپارٹمنٹ لے کر گیا تھا اور اس نے اپنی غلط باتوں سے اسے ہٹ کیا تھا۔ اب اپنی باتوں کا ازالہ وہ اس کے اپارٹمنٹ جا کر ہی کرنا چاہتی تھی۔

”میں اس لڑکی کو کھونا نہیں چاہتا“ اسے کبھی مجھ سے جدامت کرنا اللہ۔“

بہت سادہ سے اس کے یہ لفظ جن میں محبت کی شدتیں بہت تھیں اس کے دل سے نکل نہیں رہے تھے۔ اس سے اس طرح بھی محبت کی جاسکتی ہے اس میں ایسا تو کچھ خاص نہیں کہ کوئی اس سے ایسی محبت کرے۔

چھٹی کے دن شاید وہ دیر تک سویا کرتا تھا تب ہی تو اس کی پہلی تیل پر تو دروازہ کھلائی نہیں تھا۔ وہ ایک ایک دو سیکنڈ کے وقفے سے تیل بجاری تھی۔ چوتھی تیل پر اس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ بستر سے نکل کر سیدھا دروازے پر آیا تھا۔ اس نے جینز کے اوپر شرٹ نہیں پہنی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کی نیند سے بند ہوتی آنکھیں ”فورا“ ہی پوری کی پوری کھل گئیں۔ وہ ایک دم ہی دروازہ کھلا چھوڑ کر سامنے نظر آتے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے دروازے سے اندر قدم رکھ دیا مگر کھڑی ہوئی وہیں تھی۔ وہ شرٹ پہن کر اس کے اوپری شین بند کرنا کمرے سے باہر نکلا۔

”ندر آ جاؤ۔“ اس نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

وہ اسے اپنے لاؤنج روم میں لے آیا تھا۔

”ٹیمو۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئی تب وہاں سے دوبارہ اندر چلا گیا۔ اس بار وہ دو تین منٹ بعد واپس آیا تھا تو لمبے سے منہ پوچھتا ہوا۔

”ماشتہ کرو گی؟“ وہ حد درجہ سنجیدہ اس کی میزبانی کر رہا تھا۔ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کچن میں چلا گیا۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے کچن میں آگئی۔ وہ فرنچ میں سے انڈے نکال رہا تھا۔

”تم مجھ سے یہ نہیں پوچھو گے کہ میں کیوں آئی ہوں؟“

”کیوں؟“

”دیکھو میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ تم سے سوری کہہ رہی ہوں۔ اب کیا میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں؟“

عبادت گاہ کے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

”میں ناراض نہیں ہوں بنیا۔“

”ناراض نہیں ہو تو پھر یہ اچھا خاصا خوب صورت چہرہ بلا وجہ پھولا ہوا ہے؟“

وہ بے سانشہ مسکرایا تھا۔

”تھینک گاؤ۔ میں تمہاری اس ڈمبل والی مسکراہٹ کو دیکھنے کے لیے ترس گئی تھی۔“

اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔

”عبادت! نہیں عالی! تمہارے قریبی دوست تمہیں عالی کہتے ہیں۔ دیکھو عالی! کیا ہم پھر سے اشارت نہیں کر سکتے۔ فرض کر لو کہ پچھلا سنڈے ہماری لائف میں آیا ہی نہیں تھا۔ آج اس سنڈے کو تم مجھے پرپوز کرنے والے ہو۔“

وہ سنجیدگی سے اسے سناری تھی مگر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”گیا چیز ہو تم بنیا سچا؟“

”دیکھ لو۔ چاہو تو مجھے بے شرم بھی کہہ سکتے ہو کہ خود چل کر تمہارے گھر آئی ہوں کہ اینٹری بیگ مین آئیے۔ مجھے پرپوز کیجیے۔ اب اس سے زیادہ اور کیا کروں۔“

”مگر یہ چاندنی رات نہیں ہے۔“ وہ اب جیسے صرف اسے زچ کرنے کے لیے یہ بات کہہ رہا تھا۔ ورنہ اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک پوری طرح لوٹ آئی تھی۔

”کوئی بات نہیں عالی! میں چاندنی رات پھولوں کی ایک اور کینڈل کے بغیر کام چلاؤں گی۔ تم جس طرح بھی کوٹھے

مجھے رومانٹک لگے گا۔“

”اس طرح بے قرار اور بے صبری سے کبھی کسی لڑکی نے خود کو پرپوز نہیں کروایا ہوگا۔“ اس نے جیسے مصنوعی سے انداز میں اسے شرم دلانے کی کوشش کی۔

”اس لیے کہ ان کا واسطہ تمہارے پیسے مغرور بندے سے نہیں پڑتا ہوگا۔ اتنا منانے پہلی جاری ہوں تمہارے لیے اب تو مان جاؤ۔“

اس نے خاموشی سے ایک پل کے لیے کچھ سوچا پھر اس سے بولا۔

”میں باہر چلیں؟“

”کہاں؟“

”اول۔ سینٹرل پارک۔ کچھ کھانے بننے کا سامان لے لیتے ہیں، وہاں ایک بوٹ لے لیں گے، ٹپک ہو جائے گی۔“ اس نے سوچتے ہوئے جگہ چالی۔

”اور تم مجھے پرپوز کر دو گے؟“ وہ ہنستے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

”میں کروں گا۔“

”دیکھو۔ آج تک مجھے کبھی کسی نے پرپوز نہیں کیا ہے، میں بہت ایکسٹینڈ ہو رہی ہوں۔“

وہ اس کی بات کا جواب دے بغیر انڈے واپس فرنچ میں رکھنے لگا۔

”تم ٹیمو۔ میں پانچ منٹ میں شاور لے کر آتا ہوں۔“

وہ دونوں کچن سے باہر نکل آئے تھے۔

”شیو بھی کر لیتا۔ جو بندہ ہینا سجاد کو پرپوز کرنے جا رہا ہو، ایٹ لیٹ اس نے شیو تو کر رکھا ہو۔“

وہ اسے حکم دیتی واپس لاؤنج میں آگئی تھی۔

”شیو بھی کرنا پڑے گا؟“ اس نے آنکسی سے پوچھا۔

”بالکل۔ بغیر شیو کے پرپوز کیا تو میں تمہارا پرپوزل اسی وقت ریجیکٹ کر دوں گی۔ جو بندہ ہینا سجاد کو اچھے ملے میں پرپوز نہیں کر سکتا اس کا پرپوزل تو فوراً ریجیکٹ کر دینا چاہیے۔“ وہ شان بے نیازی سے بولی۔

”پھر مجھے تھوڑی دیر لگے گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کر لوں گی۔“

وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور ایک منٹ بعد ہی واپس بھی آیا۔

”جب تک میں آپ کے شاپان شان تیار ہو کر آ رہا ہوں آپ یہ دیکھ لیجئے۔“ اس نے ڈی ڈی ڈی پلیٹر میں



ایک ڈی وی ڈی لگا دی۔

”ابھی تین مہینے پہلے میں پاکستان گیا تھا تب میں نے یہ مووی بنائی تھی۔“

وہ اس کے گھر کی مووی تھی۔ اس کے ممالیائی مووی تھے۔ کہیں کہیں ان دونوں کے ساتھ وہ خود بھی تھا۔ اس کے گھر کا چکن ’لان‘ کمرے عباد کا پڑا روم‘ اس کے ممالیائی کا پڑا روم‘ اس کے پاپا کی اسٹڈی‘ بی وی لاؤنج‘ کارپورٹ‘ مختلف جگہوں پر اور مختلف دنوں اور اوقات میں اس نے یہ مووی بنائی تھی۔ کیونکہ اس کے اور اس کے ممالیائی کے لباس تبدیل ہوتے نظر آ رہے تھے۔ وہ اسے مووی دیکھتا چھوڑ کر دوبارہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ واقعی اپنے ممالیائی کا لاؤنچ مینا تھا‘ اس کی اپنے ممالیائی کے ساتھ بہت زیادہ انسٹیج منٹ تھی۔

ایک جگہ اپنی ماما کے ہاتھ سے کھانا کھاتا وہ بالکل چھوٹا سا بچہ لگ رہا تھا تو دوسری جگہ اپنے پاپا کو کپڑوں میں کچھ سمجھاتا بڑا ذمہ دار اور سمجھ دار بہن۔ وہ کچھ ہی دیر میں تیار ہو کر آیا۔ تازہ تازہ شیو کیے‘ ہنڈ شیو اور کولون کی خوشبوؤں میں ممکنا‘ بال سلیف سے جمائے تھا جینز اور سوٹ شرٹ میں ہی مگر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”اب ٹھیک ہے میڈم؟“

”ہاں اب بہتر ہے۔“ اس نے مسکراہٹ دہاتے جواب دیا۔ وہ دونوں باہر نکلنے لگے تب اس نے اس سے کنارہ لینے کے لیے کہا۔

”گھٹا؟ کیا تم یہ چاہتی ہو میں تمہیں گاکر پوز کروں؟“

”ہاں۔۔۔ گاکر کرو گے تو شاید میں تمہارا پوئل قبول کر لی لوں۔“

”گرتی لوں“ کے الفاظ پر اس نے اسے گھورا تھا مگر وہ اندر سے اپنا گٹار نکال کر لے آیا تھا۔ وہ دونوں کیم میں سینٹرل پارک جا رہے تھے۔ راستے میں کیم رکوا کر عباد ایک سپر اسٹور میں چلا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ وہاں سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کاغذ کا شاپنگ بگ تھا۔ وہ کیم میں اس کے برابر واپس بیٹھا تو اس نے شار کے اندر جھانکا۔ اندازہ تو تھا ہی کہ اس میں ان کی پانکک کا کھانے پینے کا سامان ہے۔ اس میں بریڈ بھی‘ سلاسرز والی چیز کا ایک پیکٹ تھا گرین اولیو کی بوتل بھی۔ یعنی پیر اور زیتون والے سینڈویچز وہیں تیار کر کے وہیں کھائے جائیں گے۔ اس کے علاوہ کیٹو اور سیب تھے

اور کئی طرح کے جوس اور کوک اور اسپرائٹ وغیرہ کے کافی سارے کین تھے۔

سینٹرل پارک سینٹرل مین بدن میں 843 ایکڑ رقبے پر محیط ایک بہت بڑا اور بہت خوب صورت پارک تھا۔ یہ بلاشبہ امریکہ کا سب سے مشہور اور سب سے زیادہ وزٹ کیا جانے والا پارک تھا۔ بلند بالا‘ اونچی اونچی عمارتوں میں گھرے نیویارک شہر کے وسط میں یہ پارک تو کہ بالکل قدرتی نظر آتا تھا مگر لطف کی بات یہ تھی کہ تقریباً یہ سارا کا سارا پارک لینڈ اسکیپ تھا۔ چاہے وہ اس کے اندر موجود گارڈن ہوں‘ جنگلات‘ جھیلیں‘ تالاب سب کچھ لینڈ اسکیپ تھا مگر یہ سب چیزیں تیار اس مہارت اور خوب صورتی سے تھی کہ ان پر سو فیصد قدرتی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

سینٹرل پارک کے اندر بالکل قدرتی لگتے بے شمار تالاب اور جھیلیں تھیں‘ بڑے بڑے سرسبز گارڈنز‘ لانز‘ جنگل‘ ٹینس کورٹ‘ اور طویل واکنگ اور جاگنگ ٹریک‘ ہافکنگ کی قدرتی نظر آتی سرسبز اونچائیاں بہت سارے ریسٹورنس‘ اس پارک میں ہر عمر سے تعلق رکھنے والوں کی دلچسپی کے لیے بہت کچھ تھا۔ دوسرے شہروں اور ملکوں سے آنے والے امپائر اسٹیٹ بلڈنگ‘ یو ٹائیڈ نیشرز اور جسمے آزادی کے بعد سب سے پہلے سینٹرل پارک ہی دیکھنا چاہا کرتے تھے کہ آخر وہ جگہ کیسی ہے جسے انسانی ہاتھوں نے اس مہارت سے تخلیق کیا ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

وہ دونوں سینٹرل پارک آگئے تھے۔ ان لوگوں کا چونکہ بوٹنگ کا ارادہ تھا سو وہ سینٹرل پارک کے بوٹ ہاؤس پر آگئے تھے۔ یہ بوٹ ہاؤس جمیل کے ساتھ ہی واقع تھا۔ یہاں بوٹ ہاؤس ریسٹورنٹ بھی تھا جہاں بیٹھ کر کھاتے بیٹے جمیل اور اس کی خوب صورتی سے محفوظ ہوا جاسکتا تھا اور یہاں پر سے لوگ پورے دن کے لیے مختلف طرح کی بوٹس اور سائیکلز کرائے پر حاصل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے چھوٹوں والی ایک چھوٹی کشتی کرائے پر لے لی تھی۔ 222 ایکڑ رقبے پر محیط یہ جمیل بے پناہ خوب صورت تھی۔ کمرے نیلگوں پانیوں کے ارد گرد ہیرا میزور اور گہرا سکوت

وہ دونوں کشتی میں بیٹھے جمیل کے نیلگوں پانیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جمیل کے اوپر اڑتے آبی

پرندے‘ بہت دور نظر آتی سفید سفید طغیانی اور ارد گرد بکھرا ہوا جمیل کو جاوٹی اور طلسمانی حسن عطا کر رہے تھے۔ عباد چھوٹوں کی مدد سے کشتی چلا رہا تھا اور وہ اس کے سامنے ٹھہری تھی۔ جمیل کا سفر طے کرتے وہ دونوں کافی دور نکل آئے تھے۔ ناشتہ چونکہ دونوں ہی نے نہیں کیا تھا اس لیے پہلے کھانے پینے ہی کا سلسلہ ہوا تھا۔

اس نے پیر اور زیتون کا ایک سینڈویچ بنا کر پہلے عباد کو دیا تھا اور پھر اپنے لیے بھی سینڈویچ بنا کر کھانے لگی تھی۔ سینڈویچ کے بعد کینو اور سیب کھائے گئے تھے‘ اسپرائٹ اور کوک کے کین کھول کر سو فٹ ڈرنک سے لطف اندوز ہوا گیا تھا۔

”میں سینٹرل پارک اپنے بچپن سے لے کر اب تک اتنی مرتبہ آئی ہوں۔ یہاں قیامی کے ساتھ بھی اور دوستوں کے ساتھ بھی میں نے بے شمار یادگار پانکک منائی ہیں مگر جتنا انجوائے میں آج کر رہی ہوں‘ آج تک کبھی نہیں کیا۔“ اس نے اپنے دل کی بات سچائی سے عباد کو بتائی۔ ”اس لیے کہ اس وقت تم اس کے ساتھ ہو جس کے لیے تم بنائی گئی ہو۔ تم میرے ساتھ ہوتی ہو تو تمہیں اپنے مکمل ہونے کا احساس نہیں ہوتا‘ میں تمہارے ساتھ ہوتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میری زندگی ہر طرح سے مکمل ہے‘ پرفیکٹ ہے۔ جیسے اب میری ذات میں کسی چیز کی کمی نہیں رہی۔“ وہ آہستہ آہستہ زری سے بولا۔

”ایک بات بتاؤ عالی؟“ وہ اس کے عالی کہنے پر مسکرایا تھا۔

”میں تمہیں دو ڈھائی مہینے پہلے تک سرے سے جانتی بھی نہیں تھی اور اس وقت تمہارے ساتھ ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں تمہیں ہمیشہ سے جانتی ہوں۔ میں اتنی جلدی کبھی کسی سے کلوز نہیں ہوتی۔ میرے تو قریبی دوست بھی بہت کم اور سلیکنڈ قسم کے ہیں۔ پھر تم سے میں کیسے؟ مجھے خود پر حیرت ہو رہی ہے۔ اتنی جلدی بے تکلف ہونا یہ میری نیچر نہیں ہے۔“ وہ اس کے انجمن لیے سوال پر مسکرایا۔

”میرا خیال ہے اسی کو محبت کہا جاتا ہے۔ کوئی ایسا ہوتا ہے جس کے ساتھ آپ پوری زندگی گزار دیتے ہیں اور آپ کا اس کے ساتھ دل کا رشتہ نہیں جڑتا اور کوئی پہلی نظر میں دل میں اتر جاتا ہے‘ بہت اپنا اور بہت خاص بن جاتا ہے‘ اس لیے کہ وہ آپ کے لیے بنایا گیا ہوتا ہے وہ

صرف اور صرف آپ کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے کہ ہنسیہ سجاد صرف میرے لیے بنائی گئی ہے۔“

”اگر مجھے انجینئر کے بجائے وکیل ہونا چاہیے تھا تو تمہیں بھی انجینئر کے بجائے شاعر ہونا چاہیے تھا عباد عذرا!“

شرارتی سے انداز میں کستی وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ وہ اس کے جذبوں کے واضح اظہار سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ اتنے جذب اور اتنی سچائی سے اس سے محبت کا اقرار کر رہا تھا کہ وہ اس کے لفظوں کے حصار سے اب عمر بھر باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ روز ازل سے اس کا تھا اور اب تک اسی کا رہے گا۔ وہ ہوا سے بکھرتے اس کے براؤن بالوں کو دیکھ رہی تھی‘ اس کے بائیں گال پر موجود ڈھیل کود کچھ رہی تھی۔

”ماما بھی یہی کہتی ہیں کہ میں بہت ہنڈم اور گڈلکنگ ہوں۔“ اس نے اس کی نظروں کی چوری چوری پکڑی تھی۔ وہ ہنڈم سے انداز میں اسے چھیڑ رہا تھا۔ ”میں ٹھیک ہو۔ ویسے تم نے ابھی تک مجھے پوچھ نہیں کیا ہے۔“

”اوہ ہاں۔“ اس کے کہنے پر اسے وہ بھولی ہوئی اہم ترین بات یاد آئی تھی۔ چہو اس کے ہاتھ میں پکڑا تا سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف منسوبانہ سے انداز میں قدرے جھکا۔

”مس ہنیا سجاد میں عباد عذرا عمر ساڑھے 24 سال تعلیم لی ای سول اور عقرب اب ایم ایس اسٹریکچرل انجینئرنگ‘ آپ کو پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک اچھی میڈیکل کاشریف لڑکا ہوں۔ بری عادات اور مشاغل الحمد للہ کوئی نہیں ہیں۔ میرا اکیڈمک ریکارڈ شان دار ہے اور اپنے پاپا کی فرم میں اور یہاں Zeal‘ انجینئرنگ فرم میں جن پروجیکٹس میں میں شامل ہو رہا ہوں ان میں میری کارکردگی دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ بحیثیت ایک انجینئر میرا فیوچر بہت بڑا ہے۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“

اس کا ہنسنے ہنسنے برا حال تھا‘ جبکہ وہ مسکراہٹ لیوں پر روکے بڑی سنجیدگی سے ہنوز اس کے آگے جھکا ہوا اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ ہنسنے ہنسنے ہی اس نے سر اقرار میں بلایا تھا۔ وہ اب اپنی جیب سے کچھ نکال رہا تھا۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ ڈارک بلو کٹر کا ایک چھوٹا سا جیولری کیس تھا۔ اس



نے اسے کھول کر اس میں سے ایک بریسلٹ باہر نکالا۔  
”آفسلے تو ہمارا رشتہ تب ہی طے ہو گا جب ماما یا  
تمہاری ماما جالی سے ہمارے رشتے کی بات کریں گی۔  
انجیج منٹ رنگ بھی میں تمہیں تب ہی پہناؤں گا“ لہذا  
آج رنگ نہیں دے رہا۔ لیکن ایسا سوکھا پوپڑ کرنا  
بھی اچھا نہیں لگتا“ اس لیے تمہارے لیے یہ بریسلٹ لایا  
ہوں۔“

یہ بریسلٹ بھی یقیناً وہ اسے بچکے سنڈے کو دینا چاہتا  
ہو گا جب اسے اپنے اپارٹمنٹ لے کر گیا تھا۔ وہ بریسلٹ  
کا لاک کھول رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف  
بڑھا دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے بریسلٹ اسے پہنایا پھر  
اس کا ہاتھ آگے پیچھے اور اپنے قریب کر کے غور سے  
دیکھا۔ ”اُتی بری چو اس بھی نہیں ہے میری۔“  
”مجھے کہہ رہے ہو یا بریسلٹ کو؟“  
”دونوں کو۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

وہ وائٹ گولڈ کا بہت نازک اور خوب صورت سا  
بریسلٹ تھا، یقیناً بہت قیمتی بھی تھا۔ اسے خریدنے میں  
عباد نے یقیناً کافی پیسے خرچ کیے تھے۔ مگر اسے اس سے وہ  
قیمتی تحفہ لینا ذرا بھی برا نہ لگا۔ برا کیا اسے وہ بریسلٹ لینا  
بہت اچھا لگا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں موجود اس بریسلٹ کو  
محبت سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ مت سمجھنا کہ یہ میں نے اپنے پیلا کے پیسوں سے  
خریدا ہے۔“

”نہیں۔ میں یہ نہیں سمجھ رہی۔“ وہ کھل کر مسکرائی۔  
وہ بہت امیر باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، اسے نیویارک میں پیش  
سے رہنا چاہیے، کوئی کام کاج کرنے کی بھلا اسے کیا  
ضرورت ہے؟ ایسا کوئی انداز اس نے عباد پر نہیں نہ دیکھا  
تھا۔ اسے اتنی محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی  
ایک فون کال پر اس کے پیلا بھتیجہ وہ کہتا اسے بھجوا سکتے  
تھے مگر وہ پھر بھی ڈاکٹر اینڈرو پو کے ساتھ ان کی فرم میں دن  
رات لگ کر انتہائی جانفشانی سے کام کیا کرتا تھا۔ بے پناہ  
محنت کیا کرتا تھا، مختلف پروجیکٹس میں ان کی معاونت  
کیا کرتا تھا اور اس کا صلہ اسے اپنی ذاتی بہترین کمائی کے  
طور پر ملا کرتا تھا۔

اس کا ہاتھ ابھی بھی عباد کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی اس  
بریسلٹ کو دیکھ رہا تھا۔  
”تم میرے ساتھ پاکستان میں رہ لوگی ناں؟“ اس نے یہ

ایک Sacrifice (ایثار) ہے جو میں تم سے مانگ رہا  
ہوں، تم میری خاطر اپنا ملک چھوڑ دو۔ یہ کہہ رہا ہوں۔ اس  
کے علاوہ میں تم سے اور کچھ چھوڑنے کے لیے نہیں کہوں  
گا۔ مجھے پتا ہے تمہارے لیے یہ ایک بہت بڑا اور مشکل  
فیصلہ ہو گا۔ اپنا ملک، اپنا شہر، اپنا رہن سہن کسی کے لیے  
چھوڑ دینا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے پاکستان واپس جانا  
ہے، نہ! میرا ماسٹرز جیسے ہی کمپلیٹ ہو گا، میں فوراً  
پاکستان چلا جاؤں گا۔ میں امریکہ میں نہیں رہوں گا مجھے  
ماسٹرز کرتے ہی واپس پاکستان چلے جانا ہے۔ وہاں میرے  
ماما، پیپا میری راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں پاکستان شاید چھوڑ بھی  
سکتا ہوں مگر میں اپنے ماما، پیپا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

وہ ایک دم ہی بے حد سنجیدگی سے اس سے مخاطب ہوا  
تھا۔ وہ کچھ ٹینشن اور خوف کی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا  
جیسے یہ سوچ رہا ہو کہ اگر نبیہ نے اپنا ملک چھوڑنے سے  
انکار کر دیا تو وہ کیا کرے گا۔

”تمہیں ان کے بغیر رہنا بھی نہیں چاہیے۔ تم ان کے  
اکھوتے بنے ہو، انہیں تمہاری بہت ضرورت ہوگی۔ اور رہا  
سوال میرا تو میں تمہارے ساتھ صرف پاکستان کیا دنیا کے  
کسی بھی ملک اور کسی بھی شہر میں جا کر رہ سکتی ہوں۔“

جب عباد نے یہ سوال کیا تو خود بخود ہی اس کے لبوں  
سے یہ جواب نکلا۔ وہ اپنے جواب پر دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ  
اتنی آسانی سے اپنا ملک چھوڑنے اور کہیں اور زندگی  
گزارنے پر آمادہ تھی؟ اور کہیں اور بھی وہ پاکستان جس  
سے اسے بڑی برابر بھی دلچسپی نہ تھی؟ جس کے متعلق وہ  
قطعا ”کوئی اچھی آراء نہ رکھتی تھی؟ اس نے اپنے دل کو  
ٹٹولا۔

وہ نہ دم بخود تھا نہ حیران۔ وہ بے تحاشا خوش تھا۔ وہ کہہ  
رہا تھا کہ عباد عزیز اگر ساتھ ہو تو وہ کسی ویران، بھراور  
بے آب و گیاہ ریگستان میں بھی زندگی گزار سکتا ہے۔ عباد  
طمانیت اور سرشاری سے بھرپور انداز میں یک دم مسکرایا  
تھا۔

”ہم ہر سال چھٹیوں میں نیویارک آیا کریں گے میں تم  
سے وعدہ کر رہا ہوں۔“ وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنے ہاتھ  
کی گرفت مضبوط کر کے اسے اپنے وعدوں کی سچائی کا یقین  
دلا رہا تھا۔

”میں تمہاری ماما جانی سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
”میں ماما جانی سے بات کر کے تمہیں بتا دوں گی۔“ وہ

دونوں سر پہرے کے ساڑھے تین بجے تک بوٹنگ کرتے رہے  
تھے۔

یہ اس کی زندگی کے وہ کامل ترین خوشیوں بھرے لمحات  
تھے جن کے لیے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ کبھی ختم نہ  
ہوں۔

”ایک بات کہوں عباد، یہ پانی کا سفر، یہ کھلا آسمان اور  
یہ چمکتی ہوئی دھوپ چاندنی رات سے زیادہ جادوئی اور  
رومانٹک ہے۔ میں آج کے اس دن کو اپنی ساری زندگی  
یاد رکھوں گی۔“

بوٹنگ کے اختتام پر جب وہ دونوں کشتی سے اتر رہے  
تھے تب اس نے عباد سے کہا تھا۔ کشتی بوٹ ہاؤس پر لوٹا کر  
وہ دونوں بوٹ ہاؤس ریستورنٹ میں آ گئے تھے۔ ریستورنٹ  
کے اندر بیٹھنے کے بجائے انہوں نے اس کے آؤٹ سائڈ  
ٹیرس پر بیٹھنا پسند کیا تھا کہ یہاں سے جھیل کا منظر دیکھنا  
زیادہ دلکش اور سحر انگیز تھا۔ انہوں نے بالکل کنارے والی  
میز منتخب کی تھی تاکہ پانی کے زیادہ سے زیادہ نزدیک بیٹھ  
سکیں۔ سی فوڈ سے لطف اندوز ہوتے اب وہ جھیل میں  
بوٹنگ کرتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ نظروں کے سامنے  
جدا جدا کھانے کی گنا زیادہ مزے دار لگ رہا تھا۔ کھانے کے بعد  
جب وہ ریستورنٹ سے نکل آئے تب اس کی فرمائش پر  
ایک طرف گارڈن میں گھاس پر بیٹھ کر عباد نے اسے گٹار پر  
چند دھنیں سنائی تھیں۔ وہ گٹار واقعی اچھا بجا رہا تھا۔ اس  
نے نالیاں بجا کر اور خوب دل کھول کر اسے داد دی تھی۔

شام پانچ بجے وہ دونوں واپسی کے لیے اٹھ کھڑے تھے۔  
اب یہاں سے عباد کو اپنے گھر کی راہ لینی چاہیے تھی اور  
اسے اپنے گھر وہ یک میں پہلے اسے اس کے گھر چھوڑنے  
جا رہا تھا۔ اسے ہنسی بھی آرہی تھی اور اچھا بھی لگ رہا تھا۔  
وہ نیویارک میں پیدا ہوئی، اپنی بڑھی، اور وہ اسے یوں  
چھوڑنے جا رہا تھا جیسے وہ اپنے ہی شہر کے راستوں اور  
لوگوں سے انجان کوئی ڈروپ ک سی لڑکی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا  
اس کے پاکستان میں ایسا ہی ہوتا ہے، مروا اپنے سے وابستہ  
خواتین کی پونہمی پروا کرتے ہیں، یونہی ان کا خیال رکھتے  
ہیں۔ اس کے لیے یہ بڑا نیا اور نوکھا تجربہ تھا۔

”ماما جانی نے تمہیں کل رات کھانے پر بلایا ہے۔“

اس نے اگلے ہی روز عباد کو فون کر کے کہا تھا۔ وہ ماما جانی  
سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی، اس نے کل شام گھر واپس  
آتے ہی انہیں عباد کے پوپڑ کرنے سے لے کر بانی بھی ہر  
بات بتادی تھی۔ اس کے سب بہن بھائیوں نے اپنی پسند  
سے شادیاں کی تھیں۔ جنید کی بیوی، اس کی بڑی بھائی ترکی  
کی تھیں اور خالصتا ”جنید کی اپنی پسند تھیں“ جبکہ میخانے  
ایک خالص امریکن اور عیسائی لڑکی سے شادی کی تھی، جو  
اس سے شادی کے لیے مسلمان ہوئی تھی، یعیسنہ کے  
شوہر خالد کو آیا اجداد کے لحاظ سے تعلق تو پاکستان سے  
رکھتے تھے مگر یعیسنہ اور ان کی شادی بھی سو فیصد پسند کی  
شادی تھی۔ یعیسنہ نے ان سے شادی کا فیصلہ کر لینے کے  
بعد والدین اور دادی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

وہ اگر یعیسنہ کی طرح ماما جانی کو اپنی پسند اور فیصلے سے  
آگاہ کر دیتی انہوں نے تب بھی اس کے فیصلے کو تسلیم کر لیا  
تھا مگر وہ چاہتی تھی کہ ماما جانی اس کی خاطر نہیں بلکہ اپنے  
دل کی خوشی اور رضامندی سے عباد کو قبول کریں۔

وہ دادی تھیں مگر انہوں نے اسے ماں بن کر لیا تھا۔ ان  
کا بہت حق تھا اس پر۔ وہ اپنی زندگی کے ہر فیصلے میں ان کی  
بھی خوشی اور رضامندی چاہتی تھی۔

عباد اس کی بات سننے ہی کو لٹس سا ہو گیا تھا۔ یا تو خود  
فرمائش کی تھی ماما جانی سے ملنے کی یا اب نروس ہو رہا تھا۔  
”سنو وہ مجھے پسند کر لیں گی نا؟“ وہ فون پر گھڑی گھڑی  
اس سے یہی پوچھتے جا رہا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے عالی؟ ایسے نروس ہو رہے ہو جیسے میں  
تمہیں ماما جانی سے نہیں بلکہ پتا نہیں کس خطرناک  
شخصیت سے ملنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔“

”یارا زندگی میں پہلی بار اس طرح کسی لڑکی کے گھر جا رہا  
ہوں اس کے گھر والوں کو خود کو دکھانے، وہ مجھے پسند کریں  
گے یا نہیں، اس بات کی ٹینشن تو ہوتی ہے نا۔“ وہ اس  
کے شرم دلائے تملوں کے جواب میں وضاحتی انداز میں  
بولا۔

اس نے روز ماما جانی نے عباد کے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔  
نبیہ ان سے ملوانے اس طرح پہلی بار کسی لڑکے کو گھر پر  
بلا رہی تھی، یہ خاصا اہم موقع تھا۔ ماما جانی نے فون کے لیے  
کافی کچھ بنایا تھا۔ نبیہ نے بھی اس تیاری میں ان کا ساتھ دیا



تھا۔ ماما جانی عباد کے لیے پاکستانی کھانے باری تھیں ان کا کتنا تھا کہ وہ اپنے ہاں کے کھانوں اور گھر کے دانے کو یقیناً یہاں پر بہت مس کرتا ہو گا۔ انہوں نے کھڑے مسالے کا قیمہ، آلو میٹھی، گلاب، جامن اور چیتاں جو روٹین میں ان کے گھر نہیں بنتی تھیں بنائیں جبکہ ہنیدہ نے لڑائیہ رشین سلا اور فرائیز راکس بنائے تھے۔ ماما جانی کا دعوا تھا کہ وہ ان بدبک کھانوں کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ ایک تو بھائی کی مصروفیت کے ساتھ کھنگ کا نام ہی کم لگتا تھا اور اگر ملتا بھی تو اسے بس اسی طرح کی ڈشز بنائی آتی تھیں اسے پاکستانی کھانے بنانے بالکل بھی نہیں آتے تھے۔

عباد وقت کی پابندی کے ساتھ ٹھیک آٹھ بجے ان کے گھر پر موجود تھا۔ اس نے عباد کے لیے جاکر دروازہ کھولا تو اس کی تیاری دیکھ کر پہلے حیران ہوئی پھر بے ساختہ ہنسی۔ اس کے پاس سوٹ نما چیزیں بھی تھیں اور وہ انہیں بعد ٹائی کے پرتا بھی کرتا تھا، وہ اس کے بلیک نوپس سوٹ اور موو شرٹ اور ٹائی کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ بالوں کو بڑے قریبے اور زبردست اسٹائل کے ساتھ جیل سے جمائے اور خوب صورت بلیک شوپینے وہ وہ عباد لگ ہی نہیں رہا تھا جس کے لیے شیو بنانا بھی بڑا مشکل کام ہوا کرتا تھا۔ دو واقعی بڑھکوسے کی پوری تیاری کر کے آیا تھا۔ "ٹھیک لگ رہا ہوں؟" ٹائی کی ناٹ درست کرتے اس نے اس سے پوچھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سرانبات میں ہلادیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک خوب صورت سا بکے اور ایک فیشی شاپنگ بک تھا۔

وہ اسے اندر لے آئی اور ماما جانی اس سے آکر ملیں تو اس نے وہ دونوں چیزیں انہیں سلام دعا کرتے ہوئے پیش کیں۔ ہنیدہ سے کئی بات اس نے یاد رکھی تھی اس نے یہ یاد رکھا تھا کہ اس کی ماما جانی روایتی نانوں، ڈاویوں سے مختلف ہیں اور انہیں نئی فلمیں اور نیا میوزک پسند ہے، سو وہ ان کے لیے موجودہ دور کے امریکن روک بیٹلز کے کافی سارے العزب لایا تھا۔ ماما جانی کو وہ پہلی نظر میں پسند آچکا تھا۔

وہ ان کے گفتگو کے انداز سے بہ بات باتا سکتی تھی۔ انہوں نے اس سے کھانا لگانے کے لیے کہا اور چھٹی درمیں اس نے کھانا لگایا۔ عباد عذری کی اس کی دادی کے ساتھ۔ بے تکلف دوستی ہو چکی تھی۔ ان دونوں کے قہقہوں کی

آوازیں اسے ڈانگک نیبل تک سنائی دے رہی تھیں۔ ماما جانی تو چھٹی ہی دل سے جوان، انہیں ایک لوگوں کے ساتھ بیٹھنا، باتیں کرنا اچھا لگتا تھا رہا عباد تو وہ بھی خوش مزاج، زندہ دل اور جلدی کھل مل جانے والا تھا، سو اس کی ماما جانی کے ساتھ خوب مزے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ کھانے کے وقت ماما جانی کی پیش گوئی کے عین مطابق اس نے اس کی بٹائی کئی بدبک ڈش کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ وہ صرف چیتاں قیمہ اور آلو میٹھی کھا رہا تھا۔

گھر کی روٹی دیکھ کر اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ چیتاؤں کو بڑی عقیدت اور محبت سے کھا رہا تھا۔ "تس گیا تھا میں تو گھر کی روٹی کے لیے۔ ماما جانی اگر کبھی میرا دل چاہے تو کیا میں گھر کی روٹی کھانے آپ کے گھر آسکتا ہوں۔"

انہیں ماما جانی کہہ کر خطاب کرنے سے تو وہ پہلے ہی ان کا دل جیت چکا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا انہیں آتی نہیں ماما جانی ہی کہہ رہا تھا بالکل اسی کی طرح۔ اب جو اس نے گھر کی روٹی کے جگر اور فراق کی داستان سنائی تو ماما جانی کا منہ بھرا دل پردہ میں تھا اس بچے کے لیے مزید گداز ہو گیا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ کہیں۔ "فکر کیوں کرتے ہو میرے لال میں چھبیں روز چیتاں پکا کر بھیجا کروں گی۔"

نمیدوں کی طرح وہ پتا نہیں کتنی ساری چیتاں کھا گیا تھا۔ ماما جانی کو وہ اتنا زیادہ پسند آچکا تھا کہ انہوں نے اسے صرف کھانا کھلایا ہی نہیں بلکہ گھر لے جانے کے لیے ساتھ باندھ کر بھیج دیا۔ انہوں نے باقی بچی تمام چیتاں، قہقے اور آلو میٹھی کا ساں اور گلاب جامنیں سب کچھ اس کے لیے پیک کر دیا تھا۔

"جب گھر کے کھانوں کا دل چاہا کرے بے تکلف آجایا کہو یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ بس فون پر بتا کر آنا۔ یہ ہنیدہ تو اپنے فون پر ایسا اور چادلوں میں خوش رہتی ہے، خلی اپنے لیے کون جتنی کھٹ کرے اس لیے میرا دل چاہتا ہے تو اسٹور سے کئی پکائی روٹی لے آئی ہوں۔ مگر تم ہٹا کر آؤ گے تو تمہارے لیے گرم گرم چیتاں بنا کر رکھوں گی۔"

اسے نظر انداز کیے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گمن رہے تھے۔ ان کی اس طرح کا ڈھی چھتے دیکھ کر اسے لگ رہا تھا ان دونوں کی موجودگی میں وہ آئندہ بھی اسی طرح

انور ہو کر رہے گی۔

"میں پاس ہو گیا نا؟" گھر واپس جانے کے بعد عباد نے لٹ ناٹ اسے فون کیا تھا۔ "اتنی چالو سی اور چچہ گیری کے بعد تمہیں پاس ہونا ہی تھا۔"

"میں بلا وجہ اتنا ڈر رہا تھا۔ ماما جانی تو اس قدر سونیٹ ہیں۔"

"انہوں نے چیتاں ساتھ باندھ کر دی ہیں اس لیے وہ سونیٹ لگ رہی ہیں۔"

"ناراض ہو؟ میں نے تمہارا لڑائیہ نہیں کھایا اس لیے۔" وہ اس کے چڑنے پر ہنسا۔

"ناراض نہیں ہوں فین فکر مند ضرور ہوں۔ یہ تو میری ماما جانی تھیں تو ٹھیک ہے۔ مگر تمہیں تو گھر کی کئی روٹیاں کھلا کر کوئی بھی تمہارا دل جیت سکتا ہے۔ میرا کیا ہو گا کل کہیں سے کوئی سکھو بیگم اگر نکل آئیں جو چیتاں بہت عمدہ بناتی ہوں۔"

"تو میں ان سے کہوں گا۔ آپ اپنی چیتاں اپنے پاس سنبھال کر رکھیے میں اپنی ہنسی کے لڑائیہ، پاشا اور اپنی میٹھی ہی میں خوش ہوں۔" وہ بڑے انداز سے بولا۔

"ہنسی؟" اس نے تعجب سے اس لفظ کو زہر لیا۔ اسے سب ہنسی ہی کہتے تھے۔ اس کے مئی بابا جب زندہ تھے وہ یا ماما جانی ہی بھی کھار پار میں اسے ہنسی کہہ دیا کرتے تھے ورنہ اور کوئی نہیں۔

"ہاں ہنسی۔ اگرچہ کہ باتیں تم اس وقت شدید جیسی میٹھی نہیں کر رہیں مگر یہ کو مختصر کرنا چاہوں تو ہنسی ہی بنتا ہے۔" وہ اس وقت بقول اس کے شدید جیسی میٹھی باتیں نہ کرتی اسی کے دائیں ہاتھ میں پٹنائے پریسلٹ کو اپنے بائیں ہاتھ سے آہستہ آہستہ کھار رہی تھی اس پر آہستہ سے انگلیاں پھیر رہی تھی۔ وہ اتنا نازک اتنا ڈبل کٹ سا تھا کہ وہ اسے کچن کے یا اس طرح کے کسی کاموں کے دوران احتیاطاً پہنچ نہیں تھی۔ مگر جب ایسا کوئی کام نہ ہوتا تو پھر اسے پنے رہتی تھی۔ اس پریسلٹ کی ہر دم اپنے قریب موجودگی اسے اچھی لگتی تھی۔

"ماما بابا کا امریکہ آنے کا پروگرام بن رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں بجائے فون پر انہیں تمہارے بارے میں بتانے کے جب وہ یہاں آئیں گے تب ڈائریکٹ تمہیں ان سے ملواؤں۔"

چیتاؤں کا ذکر ختم کر کے عباد نے یہ بات کہی تو وہ یک دم ہی کونفیس ی ہو گئی۔

"ایسے میں فون پر انہیں بتاؤں گا تو کہیں گے تو وہ کچھ نہیں گھر دل میں پتا نہیں تمہارے حلق کی کیا سوچیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں پاکستانی اور بچن رکھتی کوئی بہت ماڈرن اور آزاد خیال امریکن لڑکی سمجھیں۔ میں چاہتا ہوں ان کے اور تمہارا پہلا امپریشن ہی شان دار بڑے۔ تم سے انہیں چلی بار ملواؤں گا نا تو انہیں بتاؤں گا بھی نہیں کہ اس لڑکی کو میں نے پسند کیا ہے اس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یو کی ایک دوست کہہ کر تمہیں ان سے ملواؤں گا۔ ماما بابا خود ہی سے سمجھ جائیں تو الگ بات ہے مگر میں انہیں شروع میں بتاؤں گا نہیں۔ اور مجھے یقین ہے وہ تمہیں پہلی ملاقات ہی میں دل و جان سے پسند کرنے لگیں گے۔"

"میں انہیں پسند آجائوں گی ناں عالی؟ دیکھو میں بہت زیادہ خوب صورت بھی نہیں ہوں۔"

جس بات پر وہ اس کا اتنا ریکارڈ لگا رہی تھی اتنا مذاق اڑا رہی تھی اب خود کی باری آئی تھی تو وہی بات اس سے پوچھ رہی تھی۔

"کس نے کہا تم خوب صورت نہیں ہو؟ مجھ سے پوچھو میں تمہیں بتاؤں کہ ہنیدہ سجاد اس دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہے۔"

وہ اپنا بدلہ چکانے اور اسے زچ کرنے کے بجائے نرمی سے بولا۔

"تمہیں لگتی ہوں عالی اس لیے تمہیں مجھ میں کوئی کمی نظری نہیں آتی مگر کیا میں انہیں اچھی لگتاؤں گی؟"

"بالکل لگو گی۔ ماما تو ہیں ہی ایسی کسا نہیں دنیا کی ہر لڑکی اچھی لگتی ہے اپنی بیٹی جیسی لگتی ہے اور وہ گئے تو کیا تو میری پیش گوئی ہے ہنیدہ کہ تمہاری پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہو جائے گی۔ انہیں ذہن پر اعتماد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خود پر بھروسہ رکھنے والی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں اور یہ تمام خوبیاں تم میں موجود ہیں۔ مزید پسند وہ تمہیں تمہاری انجینئرنگ کی ڈگری کی وجہ سے کریں گے۔ ان کی ہونے والی بو بھی ان کے اور ان کے بیٹے کی طرح انجینئر ہے اس بات سے تو وہ بہت ہی خوش ہوں گے۔ یا زنا انہیں اپنے پروفیشن سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے اور اپنے فیملی کے افراد سے ان کی پیشہ خوب بنتی ہے۔"







ایار ٹمنٹ کی بالکلونی میں نکل آئی۔ بالکلونی سے اس پارک کا منظر صاف نظر آیا تھا جو عباد کے ایار ٹمنٹ کی بلڈنگ کی بیک سائیڈ پر اور بالکل نزدیک تھا۔ بیچ میں ایک ون وے روڈ اور سائے پارک تھا۔

پارک میں کچھ نیچے فٹ بال کھیل رہے تھے کچھ لوگ اپنے بالوں کٹوں اور بلیوں کی زنجیریں تھامے کھیل رہے تھے۔ پارک اتنا نزدیک تھا کہ سب ہی کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں گھومتے گھومتے ایک بیچ پر جا کر رک گئی تھیں۔ اس پر عباد اور ایک شخص بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ وہ کہیں کام سے جانے کا کہہ کر گیا تو وہ کبھی وہ پتا نہیں کہاں اور کتنی دور گیا ہے جبکہ وہ تو اپنے ایار ٹمنٹ کے اتنے نزدیک موجود تھا۔ وہ اس کے ایار ٹمنٹ کے دروازہ لاک کر کے خود بھی اس پارک ہی میں آئی۔

عباد نے اسے دیکھ کر کچھ حیران ہوتے اس کا تعارف اس سرخ و سپید بوڑھے آدمی سے کروایا تھا۔ ایک اتنے بوڑھے اتنے ضعیف شخص کے ساتھ عباد کو یہاں بیٹھے دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھی۔ اسی وقت فٹ بال کھیتے بچوں کی بال اچھلتی عباد کی گود میں آکر گری اور ان میں سے ایک بچے نے دوسرے ہی اسے آواز دی۔

”عالی نام ان“ بڑا بے تکلفانہ انداز تھا اسے بلانے کا۔ پتا چلا وہ سب بچے عباد ہی کی بلڈنگ میں یا پھر اس پاس کی بلڈنگز میں رہتے تھے اور وہ سب عباد کے دوست تھے۔ وہ سب بہت دیر سے اسے کھیلنے کے لیے بلارہے تھے اور وہ عباد اللہ نامی اس بوڑھے شخص کے ساتھ بیٹھا انہیں کچھ دیر میں آنے کا یقین دلارہا تھا۔ اس بار بچوں کو ٹالنے کے بجائے وہ انہما اور فٹ بال کو اپنے پیروں سے لگ لگاتا ان بچوں کے قریب پہنچ گیا۔ ایک سیکنڈ کے اندر وہ ان بچوں کے کھیل میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ ان انھ ”نو اور دس سال کی عمر کے بچوں کے بیچ بیٹا ان کے ساتھ فٹ بال کھیلنے لگا تھا۔

”اب یہ بچے اسے اتنی جلدی نہیں چھوڑیں گے تم بیٹھ جاؤ۔“

عباد اللہ نے اس سے کہا۔ وہ ان کے برابر بیٹھ بیٹھ گئی تھی۔ اور تب عباد اللہ نے اس سے عباد کی تعریفیں شروع کرتے ہوئے اسے یہ بتایا کہ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اب وہ بالکل تنہا ہیں۔ تنہا وقت کاٹنا اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے اور ایک بوڑھے بیمار شخص کے ساتھ وقت

کون گزارنا چاہتا ہے سو وہ اپنے گھر کی تنہائی اور اکیلے پن سے گھبرا کر یہاں اس پارک میں آجاتے ہیں۔ عیس ان کی عباد سے دوستی ہوئی تھی۔ اور اب عباد ہر سٹنڈے ان سے ملنے اس پارک چلا آتا ہے بیٹھنے کے بانی دونوں میں بھی اسے جب کبھی موقع ملتا ہے وہ بیچ گھر سے نکلے وقت یا شام میں لوٹتے وقت عباد اللہ کے ایار ٹمنٹ آکر ان کی خیر خیریت معلوم کر لیتا ہے۔

وہ عباد کی بہت تعریفیں کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان سے باتیں کرنے والا ان کی باتیں سننے والا عباد کے سوا اور کوئی بھی نہیں۔ عباد ہی انہیں زندہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ بن کر کھیلے عباد عذیر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنا اچھا تھا وہ کتنا مفرد اور کتنا حساس تھا۔ اتنا نرم دل وہ کتنی اور اچھا تھا۔ وہ ایک ششمن کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا اندین دوست موبن اور امریکن دوست جیف کھڑے تھے اور اس کا چالیسی دوست بیروشی ان تینوں کے پیچھے ایک اسٹول پر بیٹھا ناٹکس ہلاتا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جبکہ اس کا فریج دوست تک اس وقت ان لوگوں کے ساتھ نہ تھا۔ وہ تینوں ششمن کی طرف منہ کے اپنے کام میں مشغول تھے۔ انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر کتاب پڑھتے بیروشی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ جس طرح عباد کی کیتھی اور مائیک سے دوستی ہو گئی تھی اسی طرح اس کی بھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اس کے دوستوں کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ قریب آئی تو پتا چلا بیروشی کوئی Text book نہیں بلکہ بیروشی پور پڑھ رہا تھا۔

”وہ عباد عذیر ہر سٹنڈے کی شام کو اس پارک میں عباد اللہ سے ملا کرتے ہیں۔“ کچھ دیر بعد جب وہ دونوں تنہا ہوئے تب اس نے مسکرا کر عباد سے کہا۔

وہ اس کی شخصیت کے ایک اچھے پہلو اس کی ایک نیکی سے واقف ہو گئی ہے اس پر فخر میں جتا ہونے کے بجائے وہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ فوراً گفتگو کا موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ فوٹی اسے عباد سے اور نزدیک کر رہی تھی عباد کے لیے اس کے دل میں موجود محبت کو مزید گہرا کر رہی تھی۔

وہ بیچے جو عباد اللہ ہی کی طرح عباد کے دوست نظر آ رہے تھے اس کے ساتھ مزید کھیلنا چاہتے تھے وہ اسے بھی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے اور اسے لگتا تھا صرف وہ اور ماما جانی ہی عباد عذیر کے گرویدہ ہوئے ہیں۔ وہ سراسر غلط تھی۔ عباد عذیر تو بوڑھوں بچوں واقف کاروں ناواقفوں سب کا پسندیدہ تھا۔ وہ ہر دل عزیز تھا۔ وہ سب کے دل سے لیا کرتا تھا اسے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا آتا تھا۔ بہت امیر باب کا اگلا بیٹا مگر بہت سادہ خوش شکل ذہین اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر مسکرا لہذا۔

عباد عذیر سے اسے محبت پہلے ہو گئی تھی اور اس کی خوبیاں بعد میں پتا چلی تھیں۔ اس کی شخصیت کی خوبیاں اور اچھائیاں اس پر آہستہ آہستہ اب آشکار ہو رہی تھیں۔ وہ اتنا خوبصورت دل رکھنے والا اتنا پیارا انسان اللہ نے اس کے لیے بنایا تھا۔ اسے خود پر پیار بھی آتا فخر بھی ہوتا اور اس کا دل اللہ کا شکر گزار بھی ہوتا۔



وہ عباد کو تلاش کرتی۔ لب میں آگئی تھی۔ وہ اپنے معلومات اور روئین سے اسے اس طرح آگاہ رکھتا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ آج اسے کوئی کرٹسٹ لب میں اور اس کے بعد لا بیرری میں کام ہے اور وہ اسے ان ہی دونوں جگہوں میں سے کسی جگہ پر ملے گا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو عباد اسے وہاں نظر آیا تھا۔ وہ ایک ششمن کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا اندین دوست موبن اور امریکن دوست جیف کھڑے تھے اور اس کا چالیسی دوست بیروشی ان تینوں کے پیچھے ایک اسٹول پر بیٹھا ناٹکس ہلاتا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جبکہ اس کا فریج دوست تک اس وقت ان لوگوں کے ساتھ نہ تھا۔ وہ تینوں ششمن کی طرف منہ کے اپنے کام میں مشغول تھے۔ انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر کتاب پڑھتے بیروشی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ جس طرح عباد کی کیتھی اور مائیک سے دوستی ہو گئی تھی اسی طرح اس کی بھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اس کے دوستوں کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ قریب آئی تو پتا چلا بیروشی کوئی Text book نہیں بلکہ بیروشی پور پڑھ رہا تھا۔

”کوئی کرٹسٹ لب میں بیروشی پور پڑھ رہا تھا۔“ اس نے لب انجارج کا نام لے کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ اس ریڈو ایکٹو اسپیکر کو ڈھونڈنے نکلے ہیں جس نے بیٹری پارکر کو کٹا تھا۔“ یہ تمام columbians کے درمیان ایک عام مذاق تھا۔

اس کی آواز پر عباد موبن اور جیف نے گردن کھما کر پیچھے دیکھا تھا۔ موبن اور جیف نے ہیکو کہہ کر خوش اخلاقی سے اس کی خیریت پوچھی تھی جبکہ عباد فوراً ہی اپنا سب کام کاج چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔

”چلو ہمیں باہر چلتے ہیں۔“ جب ان دونوں کے ساتھ ان کے دوست بھی ہوتے تب وہ انہیں میں انگریزی میں بات کیا کرتے تھے۔

”لیکن تم مصروف ہو۔“

”مصروف ان کے کام میں ہیں ہم تینوں۔ یہ جو ناٹکس جھلاتے بیروشی پور سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔“ عباد نے بیروشی کو گھورا جو بیٹنی کی نمائش کرتا کھل کر ہنسا تھا۔ گویا وہ تینوں دوست بیروشی کا کوئی کام کر رہے تھے۔ وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

”اب کچھ کام خود بھی کرلو۔“ اسے لتاڑتا عباد اللہ کے ساتھ لب سے باہر نکل آیا تھا۔ ان کا سر لو اسٹینیس کی طرف تھا۔ اس کی طرح عباد کو بھی لو اسٹینیس پر بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ 8th سمسٹر کی کلاسز کافی دن ہوئے شروع ہو چکی تھیں۔ اس سمسٹر میں سب سے اہم اس کے ڈیزائن پروجیکٹ تھے اور وہ ان ہی کے متعلق باتیں کرتی ہوئی عباد کے ساتھ چل رہی تھی۔

وہ دونوں لو اسٹینیس پر آکر بیٹھ گئے۔ حسب معمول وہاں بہت اسٹوڈنٹس تھے۔ نیو پارک کی شدید سروریاں ابھی پوری طرح شروع نہ ہوئی تھیں۔ انگریزی تھلک دن کے مختلف اوقات میں دلچسپ ضرور لگی تھیں۔ اب کم از کم سونے کا استعمال لازمی تھا۔ مگر اس وقت چونکہ سورج نکلنا ہوا تھا سو وہاں بیٹھنا خوشگوار لگ رہا تھا۔ عباد نے کولمبیا یونیورسٹی کے Logo والی گرم جیکٹ جس کے ساتھ نیا بھی جڑا ہوا تھا۔ پن رکھی تھی۔ اس کی گود میں جو فائل رکھی تھی اس پر

Proud to be median کا اسٹیکر چپکا ہوا تھا۔ وہ اس کی فائل پر یہ اسٹیکر چپکا پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ مگر اس بار اسے میں کما آج تھا۔

”تم پڑھتے کولمبیا یونیورسٹی میں ہو اور Proud to be median اپنے Nedian ہونے پر فیل کرتے ہو؟“

”مالی ڈیرا یہ محبت کا معاملہ ہے۔ اور محبت تو صرف کسی ایک ہی سے ہوتی ہے اور زندگی میں ایک ہی بار ہوتی ہے۔ میں NED سے محبت کرنا ہوں میں اپنے کیپس وہاں کی چھوٹی بڑی اچھی بری ہر بات سے محبت کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں تمہیں بالکل لگوں کہ میں ایک اعلا درجہ کی یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے اپنے اس تری پندیر ملک کی اس کولمبیا کے مقابلے میں کئی گنا چھوٹی اور ورلڈ رینکنگ میں کسی بھی نمبر پر نہ آنے والی یونیورسٹی کو پسند کرتا ہوں۔ مگر محبت تو ایسی ہی ہوتی ہے ڈیرا میں کولمبیا کے مقابلے میں NED سے محبت کرنا ہوں نیو پارک کے مقابلے میں



کراچی سے محبت کرتا ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے میرا شہر ہے۔ وہاں بہت کچھ بہت برا بہت غلط ہے مگر وہ میرا اپنا شہر ہے۔ میں دنیا کے کسی بھی حصے میں چلا جاؤں، کہیں بھی جا کر رہنے لگوں، کسی بھی یونیورسٹی میں پڑھوں مگر NED اور کراچی دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔

”میرا تہماری اس یونیورسٹی اور اس شہر سے بہت جلدی ملتا چلتی ہوں عالی“

”ہاں تم ملو گی نا ابن شاء اللہ بہت جلدی۔“ وہ جواباً مسکرا کر بولا۔ باتوں کے دوران ذکر نکلتا تو اس نے عباد کو بتایا کہ ماما جانی کی برتھ ڈے آرہی ہے مگر اس بار وہ اپنی دوستوں کو پارٹی دینے کے موڈ میں نہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اب سالگرہ منانے سے انہیں اپنی بڑھتی عمر کا احساس زیادہ ہونے لگتا تھا۔ عباد اس رات ماما جانی کے بلانے پر ان لوگوں کے ساتھ ڈنر کرنے آیا تھا اور آتے ہی اس نے چکیوں میں ماما جانی کو برتھ ڈے منانے پر آمادہ کر لیا تھا۔

”آخر ایک اتنی حسین خاتون روز روز تو 75 سال کی نہیں ہوتیں۔ یہ موقع تو زندگی میں صرف ایک بار ہی آیا کرتا ہے۔“ وہ ماما جانی کی ٹیوٹ اور ان کا ڈارلنگ یونی تونہ تھا وہ اتنے مزے سے ان کے حسن کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا اور وہ قہقہے لگا کر ہنس رہی تھیں۔

”To age with grace“ کی آپ سے بڑھ کر زندہ مثال۔“ بے نہیں دیکھی ماما جانی!

ماما جانی کا شستہ ہنسنے برا حال تھا۔ اور پھر اس نے صرف کہا ہی نہیں تھا واقعی ان کی برتھ ڈے پارٹی میں آن بھی دھمکا تھا۔ ان کے اور ان کی سہیلیوں کے درمیان جو سب کی سب اس کی نالی اور دادی کی عمر کی تھیں وہ مزے سے گھسا بیٹھا رہا تھا۔



عباد اپنے تھیسس کے کسی کام کے سلسلے میں تین چار روز کے لیے بوسٹن جا رہا تھا۔ اسٹرکچل انجینئر میں MS کرنا تھا ہی مشکل کام، اس کی پڑھائی بہت نف تھی، اس پر وہ اپنے ہر کام پر محنت اتنی کرتا تھا ہر چیز بالکل پرفیکٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی اسٹڈیز کو بہت سنجیدگی سے لیتا تھا۔ اس کی ہر بات شروع اور ختم اسی جملے پر ہوتی۔

”پاپا کو مجھ سے بہت امیدیں ہیں۔ میں انہیں لیٹ ڈاؤن نہیں کرنا چاہتا۔ جو وہ مجھ سے توقع رکھتے ہیں میرا دل

چاہتا ہے میں اس سے بھی بڑھ کر ثابت ہو سکوں۔“

بول اسے بوسٹن یونیورسٹی میں وہاں کے سول انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ کے ایک پروفیسر سے ملنا تھا۔ اسے وہاں اپنی کچھ ریسرچ بھی کرنی تھی۔ اور ڈاکٹر اینڈریو نے بھی اسے وہاں کچھ کام کے تھے۔ وہ بھی کرنے تھے۔ گزشتہ روز ان کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی اور رات فون پر عباد نے جب اپنے جانے کا اسے بتایا تو وہ فوراً بولی۔

”تم مجھ سے ملے بغیر چلے جاؤ گے؟“

اگلے روز عباد کی کیمپس میں اور اپنی فرم میں بہت زیادہ مصروفیات تھیں۔ کیمپس میں اگر آنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہاں بات چیت کا موقع ملنا مشکل تھا۔ عباد کو کل وہاں اس کے ایڈوائزر نے بلایا ہوا تھا اور ان کے ساتھ طویل نشست کے بعد اس کے پاس فب سے ملنے کا پچھا مشکل تھا۔ شام ساڑھے سات بجے اس کی رواجی تھی اور اس سے پہلے کا وقت اس کا ڈاکٹر اینڈریو کی فرم میں جو وال اسٹریٹ پر تھی وہاں گزرنا تھا۔ ”پر کل ملنا تھوڑا مشکل ہے۔“

”میں نہیں جانتی اگر تم مجھ سے ملے بغیر چلے گئے نا تو میں تم سے بات بھی نہیں کروں گی۔ تمہاری ٹوٹی کال بھی ریسپونڈ نہیں کروں گی۔“ وہ فون سے جھٹکتے ہوئے کن انڈر میں بولی۔ اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے اس نے بے چارے نے بڑی مشکلوں سے بچنے کا سہارا لیا۔

”میں نے ملے کے لیے طے کیا تھا۔ اسے ففٹھ ایونٹو اتنا ہی تھا وہاں اسے ایک ایک اسٹور سے آرکینکچر اور ڈیزائن پر کوئی خاص کتاب خریدنی تھی سو اس نے فب سے ففٹھ ایونٹو میں واقع ایک ریستورنٹ میں ملنے کا پروگرام طے کیا تھا۔ اسے اس کی بے تحاشا مصروفیات میں سے وقت نکال کر زبردستی اور دھوکے سے ملنے پر مجبور کرنے کے بعد وہ خود صبح وقت پر ریستورنٹ نہیں پہنچ سکی تھی۔ ڈاکٹر گراہم نے آج ایک ایکسٹرا کلاس ارجیجنگ کی تھی اور کلاس لے کر کھائے دوڑنے لگے۔ عباد کو بھی تین بج کر تیس منٹ پر ریستورنٹ میں پہنچنی تھی۔ عباد ایک میز پر بیٹھا اسے اندر داخل ہونا پڑا۔ وہ گھور کر دیکھ رہا تھا۔

”آئم سوری۔ آئم سوسوری۔“ وہ ہونٹوں پر نا۔ وہ ڈاکٹر گراہم۔“

”کوئی کو محبت نہیں کرنی چاہیے۔“ اس کی بات کاٹ کر عباد غصے سے بولا۔ ”چھوڑو! آئی خوار ہو کر رہ جاتا ہے

اس محبت کے پیچھے کچھ نہیں منٹوں سے میں بیٹھا ہی سوچ رہا ہوں کہ عباد پر عشق نے تمہیں واقعی کتنا بتایا ہے۔ ورنہ تم آدمی کام کے تھے۔“

”سوری کہہ تو رہی ہوں۔ اچھا غصہ تھوڑا۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے؟“ وہ اسے مناتے ہوئے لیا جت سے بولی۔

”فی الحال میں صرف غصہ پی رہا ہوں فب سجاد!“ وہ کرسی پر سے کھڑا ہو گیا۔

”تم جا کہاں رہے ہو؟“

”بک اسٹور۔“ اگر آپ کو یاد ہو تو مجھے ایک کتاب ارجنٹ خریدنی ہے اور آپ سے یہاں ملنے کے بعد مجھے وہی خریدنے جانا تھا۔ مزید یہاں بیٹھنے کا میرے پاس وقت نہیں، آپ اگر آتا چاہیں تو میرے ساتھ وہاں تک آسکتی ہیں۔“

وہ خفا خفا لیے میں بولتا ریستورنٹ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ غلطی جان بوجھ کر چاہے نہیں کی گئی تھی مگر تھی تو اسی کی اس لیے فوراً ہی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے ریستورنٹ سے نکل آئی۔

(ففٹھ ایونٹو) پر ریستورنٹ سے چند قدموں ہی کی دوری پر وہ بہت بڑا سا اور چار منزلہ بک اسٹور واقع تھا جہاں وہ دونوں پیدل ملنے فوراً ہی پہنچ گئے تھے۔ بک اسٹور کے روبرو لوگ ڈور کے ذریعے وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ اس بک اسٹور میں تھیں ہی صرف آرکینکچر اور ڈیزائن سے متعلق کتابیں۔ آرکینکچر ہی کے الگ الگ موضوعات پر کتابیں الگ الگ سیکشنز میں چاروں فلور پر موجود تھیں۔

عباد فرسٹ فلور پر گیا تھا۔ اسے جو کتاب خریدنی تھی وہ اس نے وہاں پر فوراً ہی نکال لی تھی۔ اب وہ مزید چند اور کتابیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت چونکہ اس سے ناراض تھا اس لیے اس سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ اسے نظر انداز کر کے کتابیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے والے سیکشن میں گئی، ہسٹری آف آرکینکچر سے متعلق کتابیں دیکھنے لگی تھی۔ سول انجینئرز کو آرکینکچر میں بہت زیادہ دلچسپی نہ بھی ہو تو بھی دلچسپی لگتی پڑتی ہے۔ جبکہ اسے تو قدرتی طور پر ہی آرکینکچر اور خصوصیت کے ساتھ ہسٹری آف آرکینکچر میں گہری دلچسپی تھی۔ وہ قدیم مصری آرکینکچر پر ایک کتاب نکال کر دیکھ رہی تھی۔ وہ کتاب کے صفحات پلٹ کر اس میں موجود قدیم اور نیا ب

رنگین تصاویر اور نقشوں کو توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے عباد کو ایک دم تیزی سے اپنی طرف آتا دیکھا۔ وہ جو کتاب دیکھ رہا تھا، اسے ایک دم اس کی جگہ پر واپس رکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف آیا۔

”تمہارے ہاتھ میں کیا ہوا؟“

صبح دیر ہو جانے کی وجہ سے جلدی میں کپڑے استری کرتے اس کا ہاتھ جل گیا تھا۔ اس کے جس ہاتھ میں کتاب تھی اسی پر وہ جلا ہوا نشان اس کی کلائی پر نظر آ رہا تھا۔ عباد نے اس کا ہاتھ اپنے ساتھ میں لے کر اس جگہ ہوئے نشان کو ہلکا کر دیا۔

”وہ کپڑے آئین کرتے جل گیا تھا۔“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”تم اتنی لاپرواہیوں ہو فب سجاد؟“

وہ تشویش سے اس کی جلی ہوئی کلائی کو دیکھتے ہوئے پرہیزی سے بولا۔ ”اتنا معمولی سا اس کا ہاتھ جلا تھا اور وہ اسے دیکھ اس طرح رہا تھا جیسے پتا نہیں اس کے کتنی خطرناک کوئی چوٹ وٹ لگ گئی ہے۔“

”اس پر کوئی آئن منٹ (مزیم) وغیرہ بھی نہیں لگایا تم نے؟“

”کم آن عباد! اتنا معمولی سا جلا ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اسی لاپرواہی سے بولی۔

”معمولی جلا ہے یا زیادہ مگر جلا تو ہے نا؟ تم اپنی کپڑے کیوں نہیں کرتیں؟“ جواب میں کتاب لے چکا ہوں۔“

وہ ناراض لیے میں بولتا اس ہسٹری آف آرکینکچر سیکشن سے باہر نکل آیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ باہر آگئی تھی۔

”میں بے منت کر کے آتا ہوں۔ تم اوپر جا کر بیٹھو۔“

عباد نے اپنے ہاتھ میں موجود کتاب کی طرف اشارہ کر کے اس سے سنجیدگی سے کہا۔ بے منت وغیرہ سب نیچے کر اوٹھ فلور کے کلائنر پر ہوتی تھی۔ بک اسٹور کے سب سے اوپر والے فلور پر انجینئر ڈیزائننگ سے متعلق کتابوں کے سیکشن کے علاوہ ایک فاسٹ فوڈ ریستورنٹ بھی موجود تھا۔ عباد اس سے وہیں جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ جانے لگی تب عباد پیچھے سے اسی سنجیدہ لیے میں بولا۔

”کچھ آرڈر کرونا میں دس منٹ میں آتا ہوں۔“

وہ اوپر آگئی اور آکر آئن کلائی کا آرڈر کرنے کے بعد عباد



کا انتظار کرنے لگی۔ وہ دوس نہیں پندرہ منٹ بعد واپس آیا تھا۔ وہ میز پر اس کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور پھر اپنی جیب سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ ایک آنسو تھا۔

"ہاتھ دکھاؤ۔" کارٹن میں سے نیو بابر نکالتے ہوئے اس نے اس سے کہا۔ اس نے کچھ حیران سی ہوتے اپنی جلی ہوئی کلائی اس کے سامنے کر دی۔ وہ اسی کے لیے یہ آنسو خیریت سے گیا تھا اس لیے اسے دیر لگی تھی۔ ایسی وہ صبح شام اپنے مٹی چوبیس لگاتی رہتی تھی جلد بازی اس میں بھی اور جلدی کے چکر میں بھی ہاتھ جلا لینا بھی کہیں اور چوٹ لگنا تو جیسے اس کے لیے ایک معمول کی بات تھی۔ ایسے معمولی جتنے ورنے کو تو وہ کسی مٹی میں رکھتی ہی نہیں تھی۔ وہ حیرت سے عباد کو دیکھ رہی تھی۔ جو نیو ب میں سے آنسو نکال کر اس کی جلی ہوئی کلائی پر لگا رہا تھا۔ ایک ڈیڑھ انچ سے زیادہ جلا ہوا نشان نہ تھا جس پر وہ آہستہ آہستہ آنسو نکال رہا تھا۔

"تکلیف تو نہیں ہو رہی؟" اس نے آنسو نکالتے ہوئے ہی سر اٹھائے بغیر پوچھا۔ ایک تک اس کے جھکے چہرے کو دیکھتے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ سر جھکائے عباد کو اس کا انکار میں ہلکا سر کیسے نظر آسکتا تھا۔ اس لیے اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اسے دن میں تین چار بار لگایا۔ اس سے ٹھنڈک بھی پیچھے گی اور ذمہ جلدی ٹھیک بھی ہو جائے گا۔" اس کے چہرے پر موجود تاثرات کو قصداً نظر انداز کر کے وہ اسی اکٹھے اکٹھے سنجیدہ انداز میں بولا اور نیو ب کا ڈھکن بند کر کے اور اسے کارٹن میں دوبارہ ڈال کر آنسو اسے پکڑا دیا۔

"جلدی ہی ہو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ آئیں کریم اور گریڈ چاکلیٹ سے سج اپنے آنسو کافی کے گلاس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اسی سنجیدہ اور خفا انداز میں اس نے گلاس اٹھا تو کیا مگر اس کا اب اسے بیٹے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ عباد نے چند گھنٹوں میں اپنا گلاس خالی کر دیا تھا۔ وہ دونوں بک اسٹور سے باہر نکل آئے۔ عباد کے ہاتھ میں بک اسٹور سے خریدی کتابوں کے دو شاہنگ بیگز تھے اس کے سامنے تو اس نے ایک ہی کتاب خریدنے کے لیے اٹھائی تھی شاید بے منت کے لیے بیچے جا کر اسے کچھ اور کتابیں بھی اچھی لگ گئی تھیں۔ اسے

سب دے کے ذریعے اپنے گھر اور عباد کو بس کے ذریعے اپنے آفس جانا تھا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے سب دے اسٹیشن تک آگئے تھے۔

"یہ لو۔" عباد نے وہاں پہنچ کر اپنے ہاتھ میں موجود شاہنگ بیگز میں سے ایک اسے پکڑا دیا۔

"کیا ہے اس میں؟" شاہنگ بک اس کے ہاتھ سے لیتے اس نے پوچھا بھی اور ساتھ ہی اندر جھانکا بھی۔ وہ قدیم مصری آرکائیو کچھ پر دی کتاب بھی جو وہ ابھی کچھ دیر پہلے بک اسٹور میں دیکھی اور محبت سے دیکھتی رہی تھی۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری۔

"سنو تم تو مجھ سے ناراض تھے؟"

"ناراض تھا نہیں ناراض ہوں۔" وہ بس اسٹاپ کی طرف جانے کے لیے اس کے پاس سے مڑنے لگا۔

"تمہاری ناراضی ایسی ہوتی ہے تو راضی ہونا کیسا ہوتا ہوگا عباد عزیز؟ جیسے تم ناراض ہو کس بات پر؟ دیر سے آئی اس بات پر یا میں نے اپنا ہاتھ جلا یا اس بات پر؟" وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی۔

"دونوں باتوں پر۔" وہ اس کی مسکراہٹ نظر انداز کرتا سنجیدگی سے بولا۔ وہ بس اسٹاپ کی طرف جانے کے لیے قدم اٹھا رہا تھا۔

"بوشن سے میں تمہیں فون نہیں کروں گا۔ اگلے تین چار دن میں بہت بڑی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں میں کروں گی۔" اس نے پیچھے سے زور سے کہا مگر آواز اس تک واضح پہنچ سکی۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ وہاں مجھے بہت کام ہیں میں ڈسٹرب ہوں گا۔"

مڑے بغیر اس نے آگے چلتے چلتے اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ اسے خدا حافظ کہنے اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے کی اس نے زحمت گوارا نہیں کی تھی وہ بس اسٹاپ کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے بس اسٹاپ کی طرف جانا دیکھتے اس نے شاہنگ بک سے وہ کتاب نکالی۔ اس کتاب کو دیکھتے اس کے ٹائٹل پر ہاتھ پھیرتے اس کے لبوں پر ایک دقربب سی مسکراہٹ تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے کتاب کو کھولا اس کے پہلے صفحے پر خوب صورت پینڈرائٹنگ میں لکھا تھا۔

"لاہور ان کی امیر سے لیے ہی اپنی پروا کر لیا کرو۔ عالی۔"

وہ آنسو اور کتاب سنبھالے سب دے اسٹیشن کی پلٹریاں اتر رہی تھی تو اسے ایسا لگا رہا تھا جیسے وہ زمین پر نہیں آسمان پر چل رہی ہے۔ اسے خود اپنا آپ اتنا اہم اہم خاص لگ رہا تھا۔

\*\*\*

رات وہ اس کی تختے میں دی اس کتاب کو پڑھ رہی تھی جب ڈیڑھ بجے کے قریب اس کا فون آگیا۔ وہ بوشن میں بہت مصروف ہو گا لہذا وہ اسے فون نہیں کرے گا اور وہ بھی اسے ہرگز فون نہ کرے گا حکم صادر کر کے جانے کے بعد وہ اسے پہلی رات ہی فون کر رہا تھا۔

"تمہارا ہاتھ کیسا ہے؟" اس نے ہیلو کے بعد ہی سے اگلی بات یہی پوچھی تھی۔ گویا فون ہوائی اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے تھا۔

"ہاتھ میں بہت تکلیف ہے عالی!" مسکراہٹ لبوں پر درکتے وہ انتہائی سنجیدگی سے بولی۔ وہ اس کی مسکراہٹ کو محسوس نہیں کر سکا تھا اس لیے ایک دم تشویش سے کہنے لگا۔

"تم نے آنسو نہیں لگایا ہوگا مجھے یاقین ہے۔"

اس کے لیے میں کچھ بر بھی رہی اور آئی تھی جیسے اس کی پروا ہی سے ٹھیک آگیا ہو۔

"آنسو نہیں لگایا ڈاکٹر کو بھی دکھایا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا آپ کا ہاتھ تو بہت خطرناک جلا ہے اس کا تو لبا اعلان پتلے کا شاید سر جری کٹی پڑے۔"

"دیر ہی لگی؟" وہ اس کے مذاق پر چڑھ کر بولا۔

"تم میرا معمولی سا ہاتھ جتنے پر اتنا پریشان ہو رہے ہو؟"

اس نے کبھی میں واقعی بیمار جاؤں تو کیا کروں گے؟

"میں تمہیں بیمار کرنے نہیں دوں گا۔" سنجیدگی و خفگی

زک کر کے اس بار وہ مسکراتے انداز میں بولا۔

"تم سب کی اتنی پروا کرتے ہو یا مجھ میں کچھ اسٹش

ہے؟"

"کیا دل چاہ رہا ہے سننے کو؟ کیا مجھ سے پھر یہ کہلانا چاہتی

ہے کہ مجھے تم سے بہت محبت ہے؟"

"کیا حرج ہے پھر سے کہہ دیتے ہیں۔ ایسی بات تو جتنی

دوڑی کہہ دی جائے دل کو اچھی لگتی ہے۔"

"اوکے۔ تو یہ سچا اچھے تم سے بہت محبت ہے اور جن

سے مجھے بہت محبت ہوتی ہے میں انہیں تکلیف میں دیکھ

نہیں سکتا۔"

"اور ان لوگوں میں کون کون شامل ہے۔ میرا مطلب ہے یہ فہرست کتنی طویل ہے؟"

"انتہائی مختصر۔ ماما یا پاپا اور تم۔" وہ اسے اپنے ماں باپ کے بعد اپنی زندگی کا سب سے اہم فرد کہہ رہا تھا اور صرف کہہ نہیں رہا تھا۔ بلکہ اس کا رد عمل اور اس کے رویے اس بات کو ثابت بھی کر رہے تھے۔

"بک بہت اچھی ہے عالی ہاتھ بک ہو۔"

"تمہیں اچھی لگ رہی تھی اسی لیے کی تھی۔"

"مجھے جو چیز اچھی لگا کرے گی خرید کر دیا کرو گے؟"

اس نے شرارت بھرے انداز میں پوچھا۔

"ہاں ہر وہ چیز جو میری دسترس میں ہوگی۔" وہ سنجیدہ اور مستحکم لہجے میں بولا۔

گھڑی کی طرف اچانک اس کی نظر پڑی تو خیال آیا کہ اب گھنگو حق کر دینی چاہیے۔ وہ یقیناً بہت تھکا ہوا بھی ہے اور اسے کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے پھر وہاں اس کی بہت زیادہ مصروفیات ہیں۔ اس نے اس سے یہ بات کہہ دی۔

"نہیں ابھی نہیں۔ ابھی کچھ دیر اور بات کرو۔" اس سے باتیں کرتے کرتے اسے نیند آتی شروع ہو گئی تھی۔

"عالی! مجھے نیند آ رہی ہے۔" جہانیاں روکتے اور بند ہوتی آنکھوں کو کھولتے اس نے اس سے کہا۔

"تو سو جاؤ۔" اس کے اس جواب پر اسے ایک تخت پر احساس ہوا کہ وہ اتنی دیر سے اس کے سونے ہی کا ٹھکانہ تھا۔

وہ سو جانے لگی تب وہ فون بند کرے گا۔ اس کے لبوں پر

بے ساختہ گہری مسکراہٹ گہری۔ بات کتنی رومانٹک تھی

کتنی سوئیٹ سی تھی۔ وہ کتنی کوتاہی سے تو وہ یقین نہ کرے

بلکہ اس کی کوئی بھی دوست یقین نہ کرے۔

"آج ایک بات تو کفر ہو گئی عباد عزیز کہ تم اگر چاہو

تو بھی مجھ سے ناراض ہونا تو کیا ناراض ہونے کی اداکاری

تک نہیں کر سکتے۔" آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے

عباد سے مسکرا کر کہا۔ وہ جواباً اب کیا کہہ رہا تھا اسے

ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ واقعی سونے لگی تھی۔

\*\*\*

"میں وہاں بہت مصروف ہوں گا اور ایک بار بھی فون

نہیں کروں گا۔" کا زبانی اعلان کرنے کے بعد اب وہ اسے



کمال روزانہ کر رہا تھا۔

”آج تم نے میرے ہاتھ کی خیریت تو پوچھی نہیں؟“  
تیسرے روز رات میں جب بات ہوئی تب اس نے عباد  
سے کہا۔ اسے اس کا فکر کرنا اچھا بھی لگتا تھا اور ہنسی بھی  
آتی تھی۔

”اڑالو مذاق۔“

”مذاق نہیں اڑا رہی، تمہیں یاد دلانی ہوں۔“ وہ ہنس

کر بولی۔  
”تمہیں قدری نہیں ہے میری محبت کی۔“ وہ کچھ خفگی  
سے بولا۔

”قدر تو بہت ہے۔ مگر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ تم اتنی  
سی بات برائے پریشان ہو گئے تھے اور اگر کبھی میں زیادہ بیمار  
ہو گئی تو کیا کرو گے؟“

”یار میں کیا کروں۔ I cant help it میں ایسا  
ہی ہوں۔ مما کہتی ہیں عالی اتم پریشان ہو جاتے ہو کہ  
تمہارے ذہن سے اکثر بیماری مجھے چھائی پڑتی ہے۔ مجھے  
بے وقت لیٹا دیکھ لو تو پریشان ہو جاتے ہو مجھے معمولی نزلہ بخار  
ہو جائے تو ٹینشن سر پر سوار کر لیتے ہو، رہتی نہیں کیا کروں  
یار میں ایسا جان کر نہیں رہتا۔ جن تو کون سے مجھے شدید  
محبت ہے میں انہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا، میں  
انہیں معمولی سا بیمار بھی نہیں دیکھ سکتا، لایا کا چند سال پہلے  
ایک سبڈنٹ ہو گیا تھا تب میں ان کے سر ہانے سے ہٹا نہ  
تھا۔ یونیورسٹی دوست پر بھائی زندگی مجھے کچھ اچھا نہ لگتا  
تھا۔ لایا کہتے تھے۔ میں ان جیسے بیمار آدمی کا بیٹا لگتا ہی  
نہیں ہوں۔“

وہ سنجیدگی سے اپنی ایک کمزوری کا جیسے اعتراف کرنے  
لگا۔

”عالی اتم بہت اچھے ہو۔ یو آر سو سوٹ اپنی عمر کے  
دوسرے لڑکوں سے بہت مختلف۔ تمہاری عمر کا کوئی لڑکا  
میں نے تمہارے جیسا نہیں دیکھا۔ اتنا سینسٹو اتنا  
لوگ اور اتنا کٹر تک تمہارے ماما پاپا بہت لگی ہیں کہ ان کا  
تمہارے جیسا چاہئے والا بیٹا ہے۔“  
”اور تم لگی نہیں ہو؟“ اس کی سچائی سے کی تعریف کے  
جواب میں اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”صرف لگی نہیں، میں kukiest گرل ہوں (خوش  
قسم ترین لڑکی) ہوں اس دنیا کی۔“  
”ٹھیک ٹھیک ٹھیکس“ آج کے لیے اتنی تعریفیں

کافی ہیں۔ میں آسمان پر چڑھنے لگا ہوں۔“ وہ ہنس کر بولا۔  
”سنو تم واپس کب آؤ گے؟“ کچھ دیر بعد جب اسے  
خینڈ آنے لگی تھی تب آنکھیں بند کرنے سے پہلے اس نے  
عباد سے پوچھا۔

”ایک دو دن میں ان شاء اللہ۔“

”جلدی آؤ۔ میں تمہیں بہت مرس کر رہی ہوں۔“

”میں لیکن ہم روز تو بات کر رہے ہیں۔“

”روز تمہیں دیکھ تو نہیں رہی۔“

”تم اپنی آنکھیں بند کرو، میں تمہیں تمہارے بالکل  
سامنے نظر آؤں گا۔“

”اس نے آنکھیں بند کیں اور وہ واقعی اسے اپنے  
بالکل سامنے نظر آنے لگا۔ اپنی خوب صورت ڈمپل والی  
مسکراہٹ لیے۔“

”آپا نظر۔“ اس کی آنکھیں بند تھیں اور آہستہ آہستہ  
وہ غنودگی میں بھی جا رہی تھی۔

”ہاں۔“

”یہ میرا بہت آزمایا ہوا اور کامیاب طریقہ ہے۔ ماما لایا  
جب بھی بہت زیادہ یاد آتے ہیں تو میں کسی پرسکون اور  
عاموش جی جگہ جا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا ہوں یا  
لیٹ جاتا ہوں اور وہیں ماما لایا میری نگاہوں کے سامنے  
ہوتے ہیں۔ تمہارے لیے اب تک تو بھی ایسا کیا نہیں تھا“  
مگر آج کل کرنے لگا ہوں۔“

وہ اس سے اسی بات پر بھی کچھ کتا چاہتی تھی پوچھا  
چاہتی تھی مگر خینڈ کے غلبے نے اسے مزید بولنے نہ دیا تھا۔

\*\*\*

Thanks giving کی چھٹیاں آ رہی تھیں اور  
عباد لوٹا نہیں تھا۔ تین چار دنوں کے لیے کیا تھا اور ہو گئے  
تھے سات دن۔ وہ اسے بے تحاشا مرس کر رہی تھی۔ فون  
پر بات روز بوری تھی مگر فون اس کی موجودگی کا اہم البدل تو  
نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس روز تو اس کی عباد سے سرے سے  
بات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ عباد کا فون آیا نہیں تھا اور اس  
نے فون کیا تو ہیل آف ملا تھا۔ اگلے روز ”ٹھیک ٹھیکس  
گیو گے ڈے“ تھا۔

چھٹی کا دن تھا اور وہ رات بھر اسے شدت سے یاد کرتی  
رہی تھی۔ اس کی خیریت کے لیے منتظر بھی ہوئی رہی  
تھی۔ اس کا فون کیوں نہیں آیا تھا۔ آخر ایسی کیا مصروفیت



جتنی تھی جو اس نے اپنا سیل بھی آف کیا ہوا تھا۔ یوشن میں اس کا عباد سے رابطہ اس کے سیل ہی پر ہوتا تھا جس جگہ وہ گھبرا تھا وہاں کا نمبر اس کے پاس نہ تھا اور اب اسے وہ نہ کراہی اس غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہاں کا فون نمبر کیوں نہیں لیا۔  
”یا اللہ! عباد بالکل خیریت سے ہو، وہ وہاں بالکل ٹھیک ہو۔“

پریشان ہوتے اور ساتھ ہی اس کی خیریت کی دعائیں مانگتے صبح چار ساڑھے چار بجے نہیں اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ بہت گہری نیند سو رہی تھی جب سوتے سوتے اسے ایسا لگا جیسے عباد اس کے پاس آیا ہے۔ وہ بہت گہری نیند میں تھی مگر اس احساس نے اس کی نیند کو بل دہل کے لیے توڑا تھا۔ نیند سے بوجھل مندی مندی آنکھیں کھول کر اس نے اپنے ارد گرد دیکھا اس کا کمرہ خالی تھا۔ ملل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئیں۔ وہ پھر سو گئی تھی۔ اس بار وہ پتا نہیں کتنی دیر سو گئی تھی جب اس کی آنکھ کسی کے ہاتھوں سے کھلی اور ہنسنے کی آوازوں سے کھلی۔ ان کے بڑے سے بیٹے ہاتھوں میں وہ زندگی سے بھرپور آواز اور ہنسی اسے مدد ملی اپنے کمرے تک سنائی دے رہی تھی۔  
”عالی!“ وہ یک دم بید پر تھی۔

باتھ روم جانا منہ ہاتھ دھونا لباس تبدیل کرنا بال باندھ لینا ان میں سے کسی ایک بھی بات کا اسے دھیان نہیں آیا تھا۔ ”اس نے کانن کا سفید رنگ کا سلینڈر ڈریس پہن رکھا تھا جس کی قمیص اور نر او زور پر سرخ سرخ رنگ کی خوب ساری اسٹراپز بنی تھیں۔ یہ اس کا فیورٹ سلینڈر سوٹ تھا اور اس میں وہ اپنی عمر سے کہیں چھوٹی بالکل اسکول کی بچی نظر آتی تھی۔ اس کے خوب صورت انداز میں کئے بال اس وقت اس کے شانوں اور ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ آنکھیں ملتی بید سے اٹھ کر سیدھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

باتوں کی آواز اور کچھ پکے کی خوشبو میں کچن سے آری تھیں۔ وہ تقریباً ”بھائی“ ہوئی کچن کی طرف آئی۔ وہ اسے دروازے کے باہر ہی سے نظر آیا تھا۔ کل رات وہ اس کے لیے اتنی فکر مند، اتنی پریشان رہی تھی کہ اس وقت اسے اپنے سامنے موجود دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگتی ہوئی جائے اور اس کے سینے سے لگ جائے۔ مگر وہ جانتی تھی

عباد اس بات کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ وہ دونوں ساتھ کہیں باہر جاتے ان کے ارد گرد دوسرے کھینچ کر کیا کچھ نہیں کر رہے ہوتے تھے اور وہ باتیں کرتے کرتے اگر کبھی اتفاقاً ”عباد“ کا ہاتھ تمام ملتی تو وہ چند منٹوں کے بعد ایسے کہ وہ برا بھی محسوس نہ کرے ملتا ہاتھ اس کے ہاتھ سے الگ کر لیا کرتا تھا۔ اس معاملے میں اتنا زیادہ مشرقی اور شرمیلا قسم کا تھا کہ نہ لوگوں میں نہ اکیلے میں بھی بے وجہ اس کا ہاتھ تک نہ تھامتا تھا۔ خود کو خوشی اور ایک سائنسٹ کے کسی بے ساختہ اظہار سے روکتے وہ کچن کے دروازے ہی پر رک گئی تھی۔

”عالی؟“ عباد اور ماما جانی دونوں کچن میں موجود تھے۔ وہ دونوں کو گنگ رشتہ کے آگے کھڑے کچھ کر رہے تھے۔ کچن سے زبردست قسم کی کھانوں کی خوشبو میں آری تھیں۔ اس کی آواز پر عباد اور ماما جانی دونوں نے گردن گھما کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے چلے کو دیکھ کر عباد کے چہرے پر مسکراہٹ اور ماما جانی کے چہرے پر ناگواری چھلی تھی۔

عباد کو وہ اس سوئے سوئے انداز اچھے بکھرے بالوں اور ڈھیلے ڈھالے پیکانہ سے لباس میں جس میں نہیہ سجاد جیسی دو دو کی پٹی لڑکیاں یا آسانی یا سکتی تھیں بڑی باریک مست سوئٹ اور بڑی گیوٹ تھی تھی جب کہ ماما جانی نے اس کے چلے کو دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ اس فصول طے میں وہ عباد کے سامنے آ رہی ہے کہ کوئی معقول آوی تو ایسی مست ملنگ لڑکی سے شادی سے اس سے ہی انکار کر دے۔

”آئیے نہیہ سجاد۔ آئیے۔“ عباد نے اسی کے گھر میں اس کا خیر مقدم کیا۔

”تم کب آئے؟“  
”جب لوگ ہاتھی گھوڑے سب بچ کر سو رہے تھے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ وہ ماما جانی کے گھورنے کے باوجود کچن کے اندر گئی۔ اپنے بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے۔  
”دیکھیں ماما جانی یہ والی تو میں نے صبح تلی ہے نا؟“

ماما جانی نے پیرا اٹھا کر اسے بیٹے کی تیاری کرتے نظریں اٹھا کر پر زور رکھی کڑھائی کو دیکھا جس میں پوریاں تلی جا رہی تھیں۔ وہ تیل تیل کر پوریاں کڑھائی میں ڈال رہی تھیں اور عباد انہیں پھلتی والے اسٹیل کے جیمچے سے خوب دبا دبا کر تھلے میں مصروف تھا۔

”ہاں یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ پتل والی تھوڑی کم تکی معلوم ہو رہی تھیں۔“ وہ ان دونوں کے بالکل قریب چلی

آئی تھی۔

”نہیہ! پس منہ ہاتھ دھو کو بیٹا!“ ماما جانی نے دانت میٹے بظاہر نرم انداز میں بولی کو مخاطب کیا۔ اپنے گھورنے کا کچھ اثر نہ ہوا دیکھ کر آخر کار انہیں یہ بات بولی ہی پڑ گئی تھی۔ عباد نے پوریاں تیلنا روک کر ایک نظر ماما جانی کو اور پھر ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرارت بھرے تاثرات تھے اور وہ لب بلیج کراہی مسکراہٹ کو دبا رہا تھا۔

”ہاں تب تک میں اور ماما جانی ہمارا آج کا یہ اسٹیش ناشتہ بھی تیار کر چکے ہوں گے۔ حلوہ پوری بمبہ، آٹو کی ترکاری اور کھڑے مسالے کا زبردست اور چٹ پٹا قہر۔“ کسی ریٹورنٹ کے شفٹ کی طرح اس نے اسے مینیبو بتایا۔ صبح صبح اٹھنے کے ساتھ ہی اسے اپنے سامنے دیکھنے کی خوشی حیرت، ایک سائنسٹ ان سب کو ساتھ لیے وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے نماز اور لباس تبدیل کرنے میں سات آٹھ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔ وہ واپس کچن میں آئی اور ان دونوں کے پاس آکر کھڑی ہوئی تو عباد فوراً ”بولا۔“

”یہ مسمان بن کر کھڑے ہونے کی نہیں ہو رہی۔ جلدی جلدی برتن لگاؤ ڈانٹنگ ٹیل پر۔ گیارہ بج گئے ہیں اور اب مجھے اور ماما جانی کو شدید بھوک لگ رہی ہے۔ تمہاری طرح پونے گیارہ بجے سو کر نہیں اٹھے ہیں بلکہ صبح سویرے کے جاگے ہوئے ہیں۔“

نہیہ نے میز پر برتن پھینچے اور ٹیل سیٹ کرنا شروع کر دی تھی جبکہ ماما جانی اور عباد جلدی جلدی پوریاں مل مل کر ہاٹ بوٹ بھرے میں مصروف تھے۔ وہ کھانا اچھا کالیتا ہے یہ نہیہ کو بتاتا تھا۔ عباد نے خود ہی اسے بتایا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کا کھانسی کا ہنر صبح منٹوں میں تو امریکہ آکر نکھرا ہے یہاں آکر اکیلے رہنا پڑا اور سب کام خود کرنے پڑے تو کھانا پکانا اور بھی اچھا آگیا مگر امریکہ آنے سے پہلے وہ پاکستان میں بھی بلی پھنکی کھانسی شوقہ کرایا کرتا تھا۔ وہ صرف کھانے کا نہیں پکانے کا بھی شوقین تھا۔ وہ جب کراچی میں تھا تو اکثر اپنے ممانیا کو اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنا کر کھاتا تھا۔ وہ نیویارک آنے سے پہلے اپنی ماما سے ڈھیر ساری دیسی میسرز ایک ڈائری میں نوٹ کر ڈال لایا تھا۔ وہ اپنی ماما کی ریسی پیسر کو مڑائی کر کتاب خاصا اچھا لک بن گیا تھا۔

”روزانہ نہ باہر کا کھانا کھا سکتے ہیں جبکہ حلال حرام کا بھی

مسئلہ ہے اور نہ ہی روز ہمیں کوئی کھانے پر بلا سکتا ہے تو بہتر یہی ہے خود پکانا سیکھ لیا جائے۔“

اکثر رات میں بات ہونے پر جب عباد سے پوچھتی کہ آج رات کے کھانے میں اس نے کیا کھایا تو وہ اپنے کچھ نہ کچھ پکانے کا ذکر کرتے اس سے یہ بات کہتا تھا۔ کئی مرتبہ بات کرتے ایسا ہوا کہ مگنٹو کے درمیان عباد اسے ہولڈ کر ڈال کر جاتا۔

”میں ذرا سبزی میں بچھ چلا آؤں یا میں ذرا وال میں گھما لگا آؤں۔“

لنڈا رہا ہے اتنی مہارت سے کھانا پکاتے دیکھ کر حیران نہیں ہو رہی تھی مگر ماما جانی کو شاید یہ بات آج پہلی بار پتا چلی تھی اس لیے خوش ہونے کے ساتھ تھوڑی حیران بھی تھیں۔ حیرانی اس کی مہارت پر بھی دور نہ بڑھنے کے لیے باہر آئے لڑکے جب سر پر ڈیڑھی سے تو مارے باندھے کچن کا رخ کرتے ہی ہیں۔ اپنا کھانا بھی خود پکاتے ہی ہیں۔

ناشتا سارا لگ چکا تھا اور وہ لوگ ڈانٹنگ ٹیل پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ اسے حلوہ پوری اتنی زیادہ پسند نہیں تھی جتنی عباد اور ماما جانی کو۔ وہ دونوں تو خوب مزے لے لے کر تمام چیزیں کھا رہے تھے۔ جبکہ وہ سدا کی ڈانٹ کو شنس یہ سوچ رہی تھی کہ ڈھیر سارے کچن میں کئی یہ پوریاں اور اصلی کھی اور مکھن اور پتا نہیں کیا کیا ڈال کر بنا لیا سوچی کا حلوہ کھا کر اس کا وزن کما لیں گے۔

”نہیں ہو رہی تم مولی بڑھک سے کھاؤ۔“ عباد نے اس کی پلیٹ میں ایک پوری مزید ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ دیکھو عباد میرے لیے لایا ہے۔“ ماما جانی نے سامنے صوفے پر رکھا ایک شانگ بیگ اسے اشارے سے دکھایا۔ وہ ایکسائینڈ سی اٹھ کر کھنی اور شانگ بیگ اٹھا کر دیکھا۔ اس میں ماما جانی کے لیے ایک اسکارف تھا پرنوم تھا اور سوئس چاکلیٹس کا ایک پورا ڈبہ تھا۔ وہ ان چیزوں کو دیکھ کر مسکرائی۔ وہ ماما جانی کی پسند کے عین مطابق چیزیں ان کے لیے لے کر آیا تھا۔

”تم آئے کب تھے؟“ وہ واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آج صبح مجھے جے میں نیویارک پہنچا ہوں۔ گھر سامان رکھا تمہارا کمرے بدلے تھوڑی دیر وقت گزرنے کا انتظار کیا۔ چھٹی کا یہ دن میرا اکیلے گزارنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں راستے میں یہی سوچتا ہوا آیا تھا کہ تم لوگوں کے ہاں آجاؤں گا۔ جب آٹھ بجنے لگے تب میں نے سوچا



تم اٹھی ہو نہ اٹھی ہو، ماما جانی تو اب تک ضرور اٹھ چکی ہوں گی تو پھر بس فوراً یہاں چلا آیا۔ تم سو رہی تھیں اور میں اور ماما جانی پور ہو رہے تھے تو میں نے ان سے کہا۔ چلیں ہم کچھ پکا لیتے ہیں۔ اب thanks giving کا تھوڑی سی کہ ہم ٹرکی بنانے کھڑے ہوں۔ ہم تو اپنے دیکھی کھانے بنائیں گے۔

عبادت کے لیے فصل جواب دیا۔

”ناشتہ ہو گیا ہے ختم۔ اب میرا آج کے دن کا پروگرام سن لیں آپ لوگ۔ ہم تینوں آج کا یہ پورا دن ہمیں باہر کھوٹے پھرتے گزاریں گے۔ اور ماما جانی! آپ بالکل بھی منع نہیں کریں گی۔ آپ کو اکیلا چھوڑ کر میں اور بیہ کیس نہیں جائیں گے۔“

ماما جانی کے انکار کے لیے کھلتے لب دیکھتے ہی عبادت نے فوراً کہا تھا۔

”آپ جلدی سے تیار ہو کر آجائیں۔ بیہ تو میرا خیال ہے تیار ہی ہے۔“

انہیں ساتھ لے جانے پر زبردستی آمادہ کر لینے کے بعد اس نے ان سے کہا۔ وہ ان کا اتنا فورٹ تھا کہ وہ اسے ناراض کر نہیں سکتی تھیں سو تیار ہونے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اب ڈانٹنگ ٹیمبل پر وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ماما جانی کے سامنے اس سے اس طرح بات نہیں کر پاری تھی جیسے کرنا چاہتی تھی اگرچہ کہ بیٹھی ہوئی تو اس کی براہ روی کر رہی تھی۔

ان کے چلے جانے کے بعد اس نے عباد کو بغور دیکھا۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”کیسی ہو؟“

”تم نے کل فون کیوں نہیں کیا میں اتنی پریشان ہو رہی تھی۔ اوپر سے سیل بھی آف۔“ اس کی خیریت کا جواب دیتے بغیر اس نے پوچھا۔

”میں نے سوچا جب صبح یہاں پہنچ رہا ہوں تو فون کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے پتا ہے کل ہی پروگرام بنایا تھا کہ آتے ہی صبح تمہارے ہاں پہنچ جاؤں گا۔“ وہ خوشگوار لہجے میں اسے بتا رہا تھا مگر وہ یک دم ہی برہی سے ہوئی۔

”واہ ایہ اچھا ہے۔ تم نے وہاں بیٹھے خود ہی سب کچھ سوچ لیا، فیصلہ کر لیا اور میں جو یہاں ساری رات پریشان ہوئی رہی ہوں۔“

”پریشان؟ لیکن کیوں؟ میرا فون نہیں آیا اس بات پر۔“ وہ اس کی حیرانی پر مزید چڑھی۔

”جی اسی معمولی بات پر۔ خون خشک ہو گیا میرا پریشان ہو ہو کر۔ دل میں اتنے بے بے خیال آ رہے تھے۔ خود فون نہیں کیا تو نہیں کیا، آخر سیل کس خوشی میں آف رکھا ہوا تھا۔“ وہ اس بار حیران ہونے کے بجائے مسکرایا تھا۔

”تمہارے اس طرح ٹوٹنے سے پتا ہے کیا لگ رہا ہے؟ ایسا لگ رہا ہے ہماری شادی کو دس پندرہ سال تو ضرور ہو چکے ہیں۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا مگر وہ منہ پھلائے اسے گھور رہی تھی۔

”لوگ۔ غلطی میری ہے، مجھے فون کر دینا چاہیے تھا۔ پر مائی ڈیئر مس بیہ سچا اچھے یہ پتا نہیں تھا کہ آپ میرے فون نہ کرنے سے پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

”ہاں۔ پریشان ہونے کا سارا حق تو بس صرف تمہیں ہے۔ میرا ذرا سہا تھا جلا تھا تو خود نے اس قدر دوا دیا تھا اور میں دوسرے شہر گئے ایک بندے کے لیے جس کی کوئی خیر خبر کوئی اطلاع مجھ تک نہیں پہنچ رہی پریشان ہوں تو میرا مذاق اڑایا جائے گا۔“

عبادت نے بات کو کوئی ایسی نہیں کہی تھی جس پر وہ دہریے مگر بولتے بولتے ایک دم ہی اس کی آنکھیں ڈنڈا کی تھیں ”آواز بھی بھرائی تھی۔“

”ارے ارے۔ اچھا میری غلطی ہے۔ آتم سوری۔ آتم ایک شرمیلی سوری۔“ وہ ہری طرح ہونٹ لٹکایا تھا۔

”رونا مت، ڈیکھو پلیر رونا مت۔ تم اپنے اسٹرابرز والے سلینگ ڈریس میں بغیر منہ دھوئے اچھی لگ سکتی ہو مگر روتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگو گی۔“

وہ شرارت بھرے لہجے میں بولتا اسے ہنسانا چاہتا تھا مگر وہ بجائے ہنسنے کے رو رہی تھی۔

”کل تمہارا فون نہیں آیا تو میں پریشان ہو گئی تھی۔ میں تمہارے لیے بہت پریشان ہو گئی ماما جانی! مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ تم جہاں بھی ہو میں نے تم سے وہاں کا نمبر نہیں لیا۔“

”آتم سوری۔“ اس بار وہ سنجیدگی سے معذرت کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ شرارت تھی نہ ہنسی۔ اس نے اسے روکنے سے بھی منع نہیں کیا تھا اسے خود ہی ایک دو منٹ بعد جب دل ڈر لگا ہوتا محسوس ہوا تو یہ احساس ہوا تھا کہ عباد کا مذاق اڑاتے اڑاتے وہ خود بھی اسی

جیسی ہوتی جا رہی ہے۔ ایک دن اس کا فون نہ آنے کی اس کی اتنی معمولی سی بات کو الٹو ہٹا کے اس پر آنسوؤں کے دریا بہائے جائیں گے۔

”سوری۔ میں نے کچھ اور ری ایکٹ کیا ہے۔“ اس کے کندھے پر سے سر اٹھا کر شرمندہ سی آواز میں اس نے کہا۔

”لگتا ہے میں بھی تمہارے جیسی ہوتی جا رہی ہوں۔“ وہ نظریں جھکائے شرمندہ آواز میں کہہ رہی تھی۔

”تم میرا ہاتھ جلتے پر پریشان ہو رہے تھے بو سنیں فون کر کے میری خیریت پوچھ رہے تھے تو میں تم پر ہنس رہی تھی اور اب حریف خود بھی دیکھ رہی ہوں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے ناں، ہنی اذرا سوچو ہماری لائف کتنی انٹرٹیننگ ہو گئی تم میرے لیے پریشان ہوا کرنا میں تمہارے لیے پریشان ہوا کروں گا۔ بس ماما جانی کے لیے تھوڑی مشکل ہو جائے گی، پہلے صرف بیٹے کا بات بات پر پریشان ہونا اور ٹینشن لینا بڑا شٹ کیا کرتے تھے اب خیر سے بو بھی ایسی ہی مل جائے گی تو سونے پہ سہاگا ہو جائے گا۔“

”میں تمہیں بہت مس کر رہی تھی، تین چار دنوں کا کہہ کر گئے تھے اور سات دن لگا دیے۔ اوپر سے کل جب تمہارا فون نہیں آیا تو میرا دل اتنا پریشان ہونے لگا تھا اتنا گھبرا رہا تھا۔“

”ہم زبانی دعوائیں کرتے کہ تمہیں مس کر رہے تھے۔ ہم تو جناب ثبوت ہم پہنچانے صبح آتے کے ساتھ ہی خود بخود نفیس آپ کے گھر پہنچ گئے ہیں، اس وقت جب ابھی محترمہ خواب غفلت سے بیدار بھی نہ ہوئی تھیں۔“

”تم نے اگر مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟“ وہ سوالیہ لگا ہوں سے اس کے منہم پرچے کو دیکھ رہی تھی۔

”میں آتے ہی ماما جانی سے سلام دعا کے بعد تمہارے کمرے میں آیا تھا، مگر تم اتنی گہری نیند سو رہی تھیں، میرا تمہیں جگانے کو دل نہیں چاہا۔ میں نے سوچا چلو محترمہ کو کچھ دیر اور سوئے دیتے ہیں۔“

وہ عباد کے اس جواب پر حیران رہ گئی تھی۔ اسے صبح کسی وقت کی اپنی وہ کیفیت، وہ احساس یک دم یاد آیا تھا جب گہری نیند میں اسے اپنے قریب عباد کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ ”تم میرے کمرے میں آئے تھے؟“ واقعی؟

”ہاں۔ اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے۔ بس دروازے سے ذرا سانس اندر آیا تھا، ایک آدھ سیکنڈ وہاں رک کر یہ فیصلہ کرنا رہا کہ تمہیں اٹھا دوں یا سو رہے ہوں۔ ایک دل چاہ رہا تھا فوراً اٹھا کر بٹھا دوں اور دیکھوں مجھے اچانک سامنے دیکھ کر تم کیسے ری ایکٹ کرو گی اور ایک دل تمہیں اتنی گہری نیند سے اٹھانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔“

اس نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔

”میں تمہیں ایک بہت عجیب سی بات بتاؤں عالی؟ تم یقین نہیں کرو گے، مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا ابھی تک۔ آج صبح مجھے وقت نہیں پتا مگر گہری نیند میں مجھے ایسا لگا تھا جیسے تم آئے ہو۔ میں اتنی گہری نیند سو رہی تھی اور اسی نیند میں مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ تم میرے قریب نہیں موجود ہو۔ میری آنکھ کھل گئی تھی عالی! سنو کیا تم نے مجھے آواز دی تھی، کیا کمرے میں کوئی شور ہوا تھا، کیا تم نے مجھے ہلا کر یا آواز دے کر اٹھانے کی کوشش کی تھی؟“ عباد بھی اسے حیرت ہی سے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔ میں تو تمہیں اتنی گہری نیند میں دیکھ کر دروازے سے بس ذرا سانس اندر آیا تھا اور پھر وہیں سے پلٹ گیا تھا۔ اب میرے خدا یا ہنی! لگتا ہے تمہیں مجھ سے واقعی جی محبت ہو گئی ہے۔“ جیلے کا آغاز سنجیدگی سے کرنے کے بعد وہ اختتام پر پھر اپنے انداز پر لوٹ گیا تھا۔

”بد تمیزی مت کرو۔“ شرمائے درسانے کے شوق میں ہرگز جھٹکا نہ ہونے کے باوجود وہ کچھ بھیجھپ گئی تھی۔ اس لیے فوراً بات بدلتے ہوئے اس سے ہوئی۔

”تم میرے لیے کچھ نہیں لائے؟“

”میں عباد عذر پورا کا پورا حمایت سالم جو تمہارے لیے آگیا ہوں۔ اتنے شان دار تحفے کے بعد کسی اور تحفے کی ضرورت ہے؟“

”باتیں بنانے کی نہیں ہو رہی ہے، کچھ نہیں لائے تو صاف صاف بتا دو نہیں لایا، فضول میں یہ ڈالیں لڑکیوں بول رہے ہو۔“

وہ کرسی پر سے اٹھ گئی تھی۔ ماما جانی تیار ہو کر آنے والی ہوں گی وہ ان کے آنے سے قبل ناشتے کی میز سمیٹ دیتا چاہتی تھی۔

وہ پورا دن ان تینوں نے ایک ساتھ گزارا تھا۔ چھٹی کا دن تھا، شہوار کا موقع تھا اس لیے باہر ہر طرف خوب



گہما گہمی تھی۔ باہر سردی خوب تھی۔ نو مہر کے مینے میں اتنی شدید ٹھنڈ تھی، لگتا تھا اس سال نیویارک میں سردیاں ہر مرتبہ سے زیادہ شدید آنے والی تھیں۔ وہ لوگ عبادی گاڑی ہی میں ٹھونسنے لگے ہوئے تھے۔ شام سات بجے عباد نے انہیں ان کے پارمنٹ ڈراپ کیا تھا۔

”لو تمہارے لیے۔“  
عباد کو خدا حافظ کہہ کر وہ اور ماما جانی گاڑی سے اتریں تب عباد نے ایک شاپنگ بیگ گاڑی کی ڈکی سے نکال کر اسے پکڑ لیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے وہ شاپنگ بیگ اس سے لے لیا۔ اسے پہلے ہی بتا تھا وہ نوئی بول رہا ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ عباد عذر بنیہ سجاد کے لیے کچھ لیے بغیر نوئی خالی ہاتھ آیا ہو۔ وہ ایک ویل آف ٹیلی سے تعلق رکھتی تھی۔ نیویارک کے جس علاقے میں جس پر آسائش اور شان دار پینٹ ہاؤس میں وہ اور ماما جانی رہ رہی تھیں اسے دیکھ کر ہی کوئی بھی ان کی مالی پوزیشن کا ایک لمحے میں اندازہ لگا سکتا تھا۔

اس کے پاپا نیویارک میں ایک کامیاب لائبریرے تھے ایک مسٹر فرم میں پارٹنر رہے تھے اور وہ اس کے اور ماما جانی کے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئے تھے کہ اگر وہ پڑھائی ختم ہونے کے بعد کوئی جاب نہ بھی کرتی تب بھی بڑی اچھی زندگی گزار سکتی تھی۔ جب اللہ نے محاشی اقتدار سے اسے یہ خوش حالی دی ہوئی تھی تو وہ جب چاہتی اور جہاں سے چاہتی اپنے لیے کچھ بھی خرید سکتی تھی مگر خود خریدی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں اسے عباد کی تحفے میں دی اشیاء زیادہ پیاری لگ کر رہی تھیں۔ جو کتاب عباد نے اسے خرید کر دی تھی چاہتی تو وہ خود بھی کھڑے کھڑے خرید سکتی تھی مگر عباد کے خرید کر دینے سے وہ کتاب انمول ہو گئی تھی بہت خاص بہت اہم اور بہت پیاری ہو گئی تھی۔

عباد کے سامنے اس نے تھینک یو کہتے صرف شاپنگ بیگ کے اندر ڈرا سا جھانکا تھا اس میں کچھ کپڑوں ٹائپ کی چیز نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے تسلی سے اوپر جا کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اوپر آ کر دیکھا تو وہ ایک ماڈرن اسٹائل کا پاکستانی لباس تھا۔ ڈراک گرین ٹراؤزر لائٹ گرین اوپن سی قمیص اور لائٹ گرین وینٹہ فیض اور وینٹہ پروڈرک گرین رنگ کے دھاگوں سے بڑی قمیص کڑھائی ہوئی ہوئی تھی۔

اس کے پاس اس طرح کے جدید انداز و فیشن کے چند

پاکستانی ملبوسات تھے جنہیں وہ عید بقرعید وغیرہ پر یا میل تحفیم پاکستانی کمیونٹی کا کوئی فنکشن وغیرہ ہوتا تو اس میں پہن جایا کرتی تھی مگر اتفاق سے اس نے ابھی تک کبھی عباد کے سامنے پاکستانی ڈریس نہیں پہنا تھا۔ عباد اس کے لیے یہ کپڑے لایا تھا یعنی وہ اسے اس لباس میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے پاکستانی ملبوسات میں کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی پھر نیو یارک کی شدید سردی میں پاکستانی لباس پہننا تھا بھی دل گرے کا کام مگر اب وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اس طرح کے کپڑے پہننے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔ ہر وقت نہ سہی تو کم از کم جب عباد سے ملتی ہے تب تو ضرور اسی طرح کے لباس پہننے چاہئیں جن میں وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔

\*\*\*

”آخر یہ میری ہونے والی بھالی صاحبہ کب تشریف لائیں گی؟“  
اس کے ساتھ کچن میں موجود عدیل نے نجانے کون سی ویس دفعہ یہ بات کہی۔ عباد میکرو وی لیاں رہا تھا جبکہ عدیل کچن میں رہی میز پر چڑھ کر بیٹھا سوائے باتوں کے کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ عدیل سفیان اس کا سب سے قریبی سب سے خاص اور اچھین کا دوست تھا۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی وہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ ان دونوں میں اتنی دوستی تھی کہ ان دونوں کی فیملیز بھی اس دوستی کے سبب ایک دوسرے کے قریب آ گئی تھیں۔ عدیل عباد کے ماما پاپا سے اور عباد عدیل کے والدین اور بھائی بہنوں سے بہت بے تکلف تھا۔ وہ دونوں دوست ایک دوسرے کے گھر بے تکلف جایا کرتے تھے۔ ان دونوں نے این ای ڈی سے ایک ساتھ انجینئرنگ کی تھی فرق صرف یہ ہوا تھا کہ عباد نے سول اور عدیل نے میکینیکل انجینئرنگ کی تھی۔ ایک ہی ساتھ پاس کوٹ کر کے وہ دونوں اپنے اپنے متعلقہ شعبوں میں ایم ایس کرنے آگے پیچھے ہی امریکہ آ گئے تھے۔

عدیل بوٹن میں مقیم تھا۔ وہ وہاں بوٹن یونیورسٹی سے ایم ایس کر رہا تھا۔ امریکہ میں الگ الگ جگہوں پر رہنے کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع نکال ہی لیا کرتے تھے۔ پچھلے دنوں جو وہ اپنی ریسرچ کے حوالے سے بوٹن گیا تھا تب عدیل ہی کے پاس ٹھہرا تھا۔ ماما پاپا سے پہلے وہ بنیہ کے بارے میں اپنے کسی بھی

جاننے والے کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا، ملوانے کا تو ذکر ہی کیا تھا۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ جب وہ بوٹن اس کے پاس جا کر ٹھہرا تو عدیل جیسا کایاں اور چالاک اسے اتنی عقیدت اور محبت سے ٹھنڈوں کے حساب سے فون کے ساتھ مصروف دیکھ کر فوراً ”کسی گزیو کے آٹھار ہٹا دیا گیا۔ پھر تو جب تک اس نے اس سے ساری بات اگلوانے کی چین سے نہ بیٹھا۔ اور اب جب وہ تین چار روز کے لیے کسی انڈیشن میں شرکت کے لیے نیویارک آیا ہوا تھا اور عباد ہی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تب عباد کے پیچھے بڑگیا تھا کہ اسے بنیہ سے ملوایا جائے۔ تب عباد نے اس ہٹنے کی شام بنیہ کو کھانے پر انوائٹ کر دی لیا تھا۔ ان دنوں اس کی اپنی پڑھائی کی مصروفیات کافی بڑھی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ گھر پر کھانے وکانے کا جھجھٹ پانے کے بجائے میزبانی کے فرائض نبھانا عدیل کو کہیں نہ کہیں باہر لے جا کر کھانا کھلایا کرتا تھا۔

آج کی یہ دعوت خاص عدیل ہی کے اصرار پر گھر پر ہو رہی تھی۔ وہ عباد کے باہر لے جا کر کھانا کھلانے کو اچھی میزبانی ماننے ہی سے انکاری تھا۔

”امریکہ اگر تیرا خون سفید ہو گیا ہے۔ میرے پاس آیا تھا تو میں کیسا چمچے مزے مزے کے کھانے لگا کر کھانا کھاتا اور تو شرم کر عباد عذر ا شرم کر۔“  
”الک بات کہ طعنے دیتا اپنے کھانے جن مزے مزے کے کھانوں کا وہ ذکر کر رہا تھا“ وہ عباد کا دل ہی جانتا تھا کس طرح کے ہوتے تھے۔ عدیل سفیان انجینئر اچھا بے شک تھا مگر کک انتہائی برا“ خیر اس کے طعنوں، تشنوں سے تنگ آ کر عباد نے آج کی اس زبردستی کی دعوت کا اہتمام کیا تھا جس کے مہمان عدیل سفیان اور بنیہ سجاد تھے۔ وہ ابھی عدیل کو کوئی جواب دے نہیں پایا تھا کہ دروازے پر رینگ ہوئی۔ ”بنیہ آگئی۔“ وہ دروازہ کھولنے کے لیے جانا چاہتا تھا کہ عدیل جھٹ میز پر سے اتر اور اسے روک کر بولا۔

”دروازہ میں کھول دوں گا۔ تم کھانا پکاو۔“  
اس کے گھورنے کو نظر انداز کرنا عدیل دروازہ کھولنے چلا گیا تھا۔ اس کے کچن سے پارمنٹ کا تین دروازہ نظر آتا تھا وہ گردن ترچھی کر کے اس طرف دیکھنے لگا۔ عدیل نے دروازہ کھول دیا تھا اور بنیہ کے کچھ کھنے سے عملی گرم جوشی سے بولا تھا۔

”السلام علیکم۔ میں عدیل سفیان ہوں، عباد کے بچپن کا

دوست اور آپ یقیناً ”بنیہ سجاد ہیں۔“  
عدیل نے بنیہ کے ہاتھ سے اس کی چھتری لے لی تھی اور اسے دروازے کے ساتھ ہی موجود چھڑیاں ٹانگنے کی جگہ پر بٹکا دیا تھا۔

”آئیے ناں“ آپ اندر آئیے۔ بڑی خوشی ہو رہی ہے مجھے آپ سے مل کر۔“  
آج باہر سردی تو شدید تھی ہی ساتھ تیز بارش بھی ہو رہی تھی بنیہ نے (اور کوٹ) گلوڑ سب کچھ پہن رکھا تھا پھر بھی اس کا چہرہ سردی کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس بے تکلفی سے ملنے عباد کے دوست کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔“ بنیہ نے گلوڑ اتارتے ہوئے عدیل سے کہا وہ دونوں ساتھ ملے اب کچن ہی کی طرف آ رہے تھے عباد بنیہ کو دیکھ رہا تھا مگر بنیہ جب تک ٹھوڑا آگے نہ بیٹھ آئی اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔

”ویسے آپ جاہن تو مجھے تم کہہ سکتی ہیں۔ عباد آپ کا بھی دوست ہے اور میرا بھی اور دوست کا دوست دوست ہی ہوتا ہے۔“

بنیہ کو شاید وہ اس طرح ایک سکینڈ کے اندر اندر اس درجہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرنا اچھا لگ رہا تھا تب ہی تو وہ مسکرا رہی تھی۔

”اؤکے“ میرے ابھی ابھی بنے دوست عدیل سفیان آیا کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ عباد کہاں ہے؟“  
”وہ کھو پڑے ہم دونوں کے لیے کھانا پکا رہا ہے۔ لاؤ یہ کوٹ میں ہنگ کر دوں۔“  
بنیہ نے گلوڑ کے بعد اپنا اور کوٹ بھی اتار لیا تھا۔ وہ اپنا کوٹ اور گلوڑ کہیں رکھنا چاہتی تھی کہ سدا کے کام چور عدیل سفیان نے بڑی شائستگی اور مینڈر کا عقیم الشان مظاہرہ کرتے اپنی خدمات پیش کیں۔

”کینہ نہ ہو تو۔“ شام سے مجال تھی جو وہ بس سے مس بھی ہوا ہو اس کی ذرا سی بھی مدد کرائی ہو اور اب کیے اپنی خدمات آفری جاری تھیں جیسے بنیہ خود تو اپنا اور کوٹ کہیں رکھ نہیں سکتی تھی۔ عدیل کو کایاں دے کر فارغ ہوا تو اب اس نے بھرپور اور تفصیلی نگاہ ڈالی تھی بنیہ پر۔ اس نے سبز رنگ کا وہی ڈریس پہن رکھا تھا جو وہ ابھی بوٹن سے اس کے لیے لے کر آیا تھا۔



اسے بے اختیار ہنہ پر شدت سے پار آیا۔ اس نے بوشن میں ایک پاکستانی بوتیک سے اس کے لیے یہ ڈریس خریدی تھا، بوشن اس کا دل چاہا تھا وہ اپنے ہاں کے کپڑوں میں اسے دیکھے۔ بنیہ لباس بڑا باوقار قسم کا پنا کرتی تھی۔ پہنتی بے شک وہ جینز 'ٹراؤزر' شٹل اور لاگ اسکرٹس بھی مگر اس کا لباس باوقار ہوتا تھا اس میں نہ بے حیائی ہوتی تھی نہ جسم کی کسی بھی انداز سے نمائش۔ بلکہ زیادہ تر وہ پینٹ شرٹ کے اوپر اتنے ڈھیلے ڈھیلے اور بے سوز پنا کرتی تھی کہ دیکھنے والے یہ تک نہیں جان سکتے تھے کہ اس لڑکی کا فکس کیا ہے وہ کسی دلی، گنتی اسارت یا کتنے قصاب سراپے کی مالک ہے۔

اسے بنیہ سے محبت پہلے ہو گئی تھی اور اس کی خوبیاں اور اچھائیاں بہت بعد میں جا کر رہا چلی گئیں۔ جب وہ بنیہ سجاد کے لیے بے اختیار اور بے بس کر دینے والی محبت میں مبتلا ہوا تو یہ تک نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی کی نیچر اور مزاج کیسا ہے وہ کس کردار کی حامل ہے۔ پاکستانی اور بچن رتھی تھی یہ وہ ایک امریکن لڑکی تھی اور یہاں اس نے صرف پاکستانی ہی کیا دوسرے اسلامی ملکوں سے تعلق رکھتی مسلمان لڑکیوں کو ہر وہ عمل کرتے دیکھا تھا جو خالص اور اصلی امریکن لڑکیاں کرتی نظر آتی تھیں۔ جس معاشرے میں چندہ سولہ سال کی لڑکیوں میں کنواری لڑکیاں تلاش کرنا کارِ محال ہو رہا تھا وہ ایک امریکن لڑکی سے جو مسلمان بے شک تھی، محبت کر بیٹھا تھا اور جانتا نہیں تھا اس لڑکی کی زندگی کیسی ہے اس کی آمد سے قبل اس لڑکی کی زندگی میں کون کون آیا ہے۔ مگر ابھی اس کی بنیہ سجاد سے دوستی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی وہ صرف دور دور سے ہی اسے دیکھا کرتا تھا جب اسے یہ خوشگوار احساس ہوا تھا کہ جس سے وہ بے اختیارانہ محبت میں مبتلا ہوا ہے وہ ایسی لڑکی ہے جسے وہ خیریت اپنے ماں باپ سے لے جا کر ملوا سکتا ہے۔

جب وہ پہلی مرتبہ بنیہ کو اپنے لپار ٹمٹ لایا تھا اور وہ اندر آنے سے انکار کر رہی تھی تب پوری طور پر اسے بنیہ کا ایسا کرنا اپنے سچے اور خالص جذبات کی توہن لگا تھا مگر کچھ ہی دنوں بعد جب وہ بنیہ کو پر پوز بھی کر چکا تھا اور وہ اس کا پر پوز قبول بھی کر چکی تھی اس نے اس بات کو دوبارہ سوچا تو اسے بنیہ سجاد پر پیار آنے کے ساتھ ساتھ اس پر فخر بھی محسوس ہوا تھا۔ وہ کتنے مضبوط کتنے اعلا کردار کی لڑکی تھی۔

وہ آج اس کے لیے صرف اسے خوشی دینے کے لیے یہ لباس پہن کر آئی تھی اسے اس پر نوٹ کر رہا تھا۔ اتنی سخت ٹھنڈ میں اس نے یہ لباس اس کی خاطر پہنا تھا۔ وہ والمانہ نگاہوں سے اسے سر نہاؤں دیکھ رہا تھا۔ اس نے قیص کے اوپر بزرگ ہی کا سوشلزم رکھا تھا۔ میک اپ اور چوڑی سے وہ ہمیشہ کوسوں دور رہتی تھی پر آج وہ دیکھ رہا تھا کہ اس نے میک اپ بھی کر رکھا تھا اور زیور بھی پہنا ہوا تھا۔ دوپٹہ اوڑھنے کی اسے بالکل بھی عادت نہیں تھی مگر اس وقت اس نے شانوں پر اسی سوٹ کا پلے بزرگ کا دوپٹہ لیا ہوا تھا۔

دوپٹہ سنبھال کر سچ سچ چلتی وہ اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ بنیہ اور عدیل بچن کے قریب آ گئے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر ہر پورا انداز میں مسکرائی تھی۔

"کتنے ہو عالی؟" وہ دونوں بچن میں آ گئے تھے۔

"ٹھیک۔ بارش بہت تیز ہو رہی ہے تم آرام سے بیٹھ گئیں۔" وہ ایک ٹک اسے دیکھتا اس سے مخاطب تھا۔

جب سے وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اس نے ایک پل کے لیے بھی اس پر سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

عدیل جو اسے بغور دیکھ رہا تھا اس نے بلاوجہ کھنکھار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

"چلو بنیہ ابھی کھانا تیار ہونے میں تو وقت ہے جب تک عالی کھانا تیار کر رہا ہے اسے میں ہم اندر چل کر کچھ گپ شپ کر لیتے ہیں۔" عدیل بنیہ سے بولا۔ وہ جیسے کوئی ٹک یا شیفت تھا اس نے خار بھری نگاہوں سے عدیل کو گھور لیا۔

"میرا خیال ہے باتیں ہمیں کر لیتے ہیں۔ عدیل اساتھ ساتھ عالی کی ہیلپ بھی کراؤں گے۔" بنیہ ان دونوں دوستوں کے سچ کی بے تحاشا بے تکلفی سے آگاہ تھی نہ عدیل کی عادات سے نہ وہ ایسا عالی کے چرانے اور تنگ کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ اسے یہ بھی نہیں پتا تھا وہ تو بس سچی جگہ سے جواب دہی بولی تھی اور پھر اس کے قریب آئی تھی۔

"لاؤ عالی! میں ہیلپ کراؤں کیا کام رہ گیا ہے؟" وہ بچن کے کاموں سے کوسوں دور رہنے والی لڑکی تھی مگر اسے ہاتھ بچن کا رخ کرنے والی اور اس وقت پوری طرح کام کرنے کے موڈ میں اس کی مدد کرانے کے موڈ میں۔

"میں کراؤں گا تم ابھی اتنی ہو کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔" "تو میں کیا بدل چل کر آئی ہوں۔ سلاہ بنی ہے کیا؟" اس نے بولتے بولتے میز پر رکھی سبز پوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ عدیل خاموش کھڑا ایک نظر اسے دیکھ رہا تھا ایک نظر بنیہ کو اسے اس کی ہونٹ اور حیرت بھری شکل دیکھ کر ہار مزا آ رہا تھا۔ امریکہ ہی میں یہ اہوئی اور بی بی جی لڑکی سن کر یہ نہیں اس نے بنیہ کے متعلق کیا خاکہ اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا اور وہ ملاقات کے اولین لمحوں ہی میں اتنی زیادہ مشرقی ثابت ہو رہی تھی۔

اس کے منع کرنے کے باوجود بنیہ سلاہ کے لیے سبزیاں کاٹنے لگی تھی۔ جتنی دیر میں اس نے میکینو تیار کی بنیہ نے سلاہ بتائی اس کے بعد اس نے چکن لیگ ڈسپ فرائی کرنے میں عباد کی مدد کرائی تھی۔ کام چوروں اور

بے شرمیوں کی طرح ہاتھ پہنچا دھر کر بیٹھے عدیل سفیان کو بھی آخر کار شرم آئی تھی اور اس نے میز پر برتن لگانے شروع کر دیے تھے۔ اس سارے عمل کے دوران عدیل اور بنیہ کی آپس میں بات چیت بھی مسلسل ہو رہی تھی۔ وہ خود جان بوجھ کر کم بول رہا تھا۔ عدیل کو بنیہ سے ملنے کا

دوست کی پسند سے متعارف ہونے کا اتنا شوق تھا تو اب وہ چاہتا تھا عدیل بنیہ کی شخصیت کو پوری طرح جان جائے اور اسے اتنا ہی اچھا اور اتنا ہی منفرد سمجھے جتنی وہ حقیقت میں ہے۔

عدیل اور بنیہ کی زیادہ تر بات چیت اپنے اپنے پروفیشن، سول انجینئرنگ اور میکینیکل انجینئرنگ پر ہو رہی تھی۔ وہ پڑھائی میں تھی ہی زبردست۔ اپنے مضمون پر اسے پوری دسترس حاصل تھی چنانچہ وہ اپنی پری تلی گفتگو سے عدیل سفیان کو مرعوب و متاثر کر رہی تھی۔ ایسی نازک کامیابی لڑکی اور باتیں اتنی بھاری بھر کمزور دوست کے چہرے کے تاثرات کو اجوائے کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ بنیہ نے بھی میز پر سے برتن اٹھانے شروع کر دیے تھے۔ وہ ان برتنوں کو دھونے کے بھی موڈ میں تھی۔

"قار گاڑ سیک بنیہ! میں نے تمہیں ڈنر انوائیٹ کیا تھا" گھر کے کام کروانے کے لیے نہیں۔ دھل جائیں گے یہ برتن چھوڑو انہیں۔"

آج چونکہ بارش خاصی تیز ہو رہی تھی اس لیے کھانے کے بعد بنیہ زیادہ دیر کی نہیں تھی۔ وہ اپنا چاکلیٹ کھرکا اور کوٹ اور گلوڑ پہنتے جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

عدیل اس پوری شام سارا وقت ان دونوں کے ساتھ موجود رہا تھا اور اسے ایک پل کے لیے بھی بنیہ کے ساتھ اکیلے میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ اس کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔ وہ آج بہت اچھی لگ رہی ہے یہ بتانا چاہتا تھا مگر عدیل جان بوجھ کر سارا وقت اس کے سر پر سوار رہا تھا۔ بنیہ دروازے تک آگئی تھی وہ اس کے ساتھ نیچے تک جانا چاہتا تھا۔

"ہاں چلو ہم بنیہ کو نیچے تک خدا حافظ کہہ کر آتے ہیں۔" اسے بھی بنیہ کے ساتھ دروازے سے نکلتا دیکھ کر عدیل فوراً بولا۔

"بنیہ کو نیچے تک میں چھوڑ آؤں گا۔" وائٹ پیٹے اس نے دوست کو گھورا۔ بیسی کی نمائش کرنا عدیل وہیں رک گیا تھا۔

"تم سارا دوست بہت اچھا ہے عالی! بہت جلدی اور زندہ دل سا۔" لفٹ میں داخل ہوتے وہ اس سے بولی۔ اس نے آج بنیہ کو یہی کہہ کر انوائیٹ کیا تھا کہ اس کا بچپن کا اور بہت گہرا دوست عدیل سفیان اس سے ملنا چاہتا ہے سو وہ اس سے پوچھنے لگی۔

"میں ٹھیک سے تیار ہو کر آئی تھی ناں عالی! تمہارے دوست پر میرا پریش ٹھیک پڑا ہو گا نا؟"

"صرف ٹھیک! تم آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔ ویسے مجھے تو تم اسٹرابرر ڈالے سلیڈنگ ڈریس میں بھی بہت پیاری لگتی ہو مگر آج میرا خیال ہے تم سب کو اچھی لگ رہی ہوگی۔"

وہ اس کے شرارتی انداز پر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ وہ دونوں اس کے لپار ٹمٹ کی بلڈنگ سے نکل آئے تھے۔ اسے کب کے ذریعے واپس جانا تھا۔ عباد نے اس کے چھتری کھولنے سے پہلے اپنی چھتری کھولی تھی اور اس کے نیچے اسے پوری طرح لے لیا تھا۔ خود اس پر بارش کی چھینٹیں آ رہی تھیں مگر بنیہ پر اس نے بارش کا ایک قطرہ نہیں گرنے دیا تھا۔

"مہی! ملتا اور ملتا جانی نے مجھے لاؤ پار میں بالکل نہیں لگا رہا تھا مگر تجھے لگتا ہے تم مجھے Spoil کر کے ہی چھوڑو گے۔ مجھے بلاوجہ اپنے ناز، خرمے اٹھوانے کی عادت ہوتی جا رہی ہے۔"

وہ اس پر چھتری تانے اس کا مخالف بنا کھڑا تھا اور وہ مسکرا کر اس سے کہہ رہی تھی۔ باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ



شوکت جہاں ایک لمبا سا اور زندہ دل خاتون ہیں۔ خاندان اور محلے میں ان کے اچھے تعلقات ہیں۔ ان کے دو بیٹے معراج الدین اور سراج الدین ہیں۔ بڑے بیٹے معراج الدین اپنی بیوی رخشیدہ اور چار بچوں کے ساتھ گھر کے اوپر والے پورشن میں رہائش پزیر ہیں۔ جبکہ چھوٹے بیٹے سراج الدین اپنی بیوی بیگم اور دو بچوں حسن اور احسن کے ساتھ نیچے پورشن میں رہتے ہیں۔ شوکت جہاں کی طبیعت چونکہ پروین بیگم سے میل کھاتی ہے اس لیے وہ اپنے چھوٹے بیٹے اور بیوہ کے ساتھ رہتی ہیں۔ شوکت جہاں کی اکلوتی بیٹی زہرہ شادی کے چند سال بعد ہی ایک حادثے میں انتقال کر چکی ہے اور اس کا میٹھا صحن ان کے ساتھ ہی رہتا ہے جس کی پرورش پروین بیگم نے کی ہے۔

دوسرا گھر شمس الدین کا ہے جو پروین کی ماں ہے۔ پروین بیگم کے بڑے بھائی نوید مراد تھکے دار ہیں۔ ان کی شادی ساجدہ سے ہوئی جو سراسر ان کی ماں اور بہن کی پسند تھی لیکن ساجدہ نے اپنی نیک فطرت سے سب کو اپنا کر دیدہ بنالیا۔ یہ چھوٹی سی جنت نوید مراد کو بے حد عزیز ہے۔ اسے خوشخبری ملتی ہے کہ ان کے گھر ایک نئے مہمان کا اضافہ ہونے والا ہے۔ وہ اس خوشی میں مہینہ بھر کا ایک دن اچانک ساجدہ بیڑھیوں سے گر جاتی ہے۔ اسے انتہائی نازک حالت میں اس کی ماں اسپتال لے کر جاتی ہے۔ پروین بیگم اور اس کی ساس شوکت جہاں فوری طور پر اسپتال کا رخ کرتی ہیں۔

تیسری کہانی مظفر بھٹی اور منیرہ کی ہے۔ مظفر بھٹی نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف منیرہ سے شادی کی۔ منیرہ کا تعلق ایک بڑے گھرانے سے ہے۔ مظفر نے اسے کالج آتے جاتے اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اکثر اس کے اکلے کی دکان پہ آتی تھی۔ اس کی طبیعت کے ساتھ بہن نے مظفر کو اپنا اسیہ بنالیا اور اس نے فوری طور پر سنجیدہ قدم اٹھاتے ہوئے منیرہ کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ تین سالوں کی رفاقت میں دونوں میں مثالی محبت جنم لے چکی ہے جس میں کسی کے بجائے اضافہ ہی ہوا ہے۔ اسی دوران ان کی زندگی کو سودا کی شریعت نے مزید خوشگوار بنا دیا ہے۔ مظفر کی ماں نصرت بیگم اور بہن عسیم منیرہ کی دل شکنی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ مظفر اس جنگ میں ہمیشہ منیرہ کا ساتھ دیتا ہے۔ منیرہ اپنی ساس جو

فائزہ افتخار

دل و جان سے



www.pkdigest.com



طبیعت کے باعث اس صورت حال سے پریشان رہتی ہے۔  
 ساجدہ زہرا سے جانبر نہیں ہو پاتی اور ایک بچی کو جنم دے کر فوت ہو جاتی ہے۔ ایسے میں بیرون بی بی کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس موقع پر بھی شمشاد بیگم اپنے زبان کے تیر چلانے سے باز نہیں آتی جس سے سراج الدین کا دل اپنی ساس کے لیے مزید کھٹا ہو جاتا ہے۔ بیرون بی بی کا نام وشمہ تجویز کرتی ہے۔  
 منظر سے چھوٹا، صغیر، واجب تعلیم کا مالک ہے۔ باپ کے کاروبار کا کل وارث ہے۔ گھر کا سارا خرچ وہی اٹھاتا ہے۔ منظر ایک طوائف زادی ریتا کی زلفوں کا اسیر ہے۔ ریتا، جعفر محمود کو پسند کرتی ہے جو ایک اعلا سرکاری افسر ہے۔ جعفر محمود شخص وقت گزاری کے لیے ریتا کے ساتھ شامیں قاتا ہے۔  
 اصغر منظر کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے جس پر منظر فیس میں اگر اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ بیرون وشمہ کی جانب سے خاصی ٹھکر مند ہے جبکہ اس کے آئے دن کے میکے کے دورے سراج الدین کو چرائے پائیکے رکھتے ہیں۔ ایسے موقع پر بیرون کے پاس صبر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔  
 منظر ریتا کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ جعفر محمود سے شادی کی بات کرے جس پر وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ جعفر محمود ابھرتی ہوئی ماڈل سو میہ کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہے۔ اس لیے ریتا کو نظر انداز کرنا ہے۔ اس کے نئے افسانے کے قے اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ ڈال ڈال منڈلانا جعفر محمود کی حوصلت ہے۔ خاندانی بیوی بدیخ اور غمیں دنیاں آبا کی گھر میں ساس سسر کے ساتھ رہتی ہیں۔ بدیخ گھریلو طبیعت کی مالک ہے۔ ناہم مشرقی روایات پر سختی سے کاربند رہنے کی روش جعفر محمود کو کچھ پسند رہتی ہے۔ بدیخ گھریلو طبیعت کی مالک ہے۔ ناہم مشرقی روایات پر سختی سے کاربند رہنے کی روش جعفر محمود کو کچھ پسند نہیں ہے۔ یہ شادی اسے اپنی بڑی بہن کی وجہ سے وٹے ٹٹے کے طور پر کرنی پڑی۔ ریتا، جعفر محمود سے اس افسانے کے متعلق باز پرس کرتے اس کے گھر پہنچ جاتی ہے جس پر جعفر اسے بہت بے عزت کرنا ہے۔ ریتا اس رویے پر کتنے میں آ جاتی ہے۔ عین موقع پر جعفر کے گھر والے اسلام آباد سے لاہور پہنچ جاتے ہیں۔ جعفر اپنے نوکر کے ذریعے اسے پچھلے دروازے سے نکلنے کو کہتا ہے لیکن جعفر کی بیوی بدیخ اسے دیکھ لیتی ہے۔ وہ اسے ممکنہ خطرے کے پیش نظر ہاں سے بھاگ دیتی ہے۔

اصغر گھر والوں سے بغیر پوچھے ریتا سے نکاح پر دھوا کر گھر لے آتا ہے جس پر گھر کے تمام افراد صدمے سے رنگ رہ جاتے ہیں۔ نصرت بیگم اور شمیم اسے نکالنے کے درپے ہوتی ہیں لیکن ریتا ڈنکے کی چوٹ پر ان کا مقابلہ کرتی ہے۔  
 منظر کی اچانک موت پورے خاندان کے لیے ناقابل حلالی نقصان ثابت ہوئی ہے۔ منظر صدمے سے نیم پاگل سی ہو جاتی ہے جبکہ نصرت بیگم جو ان بیٹی کی موت سے ڈھسے سی گئی ہیں۔ اس عرصے میں ریتا ڈرا سے بازی اور چکنی چپڑی باتوں سے اصغر کو اپنے دام میں پوری طرح پھنسا لیتی ہے۔  
 منظر کی ابتداء ریل حالت کے پیش نظر اس کا بھائی جمشید اور بھائی شفاء اپنے پاس لے آتے ہیں۔ جہاں اگر اس کی دماغی صحت قدر بہتر ہونے لگتی ہے لیکن بڑھتے ہوئے اخراجات کے باعث وہ واپس ساس کے پاس آنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ نصرت بیگم کھلے دل سے اس کا استقبال کرتی ہیں لیکن گھر کی بدلی ہوئی حالت اسے بتا دیتی ہے کہ اب ماحول پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس عرصے میں اس کے سر کا انتقال ہو چکا ہے۔ ناہم منظر اپنے اور سواہ کے مستقبل کے لیے نہیں رہنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

شوکت جہاں وشمہ کی بھلائی کے لیے نوید کی دوسری شادی کا مشورہ دیتی ہیں جس پر بیرون اور شمشاد بیگم وقتی طور پر حیران ہوتی ہیں۔ ناہم بعد میں انہیں شوکت جہاں کا مشورہ معقول لگتا ہے وہ جمیدی بو اکو اس مشن پر لگاتی ہیں۔  
 نصرت بیگم کی تمام تر حمایت کے باوجود ریتا، منظر کا رونا دھونا بھر کر دیتی ہے۔ نصرت بیگم مرنے سے پہلے یہ وصیت کرتی ہیں کہ منظر واپس اپنے بھائی کے گھر چلی جائے۔ ریتا شمیم پر بد چٹنی کا انزاس لگاتی ہے جس سے خوف زدہ ہو کر منظر جمیل بھائی کے گھر آ جاتی ہے۔ ابتدا میں کلثوم بھابی کا رویہ سواہ اور منظر سے اچھا ہی رہتا ہے۔ جمیل بھائی عرفان (کلثوم بھابی کے بھائی) سے منظر کی شادی کرنا چاہتے ہیں جس پر کلثوم ہتھے سے اکھڑ جاتی ہے۔ جمیل بھائی دراصل ساس کی جائیداد اور قبضہ جمانے کے لیے منظر کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کلثوم ان کا مقصد جان کر منظر کے لیے خود سے رشتے کی تلاش شروع کرتی

ہے۔ اس سلسلے میں ثنا اور جمشید بھائی کی حمایت ان کے ساتھ ہے۔ بوا جمیدی کے توسط سے نوید ٹھیکے دار کے یہاں منظر کا رشتہ رکھا جاتا ہے۔ ساس کے لیے ہو نا ہے کہ سواہ شادی کے بعد جمیل بھائی اور کلثوم بھابی کے یہاں ہی رہے گی۔ اس کڑی شرط پر منظر کو نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہونا پڑتا ہے۔ سادی کی اولین رات نوید وشمہ کو منظر کی گود میں ڈال کر اس کڑی ذمہ داری سے بری ہو جاتا ہے۔

شمشاد بیگم کو منظر کی شکل میں ناپرف ہاتھ آ جاتا ہے۔ وہ منظر کو کچھ کے لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ نوید ٹھیکے دار منظر کی دل جوئی کے لیے سواہ کو اپنے گھر لے آتا ہے جس پر شمشاد بیگم کو ہٹے لگ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی وشمہ کو ارادہ "منظر سے دور رکھا جاتا ہے۔ سواہ باپ کی محبت پر چڑچی اور خدی ہو جاتی ہے۔ دونوں کی یکساں انداز میں پرورش کرنے میں منظر بھان بھائی ہو جاتی ہے۔ صرف ٹھیکے دار کا ساتھ اس کی بہت ہندھائے ہوئے ہے۔

جعفر محمود بدیخ کی محبت سے متاثر ہو کر اس کی جانب منتقل ہونے ہی لگتا ہے کہ اچانک ساس کے کم ہنونی کرم بھائی اپنی کرن متاب آتا ہے شادی کر لیتے ہیں جس پر بدیخ کے ذہن کو شدید نفسیاتی جھکا لگتا ہے۔ جعفر اپنی بہن کو واپس منظر لے آتا ہے لیکن کرم بھائی متاب آتا کو طلاق دے کر معاملہ سمجھا لیتے ہیں۔ جعفر محمود ہنونی کی بے عزتی کا نادر موقع ہاتھ سے جانے پر قلعہ پٹ کا شکار ہوتا ہے۔

ریتا مردہ بی بی کو جنم دیتی ہے جس کے بعد ڈاکٹر "اصغر کو بتاتے ہیں کہ اب وہ کبھی دوبارہ ماں نہیں بن سکتی یہ صدمہ کئی دن دونوں کو بھان بھائی رہتا ہے۔ آخر تیم خانے سے بچ لاکر ریتا کا دل بھلتا ہے لیکن اپنے بے صبر پن اور کم حوصلے کے باعث جلد ہی منظر کو دوبارہ تیم خانے میں بھیج دیتی ہے۔ اس کی نفسیاتی کیفیت اصغر کو مستقل غم حال رکھنے ہوئے ہے۔  
 حالات منظر کو زندگی کا مشکل ترین فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور اسے سواہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی جمیل بھائی کے پاس بھیجنا پڑتا ہے۔ اولاد نہ ہونے کی بنا پر اصغر سواہ کو لیتا چاہتا ہے۔ جمیل بھائی کا زہر زہن فوراً "بھائی کی ذمہ داری سے بڑی الذمہ ہونے کا پیمان بنالیتا ہے۔ منظر کو بی بی کے بہتر مستقبل کے طوعاً "کہا" ریتا اور اصغر کی تحویل میں دینے کے لیے آمادہ ہونا ہی پڑتا ہے۔

مشکل وقت یوں ہی گزر جاتا ہے اور اپنے پیچھے داستان چھوڑتے ہوئے پھر زندگی کی نئی بساط بچھ جاتی ہے۔ نئی نسل بران چھ کر جوائی کی دہلیز پر قدم رکھ دیتی ہے۔ شمشاد بیگم جن کے قدموں کی دھمک گھر بھر میں گونجتی تھیں "فالج کے مرض کا شکار ہو کر حالات کے رحم و کرم پر ہیں۔ اب گھر میں منظر کا کسک چٹا ہے اور وشمہ بھی اسی کا دم بھرتی ہیں۔  
 گزرتے وقت نے بدیخ کی شکی طبیعت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ جوان بیٹیوں کی موجودگی میں بھی وہ ڈھیلے پھڑکنے سے باز نہیں آتیں۔ بڑی بی بی تحریم واجب شکل و صورت کی ہے اور ایک ہختہ عمر کے شخص وحید کو پسند کرتی ہے۔ وحید نے اسے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اپنے دام میں پھنسا رکھا ہے۔ وہ وحید کے کئے پر اپنے گھر آنے والے ہر شے کو انکار کر دیتی ہے۔

بیرون بیگم کو سسرال میں اپنے بھرم کے لیے وصی کی پرورش ناز و نعم سے کرنا پڑی جس سے وصی کے مزاج میں لاابالی پن آ گیا ہے۔ ناہم تعلیم کے میدان میں وہ خاصا سنجیدہ ہے اور ایم پی ای میں ایڈمیشن لینے والا ہے۔ بیرون بیگم کا بڑا بیٹا حسن کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹا ہے جبکہ حسان تعلیم کے معاملے میں خاصا لاوار ہے۔ رخشندہ بیگم کی طبیعت میں وہی سنجو بی پن غالب ہے۔ رخشندہ کی چھوٹی بیٹی عیسیٰ عیسیٰ میں دلچسپی لیتی ہے جس کا احساس وصی کے علاوہ سب کو ہے جبکہ بڑی بی بی ندا کاغ میں پڑھاتی ہے۔ وصی کی ندا سے خاصی دوستی ہے۔

گزرتے ماہ و سال نے ریتا کے طور اطوار میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اپنی ذات پر توجہ دینے کا شوق ہنوز برقرار ہے جس سے اب اصغر کو بے زاری ہونے لگی ہے لیکن اس معاملے میں وہ کسی کی نہیں سنتی۔ دونوں نے سواہ کو اپنی سکی اولاد کی طرح چالا ہے۔ حد درجہ توجہ اور پیسے کی زیادتی نے اسے خدی اور ہٹ دھرم بنا دیا ہے۔ کاغ میں اپر کلاس کی بڑی لڑکیوں سے اس کی دوستی ہے جس نے اس کی ظاہری شخصیت پر بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

(اب آگے پڑھئے)



”کہاں گم ہوا اتنے دنوں سے؟“

وصی کے سوال نے سوبا کو گم صدمہ کر دیا۔

وہ سارے آن چاہے۔ ان سوچے جواب پھر سے لیوں تک آکے بولنے لگے۔  
”تم میں گم ہوں۔“ لیکن پہلے کی طرح اب بھی اس نے ان جوابوں کو جھٹک کر پرے دھکیلا جو اسے ہی اتنا  
جیراں کر دیتے تھے تو وصی کا بچانے کیا حال ہوتا۔

”بونی۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“  
”خیریت؟“ کیا ہوا؟“ الفاظ عام سے۔ مگر اس کا لہجہ بے حد تشویش لیے ہوئے تھا۔ سوبا کو اس کا یہ انداز

اچھا لگا۔

”اتنی فکر ہے تو کیسے آجائو۔“

اچانک بے ساختہ ہی اس کا جی وصی کو سامنے دیکھنے کے لیے پھٹنے لگا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی وہ کبھی ایسا نہیں  
کرے گا۔  
”کیا ہوا؟“ تم تو کسی گہری سوچ میں چلے گئے۔ وہ کیا ہوتا ہے مقابلہ۔ نہیں ہاں۔ مراقبہ میں چلے گئے  
ہو؟“

لیکن دوسری جانب گہری خاموشی تھی۔

”ہیلو۔ وصی۔ ایلو۔“

مگر فون بند ہو چکا تھا۔

سوبا نے ایک گہری سانس لی اور انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ گئی۔ تقریباً ”ساری رات رینا کے کمرے میں اٹھتے بیٹھے  
گزر گئی تھی۔ اسے کسی اور کے کمرے۔ خصوصاً ”رینا کے ہارڈ پینڈ“ پر نیند نہیں آتی تھی۔ صبح جاگنے پر جب رینا  
کو تازہ دم۔ اور کل کے اثرات سے یکساں دیکھا تو مطمئن ہو کر اسے کمرے میں آئی۔ ابھی لیٹے کا سوچا ہی تھا  
کہ وصی کا فون آگیا۔ لیکن اس دھن کی کال نے اسے اور بھی بوجھل کر دیا۔  
وصی کا فون بند کر دینا۔ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ نہ تو اسے صاف انکار کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی دل آزاری  
کے ڈر سے اور نہ وہاں آنا چاہتا تھا۔ غالباً ”بلکہ یقیناً“ اپنی دل آزاری کے ڈر سے۔  
وہ ست قدموں سے چلتی ٹیسر کی جانب کھلتی و بند ٹنگ مٹی۔ بھاری پردے پٹانے پر کمرہ دن کے اجالے سے  
بھر گیا۔ غائب رہا غشی سے وہ دیر تک نیچے لان میں جمنا کتی رہی۔ پارل کی آواز پر وہ چونک کر گیٹ کی جانب دیکھنے  
لگی۔ گیٹ کی پیر گیٹ کھول رہا تھا اور وصی کی کار اندر داخل ہو رہی تھی۔

\*\*\*

”ہے سمجھ دار عورت۔“

شوکت جہاں کے کہنے پر برون نے کوفت محسوس کی۔

”بات جو کرنی تھی مگر بھی ٹی اور برا بھی نہیں لگا بلکہ وہ کہہ کے خیال آ رہا ہے کہ کاش یہ میں نے سوچا ہوتا۔“  
”کیا؟“ برون جو نہیں۔

”آج کل منزوی کی جانب سے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نچانے کب کس وقت کیا کہہ دے۔  
”ابھی بھئی کے لیے اشاروں کنایوں میں کہہ رہی تھی ظاہر ہے لڑکی والے کھل کے تو کہہ نہیں سکتے۔ مجھے تو  
بلکہ برا لگا کہ اسے یہ بات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ تو میرا ہمارا فرض بننا تھا کہ خیال کرتے۔ ہمارے

وقت اچھے تھے۔ بچے جوان ہوتے تو ہمارے مارے پھرنے کے بجائے خاندان میں ہی دیکھ بھال کے رشتے بناتے  
ہو جاتے تھے۔ ایسا وقت نہیں آتا تھا کہ لڑکی والوں کو خود منہ سے کہنا پڑے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ۔۔۔“ برون نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔  
”ہاں۔ میں یہی سوچ رہی تھی کہ دشمنہ دیکھی بھالی بچی ہے مشکل بھی اچھی۔ عادتیں بھی اچھی۔ کیوں نہ  
ہمارے گھر کی بیوی بن جائے۔“

برون جس مرحلے کو مشکل سمجھ رہی تھیں وہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں  
منزوی کی چپ زبان کی قائل ہو گئیں۔  
”بات کرتی ہوں رخشہ سے۔“  
”رخشہ بھالی سے؟“

”ہاں۔۔۔ وہ بھی تو نندا سے فارغ ہونے کے بعد مولانے کی فکر میں ہے تاکہ ہمارے جانے کے بعد گھر بالکل ہی  
سونا نہ ہو جائے۔ چاہے بیابان کے اس کو نیچے ہی آتا ہے لیکن پھر بھی اپنے گھر کی رونق تو جاتی ہی ہے۔ یہی کے رخصت  
ہونے کے بعد پرانے ہونے کا احساس تو تب بھی اتنا ہی ہوتا ہے اس لیے کل ذکر کر رہی تھی۔ میں نے سوچا اس کا  
دھیان دشمنہ کی جانب۔“

”ماں جان۔ آپ۔۔۔“ برون کا بس نہ چل رہا تھا کہ ان کی غلط فہمی پر زور زور سے ہنسنے لگیں۔

یا پھر۔۔۔ اپنی بے بسی پر چیخ کر روئیں۔

”آپ خود ہی اتنا آگے تک گانہ سوچیں ہو سکتا ہے بھالی نے اپنے میکے میں کسی کو پسند کر رکھا ہو۔“

”ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے ذکر کرتی۔“

”پھر بھی۔ ماں جان۔ میں بہ مناسب نہیں سمجھتی۔“

بہت دیر کے انہوں نے کبھی نہ دیا۔ جانتی تھیں اب بھی نہ بولی تو سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہ رہے  
گا۔

شوکت جہاں کو ان کی جانب سے اس کھلی مخالفت کی امید نہیں تھی۔

”دشمنہ تمہارے بھائی کی بیٹی ہے برون۔“

”جانتی ہوں۔ میں اس کا برا نہیں چاہتی۔ لیکن آپ میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش بھی کریں۔ میرے  
رخشہ بھالی سے دو درشتے ہیں بھٹائی کا بھی سہ من کا بھی۔ دونوں رشتے بے حد نازک ہیں۔ اپنی ہی بیٹی کو  
ان کی بیوی بنانے کا مطلب ہے ایک طرح سے دھڑکا۔“  
یہ جواز انہیں بڑا بروقت سوچا تھا۔

وہ بھی متفق ہو گئیں۔

”ہاں۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ کل کلاں کو کوئی بات ہوئی تو اثر دونوں رشتوں پر پڑے گا۔ شادی کے بعد جو  
معمولی مسائل آسانی سے حل ہو جایا کرتے ہیں۔ وٹے کی صورت میں ان ہی مسائل کی وجہ سے گھر کے گھر  
برباد ہوتے دیکھے ہیں۔ پھر۔۔۔“

انہوں نے برون کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”پھر کیا کیا جاسکتا ہے ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ اچھی لڑکی ہے۔ ہمارے گھر آجائے گی تو۔۔۔“

”آپ بھی تسلی ہے۔“ برون نے آج سارا معاملہ صاف صاف کرنے کا تہیہ کر لیا تو ایسے بھی بات کرنا مشکل نہیں  
ہوتا، بات کو شروع کرنا مشکل ہوتا ہے اور بات شروع شوکت جہاں نے کی تھی۔



”اگر آپ۔۔۔ آپ وصی کے لیے رضامندی دے دیں تو۔۔۔“

”وصی کے لیے؟“ شوکت جہاں حیران ہوئیں۔

”ارے ہاں۔۔۔ کیا بات کی ہے تم نے پروین!“

ان کے پہلے رد عمل پہ پروین کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا لیکن پھر خوشی کے بے ساختہ اظہار نے

یہ سانس آسان کر دی۔

وہ کھل کے مسکرانے لگیں۔ کئی دنوں کے بعد۔

”بس ٹھیک ہے۔۔۔ یہ طے ہے کہ اب ہم جلد ہی تمہارے بھائی کے گھر جائیں گے۔ وصی کے لیے وشہ کا

ہاتھ بانٹنے۔“

”یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ میرے بھائی کے گھر کی عزت، عزت سے گھر کی ہو جائے گی اور میرا مان بھی رہ جائے گا۔“

پروین نے اسی وقت شکرانے کے نوافل کی نیت باندھ لی۔ منہ کو فون کر کے جتانے کی خواہش کو بعد میں کہہ کر

ٹالا۔



”میں نے یہ کہا تھا کہ طبیعت خراب ہے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے۔“

وصی کی ناراض ناراض سی شکل دیکھ کے وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی کہہ رہی تھی۔

”اچھوٹکی۔۔۔ میری ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔ اسی وجہ سے چند دن تک سوائے ان کے کسی اور بات کا

ہوش ہی نہیں رہا۔“

”یہ تم فون پہ صاف صاف بھی تو بتا سکتی تھیں۔ دوڑ لگوائی ہے میری آفس سے۔“

”دوڑ نہیں۔۔۔ ریس۔۔۔ پیدل نہیں تھے تم۔“ اس نے صبح کی۔

”ایک ہی بات ہے۔۔۔ میری نہ سہی۔۔۔ میری ماما کی عیادت کر لو۔۔۔ چلو آؤ تمہیں ملو اسکے لاتی ہوں اپنی ماما سے“

وہ وصی کا ہاتھ کھینچتی اندر لے گئی۔

وصی نے ریتا کے بارے میں سرسری سانس رکھا تھا اور وہ سرسری سا ذکر اتنا خوشگوار نہ تھا، جتنی خوشگوار حیرت

اسے ریتا کو دیکھ کر ہوئی تھی۔

طبیعت کا اضحلال چہرے سے واضح تھا لیکن سوگواری اور سکندری نے بھی شخصیت کے پرکشش اسرار پہ

فرق نہ ڈالا تھا۔ وہ کوئی بہت مسکور کن حسن کی مالک نہ تھی لیکن اس کی خوش گفتاری، خوش لباسی اور خوش خلقی جو

وقت کے ساتھ ساتھ گہری تھی، سانس والے پہ بڑا خوش کن اثر ڈالتی تھی۔

”سوا بہت محبت کرتی ہے آپ سے اس کی دس باتوں میں سے تو“ آپ کے بارے میں ہوتی ہیں۔“

”اور آخری ایک۔۔۔“ ریتا نے قہقہہ لگاتے پوچھا۔

سوا نے اسے اس موڑ سے نکتے دیکھ کر اطمینان محسوس کیا جس میں وہ گزشتہ دو دنوں سے محصور تھی۔

”that's not fair“ ماما آپ بہانے بہانے سے میری سیکرٹس جاننا چاہ رہی تھیں۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولی اسے جاتا دیکھ کر وصی نے کچھ بے چینی محسوس کی۔ کسی لڑکی سے یہ دوستی کرنے کا یہ

پہلا موقع تھا اور یہ ہے یہ تجربہ۔ کہ اس کی ماں کے سامنے بیٹہ کراس کے سوالوں کے جواب دیے جائیں۔

”میں پہنچ کر کے آتی ہوں۔۔۔ پھر چائے پیوں گی تمہارے ساتھ۔۔۔ سستی سی ہو رہی ہے۔“

”بلکہ جاؤ۔۔۔ کہیں گھوم پھر آؤ نا وصی کے ساتھ دو دن سے میرے ساتھ بندھی ہوئی ہو۔ فریڈش ہو جاؤ گی۔“

”میں آفس جا رہا تھا۔۔۔ سوا کی۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کی طبیعت کا پتا چلا تو دیکھنے آ گیا۔۔۔ مجھے یہاں سے

جنس جانا ہے۔“

”اوہ!“ ریتا کو وصی سے صاف جواب ملنے کی امید نہیں تھی۔

”ڈونٹ وری ماما۔۔۔ اسوا کو فریڈش ہونے کے لیے کسی دوسرے پہ depend نہیں کرنا پڑتا۔“

اس نے جاتے جاتے وصی کو چپانے کے انداز میں کہا۔

”اور میری دعا ہے۔۔۔ اسے واقعی کسی پہ depend نہ کرنا پڑے۔“ ریتا نے اس کے نکتے ہی سنجیدگی سے کہا۔

”نہ خوش رہنے کے لیے۔۔۔ نہ زندہ رہنے کے لیے۔“

”لیکن وہ آپ پہ تو depend کرتی ہے۔“

”نہیں۔۔۔ وہ مجھ پہ depend نہیں کرتی۔۔۔ صرف مجھ پہ ٹرسٹ کرتی ہے۔۔۔ یہ اعتماد کرتی ہے کہ میں اس کے

لیے جو سوجوں کی اچھا سوجوں کی جو کروں گی ہسٹروں کی۔۔۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ میرا اس کی زندگی میں ہونا ہی

اس کے لیے اچھا نہیں ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔“

”تم صرف سوا کے دوست نہیں ہو۔۔۔ کسی نہ کسی تعلق سے اس کی ماں کے عزیز بھی ہو۔ اس کے باقی دوستوں

اور کلاس فیلوز کے برعکس صرف تم جو جوہر جانتے ہو کہ میں اس کی اصل ماں نہیں ہوں اور یہ بھی کہ میں۔۔۔“

وہ کہتے کہتے رکی۔۔۔ وصی نے دانستہ نظر سنبھکا لیں۔

”مجھے اس سے محبت ہے اور رہے گی لیکن اب میں پوری دیانت داری سے یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میری

محبت خود غرض تھی اور اپنی خود غرضی میں میں نے سوا کی زندگی برباد کر دی۔“

”آپ نے اس کی زندگی برباد نہیں کی۔ سنواری ہے۔ اسے ایسے موڑ پہ جذباتی سارا دیا، جب وہ اپنی شخصیت

کھونے والی تھی۔ اس مقام پہ جہاں اس کا اعتبار ہر رشتے اور محبت سے اٹھنے والا تھا“ آپ نے اسے اپنی محبت کا

اعتماد دیا۔“

”ہاں کیونکہ میری اپنی زندگی میں اس اعتماد اور محبت کی کمی تھی۔۔۔ مجھے سوا کی ضرورت تھی۔ ورنہ میں ختم

ہو جاتی۔۔۔ فنا ہو جاتی۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے ایک معصوم بچی کی محبت کا سہارا لیا۔“

وہ نجانے کسے پہلی ملاقات میں ہی یہ باتیں وصی سے کہہ گئی۔ جو اس نے کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کی

تھیں۔ شاید یہ گزشتہ دو روز سے طاری فرسٹریشن کا غبار تھا۔ جس کا کھٹنا ضروری تھا۔

”دو تہا لوگ ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔ اس میں احساس جرم والی کون سی بات ہے؟“

”ہے۔۔۔ کیونکہ جب تک سوا بچی تھی۔ اسے میری محبت سے اور میرے ساتھ سے فیض پہنچ رہا تھا لیکن اب

اب مجھے لگتا ہے میری بیٹی کہلانے سے اس کے نصیب میں صرف خرابہ آئے گا۔۔۔ کس کس کو بتاؤں گی کہ وہ

میری بیٹی نہیں۔ ایک بڑے ہی عزت دار گھرانے کی عورت نے جنم دیا ہے اسے۔ لوگ تو اسے ریتا کی بیٹی ہی

سمجھتے ہیں۔ میرا اس کی ماں ہونا۔ اس کا سب سے بڑا خرابہ ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔“

وصی کا دل انجانے بوجھ تلے آن دیا۔

پھر راستے بھر وہ سوا کے بارے میں سوچتا آیا۔

”ابتدا کتنی ملتی جلتی ہے ہماری کمائی کی۔۔۔ مگر انتہا؟“



”نہیں ہر کوئی اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا جتنا میں ہر کسی کو وہ سب نہیں ملتا جو مجھے ملا۔“ نانو جیسی شفیق ہستی کا سایہ۔۔۔ چاہنے والے ماموں۔ جنہوں نے بہن کے جانے کے بعد مجھے اپنے بہنوئی کے ذمے داری سمجھتے ہوئے ان کے سرزیر دستی منڈھنے کے بجائے خلوص دل اور محبت سے اپنا یا۔۔۔ پروین ممانی جیسی وسیع قلب خاتون کی تربیت جنہوں نے بھی مجھ میں اور اپنے بیٹوں میں کوئی فرق روا نہ رکھا۔ یہ گھر جس نے نانو پھیلا کے مجھے سمیٹا۔ ایک ماں کا رشتہ واپس لیا خدا نے۔۔۔ عہد لے میں کتنے رشتے ٹوٹے اور سوا۔۔۔  
اپنی خوش قسمتی پہ شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ سوا کے لیے اسے ملال بھی محسوس ہو رہا تھا۔  
”کاش! اسے بھی یہ سب ملال ہوتا تو اس کی شخصیت کتنی مکمل ہوتی۔۔۔ ایسا ہی گھر جیسا میرا ہے ایسی ہی نانو۔۔۔ جیسی میری ہیں پروین ممانی جیسی ماما۔۔۔ نہ آپلی حسن اور حسان جیسے بھائی نہیں کاش یہ سب اسے۔۔۔  
اچانک اس کے پاؤں ہر یک پہ جا گئے۔  
کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔

اور ایسا ہی ایک جھٹکا اس کے ذہن کو بھی لگا اس اچانک وارہو نے والی سوچ سے۔  
”یہ سب اس کا ہو سکتا ہے یہ گھر نانو ماما اور میں میں بھی۔۔۔  
دل سے بوجھ پرے سرکتا ہوا محسوس ہوا وہ مسکرایا اور کارر پورس کی۔  
وہ ایک بار پھر سے سوا کے گھر کی طرف جانے والی روڈ پہ گامزن تھا۔  
وہ ایسا ہی تھا۔ فوری فیصلہ کرنے والا۔۔۔ آریا پار۔۔۔  
اور پھر اس فیصلے کو ایک بل کے لیے بھی دل میں نہ رکھنے والا۔  
فوری فیصلہ۔۔۔ فوری اظہار۔

www.pkdigest.com

”امی۔۔۔ آپہ وصی کی شادی کا کیا ذکر ہو رہا تھا؟“  
ننانے کا دل سے آنے کے بعد شوکت جہاں پروین اور رخشہ کی گفتگو کا کچھ حصہ سنا تھا مگر جھکن سے برا حال تھا۔ اور جانتی تھی ان تین کی ٹولی میں کسی کو ٹھس کر سن گن لینے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے سو کر اٹھنے کے بعد یاد آتے ہی سب سے پہلے سوال کیا۔  
دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرتی ماما نے ہاتھ روک کے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کے دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”ہاں۔۔۔ سنا ہے پروین اپنی بھینسی کے بارے میں سنجیدہ ہے۔“  
”فہم دشمن۔۔۔ دیکھتے تو باری اپنے وصی کے ساتھ اچھی لگے گی۔“ نندا مسکرائی۔  
غلط ہانے ہاتھ میں رکھی قیغ بغیر تہہ کے صوفیہ پہن گئی اور بے زاری سے پردہ لے گئی۔  
”کیا مصیبت ہے۔ ایک ٹھنڈ ہو گیا ہے۔ کپڑے ختم ہی نہیں ہو رہے۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔“  
وہ چڑچڑے پن سے کتنی اندر چلی گئی۔

”اسے کیا ہوا؟“ ننانے حیرت سے پوچھا۔  
”ہوتا ہے۔ شادی کے دن نزدیک آئیں تو میکے سے چھڑنے کا دکھ۔ نئی جگہ ایڈجسٹ ہونے کا خوف۔  
یہ سب لڑکیوں کو ایسا ہی چڑچڑا کر دیتا ہے۔“  
رخشہ نے اپنا تجربہ پیش کیا۔ جسے ننانے نے نندا ایک دم انکاری تھی۔



"یوں ایسے ہی۔ میری بھی تو تاریخ طے ہو گئی ہے۔ مجھے تو ایسے بے زاری کے دورے نہیں پڑتے۔"  
 "میں نے لڑکیوں کی بات کی ہے تمہاری نہیں۔"  
 رخشندہ نے تپ کے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔  
 "اگر مجھے لڑکی نہیں سمجھتی ہیں تو رخصت کیوں کر رہی ہیں۔ داماد کو رخصت کرا کے گھر لے آئیں نا!"  
 "توبہ ہے نا! اپنی چاندنی اور ناواں نہیں جاتی تمہاری۔ کالج میں بیکچر ہوا اور باتیں اسکول گرتوالی۔"  
 "ویسے امی! حسان اور وصی دونوں چھوٹے ہیں بھائی سے اور دونوں کی شادی کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ آخر آپ سستی کیوں کر رہی ہیں۔ سوؤ جوتے میں پروین چاچی کی طرح آپ بھی بھائی کی بیٹی لے آئیں نا!"  
 "رہنے دو تم۔ عجیب بے تحاشہ خیال آتے ہیں تمہیں۔"

"کیا برائی ہے امی؟"  
 "میری تین بیٹیوں کے لیے کسی بھائی نے سوچا۔"  
 "ضروری تو نہیں آپ بھی خود غرضی سے کام لیں۔"

"ہاں ضروری نہیں۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ میں بلاوجہ عظمت کے مظاہرے کرتی چھوں۔ میں غیر خاندان سے ہی کوئی بھولاؤں کی۔ بس وہ شرطیں ہیں ایک تو لڑکی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ سلیبی ہوئی اور ذمے دار ہو۔ کیونکہ وہ اکلوتی بھابی ہوگی تم سب کی اس گھر کی مکمل ذمہ داری اٹھانے کی تمام تر صلاحیت ہونی چاہیے اس میں تمہاری طرح چڑھ لکھ کے ڈوبنا نہ ہو اس نے۔"  
 "تیس بھر میری کھنچائی۔"

"اور دو سری بات خاندان اچھا ہو۔ سسرال نام والا ہو رعب و بدب والا تو بڑا فرق پڑتا ہے اس کے برعکس لڑکی جتنی بھی اچھی ہو اگر خاندان ذرا سا بھی دیتا ہو تو ساری عمر جینج میں گزار جاتی ہے۔ مریضی میں بھی پھنکی کی برداشت کر لیتا ہے کہ اس کا سدھارنا پھر بھی بس میں ہوتا ہے مگر سسرال کی کمی گویا ناک کھنسنے کے مترادف ہوتی ہے۔"

"رہنے دیں امی! یہ سب فرضی باتیں ہیں۔ بس میاں بیوی کی آپس میں انڈر سٹینڈنگ ہونی چاہیے۔"  
 "بے چارے کی مثال لے لو۔ کس بات کی کمی ہے تمہاری چچی کی ذات میں ہر لحاظ سے بے مثال عورت ہے بلکہ کئی معاملوں میں مجھ سے بہتر ہو اور بیوی ثابت ہوتی ہے۔"  
 رخشندہ نے پہلی بار کھل کے پروین کی اچھائی تسلیم کی۔ شاید اس لیے کہ ان کی دو دو بیٹیوں کا بوجھ ہلکا کرنے میں معاون ثابت ہوئی تھیں۔

"لیکن میں نے ہمیشہ سراج بھائی کو ان سے تالاں ہی دیکھا ہے۔ اور وجہ تنازعہ رہا ہے پروین کا میکہ۔ آج پروین کا بھائی نا شاء اللہ ایک کامیاب ٹھیکے دار ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے اس کے پاس اور پھر بیوی بھی پڑھی لکھی سمجھ دار ملتی ہے جس نے گھر کا نقشہ بدل کے رکھ دیا ہے لیکن جب پروین کی شادی ہوئی تب بے چارہ اس کا بھائی کا روبرو جہانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کم عمری میں گھرانے کی کفالت کا ذمہ گاندھوں پر آجانے کی وجہ سے وہ تعلیم بھی مکمل نہ کر پایا۔ ویسے خاندانی لوگ تھے۔ پیچھے سے کھاتے پیتے زمین دار لوگ مگر تعلیم کے فقدان اور دیہاتی طور طریقوں کی وجہ سے عجیب سا لگتا تھا ان کے گھر کا ماحول۔ خاص طور پر پروین کی والدہ جن سے سراج کو خدو اسلے کاہر تھا۔ ظاہر ہے مردوں نے باہر بھی ملنا جلنا رکھنا ہوتا ہے۔ آخر سسرال ایسا تو ہو کہ کسی کو خسرے بتایا جاسکے۔"

"مجھے تو آپ کی اس سوچ سے بالکل بھی اتفاق نہیں ہے۔ پلیز۔ مائٹ مت کیجیے گا۔"

"مائٹ کیا کرنا۔۔۔ تمہیں ویسے بھی میری کسی بات سے اتفاق ہوتا ہی کب ہے؟"

\*\*\*

"کیا ہوا؟ کچھ بھول گئے کیا؟"

سوبا بھی اسی وقت گیٹ سے گاڑی باہر نکال رہی تھی۔ جب وصی اس جانب آنا نظر آیا۔ وہ گرین پیلٹ کے ساتھ گاڑی پارک کر کے اس کے پاس آئی۔

"ہاں۔۔۔ بھول گیا۔"

"Let me guess۔۔۔"

"موبائل۔"

"نہیں۔۔۔ وہ مسکرایا۔"

"keys"

"نہیں۔۔۔" نظرس سوبا کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ آج پہلی بار اسے اس نظر سے دیکھا تو وہ بہت بدلی بدلی۔ بہت الگ الگ سی محسوس ہو رہی تھی۔

نظرس کیا بدلیں۔۔۔ جیسے سب کچھ بدل گیا۔

سوچ کیا تبدیل ہوئی۔ زندگی کا منظر نامہ ہی تبدیل ہو گیا۔

"گھاسڑ بھول گئے ہو گے؟"

"نہیں۔۔۔ میں کچھ کہنا بھول گیا تھا۔"

"what" وہ ہلکا سا چلائی۔

"کہنا بھول گئے تھے؟ مگر کیا؟"

"ایک بہت ضروری بات۔ کہہ دوں؟"

"ہاں بولو۔" سوبا کو حقیقتاً "تشویش ہونے لگی اس کی سنجیدگی سے۔"

"شادی کرو گی مجھ سے؟"

اس بار سوبا کچھ نہ کہہ سکی۔

حیرت کا اظہار نہ کہنے کی پائی۔

\*\*\*

"پروین اتنی اتناؤں نہ بنو۔ ایسی باتیں فون پہ نہیں ہوتیں۔ تسلی سے جا کے کریں گے۔ طور طریقے سے۔"

شوکت جہاں کے ٹوکے یہ وہ جزیرہ ہو کہ وہ لگیں۔ اب انہیں کیا بتائیں کہ یہ خبر منہ تو تک پہنچا دینے کے بعد ہی سکون ملے گا انہیں بھی اور منہ کو۔ وہ اس کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی ہیں یہ جتا کہ کہ وہ اتنی بھی بے اختیار نہیں جتنا وہ سمجھتی ہے۔

"جانیں گے اماں جان ظاہر ہے۔ وہ تو جانتا ہی ہے میں تو بس فون پہ صرف آنے کی اطلاع دینے کا سوچ رہی تھی۔ کل کارو گرام رکھ لیں؟ ستاؤں منہ کو؟"

"کل؟ وصی سے بات ہو جاتی تو۔۔۔"

"آپ نے میاں صاحب سے بھی بات کر لی۔ انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وصی کو کیوں ہو گا۔"



”میں جانتی ہوں وصی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اگر اس کی نظر میں کوئی لڑکی ہوتی تو وہ ہمیں بے خبر نہ رکھتا۔ اب تک لیکن کم از کم اسے اطلاع تو دینی چاہیے۔ مشورہ تو لیتا چاہیے۔ زمانہ بدل گیا ہے پروین! بچوں کو بھی اچھا لگتا ہے اگر انہیں اعتماد میں لے کر فیصلے کیے جائیں۔“

”زمانہ واقعی بدل گیا ہے اماں جان!“  
وہ ریسیور ہاتھ میں لیے سوچنے لگیں۔  
”اب بچے ہمیں اعتماد میں لے کر فیصلے کرنے کے بجائے خود فیصلہ کر لینے کے بعد اس اعتماد سے ہمیں کٹ پٹی بناتے ہیں کہ ہم لانا ان کے اشاروں پہ ناپٹے لگیں گے۔“  
”اب کیا ہوا؟ کیا سوچنے لگیں؟“

”کچھ نہیں۔“ آنسوؤں نے ریسیور واپس کر ڈیل یہ رکھ دیا۔  
”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وصی سے پہلے بات کر لیتا مناسب ہو گا۔“  
”کیا کر ڈیلا وصی نے؟“ حسن نے اندر داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔  
”اس جھگڑے کا کرنا ہے۔ کرنے والے تو ہم ہیں۔ اس کا رشتہ۔“  
”وہ خدا! یہ آپ لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔ اور نیچے بس ایک ہی موضوع۔ سارا خاندان جیسے ایک ہی مہم میں جت گیا ہے۔ قسم کھاتی ہے آپ سب نے کیا؟ کہ اسی مہینے خاندان کے ہر لڑکے اور لڑکی کو ٹھکانے لگاتا ہے۔ ایک دوی بچا تھا بس اب اسے بھی قابو کر لیا۔“  
وہ شوز اتارتے ہوئے گفتگو سے کہہ رہا تھا۔

”ایک وصی بچا تھا اور ایک وشمہ۔“  
پروین کے مسکرانے اور وشمہ کے نام پر وہ ہلکا سا  
”یہ وشمہ کا یہاں کیا ذکر؟“  
اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔  
”اسی سے تو کرنا چاہتے ہیں ہم وصی کی شادی۔“  
موزے اتارتے ہوئے حسن کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے۔  
”میں پروین کو مشورہ دے رہی تھی کہ اتنی جلد بازی سے کام مت لو۔ پہلے وصی سے اس کی رضامندی جان لو۔“

”بہت جلدی خیال آگیا آپ کو یہ مشورہ دینے کا۔“  
اس نے شکوہ کنال نظروں سے انہیں دیکھا۔  
”پاپی جلدی آگیا ورنہ تو یہ فون کرنے ہی والی تھی۔ اتنی تاؤ لی ہو رہی ہے بھتیجی کو گھر لانے کے لیے۔“  
”بھتیجی کو گھر لانے کا شوق بھی کچھ اچانک ہی ہوا ہے امی کو اس سے پہلے تو یہ خیال نہیں آیا۔“  
لال کے ساتھ ساتھ دبا دبا حسد بھی اس کے لہجے سے چھلک رہا تھا جسے اپنی ہی خوشی میں مرن پروین اور شوکت جہاں نے محسوس نہ کیا۔



”وصی تم۔۔۔“  
اور اس کے آگے سوہا کے الفاظ گم ہو گئے۔

پکلاں پہ قطار در قطار بچے آنسوؤں نے سانسے کا منظر دھندلا کر دیا۔  
وصی نے ہاتھ بڑھا کے اپنی پوروں پہ اس کے آنسو چن لیے۔  
”یقین نہیں آ رہا یا دکھ ہو رہا ہے میرے اتنے عجیب و غریب طریقے سے بتانے پہ۔ کیا کر دیں یا رب! فرسٹ ایکسپریس نہیں ہے نا۔“

وہ آنسوؤں کے ساتھ کھلکھلا اٹھی۔  
”جھوٹ۔۔۔ جھوٹ۔۔۔ جھوٹ۔۔۔“  
”تمہیں لگتا ہے مذاق کر رہا ہوں میں؟“  
اور اگرچہ سوہانے اس کی آنکھوں میں سچائی کے سارے رنگ دیکھ لیے تھے لیکن صرف اس کی زبان سے ایک بار پھر یہ اقرار سننے کے لیے کہہ دیا۔

”ہاں۔۔۔“  
”کیسے یقین دلاؤں تمہیں۔۔۔ تمہاری ماما سے بات کر کے؟“  
”تم کیا بات کرو گے؟“  
”آں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں تو نہیں۔۔۔ میرا مطلب تھا میری ماما!“  
”مامی؟“ اور جیسے اچانک سوہا کسی سانسے خواب سے جاگ گئی۔  
بچپن کی وہ سب یادیں تازہ ہو کر سامنے آ گئیں جن کو اس نے موت کو شش کے بعد بھلایا تھا۔  
شمشاد بیگم کی کرہ۔۔۔ آواز اور دل چھلنی کرنے والے طعنے جو اس کے معصوم دل نے سنے تھے۔  
نوید مراد کے بے گانگی۔ جسے جھٹنے سے وہ قاصر تھی۔

پروین کی خاموش گمراہ اور چھپتی نظریں۔ جن کا مضمون اس کا کم عمر بہن تلاش نہیں کر سکتا تھا۔  
”وصی تمہیں آنکھیں کی وصی!“  
وصی کے اظہار نے اسے ساتویں آسمان پہ ضرور لا بٹھایا تھا لیکن پروین کا خیال اسے ایک بار پھر نیچے لے آیا۔  
”میں جانتی ہوں وہ عورت مرجائے گی لیکن مجھے۔۔۔“  
بے حد تاؤ کے ساتھ کہتے کہتے اسی نے وصی کی جانب نگاہ کی اور اس کے چہرے کے بننے بگڑنے زاویے دیکھ کر

جلدی سے بات بدلی۔  
”ہمیں وصی بہت مشکل ہے تمہاری ماما میری کچھ نہیں لگتیں مجھ سے ذاتی تنازعہ کوئی نہیں ہے ان کا لیکن وہ میری ماما You know very well! پھر کیسے تم کوئی امید دلا سکتے ہو مجھے۔“  
”مجھے امید دلائی ہی نہیں ہے۔۔۔ مجھے یقین دلا نا ہے۔“ وصی نے اس کا ہاتھ دبا کے کہا۔



”حد ہو گئی۔۔۔ کیا میں انسان نہیں تھا؟ ایک جیتا جاگتا انسان۔ کیا میری کوئی مرضی۔ کوئی رائے نہیں تھی؟“

حسن اپنے کمرے میں لیٹا کڑھ رہا تھا۔  
لائسنس آف ٹھیکس۔۔۔ دیوانہ بند۔۔۔ اور لاؤنج سے آتی شوکت جہاں اور پروین کی گفتگو کی ہلکی ہلکی آوازیں اس کا اور بھی بار بار ہانی کر رہی تھیں۔  
”وصی کو رائے دینے کا حق ہے۔ مجھے نہیں اس سے اس کی مرضی جانتا امی پہ فرض ہے میری مرضی جانتا



ضروری نہیں اور۔ اور آخر اس کے لیے ہی کیوں سب کو شرم کا خیال آیا۔ کیا آج سے پہلے امی کے دل میں جیجی کی محبت نہیں جاگ سکتی تھی؟ آخر وصی ہی کیوں؟ اور کیا شرم کو میں دن رات اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہی گھر میں دیکھ سکوں گا؟ میں نے یہ تمنا تو کی تھی۔ مگر اس طرح نہیں کہ وہ میرے سامنے ہو اور کسی دوسرے کے ساتھ ہو۔ نہیں اس رشتے سے وصی کے حوالے سے اسے ایک ہی چھت کے نیچے برداشت کرنا بہت مشکل ہو گا میرے لیے۔

وہ خوف زدہ تھا کہ اگر پروین کی یہ خواہش پانچ بجیل تک پہنچ گئی تو اس کا رد عمل کیا ہو گا؟ اب تک وہ ہمارے بندھے اپنے تعلق پہ ناپسندیدگی بڑی کامیابی سے چھپاتا آیا ہے کیا شرم سے اپنی پسندیدگی بھی اس کامیابی سے چھپائے گا۔

باہر سے مدھم مدھم آتی آوازیں اچانک تیز ہوئیں اور ان میں تندی ترشی کا تاثر جھلکنے لگا تو وہ چونک گیا۔ دھیان دینے پہ وصی کی آواز صاف سنائی دی۔

”وجہ کیا صرف یہی ہو سکتی ہے کہ شرم میں کوئی کمی ہے؟“ اس نے بے حد جھنجھلا کر پروین کے کسی سوال کا جواب دیا تھا۔

حسن اٹھ کے بیٹھ گیا۔

”کیا یہ وجہ کافی نہیں کہ میں میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔“

اس کے جواب نے جہاں پروین اور شوکت جہاں کو لنگ کر کے رکھ دیا۔ وہیں حسن کا دل ہلکا چلکا ہو گیا۔

”نہیں کو لیگ نہیں ہے وہ تو اچھی بڑھتی ہے اسنوڈنٹ ہے اور نہ آپ کے کالج میں ہوتی ہے۔“

”اچھا تو نہ اے کالج کے پھیرے اسی لیے لگا کرتے تھے۔“ شوکت جہاں نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔

وصی ان کا لاڈلا چیتا تو اساتھا۔ اس کی مرضی اور خوشی جاننے کے بعد جیسے وہ بل بھر میں فراموش کر گئی تھیں کہ کچھ دیر پہلے پروین کے ساتھ کیا باتیں کی جارہی تھیں۔ لیکن پروین۔۔۔

وہ تو سن ہو کر بیٹھی تھیں۔

طمانیت کے احساس نے بس چند لمحوں کے لیے انہیں آغوش میں لیا تھا۔ اور اب وہ پھر اسی ککھش میں گرفتار تھیں جس ککھش نے اسے گزشتہ نئی روز سے حصار میں لیا ہوا تھا۔

پہلے اس ککھش کے ساتھ ایک امید بھی تھی۔ یہ امید کہ کبھی نہ کبھی یہ مسئلہ حل کر دی لے گی۔

اور اس بار تو اس نے بھی ہاتھ چھڑا کر راستہ بدل لیا تھا۔ اب صرف مایوسی بھرا تھی۔ اور یہ مایوسی کجنت جس سفر میں ہم سفر بن جائے وہ سفر صدیوں پہ محیط ہو جاتا ہے۔

”ایسی بات نہیں ہے نا تو اور ویسے بھی میں اسے پہلے سے جانتا ہوں میرا مطلب ہے بچپن سے آپ سب بھی واقف ہیں اس سے اور خاص طور پر ماما!“

پروین نے سوالیہ نظروں سے وصی کو دیکھا۔

وہ بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ابھی ابھی سوہا سے دل کی بات کہہ کے آ رہا تھا۔ ابھی ابھی اس سے ایک نئے رشتے اور نئے احساس سے بندھا تھا اور ابھی ابھی اس رشتے کو سب کو سامنے define بھی کرنا پڑا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ مقام اتنی جلدی آجائے گا۔ بغیر سنبھلنے یا کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر۔

”وہ سوہا ہے۔“

اس کے جادینے پہ بھی سامنے کھڑی شوکت جہاں اور پروین دونوں ٹکر ٹکراتے دیکھتی رہیں۔ شوکت جہاں

اس لیے کیونکہ ان کی یادداشت میں سوہا نام محفوظ نہیں تھا اور پروین اس لیے کیونکہ یہ نام سننے کے بعد بھی انہیں یقین نہیں آ رہا تھا یا شاید وہ یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھیں۔

”حسن! تم بلاوجہ اس کی حمایت کر رہے ہو۔ تمہارے ابا کو پتہ چلا تو وہ میری ہی درگت بتائیں گے جیسے سارا قصور میرا ہو۔ میں نے ہی اسے اس آفت لڑکی سے ملوایا ہو۔ حالانکہ میری غلطی اگر تم اسے واقعی غلطی سمجھتے ہو“

صرف اتنی ہے کہ اس کی ماں میرے بھائی کی بیوی ہے۔“

”امی! آپ بے کار میں پریشان ہو رہی ہیں۔ آپ اسے نہ جانتی ہیں نہ اس سے ملی ہیں پھر مخالفت کس لیے؟“

حسن وصی کی حمایت میں مضبوطی سے کھڑا تھا۔

”اچھی طرح جانتی ہوں اس نے بچپن میں کم فساد پرپا نہیں کیے تھے۔ اب کون سا سدھر گئی ہوگی۔“

”حد ہو گئی امی۔! آپ ایک بچی کی حیثیت سے اسے پرکھ رہی ہیں۔ تب کی باتیں یاد کر رہی ہیں۔ جب وہ ایک تو کم عمر تھی دوسرا عجیب و غریب حالات سے گزر رہی تھی۔ وصی کوئی نا سمجھ نہیں ہے۔ اگر اس نے سوہا کو پسند کیا ہے تو ضرور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ہوگی۔“

”اور شرم۔۔۔“

پروین کے سوال پہ حسن چپ کر گیا اور اس کی یہ چپ دانستہ تھی۔

وہ نہیں چاہتا تھا اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ اصل میں وہ وصی اور سوہا کے حق کے لیے نہیں وصی اور شرم کی مخالفت میں کھڑا ہے۔

”آپ نے کون سا ایسی بات کی ہے وہاں۔ یہ محض آپ کی ذاتی خواہش تھی۔ وصی کی خواہش اور مرضی زیادہ اہم ہے۔“

”تم نہیں سمجھ رہے حسن! اس سے بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ مجھے اعتراض صرف اس پہ نہیں کہ وہ منزو بھائی کے پہلے شوہر کی بیٹی ہے۔ اعتراض والی اصل بات یہ ہے کہ اس نے منزو بھائی کی نہیں اپنی بد فطرت چچی کے یہاں تربیت پائی ہے۔“

حسن جڑبڑہو کے رہ گیا۔

اس معاملے میں وہ کوئی دلیل نہ دے پا رہا تھا انہیں قائل کرنے کے لیے۔

”اور یہ اعتراض صرف مجھے نہیں بلکہ سب کو ہو گا اماں جان اور میاں صاحب کو بھی۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن ہے تو وہ شریف ماں باپ کی اولاد۔“

”ہاں ان شریف ماں باپ کی اولاد۔ جن کی پرورش اس کے نصیبوں میں نہیں تھی اور پرورش کا بڑا اثر ہوتا ہے بیٹا!“

”تو اس میں قصور کس کا ہے ماما؟“

وصی نے حسن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس دوران بالکل بھی دخل نہیں دے گا۔ لیکن اس وقت اس سے رہا نہیں گیا۔

”باب کو تو موت نے پھین لیا اسے تو اللہ کی مرضی قرار دے کر صبر کیا جاسکتا ہے لیکن ماں کی تربیت سے محروم کرنے والے تو آپ لوگ ہی تھے۔“



پروین ششدر رہ گئیں۔  
بات سچ تھی۔ مگر اپنے کسی چھوٹے منہ سے یہ سچ سننا بڑا تکلیف دہ امر تھا۔  
”اس لڑکی نے تمہیں اتنا بد لحاظ کر دیا کہ اب تم میرے سامنے کھڑے ہو کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے الزام دے رہے ہو۔ نجانے اور کتنا زہر بکھرا ہو گا اس نے۔“  
”وہ ایسی نہیں ہے ماما۔! آپ اس سے ایک بار مل کے تو دیکھیں۔“

وہ منت سماجت پر اتر آیا۔  
شوکت جہاں بھی نیم رخصتا مند لگ رہی تھیں۔  
”ٹھیک ہے وشمہ کے لیے سب سے پہلے خواہش میں نے ظاہر کی تھی۔ لیکن جب وصی ہی راضی نہیں ہے تو آخر زندگی تو اس نے گزارنی ہے۔ رہا وشمہ کا سوال تو اس کے لیے میں تم سے معذرت کرتی ہوں کہ نہ میں یہ بات کرتی نہ تمہارے دل میں ارمان جاگتے۔“  
”کیسی باتیں کر رہی ہیں اماں جان۔۔۔ معذرت کیسی بات اب صرف وشمہ کی نہیں ہے۔ سوال سوہا کا ہے۔ وہ کسی بھی طرح ہمارے گھرانے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ میں اس کے چچا اور چچی دونوں کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔“

شوکت جہاں بھی شش در شش میں پڑ گئیں۔  
ایک جانب پروین اتنے وثوق سے یہ بات کر رہی تھیں۔  
دوسری جانب وصی بغیر سوہا کی شان میں رطب اللسان بھی۔  
”ایک بار وصی کے کہنے پر ہمیں اس سے ملنا ضرور چاہیے۔“  
پروین بے بسی سے انہیں دیکھ کے رہ گئیں۔  
وصی کے ساتھ شوکت جہاں تھیں۔ حسن تھا۔۔۔ نہ اتنی رخشندہ کی دہلی دلی صلاح بھی یہ تھی کہ لڑکی کو جانچے پر کچھ بغیر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہو گا۔  
دوسری جانب وہ تنہا تھیں اور کمزور پڑ رہی تھیں۔  
نہا کو بہت زور دینے پر بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کے کالج کی وہ کون سے سوہانامی کی اسٹوڈنٹ ہے جس پر وصی کا دل آیا ہے۔

ہمارے بھی کل سے گھر میں گردش کرتی یہ خبریں سنیں۔ مگر دل پتھر کر لیا۔ اب اسے کیا فرق پڑتا تھا کہ وصی کی زندگی میں وشمہ شامل ہو یا سوہا۔۔۔ وہ خود پہلے جس طاری کرتی کسی اور جانب خود کو مشغول کر لیتی جب بھی یہ چہ چا آس پاس ہو رہا ہوتا۔  
سراج اور معراج تک یہ سارا معاملہ شوکت جہاں کی ہدایت پر پہنچنے نہ دیا گیا۔  
”پہلے یہ طے ہو لینے دو کہ سوہا یا وشمہ اس کے بعد گھر کے مردوں تک بات پہنچے ورنہ بلا وجہ بد مزگی ہوگی سراج کے مزاج کا تو یہ ہے تم سب کو۔“  
اور ایک لمبی بحث اور کشمکش کے بعد یہ طے پا گیا کہ یہاں سے پروین اور نہا سوہا سے ملنے جائیں گی۔  
”صرف اور صرف ملنے۔“

شوکت جہاں نے اپنے الفاظ پر زور دے کر وصی کو باور کرایا۔  
”بھی وہ اس سے یا اس کی چچی سے ایسی کوئی بات نہیں کریں گی۔۔۔ پہلے پروین کو یہ تسلی کر لینے دو کہ سوہا تمہارے لیے مناسب رہے گی یا نہیں۔ اور یاد رکھو وصی! میں نے سالوں پہلے تمہاری پرورش کا ذمہ پروین کو

سونپا تھا۔ آج میں اسے تمہارے بارے میں سارے اختیار بھی سونپ چکی ہوں۔“  
شوکت جہاں کی بات پر وصی نے تابعداری سے سر جھکا دیا۔ وہیں پروین کا بھی ڈھیروں مان بڑھ گیا۔  
”لیکن نہ اکا جانا سمجھ میں نہیں آ رہا اماں جان آپ بڑی ہیں بزرگ ہیں آپ چلی جاتیں۔“  
رخشندہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اسے تو ان معاملات کی ذرا بھی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ نجانے کیا کہہ دے۔“  
”ایسے ہی آئے گی سمجھ بوجھ۔ اگلے مہینے شادی ہونے والی ہے اس کی اب بھی ان معاملات میں دلچسپی نہیں لے گی تو کب لے گی۔ ویسے بھی اسے سمجھنے کی صرف یہ اگلوٹی وجہ نہیں ہے۔ ایک تو سوہا اس کے کالج میں پڑھتی ہے، ہو سکتا ہے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے جانتی ہو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نہا وصی سے بہت قریب رہی ہے۔ اس کی پسند ناپسند کو ہم سب سے بہتر جانتی ہے۔“  
نہا نے اتراتے ہوئے ماں کو دیکھا۔



”تم مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے اصغر؟“  
رہنا نے پھوڑے کی طرح جھکتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بڑی التجا بھرے لہجے میں اس سے کہا تھا۔  
”تمہارا کوئی حال بھی تو ہو جس پر چھوڑوں۔۔۔ یہ حال ہے؟“ اس نے بھری ہوئی ایش ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔

”شکل دیکھ اپنی شیشے میں آنکھوں کے نیچے حلقہ پڑے ہوئے ہیں رنگ پیلا ہو گیا ہے۔“  
”میں خوب صورت نظر آؤں تب بھی تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ میں بد صورت نظر آؤں تب بھی تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔“  
”تو خوب صورت لگو۔ مگر صرف مجھے۔“

اصغر نے اس کا زرد رونقا ہت کا مارا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔  
”اور تو ہے کہ جب خوب صورت لگتی ہے تو باہر والوں کے لیے اور جب کچھ دنوں سے باہر جانا چھٹا ہوا ہے تو یہ بیمار شکل میرے لیے لے کر بیٹھ گئی یہ تو کوئی بات نہ ہوگی۔“  
رہنا تک اسے دیکھ گئی۔

یہاں تک کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔  
”جھلی۔۔۔ اب روئے کیوں لگی؟“  
”جج بد صورت تھوڑا ہی کہا ہے میں نے تو بد صورت ہو بھی نہیں سکتی۔ کبھی بھی نہیں دس دن منہ نہ دھوئے تب بھی نہیں۔“  
اس کی بات پر رہنا کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

”تم بہت اچھے ہو اصغر!۔“  
”چل تجھے پتا تو چلا۔“  
”پتہ تو مجھے تھا۔ پہلے سے تھا کہ تم بہت اچھے ہو لیکن کیا ہے اصغر کہ کبھی کبھی انسان کو کسی بہت اچھی چیز کی بھی خواہش نہیں رہتی۔ کبھی کبھی اچھی چیزیں اس بھی نہیں آتیں۔“  
”پھر سے وہی مشکل مشکل باتیں کہتی بار کہا ہے۔ آسان باتیں کیا کر آسان زندگی جیا کر۔“  
”اپنے بس میں ہے زندگی کا آسان کرنا؟“





## مرحبا جوشانده

فوری اور قدرتی علاج تندرستی کے لیے

نزلہ، زکام، فلو، بخار، کھانسی اور گلے کی خراش کے لئے مفید اور موثر ہے

لیڈ ایس آئی آر ایہا ڈیڑ پاکستان سے تصدیق شدہ

E-mail: info@marhaba.com.pk  
URL: www.marhaba.com.pk

اب نئی فوائد پکیانے کے ساتھ  
پیلے سے بھی زیادہ محفوظ



نزلہ، زکام، فلو، بخار، کھانسی اور گلے کی خراش کے لئے مفید اور موثر

مستحباب استعمال  
ایک کپ گرم پانی یا گرم چائے میں ملا کر پی  
یہ دوا تیز اثر رکھتی ہے۔  
مستحباب استعمال کرنے والے پاکستانی

”ہے کیوں نہیں ہے۔۔۔ تین چار سال ہو گئے ہیں ہمیں اکٹھے ملک سے باہر نکلے۔ چل سگیا پورا ملائیشیا ہو کے آتے ہیں یہ ذرا سستے پڑتے ہیں۔“  
”نری سے اسے دیکھتے دیکھتے رونا پھرے بننے لگی۔“  
”کوئی لطیفہ سنایا ہے میں نے؟“  
”محبت میں بھی نفع نقصان پورا سوچ کے رکھتے ہو۔ بچے کا روبرو ہی ہو تم اصغر! میری خوشی کے لیے مجھے باہر بھی لے جا رہے ہو۔ یہ خیال بھی ہے کہ رُپ سستا پڑے۔“  
”وہ پھرے بننے لگی اور اصغر خجالت مٹانے کے لیے خواہ مخواہ مسکرانے لگا۔“  
”اچھا چل سگیا پورا ملائیشیا بعد کی باتیں ہیں۔ سوہا آتی ہے تو کرتے ہیں پروگرام سیٹ ۴ بھی تو چل میرے ساتھ۔ گھومتے پھرتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں شاپنگ کرتے ہیں پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔“  
”بت عرصے بعد وہ موڈ میں آیا تھا۔“  
”بت عرصے بعد رونا کو اس کا چو نچال پن برا نہیں لگ رہا تھا لیکن باہر جانے کے خیال سے پھرے کسلندی چھانے لگی۔“

”نہیں آج نہیں بہت تھکن ہو رہی ہے۔“

”تھکن۔۔۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے؟“

”ہاں۔۔۔ بیروں میں ایٹھن سی ہو رہی ہے۔“

”الہ رکھا۔“

”ٹوپس قیمتی سوٹ میں ملبوس۔۔۔ وہ ہیں اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کا پیر اپنی گود میں رکھ لیا۔“

”پھر سگریٹ؟“

”بس ایک۔۔۔ پائیز۔“

”رہانے اس کی جانب مسکرا ہٹ اچھالی۔ اور اس مسکراہٹ کے پیچھے پی تو وہ سالوں سے ہار تا آ رہا تھا اس بار بھی ہار گیا اور جب وہ سگریٹ کے کش لگائی ۴ اصغر کی گود میں پیر رکھے ہوئے تھی اور اصغر بڑی مہارت سے اس کے پیر کی انگلیوں کا ساج کر رہا تھا عین اسی وقت ملازمہ پروین اور ندا کو لے کر اندر داخل ہوئی۔“

”میڈم! یہ سوہالی بی سے ملنے آئی ہیں۔“

”پروین نے اس منظر سے بے حد کراہیت محسوس کی اور ندا بھی شرم سے نظریں چرائی۔“

”سوہا سے؟“

”رہانے پیر تو اٹھا لیے اصغر کی گود سے مگر صوفے کا ایک بھاری کش چھوڑتے ہوئے ان دونوں کے چہرے بغور دیکھے۔“

”نہ پروین سوہا کی دوست ہو سکتی تھیں نہ ندا۔“

”میں۔۔۔ میں وصی کی ممانی ہوں اور یہ اس کی بہن۔“

”پروین نے اس کی آنکھوں میں استفسار دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی آپ اپنا تعارف کرایا۔“

”اوہ۔۔۔ اس نے جلدی سے سگریٹ اینش رُے میں بھجائی اور کھڑی ہو گئی۔ اصغر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی تقلید کی۔“

”تم کھڑی کیا نہ دیکھ رہی ہو۔ جاؤ سوہا کو لے کر آؤ۔“

”وہ جی انہوں نے منع کیا تھا انہیں کوئی نہ جگائے۔ رات پونے تین بجے تو وہ گھر آئی تھیں۔“



ملازمہ کی اطلاع پر پروین اور ندا ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔  
 ”آپ باہر تشریف لے رہیں۔“  
 رہتا ہو کھلا کے آداب میزبانی نبھانے لگی۔ اس کے انداز دیکھ کے اصغر کو بھی لگا کہ آنے والے مہمان خاص  
 انہیں ہوں گے ورنہ رہتا ہر ایک کو گھاس ڈالنے والوں میں سے نہیں۔  
 پروین اور ندا بہت تکلف کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ بارہ بندہ منٹ کے انتظار کے بعد سوا تیزی سے  
 بیڑھیاں اترتی نظر آئی۔ اور ندا اس پہلی نظر ڈالتے ہی حیرت سے گھڑی ہو گئی۔



وصی سر جھکائے سن رہا تھا اور پروین اور ندا دونوں دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔  
 ”وہ سوا ہے۔ وہ؟“

ندا نے لیکن سے انداز میں اس پہ چلا رہی تھی۔  
 ”وہ۔۔۔ کانج کی سب سے بدنام لڑکی! کیا ہو گیا ہے تمہاری پسند کو وصی؟“  
 ”دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا؟ اور کیا؟“

پروین بڑبڑائیں۔ ذہن سے وہ منظر ہی محو نہیں ہو رہا تھا۔  
 ”غضب خدا کا۔۔۔ یہ شرفاء کے اطوار ہوتے ہیں کیا؟ ہسٹ کے کش لگاتی مشینوں کی طرح لیٹی تھی۔ بغیر  
 دھپے کے اور وہ جو رو کا غلام ٹائی لگائے، کوٹ پہنے گود میں اس کے پیروں کے مانشیا بننا ہوا تھا۔ یہی حال وہ لڑکی  
 تمہارا کرنا چاہتی ہوگی جس عورت نے اس کی تربیت کی ہے وہ وہاں کی ہے جہاں مردوں کو اسی طرح جوتے کی نوک  
 پہ رکھا جاتا ہے۔“  
 ”مائی وہ بہت حساس اور دکھی لڑکی ہے اسے ہمارے گھر کا ماحول اور آپ سب کی محبت ملے گی تو وہ سنبھل  
 جائے گی۔“

”نہیں وصی! یہ گھر کوئی تجربہ گاہ نہیں ہے جس میں یہ ملے کہ اس گھر میں ایسی کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔“  
 شوکت جہاں نے جتنی انداز میں کہا۔

”پروین تم اپنے بھائی کے ہاں فون کرو۔ انہیں اطلاع دو کہ ہم اس اتوار ان کے ہاں آرہے ہیں۔“  
 ”جی۔۔۔ اچھا۔“ وہ پھرتی سے انھیں۔  
 ”اور یہ بھی بتا دو کہ کس مقصد سے آرہے ہیں۔“ ان کے اضافہ کرنے پہ وصی پہلو بدل کے رہ گیا۔  
 ”مافو! بھٹنڈے دل سے غور کریں تو آپ۔“

”وصی پیڑنہ۔ غور تم کرو۔“ ندا نے ڈالتے ہوئے کہا۔  
 ”ہیشہ تم مجھے اچھا براؤ اور پیچ سمجھاتے رہے ہو۔ پھر آج تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ لڑکی کسی بھی طرح  
 تمہارے قابل نہیں۔ کل کو تم کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہو گے۔“  
 ”اور ذرا سمجھ داری سے کام لو۔۔۔ ندا کی شادی ہونے والی ہے اور وہ بھی غیروں میں کتنا اثر پڑے گا اس کے  
 رشتے پہ بھی اس عورت سے تعلق قائم ہونے کا۔“  
 وصی بے بسی سے گھراساں بھر کے رہ گیا اور اٹھ کر بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔



”اصغر۔۔۔ اتم کہیں جانے کی بات کر رہے تھے؟“  
 رہنا نے حد سنجیدی سے اس سے پوچھا۔  
 ”ہاں۔۔۔ لیکن ابھی ہماری بیگم کے شانہ و شان نہیں میں ملایشیا اور سنگاپور۔۔۔ سستے پڑھتے ہیں نا اس لیے  
 تو جناب اب ہم پلاننگ کریں گے لندن کی۔ یا پھر۔“  
 ”ملایشیا ٹھیک ہے۔ ٹکٹ جلدی مل جاتا ہے وہاں کال کی سیٹ بک کروالو۔“  
 ”خیر تو ہے؟“ وہ اس سنجیدی پہ ٹھنکا۔  
 ”ہاں فی الحال تو خیر ہے ویسے ہی سوچا سوا کا دل بھی بھل جائے گا۔ کچھ وقت ہمیں بھی ایک ساتھ گزارنے کو مل  
 جائے گا۔“ بہت مشکل سے وہ اپنے چہرے پہ مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوئی اور اصغر بھل گیا۔  
 لیکن سوا کو ہلانا اتنا آسان نہیں تھا۔

”اتنا اچانک پروگرام۔“  
 ”تم جاؤ گی تو میں جاؤں گی ورنہ۔۔۔ تمہیں تو پتہ ہے تمہارے چاچو سے زیادہ بور کوئی اور نہیں ہے اس دنیا میں۔“

”میں نے منع نہیں کیا لیکن کل ہی؟“  
 وہ سمجھ رہی تھی کہ اصغر سے گزشتہ دن ہلاک کشیدگی رہنے کے بعد رہنا پہلی بار خود سے پیش قدمی کر رہی ہے اور  
 ان دونوں کا چند دن کسی اچھے مقام پر رہنا بہت خوشگوار اثرات مرتب کرے گا لیکن دوسری جانب وصی سے دور  
 رہنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دونوں تو گزرتے تھے پہلے پہلے پار کی بارش میں بھٹکتے ہوئے۔ ابھی تو دل کی  
 دھڑکی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ سیرانی کا لگا سا بھی احساس نہ جاگا تھا۔ ایسے میں وہ چند دنوں کے لیے ہی کسی  
 گراچی دور کیسے چلی جاتی۔ کچھ اس کی ممانی کا وہاں آتا۔ بغیر کچھ کہنے چند منٹ بعد ہی روکے پھلے انداز  
 میں چلا جاتا۔ یہ بھی اسے الجھا رہا تھا۔

اس نے وصی کا نمبر ملایا۔  
 ”ہاں سوا بہت جلدی جاگ گئیں تم؟“  
 اس وقت وہ اس سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا اس لیے گڑبڑ کے اتنا ہی کہہ سکا۔  
 ”مظنر کر رہے ہو؟“

”ہاں۔۔۔ کل تمہاری ممانی آئیں تو میں وہاں تک سو رہی تھی اس لیے۔ شاید وہی غصہ نکال رہے ہو لیکن  
 رات میں بھی تو اطلاع نہیں دی ان کے آنے کی۔ ورنہ میں کسی نہ کسی طرح جاگ ہی جاتی۔ اچھوٹلی رات  
 سو سوتی دیر سے تھی۔“  
 ”جانتا ہوں۔ ظاہر ہے جب گھر میں بچے آئی تھیں تو سوئی چار بجے ہوگی۔“  
 اس کے خشک لہجے پر غور کرتے ہوئے سوا لمحہ بھر کو چپ ہوئی پھر جی سے بولی۔  
 ”رات کو تین بجے گھر آتا میرا معمول نہیں ہے اور نہ ہی دن کو ڈیڑھ بجے جاگتا۔ ایسا ہو تا تو میں کالج کیسے جاتی۔  
 لیکن رات کو میں ایک منہدی کے فنکشن میں تھی اور منہدی کے فنکشن تو رات تین چار بجے تک چلا ہی



کرتے ہیں۔“  
اپنی عادت کے خلاف وسوساتیں پیش کرتے ہوئے سوہا کو برا عجیب سا لگا۔  
”اچھا چھوٹو یہ باتیں۔ میں نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ میں ماما اور چاچو کے ساتھ دو ہفتوں کے لیے ملائیشیا چلی جاؤں؟“

”اس میں مجھ سے پوچھنے والی بات کون سی ہے؟“  
اے بچے بچے انداز میں زبردستی شاشت پیدا کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔  
”تم سے ہی تو پوچھنا ہے اب سب کچھ۔“

اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔  
”ویسے بھی مجھے اگا۔ کل تمہاری ممانی ہمارے ہاں آ کے کچھ آپ سیٹ ہو گئی تھیں۔ ہونا بھی چاہیے اتنے سالوں بعد انہیں سامنے دیکھ کر مجھے بھی بہت عجیب سا مل گیا۔ وہ سب کچھ یاد آگیا جو اچھے بھلے موڈ کو براد کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے یقین ہے انہیں بھی مجھے دیکھ کر کچھ خوشگوار احساس نہ ہوا ہو گا۔ میں کچھ دنوں کے لیے سین سے غائب ہو جاؤں گی تو شاید تم بھی اس مہم میں کامیاب ہو جاؤ۔“  
”مہم؟“ وہ غائب دماغی سے پوچھنے لگا۔  
”مہم نہیں مٹانے کی مہم یا۔ اور کیا لگتا ہے تمہاری اچھی خاصی کھنچائی ہوئی ہے گھر میں۔ تبھی ہوش اُڑے ہوئے ہیں۔“

اس کے انداز اندر ہی اندر سوہا کو بھی ڈر رہا ہے تھے مگر وہ بات کو مذاق میں اڑا رہی تھی۔  
”میں نے تو کہا تھا تمہیں کہ میری محبت تمہیں خوار کرانے کی مگر تم خود دل و جان سے راضی تھے خوار ہونے کے لیے۔“ وہ صبیحے پن سے مسکرا دیا۔  
فون بند ہونے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔  
جو وہ چاہتا تھا کر نہیں سکا۔

اور جو ہونے جا رہا تھا۔ اسے روکنے وہ قادر نہیں تھا۔  
اور تو اور اپنی پسائی کا اظہار وہ اس لڑکی کے سامنے کر بھی نہیں سکتا تھا۔ چند دن پہلے جس کے سامنے بڑے بڑے دعوے کیے تھے تو بہتر یہی تھا کہ وہ کچھ ہونے دیا جاتا۔ جو قدرت کی طرف سے ہو رہا تھا۔ یعنی سوہا کا منظر سے غائب ہونا۔

”لیکن جب میں یہ جانتا ہوں کہ وہ صرف ملک سے باہر نہیں جا رہی۔ میری زندگی سے بھی دور جا رہی ہے۔ اس کے واپس آنے کے بعد سب کچھ بدلا ہو گا۔ میں میرا دل میری زندگی میرے خواب سب کچھ اس کے باوجود بھی اس کے جانے کے خیال سے میرا دل بوجھل کیوں نہیں ہو رہا؟ میری آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں ہیں؟ میں اسے روک کیوں نہیں پا رہا؟ اسے اپنے دل سے کوشش کیوں نہیں کر رہا؟ کیا مجھے اس سے محبت بھی ہی نہیں؟ کیا یہ جذبہ جو اچانک میرے دل میں اس کے لیے جاگ اٹھا۔ یہ محبت کا نہیں ہمدردی کا جذبہ تھا؟ کیا میں ایک دوست کی حیثیت سے صرف اس کی زندگی میں کچھ آسانیاں کچھ خوشیاں لانا چاہتا تھا۔“



یہ سوچ اس شخص کی تھی۔ جس کے لیے سوہا نے اپنے دل میں سب سے بڑھ کے محبت محسوس کی تھی۔  
اور تقدیس۔۔۔ وہ لڑکی۔ جس سے سوہا نے زندگی کی سب سے سچی اور بے لوث دوستی کی تھی۔۔۔ وہ لڑکی بھی اس کے جانے کی خبر سن کر شامت سی ہو گئی۔  
”I will miss you یا را!“  
”میں بھی۔“

تقدیس دل ہی دل میں اس کی محبت اور خلوص کے سامنے شرمندہ ہو رہی تھی۔  
”کیا لاؤں تمہارے لیے؟“

اس کے احساسات سے بے خبر سوہا سے پوچھ رہی تھی۔ تقدیس کو اس کے جانے سے اطمینان کا احساس صرف اس لیے ہو رہا تھا کہ اگلے ہفتے تحریم کی شادی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ تقدیس کی بہن کی شادی ہو اور اپنی سب سے عزیز اور قریبی دوست کو وہ نہ بلائے۔ دوسری جانب اسے اپنی ماں کی جانب سے شدید خطرہ تھا۔ اگرچہ سوہا نے اپنے رنگ و ڈھنگ۔ اپنا پیٹاوا۔ اپنی بول چال عادتیں سب خاصی حد تک بدل لیا تھا لیکن اب بھی وہ مدیحہ کے مرتبہ معیار سے بہت دور تھی۔ انہیں تو بلند و بالا تک ہفتے تک لگانے والی لڑکی و اہیات لگا کرتی تھی۔ ایسے میں جب سوہا نے دو ہفتے کے لیے بیرون ملک جانے کی خبر سنائی تو یہ تقدیس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔



منزہ نے ریسیور رکھا اور بڑے جوش کے ساتھ پلٹی۔ اندر داخل ہوتے نوید مراد نے تعجب کے ساتھ دیکھا۔ اس کے چہرے پر یہ جھک اب کم کم نظر آتی تھی۔  
”اب تو آپ کو ماننا ہی ہو گا میں ایک بار جو عثمان لیتی ہوں کر کے رہتی ہوں۔“  
”کیا ہوا؟“

”پروین کا فون تھا۔“ فحشی سرشاری اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔  
”وہ اپنی ساس اور ماں کے ساتھ آ رہی ہے وشمہ کا رشتہ لے کر۔“  
”واقعی؟“ نہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔

وشمہ کے لیے ایسی سسرال اور ایسے لڑکے کے انہوں نے خواب دیکھ رکھے تھے اور وہ جانتے تھے وہ صرف خواب دیکھنے تک محدود رہنے والے شخص ہیں۔ یہ منزو تھی جس نے ان خوابوں میں تعبیر کا رنگ بھرنے کے لیے تگ و دو کی تھی۔

”تم نے وشمہ کی ماں ہونے کا حق ادا کر دیا۔“

نوید کے اعتراف نے اسے آسمان پہ پہنچا دیا۔

اس آسمان پہ۔۔۔ جہاں اس وقت اس کی بیٹی پرواز کرتی اس ملک سے دور جا رہی تھی۔  
وہ بیٹی۔ جس کی ماں ہونے کا حق وہ ادا نہ کر سکی تھی۔

باقی آئندہ شمار کریں



# کھنکھناتے دل

طرح جنم لیا اور ماں کی حسرت پر ٹھنڈی سانس بن گیا۔ وہ روئی بھر ہنسی پھر روئی مگر دامن خالی کا خالی رہا۔ آنسو ہنسی سب ایک جھوٹی سی قبر میں جا کر بسیرا کر بیٹھے۔  
”یہ پاگل عورت اپنا آپ نہیں سنبھال سکتی میرے بچے کیا سنبھالے گی۔“  
شوہر اسے واپس گھر چھوڑ گیا اور وہ گھر کے اندر پھر سے گم ہو گئی۔  
گھر کو شیشے کی طرح چمکاتی رہتی۔ ماں دوپٹے میں منہ دے کر روئی رہتی۔  
”میری بچی بگلا گئی ہے۔“  
باپ گھر کے دیکھتا نہ تھا۔ ہم لے اس جنم جلی کا۔ یہ بگلا نہیں گئی ہے۔ ہم سب کو پاگل بنا رہی ہے اگر دنیا کی خبر نہیں ہے تو اس کی قبر روز کیوں جاتی ہے۔ یہ کون جانے وہ کون ہے۔“  
”کیوں نہ جانے کی کہ وہ کون ہے رجو کے لبا وہ ماں ہے۔“  
”پر تو کیا سمجھ گ عورت کا دکھ۔“  
ابا نے منہ موڑ کر دو تین مغالطات کہیں۔ چہین نہ آیا تو جو پانی پینے کو منگایا تھا۔ وہ گلاس اس کے منہ پر کھینچ مارا۔  
”ہائے ماں۔۔۔“ وہ وہیں بیٹھ گئی۔  
ماں بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی مگر وہ وہیں آگے کر کے ماں سے کچھ بولے بغیر اٹھ گئی تھی۔ ماں نے اس کی کمر کو دیکھا اور پھر سے رونے لگی۔  
”کوئی کیوں نہیں سمجھتا یہ ماں ہے۔“  
عورت ماں بن جائے تو روح بن جاتی ہے یہ بھی روح بن گئی ہے۔ اس کے چھوڑے ہوئے شوہر کے بچے بھی کبھی اس سے چوری کی طرح وقت چرانے آجاتے تھے۔ اس دن وہ ان کے لیے گرم گرم آلو بھرے پرانے بنائی جی بھر کے ان کی من مرضی سے وقت انہیں دیتی اس دن لگتا رجو پھر سے ٹھیک ہو گئی ہے۔

باپ ایسے میں دیکھتا تو کہتا ”اب بنوں کہاں گیا پاگل پن یہ لڑکی تجھے اور مجھے پاگل بناتی ہے تاکہ ہم اسے کچھ نہ کہیں۔“ کبھی تجھے یہ اللہ لوگ لگتے ہیں کبھی دیوانی کبھی

جب اسے پہلی ٹھوکر لگی وہ اٹھارہ برس کی تھی۔ زندگی اس کے لیے بہت سادہ سی تھی۔ گھر اور چار دیواری کے علاوہ اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا مگر جب زندگی نے آنکھ چار کی تو اس کے سامنے کرم دن تھا۔ گاؤں کا سب سے اوکھا لڑکا جس کی نظر میں کسی کی اوقات چری سے زیادہ نہیں تھی اور ہوا یہ کہ وہ کرم دین اس پر مر مٹا۔ سب لیاں اس کی قسمت پر رشک کرنے لگیں اور وہ اترا اترا کر ان کی ہنسی جیسے کسی نے۔ تاج محل کا اک کونہ ہی کسی پر اس کے نام کر دیا ہو۔

تاج محل جیلہ کے منگیتر نے پہلی عید پر چپکے سے تختہ دیا تھا اور وہ اس کا بیج کے تاج محل کو دیکھ دیکھ کہ اس محل کے ایک کونہ بھر کو اپنے نام کرنے کی دعا کرنے لگی تھی زندگی نے یہ دعا قبول کی سمجھت اس کے لیے ہاں ہاں اور صرف ہاں تھی اور ہمیں اس نے ٹھوکر کھائی تھی۔

بڑا نوالہ کھانے سے حلق میں پھنس جاتا ہے اور چھیل کر اترتا ہے اور محبت کا یہ بڑا نقد اس کے حلق چھیلتا ہوا اترتا تھا۔

بدنامی سر میں خاک کی طرح آکر چکنے لگی تھی۔ وہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔

کرم دین گاؤں سے غائب ہو گیا تھا۔ ابا نے اس کو چالیس سال کے دو بچوں کے باپ سے بیاہ دیا۔ وہ چپکے سے گھر سے نکال دی گئی تھی جہاں گئی وہاں بھی عزت سے خالی تھا۔ دن رات اسے مارتے پیٹتے دن یہ دن آئے اور گزر گئے۔ اس کے ہاں پہلی اولاد نے دکھ کی

ماں مجھے تو یہ چڑیل لگتی ہے چڑیل کھاٹھی مری پر کھوں کی عزت کو۔“  
”ہاں ہاں۔۔۔“ کرتی ماں منہ پر دوپٹہ رکھ کر حیران رہ جاتی اور وہ ان سے بے پروا ہو کر زندگی بتاتی پھر یہ کوئی سات برس کی بات تھی جب اچانک گاؤں میں کرم دین اپنی بیوی کے ساتھ واپس آیا۔ وہ اس سے جان کر پچھتا پھر رہا تھا۔ دو سوتوں نے سات سال کی کہانی کہہ سنائی تھی۔ وہ بچے کی قبر پر بیٹھی تھی جب وہ آیا تھا۔  
”ابھی تک نہیں بھولی اس غلطی کو۔“  
اس نے سراٹھا کر دیکھا مگر ایک لفظ نہ کہا۔  
”سنا ہے تیری شادی ہو گئی ہے۔“ کرم دین نے اس سے پوچھا۔  
”ہاں ہو گئی ہے“ میرا ایک بیٹا ہے اس کا نام زمان رکھا ہے میں نے بہت خوب صورت ہے۔“  
”پاگل۔۔۔“ وہ نہایت ہی بات تھی کہ اسے پرانی کہانی کا اتنا اہم کردار اسے بھول گیا تھا۔  
”تجھے پھر محبت ہوئی کبھی۔“  
”میں نے محبت نہیں کی تھی۔ میں نے تو عشق کیا تھا اور عشق اک بار ہوتا ہے۔ رتو مروت کی ذات۔ تو کیا جانے۔ عشق کیا ہوتا ہے۔ تیرا عشق تو سر سے لے کر پیر تک دامن سے پائیں صرف خود تو ہی ہے پھر تو کیا سمجھے گا عشق کیا ہوتا ہے؟“  
عورت عشق کر لے تاں تو سر سے پیر تک نال و مکان سے حرف و بیان تک ہر چیز سے نکل جاتی ہے پھر وہ عشق میں مکمل ہو جائے تو روح بن جاتی ہے اور روح سے تجھ جیسے حریف دنیا کوئی مزہ نہیں لے سکتے۔ دیکھ میں بیٹھی ہوں اب ہے تجھ میں بہت چھوگر کھا۔“

کرم دین نے تسخیرانہ انداز سے اس کی طرف قدم بڑھائے مگر کوئی طاقت تھی جس نے اس کی انگلیوں کے لمس کو اس کا بدن چھوئے نہیں دیا وہ بھاری وجود سے کھڑا تھا۔

”سات سال سے تیری اولاد نہیں ہوتی۔ تیری اولاد تو یہاں دفن ہے ناں“ ہے تجھ میں بہت اقرار

کرم دین نے تسخیرانہ انداز سے اس کی طرف قدم بڑھائے مگر کوئی طاقت تھی جس نے اس کی انگلیوں کے لمس کو اس کا بدن چھوئے نہیں دیا وہ بھاری وجود سے کھڑا تھا۔

کرم دین نے تسخیرانہ انداز سے اس کی طرف قدم بڑھائے مگر کوئی طاقت تھی جس نے اس کی انگلیوں کے لمس کو اس کا بدن چھوئے نہیں دیا وہ بھاری وجود سے کھڑا تھا۔

”سات سال سے تیری اولاد نہیں ہوتی۔ تیری اولاد تو یہاں دفن ہے ناں“ ہے تجھ میں بہت اقرار

کرنے کی۔ اس کی بیوی اس کی پشت پر کھڑی اس کی زندگی کا ج سن رہی تھی۔ وہ اٹھ کر وہاں سے گھر آگئی۔ گھر میں ماں بیٹھی تھی۔ باپ لاچار پڑا تھا اور وہ اس کے لیے گرم گرم مٹی بن کر لائی تھی۔

اس نے باپ کو اٹھایا۔ بہت محبت سے منہ دھلایا اور لپاکی آنکھ میں آنسو تھے۔

”میں کہتا تھا تو اللہ لوگ نہیں ہے تو چڑیل ہے پر تو تو ماں ہے۔ میری رجو میرے سر پر تیرا سایہ ہے۔ سدا رہے۔ غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے۔ اللہ معاف کر دیتا ہے پر ہم رذیل انسان نہیں چوڑے غلطی پر طعنہ دیتے رہتے ہیں پر تو نے کبھی اف نہیں کی۔ رجو تو نے کبھی اف نہیں کی۔ تو واقعی روح ہے پوری کی پوری روح۔“

رجو کچھ کہے بغیر ابا کو پانی پوے کر نکلا جھٹنے لگی۔  
”میری ماں مجھے بھول گئی پر تیری شکل۔“ ابا کی آنکھیں پھر سے جھلکانے لگی تھیں۔  
آج اس کی آنکھ میں بھی آنسو تھے مگر آج اس کی آنکھ میں نری تھی شعور تھا۔ زندگی نے اسے طعنہ دیتے دیتے تنہا لگا دیا تھا۔  
وہاں کھلانے لگی تھی۔  
وہ روح بن گئی تھی اور روح کو طعنہ دو تنہا لگا دیا زندہ جلاو۔ اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

رجو کچھ کہے بغیر ابا کو پانی پوے کر نکلا جھٹنے لگی۔  
”میری ماں مجھے بھول گئی پر تیری شکل۔“ ابا کی آنکھیں پھر سے جھلکانے لگی تھیں۔  
آج اس کی آنکھ میں بھی آنسو تھے مگر آج اس کی آنکھ میں نری تھی شعور تھا۔ زندگی نے اسے طعنہ دیتے دیتے تنہا لگا دیا تھا۔  
وہاں کھلانے لگی تھی۔  
وہ روح بن گئی تھی اور روح کو طعنہ دو تنہا لگا دیا زندہ جلاو۔ اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

رجو کچھ کہے بغیر ابا کو پانی پوے کر نکلا جھٹنے لگی۔  
”میری ماں مجھے بھول گئی پر تیری شکل۔“ ابا کی آنکھیں پھر سے جھلکانے لگی تھیں۔  
آج اس کی آنکھ میں بھی آنسو تھے مگر آج اس کی آنکھ میں نری تھی شعور تھا۔ زندگی نے اسے طعنہ دیتے دیتے تنہا لگا دیا تھا۔  
وہاں کھلانے لگی تھی۔  
وہ روح بن گئی تھی اور روح کو طعنہ دو تنہا لگا دیا زندہ جلاو۔ اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

رجو کچھ کہے بغیر ابا کو پانی پوے کر نکلا جھٹنے لگی۔  
”میری ماں مجھے بھول گئی پر تیری شکل۔“ ابا کی آنکھیں پھر سے جھلکانے لگی تھیں۔  
آج اس کی آنکھ میں بھی آنسو تھے مگر آج اس کی آنکھ میں نری تھی شعور تھا۔ زندگی نے اسے طعنہ دیتے دیتے تنہا لگا دیا تھا۔  
وہاں کھلانے لگی تھی۔  
وہ روح بن گئی تھی اور روح کو طعنہ دو تنہا لگا دیا زندہ جلاو۔ اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔





## عزیز صبر

”اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے“ یہ مصرع میں نے جانے کب اور کہاں پڑھا تھا لیکن اس کا مطلب لی۔ اے کے فوراً بعد سمجھ میں آیا جب میں نے ابھی یونیورسٹی کی آواز فضاؤں میں اڑنے کے خواب دیکھنا شروع ہی کیے تھے کہ بربری طرح کاٹ دیے گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ کاٹ پیٹ دیے گئے یعنی میری شادی خانہ بربادی (اوہ سوری چڑے کی زبان بھسل ہی جاتی ہے) میرا مطلب تھا شادی خانہ آبادی طے کر دی گئی تھی کچھ دن تو اسی حیرانی پریشانی میں گزر گئے کہ یہ سب اتنی اچانک ہوا کیونکر زور ہوش آیا تو اس متوقع شادی کو ٹالنے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کیا، انگوٹھی، بسن ہونے کے ٹالتے طے والی اہمیت

## نالی لپٹ

جس تن لائے سو تن جانے، ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں میں لیے راحیلہ سے رابطہ کیا اس سے ہی کچھ امید تھی کہ وہ میرا غم سمجھ لے گی اور کوئی حل بھی بتائے گی۔

راحیلہ نہ صرف پھوپھی زاد بلکہ دوست بھی تھی سارا بچپن مل کر شرارتیں کرتے اور مار کھاتے گزرا تھا سو ہم ایک دوسرے کے کچھ زیادہ ہی ”قربیب“ تھے یہ اور بات کہ انسانیت کا یہ مظاہرہ ہماری مائیں کرتیں تو ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتا (یعنی شرارت پر مارتے ہوئے جب وہ بالکل لحاظ نہ کرتیں کہ اپنی بیٹی کو مار رہی ہیں کہ





دوسرے کی خبر جی اپنا دکھڑا اسے سنایا کہ کیسے راتیں تارے گن گن کر رہی ہیں۔  
 ”دیکھو شکمہ! آسمان کم مجھ سے تو جھوٹ مت بولو“  
 کیا میں جانتی نہیں کہ تمہارا ہتھ کتنا خراب ہے اتنے سارے تارے گنتا تو دور کی بات ہے ابھی تم سے پوچھا جائے کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو تم یقیناً ”چکر“ میں پڑ جاؤ گی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم میٹرک میں دوبارہ ہتھ کی وجہ سے ہی رہ گئی تھیں اور۔“  
 اتنے ناؤک اور اہم مسئلے پر بات کرتے ہوئے وہ نہ جانے کون سے وقت کا بدل لے رہی تھی ظالم خوب ناگ کر نشانے لگا رہی تھی لیکن فی الحال میں سننے پر مجبور تھی۔

”تم نہیں جانتیں راجی! کہ میرا سارا دن روتے ہوئے گزرتا ہے۔“ اس کا دل نرم کرنے کو دوڑنے سے آنکھیں رگڑ کر آنسو نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے مسکین کی شکل بنا کر بولے۔  
 ”تمہاری آنکھیں دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ ان سے ایک بھی آنسو بہا ہو گا جہاں کہ سارا سارا دن روتا۔ وہ شقی نظروں سے میری آنکھوں کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے بولی۔

”اف! آج کل لوگ کس قدر منہ پھٹ اور بے مروت ہو گئے ہیں۔“ میں یہ سوچ کر ہی رہ گئی۔

”بناؤ کیا بچ میں روٹی تھیں؟“ میری خاموشی سے شہ پاکر وہ مزہ لینے کے انداز میں بولی۔

”تم کیا جانو جو آنسو آنکھوں سے نہیں بہتے، دل پر گرتے ہیں اور زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔“ میں تو جیسے پھٹ ہی تو پڑی حد سے بھی جان پرستی ہے اور وہ۔ اور میرا فقرہ پورا ہونے کی دیر بھی کہ اسے جیسے ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

”لطفت ہے مجھ پر جو تم سے مشورہ کرنے آئی۔“ اس کی بے بسی پر افسوس کرتے زبان سے خود پر لیکن دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجتے ہوئے میں اپنے پورشن کی طرف چلے آئی۔

ہماری اس حویلی نما گھر کے چار پورشن ہیں ایک پورشن میں میرے تایا جی اور دوسرے میں باقر چاچو رہتے ہیں۔ تیسرا پورشن چھوٹی پھوپھو کے زیر تصرف ہے اور چوتھے میں ملبدولت اپنے دو عدد پیارے پیارے بھائیوں اور امی ابو کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ ہمارے اس پیارے سے بڑے سے گھر میں جہاں ہم مل جل کر رہتے تھے، آج تک راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا مگر یہ اچانک طے پا جانے والا رشتہ افنا ماننا ہوتا جانے کون ہے دیکھنے میں کیسا ہے بولنا کیسے ہے میرے ذہن میں شہر لدوں کی سی ان بان والا گلابی کا دروازہ کھول کر فانیو اشارہ مول میں داخل ہوتا آئیڈیل آکھڑا ہوا۔

”کیسا ہے کون ہے وہ جانے کہاں ہے جس کے لیے میرے ہونٹوں پہ ہاں ہے۔“ بڑوس سے آئی گائے کی آواز مجھے ایک اور رخ پر سوچنے پر مجبور کر گئی تھی۔

”کیسا ہو گا وہ؟“ ڈھیر سارے سوالیہ نشان میرے سامنے تھے اور میرا چہرہ تو بقول راحیلہ پہلے ہی سلیم شیخ کی مانند سوالیہ نشان تھا بس نیچے نقطے کی کمی تھی جو کہ کابل کے محل سے پوری کی جاسکتی تھی۔

”آئے ہائے لڑکی کیا ہے گا؟“ تمہارا بھلا سوچو کوئی تو گن ہوں لڑکی میں؟ تمہیں تو کوئی عقل کا اندھا ہائی بیاہ کر لے جائے گا۔“

ہماری شان میں گستاخی کرنا یہ فقرہ اکثر و بیشتر راوی حضور کی زبان پر رہا کرتا تھا جسے وہ ہمیشہ خاص انداز میں ہاتھ تھوڑی پر رکھ کر اور بڑے پر فکر انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا کرتی تھیں، ”آج سے پہلے تو میں نے اسے اور اس جیسے کسی فقرے کو کوئی لفٹ نہ کرائی تھی اور ہمیشہ اپنی خودی کو بولا، رکھا تھا مگر اب۔۔۔ راوی اماں جیسی نیک خاتون جھوٹے تو بولنے سے رہیں۔

”ہائے اللہ! ضرور کوئی نا کوئی نقص ہو گا اس میں“ اور یہ عقل کا اندھا ہوتا نہیں کیسا ہوتا ہے؟“ ایک تو یہ محاورے کبھی سمجھ میں آگرنہ دے۔

”لیکن آخر کیا کیا جائے؟“ ایک اور سوالیہ نشان الف میں اپنا دل اور سر تمام کر رہ گئی۔



”ان دنوں میں اکثر“ یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں، اور دوست کیا خوب وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں۔“ جیسے گیت اور غزلیں سنتی رہتی ”آنسو بہانے کی بھرپور لیکن ناکام کوشش کی مگر ایک بات اچھی طرح میری سمجھ میں آئی تھی کہ بھی رونا رانا کوئی اتنا بھی آسان کام نہیں۔

”ہائے ہائے یہ کیا سوگ کے گیت لگا رکھے ہیں“ میں کہتی ہوں خبردار! جو آئندہ ایسا کوئی گیت میں نے اس گھر میں سنا، حد ہو گی شادی کا گھر اور ایسے گیت ہمارے زمانے میں تو۔“ راوی جان عم منانے کی راہ میں رگلاؤت ہو گئیں صورت پر بھی شاید کافی سے زیادہ مسکینیت طاری ہو گئی، ”سوداوی جان کو مجھ پر ترس آئی۔“ ”میری چند! ایسا حال بنایا ہوا ہے اپنا دیکھو تو کتنا سامنے نکل آیا ہے۔“

اللہ جھوٹ نہ بلوائے میں غم غلط کرنے کو آدھا درجن کیلے کھا کر کمرے سے نکلی تھی تو راوی جان سے سامنا ہو گیا تھا، اور اب ان کا یہ لاڈ بھر فقرہ ”اور انداز میں بے ہوش ہو جاتی اگر جو پچھلے کچھ دنوں میں اس قسم کے ڈانٹ لڑنے کی عادی نہ ہو چکی ہوئی۔

”کچھ کھلایا یا کرو میری بیٹی کی تو دن ہوتے ہیں پھر تو۔“ اس پھر تو تھے آگے آنسوؤں نے اتنی ٹھنڈی آہ بھری کہ میں اتنی گری میں بھی غصہ کر رہ گئی۔

”تو گویا آگے فاتوں کا فل انتظام ہے۔ اس کا مطلب کوئی کنگا ہی ہے ہائے میرے نصیب!“ ان سے بھی زیادہ ٹھنڈی آہ میرے منہ سے نکلی تو راوی چو نکلیں۔

”ارے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اللہ بہتر کرے گا۔“ اس دم راوی کی یہ بات خالی خالی فلفلی ہی محسوس ہوئی۔

”ماں باپ کے حکم اور رضا پر قربان ہو جانے والی مشرقی دہشتور“ اپنے لیے یہ فقرہ سوچتے ہی اپنی عزت اپنے دل میں بچھ اور بڑھ گئی۔

”کچھ بھی ہو راجی! مگر ایک بات ہے جس سے یہ رشتے کی بات ہوئی ہے“ اپنے تو مزے ہو گئے ہیں گھر میں وی آئی بی کی سی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ملبدولت کو۔ میں نے فرضی کار بھجارتے ہوئے راحیلہ کو بتایا اتنی عزت و تکریم ملنے پر (اور کچھ ماں باپ کی رضا پر قربان ہو جانے والی بات سوچنے کے بعد) شادی کا غم کافی حد تک کم ہونے لگا تھا۔

”وی آئی بی! میں میڈم! یہ کہو کہ تمہاری حیثیت قربانی کے برابر کی سی ہو گئی ہے جسے اسے قربانی سے پہلے خوب کھلایا پایا جاتا ہے ایسے ہی تم بھی قربانی کا بکرا۔“ سارے خرو غور پر پانی پھیرتے ہوئے وہ فقرہ ادھور اچھوڑ کر مزے سے اتنی کھاتے ہوئے پچھارے لینے لگی۔

”کم از کم اپنی گرامری ٹھیک کر لو یہاں بکرا نہیں بکری کہا جائے گا۔“ میں نے اپنی دانست میں اس دن کی ریاضی والی بات کا بدلہ چکایا۔



”سنیے کیا یہ باقر چاچو کا گھر ہے؟“ سنا تھا کہ غم زدہ لوگ مثلاً ”شاعر وغیرہ پھول کلیوں سے خاموشی کی زبان میں حال دل کہا کرتے ہیں سو میں بھی لان میں یہی کرنے آئی تھی مگر خاموشی کی زبان میں باتیں کرتے کرتے جانے کب آنکھ لگ گئی تھی کہ اچانک اس آواز پر چونک گئی۔ ہمارے بالکل ذاتی باقر چاچو کو اتنی اپنائیت اور حق سے چاچو کہنے میں نے اس چھ فٹے اجنبی کا سر سے پاؤں تک خوب غور سے جائزہ لیا۔

”محترمہ! معاف بعد میں کر لیجیے گا، ابھی میں بہت تھکا ہوا ہوں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ اس طویل خاموشی پر وہ ہیزاری سے بولا تو میری نظر اس کے دونوں ہاتھوں میں موجود ہماری بھر کم بیگلوں پر پڑ گئی۔

”کافی لمبا پروگرام بنا کر آئے ہیں صاحب زادے!“ اس کے سوال کو ایک بار پھر نظر انداز کرتے اپنے آپ سے گفتگو میں مصروف تھی۔

”ارے یاد رہائی! آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں







جایا کرتی تھیں۔  
 ”ہاں ہو یاد آیا، یہ اپنی شانہ کی شادی پر کیا لا رہا ہے  
 تمہارا بھائی؟ آخر کو اکلوتا ماموں ہے اور بھانجی بھی  
 اکلوتی ہی ہے، کہہ دینا اسے کہ خیال رکھے پوری  
 برادری جمع ہوگی شادی پر۔“ چتا نہیں داوی جان کے  
 ترکش میں کتنے تیرتے تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں  
 لیتے تھے میں نے کچھ کہنا چاہا، مگر امی کی نیہی  
 نظرس اور گردن کے اشارے پر بہ مشکل اپنے لب  
 بھینچتی خاموش ہو گئی۔  
 امی کی شکایتی اور کچھ جناتی نظروں سے دیکھتی میں دل  
 میں ڈھیروں تاسف سمیٹے وہاں سے اٹھ آئی، امی کی  
 ماموں کے لیے اسی کی وجہ میری سمجھ میں آچکی تھی۔  
 سڑ بدلے گی کبھی تو یہ بری صورت دنیا  
 کل اور طرح کا تھا ہے آج اور طرح کا  
 مجھے ناامید ہونا نہیں آتا تھا، سو اندر کی اداسی پر قابو  
 پاتی ہنستاتے ہوئے لان میں کھیلنے بچوں کی طرف چلی  
 آئی۔

”جلدی سے چینیج کر کے تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں  
 پہنچ جاؤ۔“ میں افسانے میں بری طرح کھوئی ہوئی تھی  
 جیسی فیضانہ ہاوند میرے کمرے میں داخل ہوئی۔  
 ”سنو تو“ میں نے پکارا۔

”اوسے جانے دو نا یا راپڑی اچھی سووی گئی ہے۔“  
 وہ کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھی۔

”تمہارے وارنٹ آرڈر جاری ہو گئے ہیں کیا جو  
 اتنی جلدی میں ہو۔“ وہ پیغام پہنچا کر چھو منتر ہونے کو  
 تھی کہ میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔  
 ”میرے نہیں محترمہ! جناب کے وارنٹ گرفتاری  
 جاری ہو رہے ہیں ڈرائنگ روم میں عمر قید کی سزا  
 پاشقت سنائے گا قل انتقام ہو رہا ہے۔“ وہ بھی آخر  
 میری کزن تھی سیدھی بات کیسے کر سکتی تھی۔

”زحمت نہ تو سیدھی طرح بکواس کر دو کیا ہو رہا ہے؟“  
 افسانہ ڈسٹرب ہونے کی وجہ سے پہلے ہی میرا موڈ

خراب ہو رہا تھا اس لیے اس کی بے گئی باتوں پر  
 جھنجھلا کر بولی۔

”آپ کی ساس صاحبہ تشریف لائی ہوئی ہیں  
 ڈرائنگ روم میں اور نانی جان کا حکم ہے کہ جلدی سے  
 قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاؤ۔“ بس بتایا اب مجھے  
 جانے دو نا، وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی، اور اگلے چندہ  
 منٹ میں، میں ایک زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر  
 سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھی بقول فیضانہ اور راحیلہ  
 اچھی خاصی ہونق نظر آ رہی تھی، اور دل ہی دل میں  
 اس وقت کو کوس رہی تھی، جب ضد کر کے امی ابو کے  
 ساتھ ایک شادی میں شریک ہوئی جہاں اپنی ہونے والی  
 ساس صاحبہ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، اور اس کے  
 کچھ ہی دن بعد وہ پرنسپل کے ساتھ آموجد ہوئیں۔  
 پتا نہیں کیوں مجھے ان کے محبت کے اظہار سے  
 کوفت کا احساس ہوتا تھا، مسکراتے چہرے پر کجی  
 آنکھوں کی سرد مہری اور سختی میرے دل میں عجیب سے  
 بے چینی بھر رہی تھی لیکن یہ سب بانی کسی کو کیوں نظر  
 نہیں آتا، میں نے ایک کوفت بھری نگاہ ڈرائنگ روم  
 میں بیٹھتی باقی افراد پر ڈالی۔

”معلوم نہیں زندگی میں آنے والا اگلا موڑ اپنے  
 ساتھ کیا لانے والا ہے۔“ ایک پُرسوج نظر حاضرین پر  
 ڈالتے ہوئے میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”تم نے غور کیا آج کل واوی جان کافی خاموش اور  
 فکر مند سی نظروں سے ہمیں نکا کرتی ہیں جیسا کہ اس  
 وقت دیکھ رہی ہیں۔“ میں نے راحیلہ سے کہا۔ جو اس  
 وقت شوخی کے موڈ میں تھی۔  
 ”چھپا تم میری اونٹ جیسی گردن کے بارے میں  
 کچھ بتانے والی تھیں تاہنا تو ذرا ایسی ہے میری گردن؟“  
 اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جوابی حملہ کرتی یا اور صاحب  
 جانے کہاں سے نمودار ہو گئے، او یاور! ایسے ہیں  
 آپ۔“ میرے منہ کے بگڑتے ذوالیہ دیکھ کر راحیلہ

کچھ زیادہ ہی خوش اخلاقی سے بولی تو میں نے اور گھور  
 کے اسے دیکھا لیکن وہ نظر انداز کر کے اس کا حال چال  
 بوجھ میں مصروف رہی، حالانکہ بظاہر کوئی ایسی وجہ نہ  
 تھی مگر اسے دیکھتے ہی میرے منہ بن جاتا بقول راحیلہ  
 ”بے چارے معصوم بچے سے تم نے مفت میں ہر  
 ہاندہ لیا ہے۔“ اسے بے چارہ اور معصوم کہنے پر مجھے  
 سخت اعتراض تھا مگر یہ بیروانی بات پر میں بھی سوچ میں  
 پڑ جاتی۔

”یار اتنا کیوں چڑتی ہو اتنا مہذب اور شائستہ سائبندہ  
 ہے اور ویل ایجو کیشن بھی ہے، تمہیں نہیں کیوں فضول  
 میں۔“ راحیلہ کے انداز پر میں چونکی، یاور کچھ فاصلے  
 پر بیچ پر بیٹھا فون سن رہا تھا، اوہ راحیلہ اس پر نظر  
 جمائے اس کی وکالت میں مصروف تھی۔  
 ”ہوں، اور کیا کیا خوبیاں ہیں ان محترم معصوم۔“  
 بے چارے میں؟“ میں نے لڑاکا عورتوں کے اسٹائل میں  
 گم رہا تھا رکھ کر معاملے کی تہ تک جانے کے لیے  
 گویا پوچھنا چھ کا آغاز کیا۔

”ہمارا موت ہے، ہمارا فطرت کا مالک ہے، اس کی  
 آواز بہت اچھی ہے، اور پتا ہے اسے بھی وہی گلوکار اور  
 گانے پسند ہیں جو کہ مجھے اور۔۔۔ ہینڈ سم بھی  
 ہے۔“ اس نے میرے انداز پر توجہ دیے بغیر بڑے  
 جوش سے میرے جنرل تان میں اضافہ کرنا جاری رکھا۔  
 ”اچھا!“ میرے اچھا کو خوب کھینچ کر کہنے پر وہ کچھ  
 چونکی اور میرے تاثرات دیکھ کر کھسپائی سی ہنسی ہنسنے  
 لگی۔

”تو یہ معاملہ ہے؟“ اس کی ہنسی کو خاطر میں لائے  
 بغیر میں نے سوال جواب جاری رکھے۔  
 ”کوئی معاملہ نہیں ہے یا راجو اندر چل کر آؤ  
 کریم کھاتے ہیں رات ہی ابو لائے تھے ڈھیر ساری۔“  
 اس نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں راحیلہ حسن خان؟“ اس کا  
 کا پورا نام لے کر میں نے گویا اپنے غصے کا بھرپور اظہار  
 کیا، اس کے اس طرح پرہہ داری کرنے پر مجھے جج میں  
 بہت غصہ تھا۔

”کچھ نہیں ہے یا رب۔“ اچھے انسان ہیں بس۔“ اس  
 کا انداز ٹالنے والا تھا۔  
 ”بس؟“ میرا لہجہ ابھی تک تھکسا تھا۔  
 ”شاید۔“ میرے پوچھنے پر اس نے پلکوں کی جھار  
 اٹھا کر مجھے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے دوبارہ نظرس  
 جھکائیں، مگر میں اس کی آنکھوں سے جھلکتے جذلوں کو  
 پاچکی تھی، آہ! اب تو مجھے بھی لگنے لگا ہے کہ یہ سڑ  
 یاور ایسے ہی ہیں، بات اوھوری چھوڑ کر میں نے  
 تجسس پھیلایا۔

”کیسے؟“ اس کا سوال کرنا لازمی تھا۔  
 ”معصوم بے چارے۔“ کہتے ہی میں نے وہاں سے  
 دوڑ لگادی اور راحیلہ نے ہستے ہوئے میرے پیچھا کیا  
 بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا یاور موبائل ہاتھ میں  
 لیے حیرت سے ہمارے بدلتے موڈ کو دیکھ رہا تھا۔

”مہ میں یہ کہوں ہمیں کیا کنگا سمجھا ہے انہوں نے  
 جو ایسی بات کی کیا ہم کوئی کمی رکھیں گے ہماری اکلوتی  
 بچی ہے ہم نے تو سارے ہی ارمان پورے کرنے  
 ہیں۔“ واوی جان کے غضب کو نہ جانے کس نے آواز  
 دی تھی مگر ڈرائنگ روم میں امی اور نانی ان کے غصے کو  
 اور ٹھنڈا کرنے میں مصروف تھیں، لفظ ”اکلوتی بچی“  
 نے مجھے چونکا دیا تھا کیونکہ یہ لفظ میرے لیے ہی  
 استعمال ہوا کرتا تھا۔

”آخر معاملہ کیا ہے؟“ میرے اندر کی تجسس لڑکی  
 پوری طرح بیدار ہو چکی تھی، سو میں نے کسی بھی  
 ہمانے ارد گرد رہنے کا فیصلہ کیا اور اس پر فوری عمل  
 کرتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ  
 گئی، آنکھیں ٹی وی اسکرین پر اور کلن ڈرائنگ روم  
 سے آتی آوازوں پر لگا دیے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھو پھو، لیکن آج کا زمانہ  
 ہی کچھ ایسا آٹیا ہے کہ۔۔۔“ نانی امی نے جانے کس  
 بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی کہ واوی جان  
 نے ان کی بات کاٹ دی۔



قلمش

## جلد شاداب، چہرہ گلاب

100% خالص عرق گلاب جس کا روزانہ استعمال جلد کو رکتے

ہر طرز جواں اور خوش صورت

آنکھوں کی جلن، خراش اور آشوب چشم میں بھی نہایت مفید و موثر



بے اختیار مسکرا دی۔  
”ارے رے بار! کوئی جوالی حملہ نہیں، کوئی فائر نہیں، بلکہ دوستانہ مسکراہٹ کا اندرانہ، پلیز کچھ تو کرو اور کچھ نہیں تو فریڈی انیک ہی کرو یا بار! ہمسایا کتنی ہیں ہمیں اتنے دوستانہ رویے کی عادت نہیں۔“ راجی باقاعدہ دہائی دینے پر اتر آئی۔  
”بس کرو خدا کے لیے، مجھے خلیجان ہونے لگا ہے تمہاری یہ روتی بسورتی شکل دیکھ دیکھ کر۔“ میری مسلسل خاموشی اسے تاؤ دلائی لیکن اگلے ہی لمحے اس کا غصہ پریشانی میں بدل گیا، کیونکہ میں اس کے کاندھے پر سر رکھے زار و قطار رو رہی تھی اس نے مجھے نہ ٹوکا نہ جب کرانے کی کوشش کی، بس دھیرے دھیرے میرا سر تھپکتی رہی، جب میرے دل کا غبار کچھ کم ہوا تو میں خود ہی خاموش ہو گئی۔  
”کیوں اتنی پریشان ہو، یہ سب تو روٹین کی باتیں ہیں نا؟ ہر طرف کی سب ہو رہا ہے عام سی بات ہے نا؟ پھر تم کیوں اسے اتنا سیریس لے رہی ہو؟“ میرے خاموش ہوتے ہی اس کے بڑی سنجیدگی سے کہنے پر میری آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔  
”وہو وہو نہ رونا نہیں میری بات کا جواب دو۔“ اس بار وہ مجھے ٹوک گئی۔  
”راجی! میاں بیوی کے رشتے میں سب سے اہم کیا ہوتا ہے؟“ اپنے آنسوؤں پر کنٹرول کرتے ہوئے میں اس سوال کر رہی تھی۔  
”کیا اہم ہوتا ہے؟“ جواب دینے کی بجائے اس نے میرا سوال مجھے لوٹایا۔  
”محبت۔ اور محبت نہ سہی کم از کم خلوص تو ہونا چاہیے، سوچو میں ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنے جا رہی ہوں، جس کے لیے دولت، جائیداد دنیا کی ہر چیز کیا اہمیت ہے سوائے میرے؟“ میں سسکی۔  
”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہاری اہمیت نہیں ہے؟“ اس کے پوچھنے پر میں شکایتی نظروں سے اسے دیکھ کر کہہ سکی کیا اب بھی اس سوال کی متجانش تھی سب کچھ تو واضح تھا۔

”زمانے کی تو تم رہنے والی لی! زمانے کو الزام دینے سے کیا حاصل، شریف لوگوں کا چلن ہر زمانے میں ایک سا ہوا کرتا ہے۔“  
میری داوی تالی جان کی چھو چھو بھی تھیں مگر دوسرا رشتہ (ساس) زیادہ حاوی رہتا، کچھ بچپن سے ہی ان کا رعب دبدبہ ایسا رہا تھا کہ اب بھی ان کے سامنے بات کرتے تالی امی کی جان جاتی تھی۔  
”مگر امی جی! اب یہ بھی تو دیکھیں کہ اتنی سی بات پر ہم رشتہ تو ختم نہیں کر سکتے اور اب تو رشتے کے طے ہو جانے کے بارے میں سب کو معلوم ہو چکا ہے، خدا نا خواستہ کچھ ہوتا ہے تو کس کس کو جواب دیں گے ہم؟“ ابو کے انتہائی مؤذب نرم لہجے میں ہزاروں اندیشے بول رہے تھے، ان کی آواز سے مجھے پتا چلا کہ وہ بھی وہاں موجود تھے۔  
”مگر بیٹا! ابھی ان کے اتنے مطالبے ہیں کل جب ہماری بیٹی ان کے گھر ہوگی تو ان کا رویہ کیسا ہوگا، ہم اندازہ کر سکتے ہیں اور اس وقت ہم زیادہ مجبور ہوں گے۔“ شاید ابو نے لہجے کی بے بسی داوی جان کو پھلانگی تھی جتنی بھی سخت مزاج سہی تھیں تو آخر ایک ماں ہی، اس بار ان کا لہجہ بھی اندھے ٹوں میں ڈوبا ہوا تھا، سارا معاملہ میری سمجھ میں آچکا تھا لی وی بند کر کے میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔



”کیا ہوا ہے منہ کیوں لٹا لٹا لٹکا رکھا ہے؟“ میں بیڑھیوں میں پیشی لان کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سامنے سارے کزن کرکٹ کھیلنے میں مگن تھے، شام بہت خوشگوار تھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، چاروں طرف کیاریوں میں کھلے مختلف رنگوں کے پھول اس منظر کو اور بھی حسن بخش رہے تھے، بظاہر میری نظریں سامنے کھیلنے والوں پر تھیں لیکن میں اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی، جب راحیلہ اچانک میرے پاس آکر بولی، ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے منہ کی لہائی بتانے میں مبالغہ آرائی سے کام لینے پر میں



”اس نے آج تک مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی ملنا تو دور کی بات آج تک ایک فون بھی نہیں کیا“ اسے کوئی غرض نہیں کہ میں کیا سوچتی ہوں میری خواہشات میرے خواب کیا ہیں لیکن اسے صرف بات میں دلچسپی ہے کہ جائیداد میں میرا حصہ کتنا ہے مجھے جہیز میں کیا کچھ ملنا ہے یہ سب جاننے کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ اس کے لیے میری بھی کوئی اہمیت ہوگی؟“ غصہ، شکایت میرے لہجے میں کیا کچھ نہ تھا۔

”برانہ مانو تو ایک بات کہوں؟“ اس کا بات کرنے کا یہ انداز میرے لیے اجنبی تھا جس میں حیران ہوئی۔

”تمہیں کب سے کچھ کہنے کے لیے اجازت کی ضرورت پڑنے لگی؟“ وہی حیرت میرے لہجے میں اتر آئی۔

”اوکے۔“ میری بات کا جواب دینے کی بجائے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”صرف اس بات کی وجہ سے کہ انہوں نے جہیز اور تمہارے حصے کی جائیداد میں دلچسپی ظاہر کی ہے تمہیں دکھ ہو رہا ہے بہت برا لگ رہا ہے لیکن شامل یا راجھی تم نے سوچا کہ تمہارے خواب بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں یاد ہے تاکہ ایسا انڈیل ہے تمہارا“

بے حد ہنسنے اور بے انتہا دولت رکھنے والا جو تمہیں دنیا کی ہر آسائش مہیا کر سکے جب تم نے اپنا نیڈیل بتایا تو تمہیں اس میں کچھ برائی محسوس نہ ہوئی مگر اب اگر وہ ایک خوبصورت دولت مند لڑکی کے ساتھ کا طلب گار ہے تو ہم سب کو کتنا برا لگ رہا ہے یہ دہرا معیار کیوں؟“ زندگی میں پہلی بار میں اسے اتنا سنجیدہ دیکھ رہی تھی بلکہ ہم دونوں ہی زندگی میں پہلی بار اتنی دیر سنجیدہ گفتگو کر رہے تھے اس بات کو جس انداز میں اس نے میرے سامنے رکھا تھا ایسے تو میں نے بھی سوچا ہی نہ تھا آج میری دوست میری بچپن کی ساتھی کس احتیاط سے مجھے آئینہ دکھا رہی تھی پھر بھی اپنا خوب صورت چہرہ جس پر مجھے ہمیشہ فخر ہوتا اس آئینے میں خود غرضی کے رعبوں سے سجا مجھے اتنا برا لگا کہ میں

بے اختیار اس سے نظریں چرائے لگی۔

”ناراض تو نہیں ہو میں؟“ آج اس کا ہر انداز ہی بدلا ہوا تھا ہم تو ہزاروں بار بڑے دھڑلے سے ایک دوسرے کو ناراض کرتے اور مٹاتے تھے مگر آج ”کچھ کرو راجھی! مجھے اتنے خود غرض رشتے میں نہیں بندھنا“ مجھے کچھ نہیں چاہیے بس ایک قلعہ ہم ستر“ مجھے صرف ایک ایسا بندہ چاہیے تھا جو مجھے عزت اور محبت دیتا پورے خلوص کے ساتھ مجھے اپنی زندگی میں شامل کرتا اور مجھے اپنی ذمہ داری سمجھتا وہ ہم سفر اور شریک زندگی کا مطلب مجھے سمجھا سکتا پھر چاہے بہت دولت نہ بھی ہوتی مگر زندگی بہت خوبصورت لگتی یہ بات اب جا کے میری سمجھ میں آئی تھی اور میں راجھی سے مدد کے لیے التجائیہ لہجے میں کہہ رہی تھی ”آنسوؤں نے ایک بار پھر میری آنکھوں کا رستہ دیکھ لیا مگر اس باریہ آنسو خود ترسی کے نہیں بلکہ ندامت کے تھے۔“

”بھائی جان! یہ سب بہت زیادہ ہے اس کی کیا ضرورت ہے آخر“ آواز بھائی کے بتانے پر کہ یوسف ماموں آئے ہیں میں سیدھی امی کے کمرے میں چلی آئی اندر امی اور ماموں ہی تھے امی کے ہاتھ میں ایک باکس تھا قریب جانے پر اس میں گولڈ کا بہت خوبصورت سیٹ دکھائی دیا کچھ اور سلمان بھی نہیں پر رکھا تھا غالباً اس کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔

”وعلیکم السلام کیسی ہو بیٹا! اتنے دن ہو گئے چکر ہی نہیں لگا گھر میں سب تمہیں بہت یاد کر رہے تھے کیا ناراض ہے ہمارا بیٹا؟“

میرے سلام کرنے پر دونوں میری طرف متوجہ ہو گئے اور ماموں شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے لگے کرنے لگے تو میں کچھ شرمندہ سی ہوئی واقعی بہت دن سے میں سب سے ہی حلق توڑ بیٹھی تھی۔

”تمہیں ماموں جان ایسی تو کوئی بات نہیں بس

وہ...“ فوری طور پر کوئی مناسب بہانہ میری سمجھ میں نہ آیا تو وہ ہنس پڑے۔

”سوری ماموں جان! میں نے سیدھے سیدھے سوری کر لیا تھی مناسب سمجھا۔“

”جرمانہ ادا کرو تو معافی مل سکتی ہے، کو دیتی ہو جرمانہ؟“

”جی ضرور بتائیے اپنے پارے ماموں جان کو منانے کے لیے کیا کرنا ہو گا مجھے؟“ میں بھی کچھ دیر کو سب بھول کر اپنی جان میں لوٹ آئی۔

”ہمیں چلو آیا کرو آج میرے ساتھ چلو دو چار دن ہمارے پاس رہو کیا خیال ہے؟“ انہوں نے سوچتے ہوئے جرمانہ عائد کیا جبکہ صاف پتا چلتا تھا وہ مجھے لے جانے ہی آئے تھے۔

”میرا خیال تو کافی نیک ہے مگر باتوں کا پتا نہیں۔“ میرے شرارتی انداز میں دادی جان کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہنے پر امی اور ماموں دونوں ہنس دیے۔

”وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔ کبھی ہم ان کو اور پھر دوبارہ بھی ان کو ہی دیکھتے ہیں ظاہر ہے بھی گھر تو روزی دیکھتے ہیں نا؟“ مجھے دیکھتے ہی غزالہ شکایتی انداز میں بولی۔

”آپ بلا میں ہم نا آئیں۔ ایسے تو حالات نہیں۔“ شعر کا حساب شعر سے بے باق کرتی میں اس کے گلے لگی تو وہ بھی خوشدلی سے ہنس دی۔

ماموں کے دو ہی بچے تھے غزالہ تھوڑی بڑی طلبہ تھی اور وقاص بھائی جو ایم بی اے کر رہے تھے میرے دو حیا میں بچوں کی جتنی فراوانی تھی تنہا میں اتنی ہی کمی۔

رات کے کھانے کے بعد ماموں، ممانی کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھے اور پھر سونے کے لیے چلے گئے وقاص بھائی ان سے بھی پہلے اپنے کمرے کا رخ کر چکے تھے وہ ایک سنجیدہ مزاج کے بندے تھے۔ سارے

گزشتہ شکر کے راتے سے ان کا ٹک ٹیم ”چپ شلو“ رکھا گیا تھا۔

”یار! یہ اپنے چپ شلو کچھ زیادہ ہی خاموش نہیں ہو گئے؟“ سب کے جاتے ہی میں نے وقاص بھائی کی ضرورت سے زیادہ خاموشی کی وجہ کھوجنا چاہی جو مجھے بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

”ہمیں ہاں، ہم نے تو چاہا تھا کہ ان کے لیے ایک بولنے والی مینا لے آتے مگر ان کی خاموشی کی کسر وہ پوری کر دیا کرتی تھیں قسمت! اس کا انداز اور الفاظ مجھے الجھانے لگے۔“

”کیا مطلب؟ کیسی مینا اور یہ ”چپ شلو“ تو تا کب سے ہو گئے جو تم لوگوں نے ان کے لیے مینا لانے کی سوچی۔“ میں نے ماموں کی اداسی کو خوشی سے کم کرنا چاہا مگر وہ خاموش رہی۔

”مینا تو کیا ہوا ہے کہیں دل دل تو نہیں لگا بیٹھے ہیں وقاص بھائی؟“ میرے شرارتی انداز پر بھی اس نے محض ایک اداس سی مسکراہٹ کا ساتھ میری طرف دیکھنے پر آنکھ لگا اور ہنسنے لگی۔

”مینا تو یار! آیا ہوا؟“ اس کی خاموشی مجھے جھنجھلانے پر مجبور کر رہی تھی۔

”ہاں کوئی تھی لیکن اب نہیں ہے اس کے سوا اور کیا بتاؤں؟“ اس نے ایک جملے میں داستان سمیٹ دی۔

”کیا مطلب تھی اب نہیں ہے کہاں گئی؟“ اس فقرے سے بھلا میری تسلی کہاں ہونا تھی۔

”بس چھوڑو بھی۔“ وہ بظاہر مسکرا رہی تھی لیکن اپنے بھائی کے دکھ پر اس کی بھیجی آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی تھیں ”میں انانڈل بے حد اداس ہو چکا تھا۔“ ”کون تھی وہ؟“ کچھ دیر خاموشی سے اس کی سرگرمی دیکھتے رہنے کے بعد میں بولی تھی۔

”میں عقل عشق پہ اب اور نہ رویا جائے رات کا پچھلا پھر ہے سویا جائے اپنے لہجے میں بے باک شہید اکر تے ہوئے اس نے میری بھیجی پٹوں کو نشانہ بنایا اور وال کلاک کی طرف



اشارہ کر کے کہا، جہاں رات دو بج رہے تھے۔ لیکن وہ یقیناً اس موضوع سے بچنا چاہتی تھی، میں نے بھی خاموشی سے پلکیں موند لیں۔

”اتنے اچھے سے وقاص بھائی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ سوہری شخصیت والے جیسے مگر دلکش لہجے میں بات کرتے وجہ سے وقاص بھائی کا عکس میرے سوچ کے آئینوں میں ابھرا تو میرا دل اس دکھ پر جالی دینے لگا۔

\*\*\*

”میں تو کہتی ہوں اچھے لوگ ہیں اور اتنی محبت سے رشتہ مانگ رہے ہیں انکار نہیں کرتا چاہیے۔“ ممانی جان یقیناً ماموں سے مخاطب تھیں۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر سارے حالات تمہارے سامنے ہیں وقاص کی نوکری لگ جائے تو کچھ سکون ہو، ابھی تو شادی کی تیاری کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔“ ماموں کی آواز سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”اسی بات کی وجہ سے کہا تھا کہ شاملہ کے توالند رکھے بہت دے والے ہیں اگر وہ گولڈ کاسٹ اپنی بیٹی کے لیے رکھ لیتے تو۔“ ممانی کے کہنے پر ماموں یکدم ہی غصے سے بولے تھے۔

”کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے ایسی باتیں نہ کیا کرو ہماری بیٹی کے نصیب کا اللہ دے دے گا مگر میں اس کا اگلو ناما ہوں کیسے کیسے مان ہوں گے میری بہن کو، میں بد نصیب تو اس قابل بھی نہیں کہ اپنی بہن کے شایان شان بھات (تحائف) ہی لے جا سکوں۔“ غصے سے بولتے ماموں اچانک رنجیدہ ہو گئے۔

”میرا وہ مطلب نہیں تھا آپ جانتے ہیں آپ کی بھانجی مجھے بھی کم پیاری نہیں مگر ماں ہوں باپنی کے لیے پریشان ہو کر ایسے بول جاتی ہوں۔“ ممانی شرمندہ لہجے میں کہہ رہی تھیں اور میں خود کو شرمندگی کی اتھاہ گہرائی میں اترا تا محسوس کر رہی تھی۔

”گھر امی ابو اور بانی گھر والے اور اوجھریہ لوگ انجانے میں ہی سہی مگر میں کتنے لوگوں کے لیے مسئلہ

بن رہی تھی۔ لیکن کیا واقعی مسئلہ میں ہوں یا یہ رسم و رواج۔“ میرا ذہن ایک نئے رخ پر سوچنے لگا۔

\*\*\*

”ابھی کچھ دن اور رک جاؤ نا پلیز!“ باقی سب کے ساتھ ساتھ غزالہ بھی رکنے پر اصرار کر رہی تھی لیکن جانے کیوں میں ایک دم سے ہی ہر چیز سے ہزار ہو گئی تھی، مجھے بہت مشت ہورہی تھی اور میں بس ماموں سے جانا چاہتی تھی، سو اس کا اتنا اصرار بھی مجھے نہ روک سکا۔

”خدا تمہیں دین و دنیا کی ہر خوشی دے، کوئی دکھ کوئی غم تمہیں چھو بھی نہ پائے۔“ واپس آتے سے ممانی بڑے خلوص سے مجھے دعا میں دے رہی تھیں تب نہ جانے کیوں میری نظریں غزالہ پر جا گئیں، اس کی جھکی نظروں اور مہلتے چہرے کو دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا، میں بے ساختہ چٹی تو آؤر بھائی کو غزالہ کی طرف بڑی بر شوق نگاہوں سے دیکھتے پاکر میرا دل چلایا ہو گا، غور و فکر کرتے ہوئے خوشی سے ہنسنے لگی۔

”کیا دوبارہ ملنے کا ارادہ نہیں ہے؟“ میرے خوب بھیجے بھیجنے کے گلے ملنے پر غزالہ نے سر کو شکی کی۔

”ہاں دوست اور کرن کی حیثیت میں دوبارہ ملنے کا ارادہ نہیں ہے، ذہن میں آتے ڈھیروں خدشوں کو پرے دھکیلتے ہوئے میں کھکھلائی تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے میرے بدلتے مود کو حیرت سے دیکھ کر رہ گئی۔

\*\*\*

”مانی سویت ماما جانی کیا ہو رہا ہے؟ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو ہم حاضر ہیں۔“ میرے دروازے سے جھانک کر کہنے پر امی جو کہ کپڑے تہہ کر کے الماری میں رکھنے میں مصروف تھیں، میری طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرائیں۔

”کیا کام ہے؟“ ان کے اتنے درست اندازے پر میں ایک لمحے کو گڑبڑائی اور پھر سنبھل گئی۔

”تمہیں کام تو کوئی نہیں ہیں آپ سے کچھ نہیں

لگائے کو دل کر رہا ہے، کچھ نام ہو گا آپ کے پاس۔“ میں جان کے کچھ بجاحت بھرے لہجے میں بولی تو کچھ اور کھل کر مسکرا دیں۔

”سارا نام میری جان کے لیے ہی تو ہے، آؤ بیٹھو کیا کہنا چاہتی ہو۔“ کپڑے وہیں چھوڑ کر وہ میرے ہاتھ پر پیار کرتے ہوئے محبت میں ڈوبے لہجے میں بولیں تو جانے کیوں میری آنکھیں پھیلنے لگیں، شاید محبت اور دعاؤں کی اس پرسکون چھایا سے دور جانے کا خیال آیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بھی ان کے گل کو چومنے ہوئے مسکرا دیں۔

”مگر میں کچھ کموں تو کیا آپ مان لیں گی؟“ میں لاڈ سے ان کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں کیوں نہیں، کو تو وہ دھیرے دھیرے میرے باؤں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔“

”چاہے بہت مشکل بھی ہو۔“ میں نے تعذیق چلائی۔

”آخر بات کیا ہے؟“ میرے انداز سے وہ جان گئی تھیں کہ بات کچھ زیادہ خاص ہے، سو سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

”امی وہہ، دیکھیں پلیز آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے گا، امی کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ماموں جان کے لائے ہوئے سارے زیورات اور باقی سب سامان واپس کر دیں؟“ میں ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

”یہ کیا اول فول بک رہی ہو، کسی کا تحفہ واپس کیا جاتا ہے کیا؟“ وہ میری بات کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھیں مگر بحث سے بچنے کو مجھے ٹالتے ہوئے تھوڑا سخت لہجے میں بولی تھیں۔

”تحفہ آپ اسے تحفہ کہیں گی امی؟ تحفہ تو وہ ہوتا ہے جو انسان اپنی جیب دیکھ کر مسکوت سے پوری خوشی اور خلوص کے ساتھ دیتا ہے اور دوسرا انسان اپنی ہی خوشی اور خلوص سے اسے قبول کر لیتا ہے اس تحفے کی قیمت کا اندازہ لگائے بغیر یہ تحفہ نہیں ہے امی! یہ اخراج ہے رشتوں اور صحبتوں کا، مجھے یہ سب نہیں

چاہیے امی پلیز!“ ان کے چہرے کے آثار چہلاؤ پر نظریں جمائے میں اپنا نقطہ نظر ان پر واضح کرتی چلی گئی۔

”یہ سب ہمیشہ سے اسی طرح ہے اور اسی طرح رہے گا، تم یا میں صدیوں سے چلے آتے ان رسم و رواج کے خلاف نہیں چل سکتے۔“ امی جو بہت توجہ سے مجھے سن رہی تھیں اب ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بول رہی تھیں۔

”اور سنو آئندہ ایسی کوئی بات تمہاری زبان سے نہ نکلے جسے سن کر تمہاری دادی کو گلے کہ میں اپنے میکے کی بچت کو تمہیں الٹی سیدھی پٹیاں پر دھا رہی ہوں سمجھی۔“

”تو کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ میرے ہونے والے سرال پہ پیغام پہنچا دیں کہ میں اپنے ساتھ چیز کے نام پر کچھ نہیں لا رہی۔“ بات تو چل ہی پڑی تھی، سو میں نے اپنی یہ سوچ بھی ان تک پہنچانا ضروری سمجھا۔

”یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں، ابھی ہم زندہ ہیں یہ سب فیصلے کرنے کو۔“

”مکرائی۔“ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی بات مکمل کر کے وہ فوراً ”کمرے سے چلی گئی تھیں، ان کے سر دھجے کی ساری ٹھنڈک میرے اندر اتر گئی۔

\*\*\*

”مجھے یہ شادی نہیں کرنی بس“ پھر وہی شادی کا بھوت میرے سامنے تھا، مجھے ایک ساتھ کئی محاذوں پر لڑنا تھا اور میں اکلی تھی، یہی وجہ تھی کہ کچھ چیز چڑی ہو رہی تھی، اب بھی شادی کے نام پر راجیلہ سے اچھے پڑی۔

”مفتخول مت بولا کرو،“ راجیلہ نے میرے سلطان راہی جیسے رنگ انداز میں کہے تقرے کو چٹکیوں میں اڑا دیا۔

”میں سنجیدہ ہوں۔“ میں نے اسے یقین دلانا چاہا۔



# مٹھو مٹھو میری فالے تو نکالو مٹھو کہتا ہے! میڈی کیم بلیچ کریم لگاؤ گوری بن جاؤ!

**MEDICAM**  
BLEACH CREAM



میڈی کیم بلیچ کریم جلد کے مساموں میں نیچے تک  
لے کر جلد کو حسین، خوبصورت اور پرکشش بنائے۔

ہر سائے والی وین گوری گوری ہو جائے!

ان کے لیے میں بولا تو ہم ایک بار پھر فیس دیے۔  
”وہیے خیریت تو ہے تا کل تک تو جناب کے اس  
گھڑیاں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے پارہ سوئی آتے ہی  
سیل ختم ہو گئے ہوں اور آج بیسی ہی اندر نہیں  
جاری ہے؟“ میرے چہرے کی طرف اشارہ کر کے وہ  
مٹھو کہنے میں بولا۔

”جتنے والے کا منہ کالا“ میں اسے چڑاتی راحیلہ کا  
ہاتھ تھامے اس کے کمرے کی طرف بڑھی ابھی بہت  
سی منصوبہ بندی کرنا باقی تھی اور اپنی ایسی منصوبہ  
بندیوں کے لیے ہمیں راحیلہ کا کمرہ ہیسٹ لگتا تھا  
جس کی وہ تن تمام لکھی تھی اور سب سے اہم بات وہاں  
ذہن کو چلانے کے لیے پینول (پینول) سے بھر دوم  
فریج کا بھی انتظام تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥  
آج پہلا روزہ تھا اور سب داوی جان کی دعوت پر  
افطاری کے لیے ایک جگہ (ہمارے پورشن میں) جمع  
تھے کیا بات ہے شامل بیٹا! آپ کھانا ٹھیک سے نہیں  
کھا رہے ہیں؟ کیا جان کو مجھ سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا اور  
مسلک نوٹ کر رہے تھے کہ میں کھانے میں دلچسپی  
نہیں لے رہی، ان کے توجہ دلانے پر باقی سب بھی  
میرے طرف متوجہ ہو گئے تھے۔  
”اپنا پکایا ہوا کھانا کھانا بھی کوئی اتنی آسان بات تو  
نہیں یہ تو ہمارا ہی دل ہے کسے؟“ فرحان کی سرکوشی  
میں نے با آسانی سن لی تھی۔

”گو کیا یہ مجھے پکن میں دیکھ چکا ہے۔  
”بس یونہی لایا جان! آج بھوک نہیں ہے۔“ لایا  
جان کو جواب دیتے ہوئے میں مسلسل فرحان کو گھور  
رہی تھی جو اپنی بات میرے کانوں میں ڈال کر مزے  
سے کھانا کھا رہا تھا اتنے میں آواز بھائی پکار بیٹھے دیکھا  
ہماری گریا ہمیں بھی نہیں ہٹائے گی کہ کیا بات ہے؟  
اور میں تو جیسے اسی پل کی منتظر تھی کہ بھوکا رہنے کا ارادہ  
تو میرا بھی نہ تھا مگر مجھ سے پہلے فرحان بول پڑا۔  
”آپ کو پتا ہے آواز بھائی! کہ آج کل گری گئی زیادہ  
ہے؟“ اس کے اس سوال پر جہاں آواز بھائی نے الجھ کر

”ہاں بالکل ایسے ہی جیسے انڈیا پاک بھارت دوستی  
کے لیے اور امریکہ وزیرستان کے مسئلے کو حل کرانے  
میں سنجیدہ ہے۔“ وہ سیاست کو درمیان کھینٹ لائی  
تو۔  
میرا غصہ سے برا حال ہونے لگا۔

”لو کہ تم کچھ نہیں کر سکتیں تو میں خود ہی سب  
سے بات کر لیتی ہوں۔“ فیصلہ کرتے ہوئے میں اس  
کے پاس سے اٹھنے لگی، ”تم کچھ نہیں کر سکتی  
شامل!“ وہ دھمکانے والے انداز میں میرے پیچھے  
چلائی۔

”کروں گی اور ضرور کروں گی تم میرا ساتھ دو یا نہ  
دو“ اس کی آواز پر لمحہ بھر رک کر میں پوری سنجیدگی  
سے گویا ہوئی۔

”یہ کوئی شرارت نہیں ہے شامل! کہ میں تمہارا  
ساتھ دینے کو مان جاؤں اور ٹھوڑی سی ڈانٹ بڑے  
کے بعد سب سیٹ ہو جائے بات سمجھنے کی کوشش کرو  
یہ سب اتنا آسان نہیں ہے زندگیوں کا معاملہ ہے۔“  
اس نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ یہ میری پوری  
زندگی کا معاملہ ہے؟“ اس کے لیے سے میں جان چکی  
تھی کہ وہ صرف آخری کوشش کے طور پر یہ سب کہہ  
رہی ہے کچھ ہی لمحوں میں وہ میرے ساتھ ہوگی۔ سو  
بڑے اطمینان سے ایک طنز پر مسکراہٹ اس کی طرف  
اچھالتے ہوئے پٹی تو وہ پکار بیٹھی۔

”لو کہ۔۔۔ مگر سب سوچ سمجھ کر طریقے سے کرنا  
ہوگا۔“ اپنے یقین کے بچہ ہوتے ہی اس کی آواز پر میں  
جلدی سے دوڑ کر اس سے چلا پئی۔

”یو آر گرینٹ بار!“ میں بے اختیار اس کی عقلمندی کا  
سلام کر بیٹھی جو مجھے صرف ایسے مواقع پر ہی دکھائی  
دیتی تھی۔

”توبہ ہے لڑکی! اپنی شادی کی اتنی خوشی ہمارے  
زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا ہمیں تو لایا لکیوں کی آواز  
تک سنائی نہ دیتی تھی۔“

فرحان ہمارے قریب آکر داوی جان کی کاپی کرتے



دیکھا وہاں باقی لوگ بھی اس بے وقت کی رائگی پر حیران تھے۔

”اور ایسے میں کسی کا روزہ بھی ہو اور یہ اتنا سارا نام کچن میں گزار کر کھانا تیار کرے اور کوئی تعریف بھی نہ کرے تو۔“ اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے اس نے شرارت سے میری طرف دیکھا۔

”اوہ سب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔“

”ارے بھئی میں تو بیانی کا پسلا تچہ لیتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آج کھانا کچھ اسپیشل ہے۔“ لایا جان نے مجھے خوش کرنا چاہا۔

”مگر میں نے تو قورمہ بنایا ہے بیانی تو راحیلہ نے بنائی تھی۔“ میں بسورتے ہوئے کہنے لگی، اب سب کے لیے مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو گیا۔

”بتا ہے شائل! ہم نے تمہارے بنائے کھانے کی تعریف کیوں نہ کی؟“ فرحان کے کہنے پر میں خفا خفا سی آنکھوں میں سوال لیے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ہم نے سوچا کہ چند الفاظ میں اس کھانے کی تعریف کرنا تو کافی ہو گا تو کیوں نہ ہم اس کی تعریف میں ایک کتاب لکھیں۔“ وہ بڑے سنجیدہ انداز میں بولا اور سب کے بلند ہونے والا قہقہے پر میں بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی۔

”کیوں تک رہے ہو بھئی اس بے وقت کی رائگی میں؟“

”نہیں کہ کھانا بہت اچھا ہے اور خاص طور پر بیانی۔“

”تھنک مائی سوٹ پیسھو جان؟“ پیسھو کی طرف داری پر فرحان کو زبان چڑاتے ہوئے پیسھو کا شکریہ داکرٹی میں بھی مزے سے کھانے میں شریک ہو گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥

”آؤ بھائی مجھے کچھ چوری لینا ہے آپ مجھے مارکیٹ لے چلیں گے؟“ آؤ بھائی ہمیشہ کی طرح اس وقت فی وی لاؤنج میں اکیلے بیٹھے کرنٹ افیر کا پروگرام دیکھ رہے تھے کیونکہ اس وقت گھر کے باقی سب افراد کی اور مصروفیات ہوتی تھیں، کبھی منصوبے کے مطابق اس وقت کا انتخاب کیا گیا تھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں کتب جانا؟ کیا ابھی لے

چلوں؟“ جب سے میں واپس آئی تھی میری اداسی کے پیش نظر اور کچھ دن کی مہمان سمجھ کر سب میری دل جوئی میں پہلے سے بڑھ چڑھ کر سرگرم رہا کرتے تھے۔

”نہیں ایسی بھی کوئی جلدی نہیں ٹھیک دو دن تک لے چلیے گا بلکہ میں تو چاہ رہی تھی کہ غزالہ ساتھ چلے تاکہ اپنی پسند سے خرید لے پھرتا تو اس نے ہی ہے نا مگر وہ ساتھ چلنے کو تیار ہی نہیں۔“ میرا الجھ سراسر تھا مگر غزالہ کا نام آتے ہی وہ وی آف کرتے ہوئے پوری طرح میری طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”غزالہ کے لیے گفت لینا ہے مہم کی سالگرہ تو دو ماہ بعد ہے اور عید میں تو ابھی بہت دن باقی ہیں تو کیا عید کا گفت ابھی سے لے رہی ہو؟“

”ارے آپ کو نہیں بتا ماموں بہت جلد غزالہ کی شادی کا سوچ رہے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ سب کچھ تقریباً طے ہو چکا ہے تو میں نے سوچا کہ ابھی سے کچھ شاپنگ شروع کر دی جائے تو اچھا رہے گا ٹھیک ہے نا بھائی؟“ ان کی بے چینی کی طرح میری انجان بننے کی ایکٹنگ بھی عروج پر تھی۔

”مگر اتنی جلدی کیا ہے ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے نا؟“ ان کی پریشانی پر میں نے بڑی مشکل سے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کا کھانا اور مصحوبیت سے بولی۔

”بھئی میں تو پڑھ رہی ہوں گوری فکر رہتی ہے اور رشتہ بھی کافی مناسب ہے ویسے ابھی ان لوگوں کو ہاں نہیں کی ہے ماموں نے، لیکن ان شاء اللہ اس ہفتے کے آخر تک فائنل ہو جائے گا سب۔“ دل ہی دل ہمت کر دیا بھائی جیسے غبرے لگاتی میں بڑے غور سے ان کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔

”ارے واہ کارمن خان کا پروگرام شروع ہو رہا ہے۔“ سوچ میں ڈوبے آؤ بھائی کو متوجہ کرنے کو میں ذرا زور سے بولی انداز ایسا تھا گویا میں اس قسم کے پروگرامز کی بڑی شوقین رہی ہوں، جبکہ فی وی دیکھنا خاص کر اتنے سیریس پروگرامز دیکھنا، کبھی بھی میرے مشاغل میں شامل نہ رہا تھا۔

”ہاں تم دیکھو میں آتا ہوں ابھی۔“ وہ اچانک سی اٹھ

کھڑے ہوئے۔

”نہیں باہر جا رہے ہیں کیا؟“ میں نے ان کے اگلے اقدامات کا اندازہ لگانا چاہا۔

”نہیں ذرا ادوی جان کے کمرے تک جا رہا ہوں جاگ رہی ہوں گی ناوہ؟“

”جی جی بالکل بلکہ ابھی وہ بھی آپ کا پوچھ رہی تھیں اور یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ ناچانے کیوں آج انہیں نیند نہیں آرہی؟“ ان کی ہجھک دور کرنے کو میں شاید کچھ زیادہ ہی معلومات فراہم کر بیٹھی تھی، کبھی انہوں نے ایک لمحے کو مجھے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف مڑ گئے۔

”بھائی؟“ وہ دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ میں پکار بیٹھی۔

”خوابش کرنے سے کبھی نہیں ڈرتا چاہے اور اگر خوابش جائز ہو تو اسے پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہر انسان کا حق بھی ہے اور فرض بھی، اپنے مزاج سے ہٹ کر میں ذرا فلسفیانہ انداز میں بولی تو وہ جیسے میری بات سمجھتے ہوئے مسکرا دیے اور سکون سا میرے اندر رات چلا گیا۔

\*\*\*

”میلو السلام علیکم“ راحیلہ نے بڑے تپاک سے سلام جھاڑا۔ ”وعلیکم السلام۔“ دوسری طرف سے بڑھ کر خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا گیا جس پر راحیلہ نے منہ بنا کر مجھے دیکھا تو میں مسکرا دی، اس وقت رات زیادہ نہیں گزری تھی مگر آج کل صبح سحری میں اٹھنے کے خیال سے سب جلدی سو جایا کرتے تھے اس لیے ہم بڑے آرام سے اپنی سرگرمی میں مصروف تھے۔

”کیا ارحم صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟“

”جی ارحم بول رہا ہوں، آپ کون؟“ آواز میں جھٹس تھا۔

اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے میں آسانی سے ان کی گفتگو سن سکتی تھی۔

”مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے راحیلہ کچھ پر اسرار سے انداز میں بولی تو میں نے بڑی مشکل سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی کو کنٹرول کیا جس پر اس نے مجھے خوب گھور کر دیکھا۔

”جی کیجیے مگر بہتر یہ ہوگا محترمہ کہ پہلے ہم ایک دوسرے کا تعارف حاصل کر لیں۔“

”جی ضرور میرا نام نمرن ہے، میرے بارے میں اتنا جان لیتا ہی آپ کے لیے کافی ہوگا کیونکہ اس وقت صبا کی بات کرنا زیادہ ضروری ہے جو میری دوست ہے اور آپ کی۔“

”جی کیسے میری کون؟ میں تو کسی صبا کو نہیں جانتا۔“ راحیلہ کی لچائی خاموشی پر دوسری طرف بڑی بے صبری کا مظاہرہ کیا گیا۔

”جی وہ آپ کے متاثرین میں سے ہے میرا مطلب ہے بری طرح آپ سے متاثر ہے، مگر بزار چاہئے کہ باوجود آج تک اپنے دل کی بات آپ تک پہنچا نہیں پائی، لیکن اس کی حالت دیکھتے ہوئے آج میں نے آپ سے بات کرنے کی ہمت کی ہے۔“ راحیلہ بڑی روالی سے اپنی تخلیق کردہ کہانی سنارہی تھی اور میں خاموشی سے دوسری طرف کا مڑ کر عمل جاننے کی منتظر تھی۔

”میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ سب کچھ واضح ہونے کے باوجود وہ نہ جانے کیوں سوال کر رہا تھا۔

”شادی“ راحیلہ کے ایک لفظی جواب پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”کیا ہوا کچھ تو کہیں؟“ راحیلہ نے اصرار کیا۔

”محترمہ آپ مذاق اور انجوائمنٹ کے لیے کوئی اور نمبر ڈائل کریں اللہ حافظ۔“ اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی وہ یقیناً ”موباائل آف کرچکا تھا۔“

”اب؟“ اپنے منصوبے کے اس طرح ناکام ہونے پر راحیلہ نے منہ بنا کر موباائل بینڈ پر اچھالا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

”تو براہم ابھی اپنی بناری میں بہت سے آئیڈیاز ہیں یہ نہیں اور سنی اور نہیں اور سنی۔“ پر سوچ نظر مجھ پر ڈالی۔

”کیا ہم ہی سب ٹھیک کر رہے ہیں شامل؟“



میرے ناراض ہونے کے خوف سے اس نے  
بچھلکے ہوئے پوچھا تھا۔  
”تمہیں اس کے ٹھیک ہونے میں شک کیوں  
ہے؟“ میں انہیں اس سے سوال کرتی تھی۔  
”سوچ لو“ اس پر پھر سے واضح کرنے کا ہوت سوار  
ہوئے لگا۔ ”سوچ لیا“ میں سختی سے کہتے ہوئے رخ  
موڑ گئی۔



”بیٹا ہم لوگ تمہاری شادی کا سوچ رہے ہیں  
تمہاری کیا رائے ہے؟“ ابو کے پوچھنے پر میں اور راجی  
خوب چوتھے ہو کر آذر بھائی کے جواب کا انتظار کرنے  
لگے۔

”اس سلسلے میں اپنی رائے اور پسند وادی جان کو بتا  
چکا ہوں ابو! آپ کو شاید انہوں نے بتایا نہیں۔“ آج  
افطاری کے بعد بیٹوں کی ہونے والی میٹنگ میں آذر  
بھائی کی پیشگی سٹی اور ہماری انٹیلی جنس نے بروقت  
ہمیں یہ خبر دی، اور اب میں اور راجیلہ اسٹڈی کے  
روشن دان کے پاس اسٹول پر کھڑے اندر ہونے والی  
گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھے۔

”وہ بات اسی دن ختم ہو گئی آذر! میں تمہیں بتا چکی  
ہوں کہ اس گھر میں مجھے رشتہ نہیں کرنا“ وادی جان کا  
لہجہ بہت تو بہن آئیز تھا! یہی حالت کا سوچ کر میں  
بے حد افسردہ ہو گئی اس ساری گفتگو کے دوران وہ بالکل  
خاموش بیٹھی تھیں عموں جیسے ان کی فیملی اور ان کے  
بیٹے کی بات نہ ہو رہی ہو، بلکہ کسی اور کی بات کی جارہی  
ہو۔

”ہمارے خاندان میں ایک سے ایک لڑکی ہے جس  
کے لیے کوئے رشتہ لینے چلی جاؤں گی، بلکہ نہیں اور  
جانے کی ضرورت ہی کیا ہے، لڑکی تو اپنے گھر میں بھی  
موجود ہے وادی جان کی بات پر ہم چونک کر ایک  
دوسرے کو دیکھنے لگے، ساتھ ہی ذہن کو دوڑا لگا کر  
اور گرد کی ساری لڑکیوں کی لسٹ پر نظر دوڑائی مگر سمجھ  
نہیں پائے کہ کس کی بات ہو رہی ہے؟

”ہاں جی آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟“ ابو نے  
سوال کر کے ہماری مشکل حل کر دی۔  
”اپنی راجیلہ سے نا اپنے گھر کی بچی ہے، ہمارا خون  
ہے اور پھر ہماری آنکھوں کے سامنے ملی بڑھی ہے  
مجھے تو آذر کے لیے اس سے اچھی لڑکی اور کوئی نہیں  
لگتی، تم لوگ کیا کہتے ہو؟“ اپنی بات کہہ کر انہوں نے  
دوسروں کی رائے جاننا چاہی، ان کے لیے میں اپنی بات  
کے مان لیے جانے کا یقین موجود تھا کیونکہ آج تک گھر  
میں ان کا کانسٹی نے نہیں ملا تھا، میں نے راجیلہ کی  
طرف دیکھا، اس کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے  
گہرے سائے تھے، اس نے میرا ہاتھ گویا سارے اور  
حوصلے کے لیے مضبوطی سے تھام لیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے پھوپھو جان! راجیلہ واقعی بہت  
اچھی لڑکی ہے لیکن ہمیں آذر کی پسند کو بھی سامنے  
رکھنا چاہیے زندگی تو اس نے ہی گزارنی ہے اور  
پھر۔“ آذر بھائی کے لیے مائی جان کی مشہور زبانہ  
محبت جوش میں آچکی تھی اور وہ ان کی وکالت کے لیے  
اسٹینڈ لے چلی تھیں۔ ”میرا خیال تھا کہ مجھ میں ابھی  
اتنی عقل سمجھ ہے کہ میں اب بھی بہتر فیصلے کر سکتی  
ہوں، وادی جان کی آواز میں دوا دماغ صبر اور رنج تھا۔

”اب کا ہر حکم سر آنکھوں پر وادی جان! گھر میں اتنا  
یاد رکھیے راجی کو میں نے ہمیشہ شما کی طرح ہی سمجھا  
ہے، گزن تو بھی سمجھا ہی نہیں، اور اگر آپ کو غزالہ  
پسند نہیں تو میں اس سے شادی کے لیے ضد نہیں  
کروں گا لیکن گستاخی معاف میں غزالہ کے علاوہ کسی  
اور کو بھی اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا، مجھے اس  
بات کے لیے مجبور مت کریں پلیز!“ آخر میں جانے  
نہیں مجھے ان کا لہجہ بھیجا ہوا سا لگا میرے حلق میں  
آنسوؤں کا گولہ سا بن گیا، آذر بھائی اپنی بات پوری  
کر کے کمرے سے جا چکے تھے ہم بھی پوچھل دل کے  
ساتھ واپس چلے آئے۔



کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ہمیں جان سے

بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں اپنی بے وقوفیوں سے ہم  
انہیں ہی ناقابل تلافی نقصان پہنچا بیٹھتے ہیں، میرے  
ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا، میری احساس جرم سے  
پوچھل آنکھیں ابو کے کمزور زرد چہرے پر ٹکنے کی ناکام  
کوشش کرتے ہوئے جھکی جا رہی تھیں۔  
”تین دن ہو گئے تم مسلسل نہیں ہو، اب تو ابو کی  
طبیعت ٹھیک ہے، تم اب گھر چلی جاؤ ورنہ یہ نہ ہو کہ  
تمہارے لیے بھی ایک ہیڈ کا انتظام کرنا پڑ جائے۔“ یہی  
سب سوچتے ہوئے میں ابو کو کچ کر وادی بھی جب آذر  
بھائی میرے سر پر چپٹ لگاتے ہوئے شوخی سے  
بولے۔

”ہاں بیٹا! میں اب ٹھیک ہوں تم گھر جا کر آرام  
کرو۔“ ابو بھی آذر بھائی کی ہاں میں ہاں ملائے لگے تو  
مجھے سب کی بات ماننا ہی پڑی، ویسے بھی اب ابو کی  
طبیعت بہت بہتر تھی اور ایک دو دن میں ہم انہیں گھر  
لانے والے تھے۔

”کیسی ہو؟“ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے  
وقاص بھائی کی آواز پر میں چونکی، میرا خیال تھا کہ مجھے  
آذر بھائی کے ساتھ جانا ہے، ان کے الفاظ سے زیادہ  
انداز نے مجھے چونکا دیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ جیسے میری حیرت بھانپ کر دھیرے  
سے مسکرائے تھے۔

”کچھ نہیں۔“ اور کوئی وقت ہو تا تو میں اپنی حیرت کو  
لفظوں کا روپ دینے میں لگہ بھی نہ لگائی مگر اس وقت  
کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”زندگی میں دکھ سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں تم پریشان  
مت ہو سب ٹھیک ہو جائے گا، کبھی کسی کچھ ایسا ہوتا  
ہے جو بظاہر ہمیں بہت برا لگتا ہے لیکن وہی ہمارے  
لیے بہترین ہوتا ہے۔“ انہوں نے مجھے تسلی دینے کی  
کوشش کی۔

”جی“ میں بس اتنا کہہ پائی۔ ”آج شام کو یا کل تک  
انکل کو ڈسچارج کر دیا جائے گا، اور ماشاء اللہ اب وہ  
بالکل ٹھیک ہی، لیکن ہم سب کو بھی اپنے چہروں سے  
پریشانی ہٹا کر خوش خوش نظر آنا چاہیے، کبھی وہ

جلدی جلدی صحت یاب ہو سکیں گے۔“ اتنا کہہ کر  
انہوں نے میری طرف دیکھا مگر میں باہر نظر نہیں جمائے  
ہوئے تھی، میرے دل میں اس وقت جو جھنجھل  
رہے تھے وہ مجھے کسی طرف توجہ ہی نہیں دینے دیتے  
تھے وہ سمجھ رہے تھے میں ابو کے لیے پریشان ہوں ہاں  
یہ کسی حد تک ٹھیک بھی تھا مگر کچھ اور بھی تھا جو مجھے  
ستارہا تھا، میری مسلسل خاموشی پر وہ بھی خاموش  
ہو گئے باقی کا سارا سفر ایسے ہی خاموشی سے گزرا۔

”بیٹا بہت خیال رکھنا اللہ حافظ،“ گھر کے سامنے  
مجھے اتار کر انہوں نے بس اتنا کہا اور میرے جواب کا  
انتظار کیے بنا گاڑی بڑھالے گئے۔



”شکر ہے تم نے آنکھیں تو کھولیں۔“ آنکھ کھولتے  
ہی مجھے راجیلہ کی آواز سنائی دی۔ ”مجھے کیا ہوا ہے؟“  
مجھے یاد آیا افطاری کے بعد عشاء کی نماز ادا کر کے میں  
سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئی تھی، ہاں طبیعت  
کچھ خراب لگ رہی تھی مگر اتنی نہیں جیسے اب میں  
نے بستر سے اٹھنا چاہا مگر شدید کمزوری کے احساس نے  
میری یہ کوشش ناکام کر دی۔ ”روٹوں سے پیچھا  
چھڑاتے ہوئے خد میں کروانے کا شوق ہوا ہے جناب  
کو اور کیا ہونا تھا؟ اچھا تم آرام سے لیٹو میں باقی لوگوں کو  
بلائی ہوں، ابھی گئے ہیں تمہارے پاس سے نئی اماں  
اور آنٹی وغیرہ۔“ ہلکے پھلکے انداز میں کہتی وہ سب کو  
بلانے چل دی کچھ ہی دیر میں سب لوگ میرے پاس  
جمع تھے۔ ہر کوئی میرے لیے پریشان تھا اور گزرے  
وقت کا سوچ کر میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”تم کس لیے اتنی پریشان ہو رہی ہو، جو کچھ بھی ہوا  
اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا، ہم سے ہی فیصلہ  
کرنے میں کچھ غلطی ہو گئی۔“ وادی اماں میرے آنسو  
دیکھ کر میرے قہقہے آئی اور افسردگی سے بویں میں  
ان سے لپٹ کر اور ابھی بری طرح روتی، وہ کچھ نہیں  
جانتے تھے مگر میں تو سب جانتی تھی اپنی غلطیوں  
کو تاہمیں اور بے وقوفیاں، کبھی کچھ مجھے زلا رہا تھا



میری وجہ سے سب کو کتنی تکلیف ہوئی تھی یہی احساس میرے آنسو تھنے نہ دے رہا تھا اور انہی سوچوں نے مجھے بیمار کر ڈالا تھا، دل کرنا تھا اپنی غلطی بتا کر سب سے معافی مانگ لوں مگر جب وہ سب کچھ جان لیں گے تو مجھ سے ناراض ہو جائیں گے یہی خیال مجھے بولنے سے روک رہا، ان محبتوں، عنائتوں، مان اور بھروسے کے بنا میری ذات کی کیا حیثیت رہ جائے گی؟ میری زندگی بظاہر بہت آسان مگر اکثر بہت سے سوالیہ نشانوں کی زد پر رہی تھی اور میں ہمیشہ ان سوالوں کا جواب دینے میں ناکام رہی تھی میں نے آج بھی تھک کر آنکھیں موند لیں۔



اس روز ارجم سے بات کرنے کے بعد ہمیں محسوس ہوا تھا کہ اس کی ماں ہمارے لیے زیادہ آسان ٹارگٹ ثابت ہو سکتی ہے اور یہی ہوا "امریکہ میں مقیم اپنی ایک دوست سے دو چار بار ان کی بات کروانے کے بعد انہیں یہ یقین دلانا کوئی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا کہ کوئی امریکہ میں رہنے والی پاکستانی لڑکی جو کہ بہت امیر بھی ہے ان کے بیٹے پر مر رہی ہے" اور اس یقین کے بعد رشتہ ختم کرنے کی بات کرنے کی ہمیں ضرورت ہی نہ پڑی تھی یہ کام انہوں نے خود ہی پہلی فرصت میں کر لیا تھا مگر جو وجہ انہوں نے بیان کی تھی وہ ناقابلِ برواشت تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہم آپ لوگوں سے کوئی رشتہ داری نہیں کر سکتے کیونکہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ لڑکی کا کردار مشکوک ہے" ایسی لڑکی ہمارے گھر کی ہونی نہیں بن سکتی اور۔۔۔" انہوں نے بنا کسی گلی لٹی کے جانے کس زعم میں فرعون کے لہجے میں بڑی آسانی سے میرے کردار کی دو جھپاں اڑائیں۔

"بس۔۔۔ آگے ایک لفظ بھی مت کہنا ہمیں اپنے بچوں کے بارے میں جاننے کے لیے آپ جیسے لوگوں کی ضرورت نہیں، ہمیں اپنے بچوں اور اپنی تربیت دونوں پر پورا بھروسہ ہے، اچھا ہونا کہ آپ ان

گھٹاؤنے الزامات کے بنا ہی یہ رشتہ ختم کر جاتیں، ہمیں بھی آپ کے جیسے گھٹاؤ لوگوں سے رشتے داری کا کوئی شوق نہیں ہم خود یہ رشتہ ختم کرنے کا سوچ رہے تھے، اب آپ تشریف لے جاسکتی ہیں" اتنے میں ان کی تسلی نہیں ہوئی تھی وہ شاید اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن دادی جان نے انہیں موقع نہیں دیا تھا ان کے شدتِ جذبات سے سرخ پڑنا چہرہ تیار ہا تھا کہ وہ ضبط کی انتہا پر ہیں، ہم سب شاک کی کیفیت میں تھے مگر ابو یہ سب برواشت نہیں کر سکے اور ان کو ہارٹ اٹیک ہو گیا، وقتی طور پر سب کی طرح میں بھی وہ سب بھول کر ابو کی طرف متوجہ ہوئی، مگر مسلسل ٹینشن اور سوچوں نے آخر مجھے بیمار کر ڈالا۔

"مار جلدی جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تم مزے سے بستر نشین ہو، ادھر سحریاں اور افطاریاں بھگتا بھگتا کر میں تھک گئی ہوں اور تمہیں میرا کوئی خیال نہیں ہے نا؟" اچھا ہاں یاد آیا تمہیں بہت ساری اہم باتیں بتانی ہیں۔۔۔" گزرے گھنوں کی سوچوں سے شاید میرے چہرے پر اذیت کے تاثرات ابھرتے تھے بھی راحیلہ میری توجہ بنانے کو بولی۔ بے چاری مسلسل وہ سرے کاموں کے ساتھ ساتھ مسلسل میری دل جوئی اور دیکھ بھال میں مصروف رہتی مگر میرے دل میں جیسے برا احساس ہر جذبہ ختم ہو گیا تھا۔

"ہاں بتاؤ کیا بتانا ہے؟" میری مسلسل خاموشی اور بیزارگی کے چہرے پر چھائے مایوسی کے تاثرات مجھے اس کی بات میں دلچسپی لینے پر مجبور کر گئے جو بھی ہوا اس میں اس کا بھی تو تصور نہیں تھا صرف اور صرف میرا تھا۔

"ہاں سو بہت مزے کی باتیں ہیں۔۔۔ میری اتنی سی توجہ سے ہی وہ کھل اٹھی۔

"وہ نالہ وہ آئے ہوئے ہیں۔۔۔ اس کے انداز سے میں جان گئی کہ کون آیا ہو گا۔

"کون معصوم بے چارہ؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں اور ان کے امی ابو بھی ساتھ آئے ہی جانتی ہو کس لیے؟" ایک معصوم سی مسکراہٹ مسلسل اس

کے لبوں پر بسیرا کیے ہوئے تھی۔

"ہاں جانتی ہوں۔"

"کس لیے؟" وہ مجھ سے بوجھنے لگی۔

"تم سے ہماری جان چھڑوانے کے لیے اور کس لیے؟" میری بات پر اس نے خوب گھور کے مجھے دیکھا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ٹھیک ہو جاؤ پھر پوچھوں گی تم سے" یاد رکھو کے ذکر سے ہی اس کے چہرے پر دھنک اتر آئی تھی۔

"تمہارا کہ ہو" میں نے دل کی گھرائیوں سے اسے مبارکباد دی۔

"تھینکس" اور بھی کچھ خبریں ہیں مابذلت کی زنجیل میں۔۔۔ وہ شوخ ہوئی۔

"پچھائی تو جلدی جلدی ساری سناؤ نا دیر کس بات کی ہے۔"

"عدالت عظمیٰ نے غزالہ کو تمہاری یعنی ہم سب کی بھالی اور آؤر بھائی کی شریکِ حیات بنانے کی منظوری دے دی ہے" اور اس پر عمل درآمد کے لیے اپنی لاڈلی پوتی مس شائلہ کے فحشٹ یا ب ہونے کی منتظر ہیں۔"

وہ بڑے مزے سے سن رہی تھی۔

"رنگی! تم سچ کہہ رہی ہو نا؟" میری آواز خوشی سے کانٹنے لگی۔

"جی جناب بالکل سچ اور صرف اتنا ہی نہیں انہوں نے مسٹر وقاص کو بھی اپنی فرزندگی میں لینے کا اہم اعلان کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں اس کی بات کا مطلب بالکل نہ سمجھ پائی۔

"یہ تمہیں اہم اہم خبریں اور اب خبریں تفصیل کے ساتھ۔۔۔ وہ شوخ لہجے میں تفصیلات بتانے لگی۔

"جیسے ہی دادی جان کی لاڈلی پوتی نے شدید ٹینشن کی بدولت بستر کو مستقل ٹھکانا بنایا دادی جان کے خیالات میں زبردست قسم کا انقلاب آیا اور بس پھر کیا تھا سارے فیصلے ہوتے چلے گئے اور جناب اب

ہمارے ہوم سوٹ ہوم میں راوی ایک بار پھر چین ہی

چین لکھ رہا ہے بس ایک تم نے بیمار پڑ کر روبرو پھینکا رکھی ہے۔" آخر میں وہ منہ بنا کر بولی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ وقاص بھائی کا کیا ذکر ہے؟" میں ابھی تک اسی الجھن میں تھی۔ "مارے

اتنی سی بات نہیں سمجھیں؟ تم تو جانتی ہی ہوتی جان ایسے پرانی دشمنیاں بھلانے والوں میں سے نہیں بظاہر

دوستی بناتے ہوئے بھی انہوں نے تمہارے ماموں سے اپنی پرانی دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے اور کچھ ماموں

ایڈجسٹنگ کے پر زور اصرار پر تمہیں ان کی ہوسٹلے کی منظوری دے دی ہے اوکے؟ وہ مجھے اکسانے پر تلی

ہوئی تھی مگر مجھے مزید حیرت نے آگھیرا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" جانے کیوں میں بے چین ہوئی شاید وقاص بھائی کے ناکام عشق کا خیال آیا تھا۔

"ہو سکتا ہے، نہیں یہ ہو چکا ہے، عید کے دن باقاعدہ منگنی کی رسم ادا کر دی جائے گی۔" میں اس سے

بہت کچھ کہتا اور بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن فون کے تیل پر اسے جانا پڑا۔

وقاص بھائی۔۔۔ میں اور وقاص بھائی، میں نے تصور کرنے کی کوشش کی کیا میں ایسا ہونے سے روک

سکتی ہوں؟ شاید نہیں بلکہ یقیناً نہیں مجھے اب کچھ کہنے کا کوئی حق نہیں جو بھی ہونا ہے ہو جائے۔ میں فیصلہ سوچ مطمئن ہو گئی۔



"کچھ لوگ کہتے ہیں زندگی بہت خوبصورت ہے، کچھ کے نزدیک اس سے بڑھ کر ظالم اور بری چیز کوئی

نہیں، فرق صرف نقطہ نظر کا ہے، دونوں ہی اپنے اپنے نقطہ نظر کو درست سمجھتے ہیں نہ کبھی کسی نے یہ سوچا

کہ زندگی دو سروں کو خوبصورت کیوں لگ رہی ہے اور نہ کبھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کسی کو زندگی

بد صورت کیوں لگ رہی ہے؟ زندگی یقیناً "خوبصورت ہے مگر حالات اسے بد صورت بنا دیتے ہیں۔

بڑے ہمارے لیے فیصلے کرتے ہیں ان میں کچھ خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن ان کے علم میں لائے بغیر



اپنے مسئلے خود حل کرنے کی کوشش کرنا مزید مسائل کو جنم دے سکتا ہے یہ بات اب جا کے میری سمجھ میں آئی تھی کہ محبت بھرے ساروں نے مجھے بڑی جلدی سمیٹ لیا تھا ورنہ یہ شوکر ایسی نہ تھی کہ میں اتنی جلدی سنبھل پاتی، لیکن ہر لڑکی میری طرح خوش قسمت نہیں ہوا کرتی۔ دوبارہ اس بات کا ذکر تک گھر میں نہیں ہوا تھا پھر بھی میں بے قرار تھی اور کم از کم وقاص کے سامنے سب کلیئر کر دینا چاہتی تھی اس کا ایک مقصد تو اپنی انا اپنی عزت نفس کا تحفظ کرتے ہوئے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا تھا اور دوسرا اپنی غلطی کا اعتراف کر کے دل و ذہن کو ہر بوجھ سے آزاد کرنا لیکن پتا نہیں مجھے ان سے بات کرنا بھی چاہیے کہ نہیں؟ اپنے فیصلوں سے ایسا اعتبار اٹھا تھا کہ اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی بہت محتاط ہو جانا عادت سی بن گئی تھی۔

”سیلو کرن کیا سوچا جا رہا ہے؟“ میں اپنی سوچوں میں گم تھی نا جانے کب وقاص ابوکے پاس سے اٹھ کر باہر لان میں آگئے اور وہاں مجھے بیٹھا دیکھ کر میری طرف چلے آئے۔

”کچھ بھی تو نہیں بس ایسے ہی۔“ ان کے اتنی بے تکلفی سے پوچھنے پر میں تھوڑا جھجک گئی، کیونکہ زندگی میں شاید پہلی بار وہ اتنی بے تکلفی سے مخاطب تھے اور ان کا انداز ایسا تھا جیسے ہم ہمیشہ ہر بات ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرتے رہے ہوں۔

”ایکسکیو می مجھے کھانا بنانا ہے۔“ اپنے چہرے پر بگی ان کی گہری نظروں سے گھبرا کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سنو“ ان کی سنجیدہ نیکار پر مجھے رکنا پڑا۔ ”زندگی میں کبھی کسی کو یہ موقع مت دو کہ وہ تمہارے چہرے سے مسکراہٹ چھین لے یا درکھنا دینا تمہارے لیے ہے تم دنیا کے لیے نہیں میں جانتا ہوں تم بہادر لڑکی ہو بس اسے ثابت کرو“ ان کی اس بات پر پہلی بار میں نے ذرا دھیان سے انہیں دیکھا، بلیک پنٹ اور بلیو شرٹ پہنے عام سے چلے میں آنکھوں میں تشویش اور ابا نیت کے گہرے رنگ لیے ہونٹوں پر جچی ہلکی سی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ بہت اپنے سے لگے

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان الفاظ نے ذمہ داری بہت یقین اور حوصلہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا ہو۔ ”تھنکس“ میرے لب بٹے وہ گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ گئے۔

”نہیں مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے“ میں نے خود کو بولتے ہوئے ”ہاں کو“ میری آواز پر وہ پر اشتیاق لہجے میں بولتے پھرے میرے مقابل اٹھ کھڑے ہوئے۔

”وہ میں نے ارجح کو کال کر کے۔“ میرا مطلب ہے کہ میں۔“ سب کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ ”اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے یا کسی سے بھی آج یا پھر بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں میں سب جانتا ہوں راحیلہ نے مجھے سب بتا دیا تھا۔“ وہ بڑے اطمینان سے بتا رہے تھے گویا کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔ آپ کو مجھ پر غصہ نہیں آیا؟ میں جانے کیا جانتا چاہتی تھی۔

”خمس کس بات پر آتا تھا بلکہ میں تو تمہارا شکر گزار ہوں دیکھو اگر تم ایسا نہ کرتیں تو مجھے بھی میرے دل کی خوشی پائل پاتی۔“ میں تو بتا نہیں کیا، کیا سوچ کر مری جاری تھی اور یہاں تو بات ہی ساری مختلف لگی۔

”اور سنو“ وہ جلتے جاتے رکے۔ ”آئندہ بھی تم جی بھر کر بے وقوفیاں اور حماقتیں کر سکتی ہو ڈونٹ وری میں سنبھال لوں گا مگر یہ روٹی بصورتی صورت افلاطون ثابت کچھ سوچنی ہوئی اسرار میں ڈوبی آنکھیں تم پر بالکل اچھی نہیں لگتیں تمہارا وہی روپ بہت خوبصورت تھا جلدی سے ویسی ہی بن جاؤ یا پھر مجھے بولتی مینا بہت اچھی لگتی ہے۔“ شرارتی لہجے میں بولتے ”چپ شاہ“ ہمیشہ سے بہت مختلف لگ رہے تھے خوشی اور سرشاری ان کے ہر ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔

”ہم نے تو چاہا تھا کہ ان کے لیے ایک بولتی مینا لے آئیں مگر قسمت۔“ اس روز غزال کا کہا فقرہ مجھے یاد آیا۔

”مجھے بولتی مینا بہت اچھی لگتی ہے“ غزال کا فقرہ وقاص کی آواز میں گم ہوئے لگا تو جانے کس احساس پر

بہت دن بعد مسکراہٹ نے میرے لبوں کو چھوا، یوں لحوں میں دل کے بدلے موسموں پر میں مسکرا دی۔

اور آج ستائیسواں روزہ تھا ماسوں کی فیملی ہماری طرف افطاری پر مدعو تھی، روزہ افطار کرنے کے بعد جب سب نماز کے لیے اٹھے تو ایسے میں وقاص نے میرے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھما دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ میرے پوچھنے پر وہ ہنس دیے۔ ”جو بھی تمہارے لیے ہے تمہارے ہاتھوں میں ہے دیکھ لو“ ان کی بات پر میں چھینپ گئی۔

”اچھا میں بعد میں دیکھوں گی اب کھانا لگا دوں سب ڈیز کے لیے آنے والے ہیں“ دل میں ابھرتے ہوئے تجسس کو نظر انداز کرتی میں وہ پیکٹ اپنے کمرے میں رکھ آئی تھی اور پھر سب کے جانے کے بعد ہر کام سے فارغ ہو کر اسے لے کر بیڈ پر آ بیٹھی، اپنے احساسات میں خود بھی سمجھ نہ رہی تھی ایک تو اکلوتی بیٹی اور پھر سب کی لڑائی ہونے کی وجہ سے مجھے کف نفس بہت زیادہ ہی لگتے رہے تھے مگر اس خننے کو باکر میں جو خوشی جو سرشاری محسوس کر رہی تھی وہ پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے رن کھول کر اس میں رکھی چیزوں کو باہر نکالا، رائل بلیو اسٹائلش سے ڈریس کے ساتھ وائٹ موٹیوں کی خوبصورت والا اور ایسی ہی کچھ چیزیں اور بھی تھیں مگر اس سب سے نظرس ہٹا کر میں نے دھیان سے اس کارڈ کو دیکھنا شروع کیا جس پر to someone special لکھا تھا کارڈ کھولتے ہی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھی ایک نظم نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی۔

کبھی تم ملنے آؤ  
تمہیں محسوس کرنا ہے  
تمہاری ذات میں کھو کر  
تمہارا حصہ بننا ہے  
مجھے ویران آنکھوں میں  
تمہاری بکھری باتوں میں

وفا کا رنگ بھرتا ہے  
تمہارے پھول سے چہرے پر  
اواسی کا جو منظر ہے  
میں پہ اپنی چاہت سے ہنسی کو نقش کرنا ہے  
تمہارے ساتھ مل کر زندگی سے جنگ لڑنا ہے  
کبھی تم ملنے آؤ نا تمہیں محسوس کرنا ہے  
کارڈ پر لکھی اس نظم کو میں نبھانے کتنی بار پڑھ چکی تھی مگر ہر بار ہر حرف ایک نیا مفہوم دیتا محسوس ہوا۔

”ارے آپ اس وقت یہاں؟“ کچھ دیر پہلے راحیلہ نے مجھے کہا تھا کہ وہ چاند کھینے چھت پر جا رہی ہے اور یہ کہ میں بھی فائنٹ وہی آجاؤں، میں بھی وہیں آجاؤں، میں آخری سیڑھی پر تھی جب میں نے راحیلہ کی آواز سنی تو غیر ارادی طور پر وہیں گھس گئی۔

”اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہاں سے زور رہا تھا سوچا تھا سے ملنا چلوں، کیونکہ مابدولت سب کی اجازت لے کر اتنی دور تمہیں عید مبارک کہنے آئے ہیں۔“ یاور کی آواز پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ”ان کی گلی میں آنا جانا عادت سی ہو گئی ہے“ میں دیواری اوٹ سے گنگنائی تو وہ جو گنگنے

”جی محترمہ سالی صاحبہ! آپ کو بھی ظالم سماج کی طرح اسی ناظم انٹری دنا تھی؟“ یہ انٹری کینسل ہو سکتی ہے بھائی صاحب! اگر جو ہماری مرضی کی عیدی، جو ناچھپائی، دودھ پلائی وغیرہ وغیرہ وغیرہ دینے کا پکا وعدہ کریں تو“ میں نے بڑے مصالحانہ انداز میں سیاست دانوں کی طرح گویا پوری قوم کے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے مفاہمت کا ارادہ کیا۔

راحیلہ کی طرح سیاست کو درمیان میں کھینچتے ہوئے میں نے وعدہ خلافی کی صورت میں مستقبل میں آنے والی مشکلات کی دھمکی دی۔

”جی بہت بہتر اب آپ ذرا تشریف لے جانا پسند کریں گی۔“ مسکین سالی بھجے جاتے ہوئے یاور نے جیسے منت کی۔



”ہاں چلی تو جاتی مگر کیا کروں کہ چاند رات کو چھت پر آکر چاند دیکھنا میری پرانی عادت ہے اور آج تو یہاں موسم ہی بڑا خوبصورت ہو رہا ہے تو نیچے جانے کو دل نہیں کر رہا“ سو رہی! ”میں نے ان کی حالت سے حظ اٹھایا۔ راحیلہ ہم دونوں کی بحث پر خاموش سے مسکرا رہی تھی۔

”سوچ لو یہ دخل اندازی جناب کو مہنگی بھی پڑ سکتی ہے“ میری ڈھٹائی دیکھتے ہوئے وہ بھی دھمکی پر اتر آئے۔

”جو ہو گا دیکھا جائے گا“ میں نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔

”شاملہ پلیر!“ اور ان کے اس انداز پر میں نے ان کی جان چھوڑنے کا فیصلہ کیا ویسے بھی میں انہیں کافی سے زیادہ تنگ کر چکی تھی۔

”اپنے سارے وعدے یاد رکھیے گا“ میں جاتے جاتے یاد دہانی کرنا نہیں بھولی تھی۔



یہ چاندنی کھلی ہوئی  
ہزاروں سال سے یونہی

کہیں نہ کہیں خوشی  
ہزاروں رنگ میں ملی

مگر نظر کی تھکی  
کسی طرح نہ مٹ سکی

ہمارے واسطے بھی تو  
یہ عید خوش نصیب ہو

جو تم ملو تو عید ہو  
جو تم ملو تو عید ہو

عید کے لیے تیار ہوتے میرے لیوں پر مسلسل یہی  
لقمہ تھی جو رات انہوں نے فون پر چاند رات کی

مبارک باد دیتے ہوئے سنائی تھی، کچھ ہی دیر میں ہم عید ملنے ماموں جان کے گھر جانے والے تھے جہاں کوئی بڑی شدت سے خٹک رہا تھا، اور آج کی شام ہماری زندگی کی سب سے خوبصورت شام بننے والی تھی۔

داوی جان کی خواہش پر ہی تیار ہو کر میں نے خود کو آئینہ میں دیکھا اور اپنے جگمگاتے چہرے اور لودیتی آنکھوں کو دیکھ کر خود ہی حیران ہو گئی۔

”ارے بس بھی بس اب یہ مت کہنا کہ بول آئینے بول مجھے بتائیں لقمی خوبصورت ہوں، کیونکہ مجھے یقین ہے اس کے جواب میں آئینہ ٹوٹ جائے گا اور ابھی

مادہ دولت نے بھی اسی آئینے میں اپنا ہار سنگھار دیکھنا ہے۔ چلو فافٹ مجھے بھی تیار کر دو وہ آئے والے ہیں۔“

راحیلہ جانے کب میرے کمرے میں آئی تھی اور مجھے خود میں غم دیکھ کر شروع ہو گئی تھی، اس کے بڑے اسٹائل سے ”وہ“ کہنے پر میں بے ساختہ ہنس دی تو بھی میرے ساتھ ہنس پڑی۔ اسے تیار کرتے ہوئے

میں نے آئینے سے جھانکتے راحیلہ کے عکس کو دھیان سے دیکھا وہ آنکھیں بند کیے جانے کس خیال پر مسکرا رہی تھی۔

”شامل!“ اس نے اچانک مجھے پکارا۔

”ہاں“ میں بھی رو پٹے سپنوں کے زیر اثر تھی سو دھیرے سے اس کی پکار کا جواب دیا۔ ”یار آیا، ہم نے کبھی سوچا تھا کہ زندگی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے“ وہ یونہی آنکھیں بند کیے دھیمے سروں میں یوں بولی گویا گنگنائی ہو۔

”ہاں کیوں نہیں میں تو اکثر سوچتی تھی کیونکہ میں نے سنا تھا کہ خوبصورت لوگوں کی زندگی بھی بڑی خوبصورت ہوتی ہے، ہاں مگر اپنی لائف کے

خوبصورت ہونے پر تمہارا حیران ہونا بالکل بجا ہے۔“ میرے بے حد سنجیدہ لہجے میں چھپی شرارت کو سمجھتے ہوئے اس نے ایک لمحہ میرے فہرے پر غور کیا پھر ہاتھ میں پکڑے ہیر برش کو میری طرف اچھال دیا مگر میں تیزی سے سائیڈ پر ہوتے ہوئے اپنا بچاؤ کرنے میں کامیاب رہی بڑی بد تمیز ہو۔ ”مسکراہٹ کو فحش کے

ردے میں چھپاتے ہوئے وہ مجھے آنکھیں دکھانے لگی۔

”نہیں جی ہم کہاں کے بڑے بڑی تو آپ ہیں جی۔“ میں نے اس کے خود سے تین دن بڑے ہوئے کافاندہ اٹھایا، اس بار اس نے کسی بھی چیز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے خود میری طرف پیش قدمی کی لیکن اس کا ارادہ بھانپ کر میں نے بھی باہر کی

طرف دوڑ لگادی۔

”ہو مجھے ان نکموں سے کوئی امید نہیں سب تیاریاں اپنی مگرانی میں کروانا دیکھو کچھ کی نہ وہ

جائے۔“ داوی جان شام میں ہونے والے فنکشن کی تیاریوں کے لیے یہ لیاات دیتے ہوئے خود بھی بوکھلائی ہوئی سی لگ رہی تھیں اور باقی سب کو بدحواس کیے دے رہی تھیں۔

”امی جان! آپ بالکل فکر نہ کریں سب کام ٹھیک وقت پر اور اچھی طرح ہو جائیں گے۔“ داوی جان کو اطمینان دلاتے مختلف کاموں میں مصروف امی کو میں نے زندگی میں پہلی بار اتنا خوش اور مطمئن دیکھا تھا۔

”آؤر بھائی کیا آپ بہت مصروف ہیں؟“ باہر کی طرف جاتے آؤر بھائی کو روک کر میں پوچھنے لگی۔

”نہیں تو کوئی کام ہے کیا؟“

”تو کیا عید پر میپائل کمپنی کی طرف سے آنے والے کسی بھیج کے منتظر ہیں۔“ میں پھر سنجیدگی سے سوال کر رہی تھی۔

”نہیں تو وہ میری بات پر غور کیے ہاں فوراً“ بولے۔

”تو پھر دیر کس بات کی ہے جلدی سے ماموں جان کا نمبر ملا کر عید مبارک کہہ ڈالیں وہ بے چارے صبح سے آپ کی کال کے منتظر ہوں گے۔“ میری بات پوری ہوتے ہی آؤر بھائی کا قہقہہ فضا میں بکھر گیا جلدی کریں

کچھ دیر میں مہمان آنے شروع ہو جائیں گے، میں نے جاتے جاتے مزید ہدایات دینا ضروری سمجھا۔ ہمارے واسطے بھی تو یہ عید خوش نصیب ہو۔ جو تم ملو تو عید ہو جو تم ملو تو عید ہو۔ وال کھاک پر نظر ڈالتی میں بے ساختہ گنگنائی لگی۔ اس بار عید کا چاند دلوں کے

فلک پر ابھرا تھا، اور تن من خوشیوں کی چاندنی میں نہا گیا تھا۔

اور آپ۔۔۔ آپ ابھی تک بیٹیں ہیں ارے جلدی سے جائے نا وہاں جہاں کوئی بہت شدت سے آپ کا منتظر ہے اور شاید میری طرح شاید وہ بھی گنگنا رہا ہے جو تم ملو تو عید ہو جو تم ملو تو عید ہو۔ تو پھر جارہے ہیں نا؟

☆

### ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

| کتاب کا نام            | مصنف              | قیمت  |
|------------------------|-------------------|-------|
| زندگی اک روشنی         | رخسانہ نگار عدنان | 500/- |
| خوشبو کا کوئی گھر نہیں | رخسانہ نگار عدنان | 150/- |
| شیردل کے دروازے        | شاذیہ چوہری       | 300/- |
| حیرت نامہ کی شہرت      | شاذیہ چوہری       | 150/- |
| دل ایک شہر جنوں        | آسیہ مرزا         | 400/- |
| آئینوں کا شہر          | فاخرہ افکار       | 400/- |
| بچکان دس رنگ کا لے     | فاخرہ افکار       | 180/- |
| جینا سے محبت           | فرخ الدین مرزا    | 150/- |
| دل آسے لا محظ لایا     | آسیہ ذائقا        | 300/- |
| نکھرنا چاہیں خواب      | آسیہ ذائقا        | 150/- |
| خواب وہ بچے            | سعدیہ اہل کاشف    | 150/- |
| لداؤں کا چاند          | نثری سدید         | 150/- |
| رنگ خوشبو واداد        | افسان آفریدی      | 400/- |
| دور کے قافلے           | رضیہ جمیل         | 400/- |
| آج سگن پر ہاں نہیں     | رضیہ جمیل         | 180/- |

ناول نگاروں کے لئے کتاب ایک خرچہ 30/- روپے۔  
نگاروں کا پتہ:  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔  
فون نمبر: 2216361



## گسٹے طاق کی ناراضی

ولشاویگم کو ابراہیم صاحب سے شادی کے بعد سسرال میں وہ حیثیت نہیں ملی جس کی وہ ہر لڑکی کی طرح آرزو مند تھیں۔ اگلے ہاتھ سے کام کرنے کی بنا پر اماں جی (ماس) نے ان کو گھر میں اچھوت بنادیا تھا۔ وہ ان کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند نہیں کرتیں۔ انہوں نے خاندان بھر میں دل شاویگم کا پھوپھو بن مشہور کر دیا تھا۔ آئے دن ان کے ابراہیم صاحب سے جھگڑے چلتے رہے۔ جس کا واضح اثر بچوں پر پڑا۔ بڑی دل آویز شادی کے بعد ہی میکے آئی تھیں ماں باپ کی ناچاکی نے اسے نفسیاتی مریض بنادیا۔ وہ اپنے شوہر کی قربت پسند کرتی تھی طاق نسبتاً صلح جو تھا۔ بچپن سے اس کی منگنی پھوپھی زاد خورالعین سے ملے ہے جس کی پرورش ماں کے مرنے کے بعد اماں جی (نانی) نے کی ہے۔ وہ بے باق اور پراعتماد لڑکی ہے۔ بچپن سے اس واضح جھکاؤ طاق کی طرف رہا ہے۔

ابراہیم صاحب لی لی اور بیٹیوں کی ناراضی مول لے کر محض اماں جی کی خواہش کی تکمیل کے لیے طاق کی شادی خورالعین سے کر دیتے ہیں۔ گھر والوں کا رویہ خورالعین سے بہت خراب ہے۔ صرف طاق کا پھوپھا بھائی ولید خورالعین کا ساتھ دیتا ہے۔ ولید کی بے باقی کی وجہ سے گھر میں سب ولید سے ڈرتے ہیں۔ جس کا احساس خورکو چند گفتگوں میں ہی ہو جاتا ہے۔ طاق اولین حالت سے ہی خور سے بے اعتنائی برتا ہے۔ وہ خور کی نا اہلی فطرت سے بھی غافل ہے۔ خورالعین حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے خود تیار کرتی ہے۔

خورالعین کو پہلے دن سے ہی سسرال میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دل شاویگم ہی نہیں دل آویز اور دل نشیں بھی اس سے جملن محسوس کرتی ہیں۔ صرف ولید اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اپنی اچھی فطرت سے مجبور ہو کر وہ اپنے جست کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ طاق اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دل نشیں اپنے کلاس فیلو راجیل کو پسند کرتی ہے۔ یہ بات طاق اور ابراہیم صاحب کے علم میں آجاتی ہے۔ دل نشیں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں پر انہیں شدید تشویش ہوتی ہے۔ (اب آگے پڑیے)





راجیل اپنا اسٹینس بڑھانے اور یونیورسٹی میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے دل نشین سے راہ و رسم بڑھاتا ہے۔ لیکن معاملہ اس وقت بڑھتا ہے جب کلید باجوہ دل نشین میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ وہ ایک بدکردار انسان ہے۔ کلید دل نشین کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے جس پر غصے میں آکر وہ اسے پھینک دیتی ہے۔ کلید بدلے لینے کے لیے راجیل کو استعمال کرتا ہے اور اپنا کیہر بڑھانے کے لیے راجیل ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ راجیل کا بے گانہ رویہ دل نشین کا دل اس کی جانب سے ہٹا رہا ہے۔ اس دوران دل شاد بیکم اپنے بھانجے عباد سے اس کی منگنی کے معاملات طے کر رہی ہیں جس پر اسے کوئی اعتراض نہیں۔

اپنے والد ارباب رحیم کی ناسازی طبیعت پر حور اپنے میکے آتی ہے تو اسے اپنے سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کا گرم جوش رویہ شرمندہ کر دیتا ہے۔ جلدی میں وہ صرف طارق کو فون پر مطلع کر پاتی ہے۔ وہ وہاں خاصی مطمئن ہوتی ہے کہ اچانک اسے اپنے ولید صبح آج آدھنک آ رہا ہے اور گھر لے جانے کے بجائے اسے نانوکے گھر لے آتا ہے جو ان دنوں ولید اور اس کے دوستوں کے استعمال میں ہے۔ ولید کی نابہا حرکت کا علم جب حور العین کو ہوتا ہے تو پہلی فرصت میں وہ واپسی کا قصد کرتی ہے۔ لیکن اسی وقت دل شاد بیکم اور ابراہیم صاحب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ دل شاد اس پر بے ہودہ الزامات لگاتی ہیں جس پر وہ زمین میں گر کر رہ جاتی ہے۔ زیادہ تکلیف اسے ابراہیم صاحب کی نظروں میں اپنے لیے بے اعتنائی دیکھ کر ہوتی ہے۔ (اب آگے پڑے)

## چوتھی قسط

شدت گم سے حور کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

یہ دقت تمام اس نے دیوار کا سہارا لیا تھا۔ درود یوار اس کے سر پر آ رہے تھے۔ ولید باپ کے پیچھے پیچھے نکل گیا تھا۔

”شیر خان!“ دل شاد نے ملازم کو پکارا۔ پھر ملازم کے پیروں میں گاڑیاں کی چابیاں پھینکتے ہوئے بولیں۔

”یہ جہاں جانا چاہتی ہے“ اسے چھوڑ آؤ۔ اس سے قبل یہاں آس برسوں کے لوگ اکٹھے ہوں اور ہماری عزت کا جنازہ لگے۔ اسے یہاں سے دفعان کرو۔ مجھے تو ابراہیم کی فکر ہو رہی ہے۔ کیس وہ یہ صدمہ دل پر ہی نہ لے لیں۔“

وہ تحقیر بھری نگاہوں سے حور کو دیکھتے ہوئے بہ عجلت باہر نکل گئیں۔ حور دیوار سے سرخسہ ہٹ کر روٹنے لگی۔ روتے روتے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

شیر خان اس کے انتظار میں گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

بہت دیر تک وہ زمین پر ایسے ہی بیٹھی روتی رہی

بہت دیر تک وہ زمین پر ایسے ہی بیٹھی روتی رہی

بڑا الزام لگایا ہے۔ طارق میرے شوہر شہر سے باہر ہیں۔ انہیں یہ سب بتایا جائے گا تو میرا گھرا جڑ جائے گا۔“ یہ کہہ کر حور نے رات کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”تم تو سچائی سے واقف ہو۔ ان لوگوں کو بتاؤ کی تا کہ سچ کیا ہے۔ تم میرا ساتھ دو گی میں رات ہی؟“ حور رو رہی تھی۔

رات کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور اس نے حور کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔

”آپ فکر نہ کریں بیکم صاحب! میں اور شیر خان آپ کا گھرا جڑنے نہیں دیں گے۔ ہم سچائی بتا دیں گے۔“

”ہاں بھولو۔“

”بیکم صاحب!“ جب آپ کو پتا تھا کہ آپ کا دیور اچھے کردار کا نہیں ہے۔ تو آپ اس کے ساتھ کیوں یہاں آئیں۔ یہاں تو آئے دن ایسی ہی عیاشیاں ہوتی ہیں۔ ہم تو جی کی کمین ملازم لوگ ہیں۔ اسی تابع داری کے لیے ملتے ہیں ہمیں۔ لیکن آپ تو کچھ سوچیں آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

حور نے آنسو صاف کر لیے۔ اس کے دل میں ولید کے لیے زہر اور آنکھوں سے نفرت ابل رہی تھی۔

”ولید نے جان بوجھ کر میرے ساتھ ایسا کیا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی اپنے بیٹوں کی پردہ پوشی کرنے کے لیے اس نے مجھے نشانہ بنایا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

وہ غصہ اور حقارت سے بولی تھی۔

”بے غیرتی کی انتہا اس وقت ہو جاتی ہے جب انسان اپنے لیے ہر ممکن ہو اسے کوئی شرمندگی نہ ہو۔“

یہ بے غیرتی کا چلنا پھر تاشا بکار ہے۔“

دل شاد نے اسے اوپر کر کے میں جاتا دیکھ کر دونوں بیٹیوں سے استہزاء کیے کما تو حور کے قدم بیڑھیوں پہ جم گئے۔

”اب جانے دیں اس بات کو۔“ دل شاد نے گویا ٹالا

گئے۔ وہ گویا پتھر کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔

”طارق کو فون کر دیا ہے میں نے“ شام کی فلائٹ سے وہ واپس آ رہا ہے۔ جو کچھ یہاں سے لے جانا چاہتی ہو سلمان باندھ لیتا۔ غیرت مند مرد صورت عورت کے ساتھ تو گزارہ کر لیتا ہے۔ لیکن بدکردار عورت کے ساتھ ایک بل بھی نہیں رہ سکتا۔“

حور لڑکھڑائی تھی۔ گرل نہ تھا مٹی تو منہ کے بل نیچے آتی۔

”میرا طارق غیرت مند ہے۔ میں نے ولید کو بھی گھر سے نکل دیا ہے میں نہیں چاہتی۔ تمساری وجہ سے بھائی بھائی کا فون کرے۔ اب اس میں ولید کا بھی کیا قصور۔ نجائے تم نے رنگ رلیاں اس کے ساتھ منائی تھیں یا اس کے دوستوں کے ساتھ۔“

”دل شاد بیکم! خدا کے واسطے خاموش ہو جائیں۔ میرے دل غی نہیں پھٹ جائیں گی۔“ ابراہیم کی رنج میں ڈوبی دل گیر آواز ابھری تو دل شاد کے لب سل گئے۔ وہ گھبرا کر۔ شوہر کی طرف دوڑیں۔

”آپ کیوں بستر سے اٹھ کر آگئے۔ پہلے ہی آپ کی ہارٹ ٹیس اس قدر تیز ہے۔ میڈیٹ کے بعد کچھ دیر آرام تو کر لیتے۔ کچھ ہو جائے گا آپ کو تو کیا کریں گے ہم لوگ۔“ دل شاد نے مصدوعی آنسو نکلے تو ابراہیم نے ملال و تاسف سے بیوی کی طرف دیکھا۔ اور دل گرفتہ لمحے میں بولے۔

”کچھ ہونے کو اب بھی باقی ہے؟“

دل شاد چمک کر بولیں۔ ”آپ اپنے دل پر نہ لیں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔“ دل شاد کی کھلی نگاہیں بیڑھیوں پہ تھیں۔

”خدا کے واسطے دل شاد بیکم! جو کچھ ہو چکا ہے۔ وہ کم تکلیف دہ نہیں۔ آپ بار بار ہمارے زخموں پہ نمک پاشی کیوں کر رہی ہیں اس گھر کی عزت کیوں برباد کر رہی ہیں آپ۔ یہاں ملازم بھی ہیں وہ کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں۔ آخر کو وہ بیٹا تو ہمارا ہی تھا۔“

”اب جانے دیں اس بات کو۔“ دل شاد نے گویا ٹالا



تھا۔ ”کیوں جانے دوں کیسے جانے دوں؟“ وہ بھڑک  
میں۔ ”کیا آپ اسے جرم سے بری الذمہ کر دیں گی؟“  
دل شاد بیگم کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں  
تھا۔ انہوں نے نرمی سے ابراہیم کا بازو پکڑا اور انہیں  
اندھ کرے میں لے گئیں۔

”میں جانتی ہوں۔ آپ سارا الزام اپنے بیٹے کو ہی  
دیں گے۔ ٹھیک ہے ہمارا ہی بیٹا گندہ تھا۔ گندہ ہے۔  
میں پوچھتی ہوں۔ آپ کی بھانجی تو سستی سلوتری تھی۔  
وہ کیا لینے پہنچی تھی وہاں۔ چندہ سال سے تو میری  
بیٹیاں وہاں نہیں گئیں۔ صرف اس لیے کہ اس بے  
غیرت نے عیاشی کا اڈہ بنا رکھا ہے اسے۔ آپ بھی  
جانتے ہیں اور میں بھی جانتی ہوں ولید میں ہٹ و جھری  
اور دھتکالی اتنی ہے کہ آپ نے اس گھر کو تالے لگوا  
دے تو اس نے تالے توڑ ڈالے۔ ملازمین کے ساتھ  
بد سلوکی کی۔ محکمے والوں کو ستایا۔ کتنا کتنا ہم نے آپ  
سے اس گھر کو ہی بچ دیں۔ محکمے والے بھی ہمارے اوپر  
لحنت ہی بھیجتے ہوں گے۔ لیکن آپ کو تو جیسے الما جی  
کی یادوں سے جڑا رہا تھا۔ اس گھر کو ملکیت میں ہی  
رکھنا تھا۔ کیسا چاند چڑھا ہوا ہے۔ آپ کی بھانجی نے۔  
چلو اماں جی کی روح کو بھی سکون آگیا ہو گا۔“  
دل شاد کا ٹیلا انداز ابراہیم کی روح کو گھاسل کر گیا  
تھا وہ سر تھام کر بے بسی سے بیٹھ گئے۔

”اس گھر سے اس کا بچپن وابستہ تھا۔ اماں جی کی  
یادیں اور اور بھی بہت کچھ۔ ہو سکتا ہے وہ اسی لیے ہی  
ہو۔ لیکن اس نے اکیلے وہاں رات کیوں گزار دی۔ مجھے  
زندہ مار ڈالا ہے جو! اتم نے نہیں کا نہیں چھوڑا۔ مجھے  
تمہاری یہ حرکت بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ تم اتنی  
تاوان اور مھولی تو نہیں گئیں۔“

ابراہیم رو رہے تھے۔ دل شاد کو ابراہیم کی باتوں سے  
تقویت مل رہی تھی۔ وہ قریب بیٹھ گئیں اور ان کی دل  
جوئی کرتے ہوئے بولیں۔  
”آپ نہیں سمجھ سکتے۔ جو بچے بنا والدین کے  
ترہیت پاتے ہیں اور خاص طور پر ماں کی تربیت سے

محروم لڑکیاں۔ وہ خود کو تو نقصان پہنچاتی ہی ہیں۔ اپنے  
خاندانوں کا بھی اچھا برا نہیں سوچتیں۔ یہ لڑکی شروع  
سے ہی خود سر تھی۔ مجھے تو لگتا ہے اس نے طارق کو بچا  
دکھانے کے لیے ایسا دانستہ کیا ہے۔“

”طارق کو بچا دکھانے کے لیے؟“ ابراہیم نے حیرانی  
سے بیوی کی طرف دیکھا۔  
”ہاں کیونکہ میں محسوس کرتی تھی۔ طارق نے  
اسے اس کی اوقات۔ رکھا ہوا ہے۔ بار بار مجھے ایسا لگتا  
تھا کہ ان کے مابین تعلق خوشگوار نہیں ہے۔ شادی  
والی رات تو ساری رات طارق نے باہر لان میں گزاری  
تھی۔“

ابراہیم کو یہ انکشافات سن کر حیرانی ہو رہی تھی۔ پھر  
بھی دل شاد کا رویہ ایسا تھا جو بیٹے کے ساتھ۔  
”میں ماں ہوں ابراہیم! اپنی اولاد سے غافل نہیں رہ  
سکتی۔ طارق میرا بیٹا ہے۔ وہ ایک نظر بانی پختہ سوچ  
رکھتا ہے۔ ایسی لوٹ پناہنگ لڑکیاں تو ہزار مل سکتی  
تھیں اسے۔ مگر آپ نے خیر۔ چھوڑیں اس بحث کو  
بہر حال یہ لڑکی اگر ایسا سوچتی ہے۔ تو یہ گھر سامنے کے  
نہیں گھر اجاڑنے کے حربے ہیں۔ نہیں کیا خود ہی  
نقصان اٹھائے گی۔“

ابراہیم کو دل شاد بیگم کی باتوں سے سازش کی بو آ  
رہی تھی۔ مگر انہوں نے کسی بات کی تردید نہیں کی  
چپ چاپ وہ سنتے رہے۔ پھر طویل خاموشی کے بعد  
بولے۔

”اب مزید وقت نہیں ہے۔ ولید کا گھر بس جانا  
چاہیے۔ یہ ہماری ہی غفلت اور ڈھیل کا نتیجہ ہے کہ  
آج بانی سر سے گزر گیا پھر خداوند تعالیٰ کو بھی ہم نے  
منہ دکھاتا ہے۔ آپ اس کے لیے لڑکی دیکھیں۔ میں  
جلد از جلد اس کی شادی کروانا چاہتا ہوں۔“

”لڑکی اور میں۔۔۔“ دل شاد بیگم انہیں سے بولیں۔  
”کہاں خاطر میں لائے گا وہ میری پسند کو۔“  
”دل شاد بیگم! وہ ہمارا ہی بیٹا ہے۔ اسے اتنا ہوا  
نہیں بنا میں۔ وہ کیوں شادی نہیں کرے گا۔ کیا عمر بھر  
ہمارے منہ پہ کالک ملنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔“

وہ یکدم غیض و غضب میں آکر بولے تو دل شاد  
بیگم چپ ہو گئیں۔



وہ ابراہیم کے چھپے چھپے گھر تک آیا تھا۔ اور انہیں  
یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ جیسا وہ لوگ سوچ  
رہے ہیں ایسا ہرگز کچھ نہیں ہے۔ ابراہیم نے حقارت  
سے اس کے گلے ملے اور اس کے منہ سے پھوٹی  
شراب کی بدبو کو نہ کھاتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس غبار کی  
وجہ سے سرخ ہو کر سوچ رہی تھیں۔

وہ اس حالت میں ایمان اور قرآن کی قسمیں کھا رہا  
تھا۔ ایک غلط اور نلک شخص بار بار اللہ کا نام لے رہا  
تھا۔ ابراہیم کو اس کے وجود سے کھن آ رہی تھی۔ وہ  
اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

بچ ہو کر وہ غیض و غضب میں چلائے تھے کہ وہ  
ان کی نظروں کے سامنے سے دفع ہو جائے وہ جانتا تھا  
اس وقت ماں کو مطمئن نہیں کر سکتا لیکن بابا باب  
اس کے ساتھ یہ بد سلوکی اور بد اعتدالی کرے گا جس  
سے برداشت نہ ہو اور وہ غصے میں گھر سے نکل گیا۔ یہ  
سوچے سمجھے بنا کہ اس کے پون غائب ہو جانے سے  
حوریہ پر زندگی کا دائرہ کس قدر تنگ ہو جائے گا مگر اسے  
پرواہی کہاں تھی۔ رنج تھا تو اس بات کا کہ اس کے  
والدین اسے اتنا کھٹیا بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اسے صرف  
اپنی ذات کی پرواہ تھی۔ اور کچھ نہیں۔ سارا دن وہ اپنے  
دوست کے ہاں بند کمرے میں شراب کے سارے اپنا  
غم بھلانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔



دن بھر میں اس کے تین چار فون آچکے تھے۔  
سب سے پہلے اسماء نے اس کی خیریت دریافت کی۔  
پھر اس کے ماما نے پھر اس کے چھوٹے بہن بھائیوں  
نے۔ سب ہی گویا فکر لاحق تھی کہ وہ اچانک صبح صبح  
چلی گئی تھی۔ کیا بات تھی۔ وہ کیا جاتی کہ اس پہ کیا  
قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ اسے انتظار تھا تو طارق کا۔  
طارق آئیں گے تو میں انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی

قدیموں سے گندھی ہوئی تحریر۔  
اداس اور غمگین قارئین کے لیے  
ایک غم گسار کہانی



وہ غائب ہونا چاہتا تو حاضر ہو جاتا  
حاضر ہونا چاہتا تو غائب ہو جاتا  
ایک مرد و عورت کی داستانِ حیرت  
شکوہ۔ کچھ خیالِ اللہ جاتا ہے

حاضر غائب  
اظہارِ کلیمِ ایم اے



قیمت: 300/- روپے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی



اور مجھے ملازموں کی گواہیاں لینے کی ضرورت کیا ہے۔ میرے ماں باپ اور اور میرے بہن بھائی جن کے ساتھ میں نے رات گزار دی تھیں وہ میرے حق میں نہیں کھڑے ہوں گے۔

مگر کتنی شرم ناک بات ہے۔ کس طرح سامنا کروں گی میں اپنے ماں باپ کا اور بہن بھائیوں کا۔ کیا میرے سرال والے مجھ پر اتنا گھٹیا بھی الزام لگا سکتے ہیں۔ کیا اوقات ہے میری میرے سرال میں سب کو پتا چل جائے گا یا خیر میں کیا کروں۔ کیا کروں۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی۔

جو لوگ ایسا الزام لگاتے ہوئے نہ کانپے۔ وہ کیونکر کسی کی گواہی کا یقین کریں گے۔ پھر تو میں ہر طرف سے ذلیل و خوار ہو کر رہ جاؤں گی۔ اسے کوئی راہ بچائی نہ دے رہی تھی۔



بالآخر سب سب کروقت گزری گئی۔ طارق گھر آ گیا تھا۔ ابراہیم نے بیوی کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ فی الحال کوئی بھی بات طارق سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک تو وہ سفر سے آ رہا ہے۔ دوسرے جب تک ہمیں خود کسی معاملے کا صحیح علم نہیں ہو جاتا۔ اسے پتہ چلانا ہمارے لیے بھی باعث شرم ناک ہے۔

”جو گویا آپ ابھی تک بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔“

”ہاں! ابراہیم نے نفوس لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ وہ ہماری ہی بیٹی ہے ہمارا خون ہے۔ وہ بد کردار نہیں ہو سکتی۔“

”موقع واردات سے باز یا اب ہونے کے باوجود آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔“

”یہی معذرت تو عمل نہیں ہو رہا ہے۔“ وہ یکدم تذبذب سے بولے تو دل شاد کے چہرے پر چمک آئی۔ ”بھیک ہے آپ کہتے ہیں تو میں طارق کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ پھر بھی میں دیکھتی ہوں آپ کی بھانجی اپنا گھر

بہالے کی کیا نہیں۔“

طارق والدین کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھا رہا تھا۔ اسے باپ کی طبیعت کی فکر ہو رہی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر امجد سے ٹائم بھی لے لیا تھا جو انہوں نے کل رات کا دیا تھا۔

رات دس بجے جب طارق اپنے کمرے میں آیا تو حور کی حالت دیکھ کر رنگ رہ گیا۔ ستا ہوا چہرہ۔ متورم آنکھیں اور خشک ہونٹ اور اجڑا اجڑا سا حلیہ۔ وہ طارق کو دیکھ کر بے صبری سے بستر سے اٹھی اور طارق کے سینے سے لگ گئی۔ وہ ہلک ہلک کر رو رہی تھی۔

طارق حیران ہو پریشان تھا۔

”کیا ہوا ہے حور! کچھ بتاؤ تو سہی۔“ اس کا نرم اور ملائم لہجہ۔ حور کو حیران کر گیا۔ اس نے بے یقینی سے سر اٹھا کر طارق کی طرف دیکھا۔

وہ خود پریشان سا لکھا ہوا اس کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ حور نے جلدی جلدی دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں۔

”آپ کو کسی نے کچھ نہیں بتایا؟“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ وہ خود کس منہ سے اور کس طرح بتائے گی کہ بات کیا تھی۔

طارق نے لٹی میں گردن ہلا دی اور مسکرا کر اس کے گرد بازو جا مل کر تے ہوئے اسے صوف پر اپنے ساتھ بٹھایا پھر کہنے لگا۔

”ضرور ملنا کا اور تمہارا بھگتا ہوا ہو گا۔ ہے ناں۔ یا دل تو بڑو غیو نے تمہیں کچھ کہہ دیا ہو گا۔ کم آن حور! ان باتوں کو لے کر چلو گی تو زندگی کیسے گزرے گی۔ ہاں اور تمہیں پتا ہے۔ بابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ان کی ہارٹ ٹیسٹس بڑھی ہوئی ہیں۔ جو تشویش ناک ہے۔ شاید اسی وجہ سے کسی نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ تم بتاؤ تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ ارے یہ کیا مجھے تو لگتا ہے تمہیں کچھ بھی ہو رہا ہے۔

”تم آن حور۔ کچھ تو حوصلہ کرو۔ میرے ساتھ زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہیں میں پہلے بھی بتا چکا ہوں تمہیں ان سب مسائل کا سامنا کرنا پڑے

گا۔“

وہ آہستہ آہستہ پار سے اسے بہلا رہا تھا۔ وہ اس کی محبت یا کرجائے خود کو مضبوط پانے کے ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔

”طارق! آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے۔“ اس کی آواز اندھم تھی۔

”کیا میں نے تمہیں چھوڑنے کے لیے اپنا یا تھا۔“ وہ اس کے بال سنوار رہا تھا۔ وہ بے یقینی سے طارق کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اسے طارق کو سب کچھ بتا دینا چاہیے وہ طارق سے کچھ نہیں چھپائے گی اور طارق کو سب کچھ بتا دیا۔

”آج صبح صبح ولید نے مجھے فون کیا۔ میں ابو کے گھر میں تھی سو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے لینے آ رہا ہے۔ وہ بہت پریشان لگ رہا تھا میں خود بھی پریشان ہو گئی۔ وہ مجھے لینے آ گیا۔ میں اس کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھی تو میں نے سب گھروالوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ اپنے فونوں میں مصروف رہا۔ پھر وہ مجھے تانوالے گھر میں لے گیا اور اس نے مجھے سارا قصہ سنایا کہ وہ مجھے کیوں لے کر آیا ہے۔ مجھے اس پر سخت غصہ آیا۔ اسے آپ کا بھی پتا نہیں تھا کہ آپ سفر سے باہر ہیں۔ ابھی میں اسے غصے میں برا بھلا کہہ کر نکل رہی تھی کہ ملا اور بابا پہنچ گئے اور پھر۔۔۔ ملا نے مجھ پر ایسے ایسے الزام لگائے کہ میں بتا نہیں سکتی۔“

یہ کہہ کر حور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ”میں نے ان کے الزامات کو جھٹلایا اور ولید نے بھی۔ مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ انہوں نے کیا کہ میں رات بھر وہیں رہی ہوں پھر انہوں نے بابا کو بھی یہی کچھ بتایا۔ طارق میں نے بابا کی نگاہوں میں خود کو مجرم پایا تو میں بالکل ٹوٹ گئی۔ مگر میں مجرم نہیں ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں مجرم نہیں ہوں۔ آپ تو اس بات کا یقین کریں گے ناں۔ اور وہ ولید ولید تو خاندانی ہو گیا۔ کم از کم۔ اسے بھی سچائی کا سامنا کرنا چاہیے تھا۔ آپ کے بھائی نے میرے ساتھ جان بوجھ کر ایسا کیا

ہے۔ نہ جانے یہ لوگ کیا چاہتے ہیں طارق! جو میرے ساتھ ایسا ہوا۔“ وہ رو رہی تھی۔

ایک دم اس نے محسوس کیا۔ طارق کا بازو اس کے گرد سے ہٹ گیا تھا۔ طارق کی آنکھوں میں اجنبیت اور چہرے پر سفاکی تھی۔ حور اس کے تاثرات دیکھ کر کانپ اٹھی۔



دو روز کے بعد ولید کو اس بات کا خیال آیا تھا کہ یوں بند کمرے میں بیٹھ کر ماتم کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اسے اصل حقائق کو سامنے لانا ہو گا۔ سچائی جب ہی بے نقاب ہو گی جب وہ دونوں ملازموں کو گھر لے کر جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ وہاں سے نکل پڑا تھا۔ دو دن تک غم و غصے میں بھر بھر جھٹلنے کے باوجود بھی اس کا غصہ نہیں اترتا تھا کہ اس کی ماں نے اس پر اتنا گھٹیا الزام لگاتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا۔

کیا وہ اسے اتنا ذلیل سمجھتی ہیں کہ وہ اس قدر مگر ہی ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ ملانی کا کھانا کم از کم آپ کو کچھ تو کھانا کرنا چاہیے تھا۔

آپ حور العین سے اتنی نفرت کرتی ہیں کہ آپ نے اپنے بیٹے کے منہ پر بھی پتھر پڑا دی۔ ہاں میں بھائی کا کیا حال ہو گا۔ یہ حالات تو طارق کو بھی پتا چلے ہوں گے۔ بھابھی کس طرح ایسی ساری نفرتوں کا مقابلہ کر رہی ہوں گی۔ کوئی بعد نہیں ملا نے انہیں گھر سے بھی نکال دیا ہو۔“ اس کی گپشیاں سلگنے لگی تھیں۔

وہ سیدھا اپنے ٹھکانے پر پہنچا تھا۔ مگر وہاں تالے لگے ہوئے تھے اور یہ اس کے لیے اچھے کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ایسا پہلے بھی ہوا تھا۔ اور تب وہ با آسانی تالے توڑ دیتا تھا۔ مگر اب اسے تالے توڑنے سے غرض نہیں تھی۔ اسے تو شیر خان اور رانی سے ملنا تھا۔ دونوں گھر کی پچھلی سائیڈ پر کوارٹر نما پورشن میں رہتے تھے۔ وہ گھر کی پچھلی سائیڈ پر آ گیا۔ کوارٹر میں بھی ملا لگا ہوا تھا۔ ایسا آج تک نہیں ہوا تھا کہ شیر خان اسے



بتائے بغیر کہیں گیا ہو۔ شیر خان اس کا ذاتی ملازم تھا۔ وہ اس کے ہر ٹھکانے سے واقف تھا۔ لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی۔ شیر خان کا کہیں بھی اتنا پتا نہ ملا۔ شیر خان کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر اسے شاید جھنجھلاہٹ اور غصہ آ رہا تھا۔ مگر وہ لاچار تھا اچانک شیر خان کا یوں غائب ہو جانا۔ اس کے پیچھے کیا بھید ہو سکتا ہے اسے یہ سب کچھ جاننے سے غرض نہیں تھی۔ نہ ہی اس کا فی الفور اوھر دھیان گیا۔

شام تک رنج ہو کر وہ گھر لوٹ آیا اور اسے گھر لوٹنا ہی تھا۔ وہ مجرم تو نہیں تھا جو یوں منہ چھپا کر بیٹھا رہتا۔ حیرت کی بات تھی یہ باتیں آہستہ آہستہ اس کے دلخ میں آ رہی تھیں۔ ان دونوں میں جو ر پر کیا گزری ہوگی اسے اب اس کی بھی فکر ہونے لگی تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا تھا۔ ٹھیک نہیں تھا۔ اسے ہی اس سنگین مسئلے کا حل نکالنا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو گھر میں غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پیشہ کی طرح وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ پھر اچانک بیڑھیوں کے آگے اس کے قدم رک گئے۔ پہلا خیال یہی آیا۔ نبھانے بھالی اوپر ہیں یا۔ اپنے میکے

وہ اس قدر شرم سار تھا۔ فی الحال حور کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ گزرتے ہوئے اسے دل نشیں کے کمرے سے آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ یہ کمروں کی پچھلی سائڈ تھی۔ دل نشیں کے کمرے کی کھڑکی اٹھ کھلی تھی۔ وہ باسانی سن سکتا تھا۔ دل نشیں ماں سے اٹھ رہی تھی۔ ”فار گاڈ سیک ملا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ نے یہ بات طارق بھائی سے کیوں چھپا رکھی ہے۔ مصلحت۔ مصلحت۔ غیرت کے اوپر آپ مصلحت کو ترجیح دے رہی ہیں۔ ملٹی گاڈ ملا۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ یہ طارق بھائی کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہو گا۔ آپ کو انہیں صاف صاف بتادینا چاہیے تاکہ اس مصیبت سے جان چھوٹے۔“ دل نشیں کے لہجے میں بے زاری ہی نہیں نفرت

بھی تھی۔

”بے وقوف ہو تم دلشی۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ اس طرح وہ حور سے جان چھڑانے کا اور ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ تم معاملے کی سنگینی کو سمجھو۔ طارق بھی مرو ہے۔ کیا وہ ایک منٹ بھی اس بات کو برداشت کر سکے گا۔ وہ اپنے بھائی کا خون کر ڈالے گا۔ پھر اس سے جان چھڑائے گا۔ اس چیزیل کے پیچھے میں اپنے دونوں بیٹوں سے ہاتھ دھو ڈالوں۔ ایک زندگی سے چلا جائے اور دوسرا سلاخوں کے پیچھے کیا تم اخبارات میں آئے دن ایسے واقعات نہیں دیکھتیں۔“

وہ تو اس گھر کی بریادی کا ہی عزم لے کر آئی ہے۔ تب ہی ایسے گل کھلا رہی ہے۔ مگر میں تو بے وقوف نہیں ہوں۔ اس کا وار کا سیاب نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے اس سے جان بھی چھڑانی ہے اور اپنے دونوں بیٹوں کو بھی بچانا ہے۔ پھر تمہارے بابا۔ ان کی صحت اجازت نہیں دیتی کہ اس معاملے پر مزید ہم کچھ کریں۔ اس کا کچھ نہیں جائے گا دلشی۔ ہر طرف سے نقصان میرا ہی ہے۔ اس لیے میں طارق کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ بوقت طارق کو خود بتائے گا۔“

”مگر مجھے یقین ہے۔ اس چلترنے سنی ساو تری بن کر طارق کو کوئی نہ کوئی من گھڑت کہانی ضرور سنائی ہے۔ آپ طارق کی خاموشی دیکھ رہی ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ طارق اس معاملے سے آگاہ ہو چکا ہے وہ الجھا ہوا بھی ہے اور پریشان بھی۔ مگر بابا کی وجہ سے وہ کوئی بات نہیں کر رہا۔ شاید وہ سچائی سے پوری طرح واقف نہیں ہوا ہے۔“

”اسے اچھے دو دلشی۔ وہ جتنا الجھے گا اتنا ہی اپنی بیوی سے دور بھاگے گا۔ آخر وہ کب تک اپنی غیرت پر ہرے بھائے گا۔ یہ خود اپنی جگہ کے لمحے ہی اسے حور سے دور کرنے کے لیے ہی کافی ہیں۔“ پھر ہماری بلا سے طارق اسے رکھے یا چھوڑے۔ ہمیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں۔ میں اصباح کو طارق کی دلہن نہیں بنا سکی تو کیا ہوا طارق کسی اور کے ساتھ بھی نہیں رہ پائے گا۔“

پھر دل شاو کا لہجہ مغموم ہو گیا۔

”میں نے اس گھر میں اس کے نہیں۔ اپنی جتنی کے خواب دیکھے تھے اس غلطی کا احساس میں تمہارے باپ کو دلانا چاہتی ہوں۔ وہ تمہارے باپ کی مرضی سے اس گھر میں آ تو گئی تھی۔ لیکن یہاں بس نہیں سکتی۔ تم دیکھنا طارق اس سے جلد ہی علیحدگی اختیار کر لے گا اور تب میں اصباح کو بڑی دھوم دھام سے طارق کے ساتھ بہا کر لاؤں گی۔“

تم نہیں جانتیں دلشی۔ میں اپنے بھائی کے سامنے کس قدر شرم سار ہوں۔ میں جو مدت سے اصباح کو بہو بنانے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ میرے ان خوابوں سے میرے بھائی واقف تھے۔ مگر میں نے طارق کو بہا کر اپنے بھائی سے وعدہ خلافی کر ڈالی۔ اس وعدے کو نبھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب تم دیکھنا اس گھر میں ہماری من چاہی خوشیاں ہوں گی۔ بس تھوڑا سا صبر کرو۔“

ولید کے اندر بھونچل بیا ہو گیا۔ تو صرف ایک اصباح کو اس گھر میں لانے کے لیے آپ نے ملا! آپ نے یہ ڈرامہ رچایا ہے۔ صرف اپنے مفاد کے خاطر۔ نہ صرف اپنے بیٹے کو ذلیل کیا۔ بلکہ طارق کا بھی گھرا جڑنا چاہتی ہیں۔ نہیں۔ ملا نہیں۔ میں طارق کا گھر اجڑنے نہیں دوں گا۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ جو چاہیں گے وہ ہوتا چلا جائے گا۔“

وہ ماں کا سامنا کر سکتا تھا۔ ان سے سوال جواب کر سکتا تھا۔ مگر نہیں۔ اس وقت اسے اپنے غصے اور جذبات پر قابو پانا تھا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے غم غصے کی حالت میں وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔



ٹی وی کی تیز آواز سن کر دل شاو ٹھٹک گئیں۔ تو کیا آج دونوں بعد وہ گھر آئی گیا تھا۔ دروازہ اٹھ کھلا تھا۔ کمرے کی ساری لائٹس روشن تھیں۔ وہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔ دل شاو نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ بستر پر بدستور پڑا رہا۔ جیسے ماں کو نظر

انداز کر رہا ہو۔ دل شاو اس کے روتے ہوئے کھول اٹھیں۔ ”دل گئی تمہیں فرصت گھر آنے کی۔“ دل شاو نے ٹی وی — آف کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔ جیسے سننے سے قاصر ہو۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں ولید۔!“ دل شاو سخت غصے میں تھیں۔ اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا اس کی ڈھٹیلی اور ہٹ دھرمی سے دل شاو اچھی طرح سے واقف تھیں۔

”کس منہ سے اس گھر میں قدم رکھا ہے تم نے۔؟“

ولید کے بدن میں خون آگ بن کر دوڑنے لگا۔ کینٹیناں سلگ گئیں اور ضبط کی کھٹکھٹ چرے سے عیاں ہونے لگی۔ وہ بستر سے اٹھ گیا اور فریق کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔

”میں تمہاری ہٹ دھرمی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ بچپن سے آج تک تم نے جو بھی غلط کام کیے تمہیں کبھی اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا۔“

وہ تب بھی کچھ نہیں بولا۔ بیٹھ موڑے کھڑا رہا۔ ”تمہارے باپ نے اس واقعے کو اپنے دل پہ لے لیا ہے۔ مگر تمہیں۔ تمہیں ذرا سا احساس بھی نہیں ہے۔“

اس نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا۔ دھواں دھواں چہرہ اور دکھ سے لبریز آنکھیں۔ جو رنج سے شکوہ کر رہی تھیں۔ دل شاو نظریں نہ ملایا میں۔ ذرا دیر کو ندامت نے بھی دل پہ دستک دی تھی۔

”جو کچھ بھی ہوا۔ میں اس پہ بحث نہیں کرتا چاہتی۔“ دل شاو نے خود ہی اس موضوع کو ٹال دیا۔

ولید کو حیرت ہوئی۔ وہ ماں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ شیر خان اور رانی کو کہاں غائب کر دیا ہے۔ لیکن اسے شدید شک لگا جب دل شاو نے اس موضوع پر بات کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

”تمہارے بابا۔ تم سے سخت ناراض ہیں۔ اب ہماری عمر اور صحت اس چیز کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم آئے دن تمہارے ان کارناموں سے اپنے منہ پہ کالک



بنا سیتی

# نعمت

واقعی ایک نعمت ہے

Double Refined



Phone: 044-2661250-51  
Fax: 044-2661104  
nemat@xpert.net.pk  
www.salva.com.pk

سلوا ایل اینڈ ویجیٹیبیل گھس  
انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ اوکاڑہ



Noorani

نے مجھے ایسے گھٹاؤ نے فعل کا زمہ دار ٹھہرا دیا۔ کیوں  
مام۔ کیوں۔ کیا میں آپ کی اولاد نہیں تھا۔؟ وہ  
ترپ اٹھا تھا۔  
دل شاد کا دل ہی تو تھا پھر تو نہیں۔ ہمتا کے احساس  
سے لبریز ہو گیا۔ وہ بڑھری سے ولید کے قریب آگئیں  
اور اس کے کانڈھے پہ ہاتھ رکھ کر رنج سے کہنے  
لگیں۔

”کیوں نہیں۔ تم بھی میری اولاد ہو  
لیکن۔ تمہاری کچھ نادانیوں نے ہمیں آج رسوا  
کیا ہے؟ میں نہیں اول روز سے منع کرتی تھی کہ  
تم اس سے تعلق نہ رکھنا۔ یہ عورت اچھی نہیں ہے۔  
مگر تم نے میری ایک نہ سنی اس واقعہ کا ہمیں کتنا  
صدمہ ہے۔ جبکہ وہ سکون سے رہ رہی ہے۔ غیرت مند  
ماں باپ کی اولاد ہوتی تو کیا اس گھر میں آتی۔“  
ماں کے خیالات سے ولید کے دل کو گھیس پہنچ رہی  
تھی۔ صرف حور العین کو اس گھر سے نکالنے کے لیے  
یہ ساری سازش بنی جاری تھی اور اصباح کو لانے کے  
خواب دیکھے جارہے تھے۔ اسے اصباح سے سخت  
نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ حور العین کی صفائی میں  
بولتا چاہتا تھا۔ مگر دل شاد سننے پہ آمادہ ہی کہاں تھیں۔  
”جو کچھ ہو چکا ہے نا۔ اسے بھول جاؤ۔ ولید۔ اس  
گھر کی سلامتی کے لیے یہی بہتر ہے۔“  
پھر وہ رمان سے اس کا بازو پکڑ کر صوفے پہ بٹھاتے  
ہوئے بولیں۔

”جو پرنزل میں نے تمہیں دیا ہے۔ اس پہ  
ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر مجھے جواب دینا۔ اب  
ہم مزید تمہاری شادی میں تاخیر نہیں کر سکتے۔“  
وہ گرم صم سالماں کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔؟ دل شاد نے نرمی و محبت  
سے اس کے بال پیشانی سے ہٹائے۔ تو ولید کا دل کسی  
پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ اسے اصباح سے شدید نفرت  
محسوس ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ماں نے یہ  
مکرو فریب جال بنا تھا۔ ولید نے سر جھکایا اور فرش کو  
گھورنے لگا۔

ملیں اور تمہیں بے ہمار چھوڑے رکھیں۔ تمہاری  
شاوی بھی طارق کے ساتھ ہو جاتی تو بہتر تھا۔ لیکن تم  
سجیدہ ہی نہیں ہوئے اور اس کی سزا ہم بھگت رہے  
ہیں۔ خیر۔ ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی  
جلد از جلد کروں تاکہ تمہارے گناہوں کا بوجھ ہمارے  
دامن میں نہ آئے۔“

ولید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دل شاد نے نظریں  
اٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا تو وہ ماں کے سامنے سے  
ہٹ کر کھڑکی کی جانب بڑھ گیا جو لالان میں کھلتی تھی۔  
”تمہیں اگر کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ۔ ورنہ میں  
اور تمہارے بابا اپنی پسند سے تمہاری شادی کرنے کا  
پورا اختیار رکھتے ہیں۔“ دل شاد کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔  
ولید کے چہرے پہ تلخ ہنس بکھر گیا۔ چونکہ اس کا  
رنگ دل شاد کی طرف نہیں تھا۔ اس لیے دل شاد اس  
کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھیں۔ جب اس نے  
کوئی جواب ہی نہ دیا تو دل شاد رنج ہو گئیں۔

”میں ایک گھنٹے سے بک بک کر رہی ہوں اور تم ہو  
کہ پتھر کی طرح کھڑے ہو۔ آخر اس طرح کب تک  
چلے گا ولید۔ تمہارے اس غیر ذمہ دارانہ رویے سے  
جانتے ہو۔ یہ گھر بربادی کے دہانے پہ آکھڑا ہوا ہے۔“  
ولید کے اندر آندھیاں چلنے لگیں۔ ماں کے  
روئے پر اسے شدید دکھ ہو رہا تھا۔

”اور تم ہو کہ تمہیں احساس ہی نہیں۔“  
”میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ماما۔“ اس کی آواز  
حلق میں پھنس رہی تھی۔ ”مگر مجھے دکھ اس بات کا ہے  
کہ آپ نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔“  
دل شاد نے چونک کر دیکھا۔ وہ پیٹھ موڑے کھڑا  
تھا۔

”ہمیشہ سے ہی آپ طارق کو چاہتی تھیں اور اسے  
ہم سب پہ فوقیت دیتی تھیں۔ آپ کی بھرپور توجہ سے  
وہ آپ کا قریب برادر بننا چلا گیا اور میں۔ میں محبتیں  
باہر تلاش کرنے کی کوشش میں خود سے بھی دور ہوا  
چلا گیا۔ پھر آپ نے مجھے اپنے وجود سے ہی کاٹ کر  
پھینک دیا۔ اور آپ کو مجھ سے اتنی نفرت ہے آپ



”آپ نے طارق کی زندگی کا فیصلہ کرنے سے پہلے طارق کو تو ایسا اختیار نہیں دیا تھا۔ جیسا مجھے دے رہی ہیں۔ حالانکہ سب جانتے تھے طارق جو بھائی کو پسند تھی کرتا ہے اس کے باوجود اس رشتے کی آپ نے مخالفت ہی کی۔ پھر مجھے یہ اختیار کیوں۔“

وہ پوچھتا چاہتا تھا۔ مگر دانت۔ دانت۔ جمائے بیٹھا رہا۔ دل شاد اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے طارق کا گھر بچانا تھا اور وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

”جن لڑکیوں سے میری دوستیاں ہیں ایسی لڑکیاں بیویاں بنانے کے قابل نہیں ہوتیں۔“

کافی دیر بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو دل شاد کو خوش گوار حیرت ہوئی۔

”مجھے خوشی ہوئی کہ تم ایسی سوچ رکھتے ہو۔“

”میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جو صرف آپ کی من پسند ہو۔“

”میری من پسند۔“

دل شاد کو جھٹکا لگا۔ گویا انہیں ولید کی فرماں برداری پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

”ہاں ماما۔ صرف آپ کی من پسند۔“ ولید نے یہ کہہ کر ماں کے ہاتھ تھام لیے اور عقیدت سے انہیں اپنے ہاتھوں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

”صرف آپ کی من چاہی لڑکی ہی میری زندگی کا رخ بدل سکتی ہے۔ مجھے بھٹکنے سے روک سکتی ہے۔ باکروار خاندانی اور نیک سیرت لڑکی۔ آپ ہی میرے لیے تلاش کر سکتی ہیں۔“ دل شاد کو اپنے کالوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”نیک سیرت۔ باکروار۔ من پسند۔ صرف اور صرف اصباح اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ دل شاد کا دل گواہی دے رہا تھا۔ مگر۔ نہیں۔ ولید۔ ولید میں بہت کمی ہے۔ وہ اس رشتے کو نہیں نباہ سکتا۔“

”کیا سوچتے گئی ہیں ماما۔“ ولید نے دل شاد کے چہرے پر آئی چمک کو مایوسی میں ڈوبتا دیکھ کر استفسار کیا تو دل شاد صاف گویا سے بویں۔

”کیا تم میری من پسند لڑکی کے ساتھ خوش گوار اور

باعزت زندگی گزار لو گے۔“

ان کے اندیشے زبان پہ آئے تو ولید کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھوکا دینے میں لطف آیا۔

وہ ماں کے پہلو سے نکل کر کھڑا ہوتے ہوئے شکوہ کنال لہجے میں بولا۔

”میں جانتا ہوں۔ آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ مگر نہ تو آپ نے پہلے مجھے اس کے قاتل سمجھا تھا اور نہ ہی اب سمجھیں گی۔“

وہ مایوسی سے کہہ کر دوسری جانب بیٹھ گیا۔ دل شاد لہجہ نکلیں اور شش و پنج میں مبتلا ہو کر بیٹے کی طرف دیکھنے لگیں۔ جہاں سنجیدگی نمایاں تھی۔ (اچانک ولید میں اتنی چمک ہے ضرور وہ اپنے کیے پر نادم ہے۔)

کچھ لمبے یوں گزر گئے۔

”میں تمہارے پیار سے بات کر رہی گی۔ پھر جیسا وہ چاہیں گے ویسا ہی ہو گا۔“

”نہیں ماما۔ مجھے بابا کی چاہت کی نہیں آپ کی چاہت کی ضرورت ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں وقار ماموں کی اصباح سے زیادہ آپ کے دل میں کسی اور لڑکی کی چاہت ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ کو یہ رشتہ قبول ہے۔ تو مجھے بھی دل جان سے قبول ہو گا۔“

دل شاد کو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اگر کبھی طارق سے ہٹ کر ولید کے بارے میں انہوں نے سوچنا بھی چاہا تھا تو اسی خوف نے پیش قدمی سے روک دیا تھا کہ ولید کہاں ایسی لڑکی کو خاطر میں لائے گا۔ جو کم بزمی نکلی اور سیدھی سلوی ہوگی۔

لیکن اب ولید خود ہی ایسی لڑکی کی خواہش کر رہا تھا۔ ولید نے انہیں نئی امنگ اور نئی فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔

\*\*\*

آج بہت دن کے بعد اسے یونورسٹی میں دیکھ کر راجیل کو کھری طہانیت کا احساس ہوا تھا۔ دل نہیں میں واضح تبدیلی تھی۔ پہلے کی نسبت وہ زیادہ خود اعتماد اور بولڈ دکھائی دے رہی تھی اور یہ تبدیلی سب ہی محسوس کر رہے تھے۔

”بہت دن سے میں تمہیں مس کر رہا تھا۔ دلشٹی! آئی بار تمہیں فون بھی کیا لیکن تم نمبر دیکھ کر فون آف کر دیتی تھیں۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ اس دوران میں سخت ٹینشن میں رہا۔ تم جانتی ہو۔ امی کی طبیعت صحیح نہیں رہتی۔ ساری دن سے داریاں بچھ ہی رہیں۔

تس ان ہی حالات کی وجہ سے تمہیں نہ جانے کیا کچھ کہہ بیٹھا۔ آئی ایم سوری دلشٹی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں بہت دن سے کھٹی میل کر رہا ہوں۔ کئی راتوں سے سو نہیں پایا۔ میں نے واقعی تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ حالانکہ تم جیسی لڑکی ہی میرا آئیڈل ہو سکتی ہے۔ اس بات کا احساس مجھے تم سے دوری کے بعد ہوا ہے کہ تم میرے لیے کیا ہو اس روز میں نے تمہیں برا بھلا کہا۔ تم بھی مجھے برا بھلا کہہ لو لیکن پلیز ناراض مت ہوؤ۔ آئی ایم سوری دلشٹی۔ آئی ایم ریلی سوری۔“

اس کی منت ساجت۔ دل نشیں قہقہہ لگا کر فون پر۔ جو راجیل کو حیران کر گیا۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ اس کی ایک بات نہیں سنے گی۔ انابرا بھلا کہہ کر اس کے پاس سے اٹھ جائے گی۔ لیکن دل نشیں کا رویہ بالکل متغیر تھا۔ وہ دوستانہ لہجے میں راجیل سے مخاطب ہو کر بولی۔

”ایسی دس۔ جو کچھ ہو چکا ہے۔ میں اسے بھول چکی ہوں۔ تمہیں بھی وہ سب کچھ بھلا دینا چاہیے۔ ہم اچھے دوست ہیں۔ اور اچھے دوست ہی رہیں گے۔“

”ریلی دلشٹی!“ راجیل کو یقین ہی نہیں آیا۔ وہ تو اسے منانے کو ایک معرکہ سمجھ رہا تھا لیکن یہاں تو معجزہ ہی ہو گیا تھا۔ وہ حیرانی سے دل نشیں کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

راجیل کو اپنا مقصد با آسانی دل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ جبکہ دل نشیں اس کی دیوانہ وار خوشی پہ دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

جب اسے علم ہو گا کہ میں کسی اور سے منسوب

ہو چکی ہوں اور اسے چاہتے بھی گئی ہوں۔ تب اسے بالکل ویسا ہی صدمہ ہو گا۔ جیسا مجھے اس روز ہوا تھا۔ جب میں نے بے وقوفی میں خود ہی اسے رپوز کر دیا تھا۔ تب اس کی بے اعتنائی پہ مجھے اپنا آپ گستاخا لگا تھا۔ میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو مجھی بھی خود کو نہ سنبھال پالی۔ مگر میں نے خود کو سنبھال لیا اور یہ۔ یہ بھی خود کو سنبھال نہیں پائے گا۔ تب مجھے اپنی بے عزتی کا جواب لوٹا کر کتنا سکون ملے گا۔ وہ دل ہی دل میں ہنستے ہوئے راجیل کے ہمراہ کھاس پہ چل رہی تھی۔



”میرا خیال ہے کہ تم کچھ روز کے لیے اپنے پیر شس کے بل چلی جاؤ۔“

بہت دن کے بعد طارق نے اس سے گفتگو کی تھی۔

طارق کے سرد رویے سے وہ پہلے ہی لبو لبان تھی۔ اب اسی بات پر اس کی جان پید بن گئی۔

”میں اپنا گھر چھوڑ کر بلا وجہ کیس کیوں جاؤں؟“

اس کا زلی اعتماد۔ اور خود سری۔ بہت دن کے بعد اس کے رویے میں عود آئی تھی۔ طارق نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی وہ کتنی دلیر تھی جبکہ ولید نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اور وہ ملاکی مرضی سے شادی کرنے پر رضامند بھی ہو گیا تھا۔

آخر ولید کے اس قدر ٹوٹنے کی وجہ کیا تھی؟ شاید یہ کہ وہ مجرم تھا۔ طارق کے شبہات پھر سے زندہ ہونے لگے تھے۔

”میں رانی اور شیر خان کو زمین کی ساتویں تہ سے بھی ڈھونڈ نکالوں گی۔“

گویا اس نے طارق کی خاموشی کو چیلنج کیا تھا۔

طارق کچھ نہیں بولا۔ اس کی سرد مہر بے اعتنائی پہ وہ سلگ گئی۔ اور شکوہ کنال نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے آپ سے ایسے رویے کی امید نہیں تھی



طارق! آپ کے گھر میں میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، میں نے کبھی آپ سے سپورٹ نہیں مانگی۔ کبھی ان حالات کا رونا نہیں دیا۔ آپ سے جو مجھے درپیش تھے، اکیلے ہی مقابلہ کرتی رہی۔ صرف آپ کی خاطر آج مجھے آپ کی سپورٹ کی ضرورت تھی۔ آپ کے مکمل اعتماد کی ضرورت تھی۔ آج آپ نے پھر مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ آپ نے تو مجھ سے محبت کے دعوے کئے تھے۔ کہاں گئی وہ محبت۔ وہ دعوے؟

”مگر پھر بھی آپ کو ایسا ہی لگتا ہے۔ تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی وارڈروب کھولی اور اپنے کپڑے بیک میں ڈالنے لگی۔ اسے طارق کی محبت پر اعتماد تھا۔ تب ہی اس نے طارق کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ مگر طارق ایسا کرے گا۔ اسے امید نہیں تھی۔ اسے طارق کے رویے کا گمراہ کہہ سکتا تھا۔

”میں اب یہاں سے چلی گئی۔ تو پھر کبھی واپس نہیں لوٹوں گی۔“

اس کی آواز دھیمی اور رنجیدہ تھی۔ اس نے بیک کی زپ بند کرتے ہوئے کہا تو طارق اس کے سامنے آگیا۔ اور اس سے بیک چھین کر دور پھینکتے ہوئے بولا۔

”یہاں کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ گھر میں بھی کچھ تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں۔ جو میرے لیے ہی نہیں شاید تمہارے لیے بھی اچھے کا سبب ہوں۔ میں نے تمہیں عارضی جانے کا کہا ہے۔ بیشک کے لیے نہیں۔ میرے اوپر کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ جنہیں میں یکسوئی سے نبھانا چاہتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ دن رات تم اس واقعے کو دہرا دہرا کر مجھے ذہنی اذیت پہنچا رہی ہو۔ میں نے تمہیں ایک بار بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ مگر شاید تمہیں احساس ہی نہیں ہو رہا کہ مجھے اس موضوع سے کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔“

خو نے حیرت سے طارق کی طرف دیکھا۔ وہ کس

خود غرضی سے اپنی تکلیف کا احساس دلا رہا تھا۔ اور جس کے اوپر یہ جھوٹی ہنسٹ لگی تھی۔ اس کی تکلیف اس سے کتنی زیادہ گہری تھی۔ اس کا اسے احساس ہی نہیں تھا۔ حور کا دل شدت غم سے پھٹ پڑا۔

”آپ۔ طارق۔!“ اس کی آواز گھٹ رہی تھی۔ اور انگشت شہادت طارق کے سامنے تھی۔

”آپ کو ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ اس لیے آپ مجھے میرے پیرتیس کے ہاں بھیج رہے ہیں۔ میرا سوچا ہے، میرا چین سکون، راتوں کی نیندیں سب کچھ برہلو ہو گیا۔ کوئی مددوار کرنے والا نہیں۔ ایسی صورت حال میں۔ میں وہاں۔ وہاں۔ کیسے رہاؤں گی۔“

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ مگر وہ کیا کرتا۔ اس کے شکوک کو تقویت پہنچانے کے لیے ولید کا فیصلہ۔

کاری ضرب ثابت تھا۔

”میں فی الحال تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ جیسے چکر اس کا گیا تھا۔

”آپ مجھ سے کھل کر بات کریں طارق۔! یہ معاملہ معمولی نہیں ہے۔ ہماری ازدواجی زندگی کا سوال ہے۔ آپ کا مجھ سے فرار مجھے مجرم ثابت کر رہا ہے۔ مجھے زمانے کی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن آپ کی سردمہری دن رات مجھے شکار کر رہی ہے۔“

”ولید نے فوری شادی کا اعلان کر دیا ہے۔ اور وہ بھی ماما کی پسند ہے۔“

وہ اپنے غم میں غرق تھا۔ طارق نے یہ ہم اس کے سر پر مارا۔ اس کی رگ رگ میں سناٹا پھیل گیا۔ اس نے خیر سے طارق کی طرف دیکھا۔ جیسے یقین ہی نہ آیا ہو کہ ولید کے اس فیصلے کے پیچھے کون سا مکمل کارفرما ہے۔

”وہ گھر واپس آگیا ہے۔ بچپن سے ہی وہ اس قدر ہٹ دھرم اور ضدی ہے۔ کبھی اپنے کسی گناہ یہ ٹام نہیں ہوا۔ اچانک اس کا یوں جھک جانا۔ کیا ثابت کرتا ہے؟“

وہ حور سے سوال کر رہا تھا۔ حور کے اندر باہر آندھیاں چلنے لگیں، اتنی بڑی سازش۔ سب کچھ۔

باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا ہے۔

میں ولید کو فیر سمجھتی رہی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ وہ بھی اپنی ماں بہنوں کے ساتھ ملتا ہوا ہے۔

حور کے چہرے کے تاثرات طارق سے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ کیپتے لیوں سے کچھ بولنا چاہتی تھی۔ طارق نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

”ولید کی شادی خیر خیریت سے ہو جائے۔ میں اپنی رہائش تبدیل کر لوں گا۔ میں آئندہ زندگی میں کبھی اس موضوع پر تم سے کوئی بات سننا پسند نہیں کروں گا۔“

طارق کے رویے میں اجنبیت اور سردمہری تھی۔ گویا اپنے ساتھ اسے رکھ کر وہ اس پر احسان کر رہا تھا۔ وہ یوں نظروں سے گزر کر۔ اپنے جیون سا بھی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل پائے گی۔ جسے یہ زعم تھا کہ وہ پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ اس کی زندگی میں داخل ہوگی۔ اس کی عزت تو قیر تو ملیامیت ہو گئی تھی۔ پھر وہ کیسے زندگی گزارے گی۔

طارق کمرے سے جا چکا تھا۔ اور وہ۔۔۔ شش و پنج میں مبتلا کھڑی تھی۔

www.pkdig.com

ولید نے شادی کے لیے رضامندی کا اظہار کیا تو

سارے ہی کام جھٹ پٹ طے مانے۔

دل شاد کو امید ہی نہیں تھی کہ وہ اپنے بھائی سے بڑے بیٹے کے بجائے چھوٹے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی مانگیں گی۔ اور وہ فوراً رضامند ہو جائیں گے۔

وقار احمد کی طرف سے رشتے کی رضامندی سامنے آنے ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

اس رشتے پہ دل آویز اور دل نشین دونوں ہی بہت خوش تھیں اور بڑھ چڑھ کر ماموں کے ہاں جا رہی تھیں۔ انہیں اصباح پسند بھی بہت تھی۔ خوبصورت اور بھولی بھالی سی۔ دل نشین جو ہر وقت ولید سے خار کھائے رہتی تھی۔ اچانک۔۔۔ ولید کے قریب ہو گئی تھی۔

ولید بھی دونوں بہنوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دے

رہا تھا۔ آئے دن شاپنگ کے سلسلے میں ولید کے ہمراہ کہیں نہ کہیں نکل جاتیں۔ حیرت انگیز طور پر ولید کی سابقہ ساری سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ طارق تنجید کی سے نہ صرف شادی کی تیاریوں میں منہمک تھا۔ بلکہ باپ کی روز بروز گرتی صحت بھی اسے پریشان کر رہی تھی۔

انہیں اچھے سے اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ ان کی غذا اور دوائیوں کا خیال رکھتا۔ اس کی ذمے داریوں میں شامل تھا۔

دل ہی دل میں وہ حور کے لیے بھی پریشان تھا۔ وہ بالکل بچہ کر رہ گئی تھی۔ اب نہ اس میں پہلے کی طرح تیزی تھی۔ اور نہ ہی کام کاج کرنے کی لگن۔ گھر میں کیا ہو رہا تھا۔ اسے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ وہ جیسے لالچل سی ہو گئی تھی۔

وہ حور کو زندگی کی طرف نہیں لاسکتا تھا۔ اسے حور سے شکوہ تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی لار وائی کی بدولت ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی ولید کس قسم کا شخص ہے۔ پھر اس پر اس نے اندھا اعتماد کیوں کیا؟

وہ دن رات ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ جبکہ گھر میں اس واقعے کی اب کسی کو پرواہ ہی نہیں تھی۔ سب

ولید کی شادی میں لگن تھے۔

دل آویز اور دل نشین کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”ڈیٹ کلنگ سے پہلے اگر منگنی کا چھوٹا سا فنکشن ہو جائے تو مزہ اور بھی دوبا ہو جاتا۔ مگر نجانے ملا کو اتنی جلدی کیا تھی۔ ماموں جان سے ڈاکٹر کیس ہی تارخ لے لے۔“

”منگنی کا فنکشن میں نے تمہارے پاپا کی رائے سے ختم کیا ہے۔ اور وہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ خواہ مخواہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔ کون نہیں جانتا۔ اصباح طارق سے منسوب تھی۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ لوگوں کو ڈاکٹر کی شادی کے



کارڈزی دس گے۔

دل شادی بیکم نے سمجھایا۔

”ویسے ملا! ولید بہت خوش نظر آ رہا ہے اس رشتے سے۔“ دل آویز نے دل کو جیسے ہی خوش خبری سنائی ہو۔

دل شادی بیکم کی طرف دیکھ کر طمانیت سے مسکرائیں اور اس کا گل چھوٹے ہوئے محبت سے بولیں۔

”وہی نہیں۔ تم بھی اس شادی سے بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ ذرا آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو۔ کیسے گلاب کے پھول کی طرح گل رہا ہے۔“

دل کی تعریف پر دل آویز بھی پتھپتھ گئی۔

آہ۔ میں بھی کتنی نادان تھی۔ چھوٹی سی عمر میں تمہیں اس گدھے کے لیے پابندہ بیٹھی۔ حقیقت میں شادی کی عمر تو تمہاری اب تھی۔“

شادی کے نام پر۔ دل آویز کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ اور جھٹ سے رمبھ کا سر لپا آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

وہ یکدم جھنجھلاہٹ سے بولی۔

”کیوں کرتی ہیں آپ بار بار ان منحوس لحوں کا ذکر؟ جنہیں میں سوچتا نہیں چاہتی۔“

”کیسے کہوں۔“ دل شادی بیکم کی طرف دیکھ کر بولی۔

”تم سے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں ہوں گی تو

لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوال نہ کریں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں ملا! مجھے لوگوں کے سوالوں کے جواب دینا آتے ہیں۔ دنیا والے کون ہوتے ہیں میری

طرف انگلی اٹھانے والے۔ یہ میری زندگی ہے۔ چاہے میں جیسے بھی گزاروں۔“

وہ ہنسنے ہوئے موڈ میں بولی تو دل شادی نے نرمی سے اس کا گل تھپتھپایا۔

”گلد۔ میں بھی تمہیں ایسا ہی دیکھتا چاہتی ہوں۔“

یہ اعتماد اس نے جوڑ سے چڑایا تھا۔ اس کے دل نے خود ہی گواہی دی تھی۔

”وہ بیکم صاحبہ کتنے دن کے لیے سنبھلی ہیں میکے؟“

حور کا خیال آتے ہی دل آویز نے اس سے پوچھا تھا۔

”کم آن۔ دل! یہ حور دور ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ

جائے یا رہے۔ تم لوگوں کو اپنی خوشیاں قائم رکھنی

ہیں۔“

”پھر بھی اگر وہ ہوتی تو ضرور جلن محسوس کرتی۔

کمال وہ گھر بھر چھائی جا رہی تھی۔ سمجھ رہی تھی۔

وہی سب سے زیادہ سکھ اور خوب صورت ہے۔ چند ہی

دن میں محترمہ کی چھٹی کرا دی۔“

وہ دل ہی دل میں مسکرائی تھی۔

”ملا! میں چاہتی ہوں۔ جب بری کی نمائش ہو

نہیں۔ تو آپ سب کو یہ بتائیں کہ صرف یہ آپ کی بڑی

بیٹی کی پسند ہے۔“

”کیوں نہیں دل! مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے

کہ میں جتنا نہیں سکتی۔ میری بیٹی میں جینے کی اتنی

انگ جاگ جائے گی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی

تھی۔“

”کم آن۔ ملا۔ آپ بار بار ایسا نہ کہہ کریں۔ کیا میں

پہلے مری بڑی تھی۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ ملا۔ پہلے ان

باتوں پر توجہ نہیں دیتی تھی۔ اور اب توجہ دینے لگ گئی

ہوں۔“

”وہ کون ہے۔ جس نے تمہیں ان باتوں پر توجہ دینا

سکھایا ہے۔“

طارق کو بہن میں تبدیلی اچھی لگی تھی۔ سو سرا

ہے پتا نہ رہ سکا۔

لیکن دل آویز کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔ اس

کا موڈ بگڑ گیا۔

”نجانے تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر مجھ سے یہ

سوال کر رہے ہو۔ مگر اپنی خوش فہمی کو دور کر لینا۔ مجھے

تمہاری بیوی سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں

ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر گیا جہاں چلی گئی۔

یعنی اس نے انکار کر کے اقرار ثابت کر دیا تھا کہ وہ

واقعی حور العین سے ہی متاثر ہوئی ہے۔ طارق دل ہی

دل میں ہنستا تھا۔ گویا اس نے اپنا بھی مذاق اڑایا ہو۔

ایسی لڑکی جو ایک بیمار ذہن کو صحت یابی کی طرف لے جا

سکتی تھی۔ وہ کیونکر۔ اپنی زندگی۔ غلط سمت کی طرف

لے کر جائے گی۔

وہ الجھا تھا تب ہی دل شادی نے اس کی توجہ اپنی

طرف مبذول کر لی۔

”آؤ۔ طارق۔! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔

آج ہم نے جیولر کے پاس جانا ہے۔ تم کھانا دانا کھاؤ۔

پھر ہم چلتے ہیں۔ دل شادی اور دل آویز بھی اپنے لیے بھی

کچھ شاپنگ کرنا چاہتی ہیں۔“

”کھانا پھر باہر ہی کھا لیں گے۔ کیوں طارق بھائی؟“

دل شادی نے جوش کا اظہار کیا۔ اور طارق کی آنکھوں پر

دل آویز کو آوازیں دینے لگی۔



جیولر کی دکانوں پر چکا چوند روشتیاں اور قیمتی

جیولری نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ طارق اور دل شادی

دھن کے زوڑات پسند کر چکے تھے۔ جبکہ دل شادی اور

دل آویز کو کوئی ایک چیز بھی پسند نہیں آ رہی تھی۔

تین گھنٹے سے پھر پھر کمال آویز تھک چکی تھی۔

سوئے دار ہو کر دکان سے باہر نکل آئی اور گاڑی میں

آکر بیٹھ گئی۔ اسے بھوک ستا رہی تھی اور پیاس بھی۔

کیونکہ ان سب نے ہلکا پھلکا فاسٹ فوڈ اور سوپ وغیرہ

لے لیا تھا۔ جبکہ اپنے مزاج کے ذریعہ اس نے جیولر

کی دکان پر کوئلہ ڈرنگ تک نہیں لی تھی۔ اب اسے

خفت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا منسل واٹر کی

بوٹل ہی خرید لے۔ کم از کم پیاس تو بجھے گی۔ اس خیال

کے تحت وہ گاڑی سے نکل گئی۔ ابھی دکان دار سے وہ منسل

واٹر کی بوٹل خرید کر مڑی ہی تھی کہ اچانک بھیڑ میں

ایک شہساز چہرہ نظر آیا۔ رمبھ کو سامنے دیکھ کر وہ تنگ

رہ گئی۔

رمبھ بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر رمبھ نے ہی بولنے میں پہل کی۔

”تم تو بالکل اچھی بھلی دکھائی دے رہی ہو۔ جبکہ

تمہارے باپ نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ تم بیمار ہو۔ اور وہ

تمہارا علاج کروا رہے ہیں۔“

”میرے راستے سے ہو۔“ دل آویز نے اس کی

ساری بات بڑی ہر دشت سے نظر انداز کی تھی۔

”وہ۔ اس کا مطلب ہے۔ تم نے مجھے پہچانا

نہیں۔ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ ویسے کس چیز کا علاج

کروا رہا ہے تمہارا باپ؟“ وہ سامنے ٹٹ کر کھڑا تھا۔

”میں تمہاری کوئی بیکواس سنتا نہیں چاہتی۔“

وہ دبے دبے لہجے میں غرائی تھی۔ ارد گرد لوگ

روال ہواں تھے۔

”مگر میں اس بیکواس کا جواب لوٹانا چاہتا ہوں۔ جو تم

نے اور تمہاری ماں نے خاندان بھر میں میرے متعلق

پھیلا رکھا ہے۔“

وہ بھی دبے دبے لہجے میں غرائی تھا۔ دونوں اپنی اپنی

گاڑی کے درمیان میں کھڑے تھے۔

”کون سی بیکواس؟“ دل آویز نے لاشعری کا اظہار

کیا۔

”سب باتیں راہ چلتے نہیں ہوتیں۔ دل آویز بیکم۔“

”تو تھک ہے۔ پھر میرے راستے سے ہو۔ جو بات

کرنی ہے تمہارے گھر آ کر کرنا۔“

”بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تم نے مجھے پہچان

لیا۔ اور وہ کیا سوال تمہارے گھر کا۔ تو تمہارا گھر وہ ہے

جہاں میں رہتا ہوں۔ وہ نہیں جہاں تم رہ رہی ہو۔“

وہ غصے سے بولا تو دل آویز کو بھی غصہ آ گیا۔

”یاد کرو۔ تم نے ہی مجھے گھر سے نکالا تھا۔ یہ کہہ کر

کہ میں ذہنی مریضہ ہوں۔ اب کیوں اس ذہنی مریضہ

کی ضرورت پڑ گئی تمہیں۔ رچا لیتے دو سرا بیاہ۔ بہت

زعم تھا تمہاری بہن کو۔ کہ وہ تمہارا دو سرا بیاہ کرے

گی۔“

وہ جیسے اپنی جان چھڑا رہی تھی۔

رمبھ اس کی بات پر ہنس پڑا۔

”دو سری شادی کرنا میرے لیے کوئی بہت بڑا مسئلہ

نہیں ہے۔ ظاہر ہے۔ مجھے اپنا گھر بسانا ہے تو یہ کام تو

کرنا پڑے گا۔ لیکن اس سے پہلے تم میرے بچے کی

ماں بنو گی۔ تب ہی میں دو سرا بیاہ رہاؤں گا۔“





کتنا خوش پوش نظر انکلا

دل کے اندر سے ستارا نکلا

گھاس پر اوس پڑی تھی میسے

پاؤں رکھا تو شرار انکلا

ایک بے رنگ سامنظر تھا میں

کتنے رنگوں سے سنوارا نکلا

وہ بھی نکلا نہیں گھر سے اپنے

چاند بھی پھر نہ دوبارہ نکلا

میں فقط دشت جسے سمجھا تھا

کسی دریا کا کنارہ نکلا

رمزی آثم

ہر طرف بھلی تھی اُس کی یاد جنگل کی طرح

میں گزر کر آگیا ہوں اُڑتے بادل کی طرح

ایک لمحے کو جُدا ہونے دے ممکن ہی نہیں

وہاں رکھتی ہے ہر وہ اپنے آنچل کی طرح

نسر کر دیکھتی ہے جب وہ کھرکی سے کبھی

ایک خواہش دل میں کھل جاتی ہے کوئل کی طرح

چھوٹی چھوٹی بات پر رونے کی عادت ہے اُسے

اور آنکھوں میں مجھے رکھتی ہے کاجل کی طرح

جب بھی پانی پھینکتی ہے وہ شہریت میں حسن

جسم گتا ہے مجھے بھیگے ہوئے تھل کی طرح

حسن عباسی

خفت غصہ آیا تھا۔  
”کیوں نہیں لے کر جاسکتا؟“ وہ بھی کندہ بن  
اڑیل فحش تھا۔ طارق کو اپنے روپے میں نرمی کرنا  
پڑی۔  
”دیکھیں۔ ہمارے جو بھی معاملات ہیں۔ وہ بات  
چیت سے حل ہوں گے۔ پھر ہی تو آپ دل آویز کو لے  
جاسکیں گے۔“  
”پہلی بات تو یہ کہ میرا تم لوگوں سے کوئی معاملہ  
نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں اپنی بیوی کو لے کر  
جا رہا ہوں۔ اس کے لیے مجھے اجازت کی ضرورت  
نہیں ہے۔ صرف بتانا تھا۔ کہیں تم لوگ پریشان نہ  
ہو جاؤ۔“

یہ کہہ کر رمیض نے فون بند کر دیا۔

طارق کا دماغ چکر اُٹھا۔

”طارق بھائی۔ دل۔ آئی۔“

دل نشیں گھبراہٹ ہوئی طارق کی طرف بومبھی تھی۔

طارق نے دیکھا۔ دل شاد کے چرے پر بھی ہوائیاں اڑ  
رہی تھیں اس نے خود کو سنبھالا۔ اور انہیں گاڑی کے  
قریب لے آیا۔ وہ پہلے ہی ذہنی اذیت کا شکار تھا۔ اس  
پر مستزاد یہ واقعہ۔

”آپ لوگ گھر چلیں میں بتاتا ہوں۔“

”مگر دل آویز کہاں گئی ہے؟ دل شاد فکر مند ہونے  
لگیں۔ طارق کی سمجھ میں نہ آیا کہ ماں کو کیسے مطمئن  
کرے۔ اسے جھوٹ بولنا پڑا۔

”دل آویز گھر چلی گئی ہے۔ گھر سے ابھی ابھی فون  
آیا تھا اس کا۔ اس کی طبیعت صحیح نہیں تھی۔ شاید  
ٹیکسی وغیرہ میں چلی گئی ہو۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں  
چل رہے ہیں ناں گھر۔“

وہ راستہ بھر ماں کو مطمئن کرتا آیا تھا۔

باقی ایسٹو شیلپے ہیں

یہ کہہ کر رمیض نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور  
اسے اندر دھکیل دیا۔ پھر فرنٹ سیٹ سنبھال لی۔  
”شور مچا کر لوگوں کو تماشا دکھانے کی ضرورت نہیں  
ہے۔ کچھ عرصہ سے نکاح نامہ ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔  
میاں بیوی میں سو جھگڑے ہوتے ہیں۔ یوں نیکی میں  
جا کر بیٹھ جانے والی لڑکیاں عزت دار نہیں ہوتیں۔  
لوگ آنکھیں ہوں گے تو انہیں یہی بتانا پڑے گا کہ  
تمہاری ماں نہیں بسانا نہیں چاہتی۔ اس لیے زبردستی  
سر راہ پکڑ کر لے جاتا رہا ہے نہیں۔“  
دل آویز کے لیے یہ عمل یہ جملہ غیر متوقع تھا۔ وہ  
شور کیا مچائی۔ اس کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔ پانی  
کی بول ہاتھ سے چٹختی اور وہ ہوش سے بیگانہ ہو گئی۔

\*\*\*

گاڑی رش سے نکالنے کے بعد رمیض نے طارق

کو فون ملایا تھا۔ وہ لوگ چور کا حساب کر کے ابھی

دکان سے نکل ہی رہے تھے کہ رمیض کا نمبر دیکھ کر

طارق گنگ رہ گیا۔ جب سے ابراہیم اور دل شاد نے

اسے برا بھلا کہا تھا۔ تب سے اس نے رمیض سے

تعلق ختم کر لیا تھا۔ لیکن آج رمیض کی کل اس کے

لیے چیرائی کا باعث تھی۔ اچانک رمیض کو اس کی یاد

کیسے آئی۔

وہ دل شاد اور دل نشیں کو گاڑی کی طرف جانے کا

اشارہ کر کے سائیڈ پے ہو گیا۔ اور فون انیڈ کیا۔

”ایسی بھی کیا مصروفیت طارق صاحب!“

”کیسے فون کیا؟“ طارق کا اوجہ روکھا تھا۔

”صرف یہ بتانے کے لیے کہ میں اپنی بیوی دل آویز  
بیکم کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں۔“

طارق کو یکدم شاک لگا تھا۔ اوہ دل نشیں اور دل  
شاد انہیں بائیں منگھر اور ہر سال سی دل آویز کو دیکھ  
رہی تھیں۔ جو دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہی  
تھی۔

”کیا۔ تمہارے دل آویز کو۔ ملنی گائے۔ تم اس طرح  
اسے لے کر نہیں جاسکتے۔“ طارق کو اس کی حرکت پہ



یہ مدارات اہل روف کر گئے  
محفل گل میں بادیدہ تر گئے

ہم تو کستر کے گزرے مگر کیا کریں  
راستے سب کے سب آپ کے گھر گئے

مری کم آشنائی تیری بے رخی  
سارے انعام تقدیر کے سر گئے

کوچہ آرزو، الامان، الامان  
گل بکھ آئے تھے خاک بسر گئے

آپ کو کیا خبر، آپ کو کیا پتا  
وہ بھی تھے لوگ جو جیتے ہی مر گئے

اہل دانش میں رسم و فاجرم تھی  
لوگ دانستہ جرم و فاکر گئے

زندگی کی رگوں کو لہو بخش کر  
اہل دل فرض اپنا ادا کر گئے

ادا جعفری

عید آئی گلاب چمکے  
ہماری آنکھوں کے خواب چمکے  
مہکتی کیوں کو دیکھ کر پھر  
محبتوں کی وہ سوئی خواہش

چنگ کے بیدار ہو گئی ہے  
گلوں کے شانے پہ سر زیکا کے  
ہوا بھی سرشار ہو گئی ہے  
وہ بھولے بسرے تمام لمحے  
وہ ساعتیں وہ تمام جذبے  
جو وقت کی دھول میں اٹ گئے تھے

خود اپنے اندر سمٹ گئے تھے  
وہ لے کے انگڑیاں جی اٹھتے ہیں  
ہماری آنکھوں میں جھلکتے ہیں  
اے لاش اول کی ویراں زمیں پہ

محبتوں کی پھوار برستے  
برستی برکھا کہاں مقدس

دو بوند ہی تیرا پیار برستے  
تو دیکھنا پھر کہ جان جاناں!  
ہماری آنکھوں کے ٹمٹماتے  
چراغ یوں لو دے اٹھیں گے

کہ چاند سورج مدغم لگیں گے  
دل کے غنچے یوں کھل اٹھیں گے  
کہ بھول بھی مسکرا کے اپنی  
قبائل کو پھر سیمٹ لیں گے  
فاطمہ نجیب

## شگفتہ جادو زندگیاں بھول

عینی ادھر بڑا شیر نے جبر پھاڑ کر دے میں گر دیا اور وہ  
اڑدھکے منہ میں جا پہنچا۔  
مولانا دوم نے اس مثال کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔  
کہ جنگل سے مراد یہ دنیا ہے اور شیر موت ہے کہ کچھ لگی  
ہوئی ہے گڑھا قبر ہے جو انسان کے آگے ہے اور اڑدھکے  
اعمال قبر میں ڈسے گا۔ چوبیس دن اور رات ہیں۔ درخت  
عمر ہے اور شہد کا جھڑ دنیا فانی کی غافل کر دینے والی لذت  
ہے کہ انسان دنیا کی فکر میں موت اور اعمال کی جواب دہی  
وغیرہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اور پھر اچانک موت  
آجاتی ہے۔  
سیوہست زہرا۔ کھر وڈیکا

### انذہ

ایک صاحب نے دوسرے صاحب سے پوچھا۔  
"آگ آپ نئی کار خرید لیں تو آپ کی بوی کیلکے گی؟"  
"بس یہی کہ۔ کیا آپ کو مسئلہ نظر نہیں آتا؟" ہارے  
اسے۔ "بریک آؤٹ لگا کر میں۔ مودر آؤٹ لگا کر میں  
یہ آگ آپ اندھوں کی طرح گاڑی کیوں چلا رہے ہیں؟  
وہ دیکھیں، سائنسے بس آ رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔  
دوسرے صاحب نے جواب دیا۔

### عشق

ایک صاحب عشق کے موضوع پر لمبا چوڑا لیکچر دے  
رہے تھے۔ لیکچر کے دوران کئی بار انہوں نے عشق کی  
نشانیاں بتائیں کہ جب کسی شخص کو عشق ہو جاتا ہے تو اس  
کی نیند اڑ جاتی ہے۔ بھوک ختم ہو جاتی ہے اور اسے  
دن رات کا بالکل پتہ نہیں چلتا کہ کب صبح ہوئی اور کب  
شام۔

حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،  
حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا۔  
"موت کے ستر گناہ ہیں جن میں سب سے ہلکا گناہ اس  
تقدیر بڑا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے نکاح کرے"  
(ابن ماجہ)  
حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے سو دھانے والے پر سو دینے والے پر  
اس کے گواہوں پر اور اس کی تحریر رکھنے والے پر لعنت فرمائی  
ہے۔ (ابن ماجہ)

### مثال دنیا

مولانا دوم سے کسی نے دنیا کی حقیقت پوچھی تو آپ  
نے فرمایا۔  
"دنیا کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص جنگل میں چلا  
جاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے پیچھے شیر چلا کر رہا ہے وہ  
بھاگتا ہوا جب تھک جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ آگے  
ایک گڑھا ہے۔ وہ جاہتا ہے کہ گڑھے میں گر کر جان بچائے  
تسکین کرے میں ایک اڑدھکے نظر آ جاتا ہے۔ اسے میں  
اس کی ایک درخت کی ٹہنی پر نظر پڑی۔ وہ اسے پکڑ کر درخت  
پر چڑھ گیا مگر درخت پر چڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ درخت کی  
جڑ تو دوسرا اور سفید چوبے کاٹ ہے ہیں۔ وہ بہت  
پریشان ہوا کہ غصہ دیر میں درخت جڑ سے کٹ جائے  
تو میں گر جاؤں گا۔ اور پھر شیر اور اڑدھکے کا لقمہ بننے میں  
دیر نہیں لگے گی۔ اتفاقاً اس کو اوپر کی جانب شہد کا ایک  
جھڑ نظر آیا۔ وہ اس شہد میں کوپٹے اور حاصل کرنے  
میں اتنا مشغول ہو گیا کہ شیر کا ڈر نہ اٹھے کا خوف  
اور نہ چوہوں کا حمل۔ اسے میں درخت اور درخت کی جڑ کٹ



سامعین میں سے ایک شخص جسے بہت نیند آرہی تھی اور بھرک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی، کھڑے ہو کر بولا۔

”جناب! یہ تو بتائیے اس کے برعکس جب کسی کو بہت زیادہ نیند آئے اور بھرک بھی زیادہ لگنے لگے تو کیا ہوتا ہے؟“

تقریر کرنے والے صاحب نے لمبی جوائی ادا دلا کر فرمایا۔

”اس نے عشق کرنے کا انجام دیکھ لیا ہوتا ہے۔“

صاحبزادہ لطیف۔ خیر بلکہ میریں

### دعا

”جس کا خدا پر یقین نہ ہو، اس کا دعا پر یقین کیوں ہوگا۔“

”دعا کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں دعا لگنے والی ہے، وہیں دعا قبول کرنے والا ہے۔“

”دعا پر اعتماد، ایمان کا علاوہ جہ ہے۔“

”دعا مانگنا شرط ہے، منظوری شرط نہیں۔“

”دعا سے ملائی ہے۔“

”صاحب دعا صاحب محبت ہوتا ہے۔“

”دعا سے حاصل کی ہوئی نعمت کی قدر ایسے کرنی چاہیے جیسے نعم کی۔“

(واصف علی واصف)

مینا جمال ذراغ۔ راولپنڈی

### صفتِ ربی

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

”سب انسانوں سے مبارک وہ کیونکہ ہر انسان میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی صفت ضرور موجود ہوتی ہے۔“

مصباح گل۔ سرگودھا

### مشکوہ

”ماں نے دوسرے کمرے میں آواز دے کر بیٹے سے پوچھا۔  
”بیٹا! تمہارا چھوٹا بھائی کیوں دودھ پیتا ہے؟“  
”مٹی! میں اپنے بیکٹ کھا رہا ہوں اور اسے نہیں دے رہا۔ اس لیے دودھ پیتا ہے۔“  
”بیٹے نے جواب دیا۔  
”اس کے پاس اپنے بیکٹ نہیں ہیں کیا؟ میں نے اسے

بھی تو دیے تھے؟“ ماں نے کہا۔  
”جی جی میں وہ کھا رہا تھا، یہ تب بھی رو رہا تھا۔“  
بیٹے نے شکوہ صبر سے انداز میں کہا۔  
نمر، اقرار، کراچی

### حکمت کے موتی

”عقل مند دوسروں کی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں جبکہ بے وقوف اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔“

(ابن عطار)

”حقہ کرنے کا مطلب ہے ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں۔ اور یہ کتنی حیرت انگیز اور مشکل خیر بات ہے۔“ (پوپ الیکزینڈر)

”دوست کمزور ہو جائیں تو دشمن خود بخود طاقت ور ہو جاتے ہیں۔“ (واصف علی واصف)

”احتیاط دانشمندی کی سب سے بڑی بیہوشی ہے۔“ (ڈکٹر بیگو)

”قلبت عقل کا اخلالہ کثرت کلام سے ہوتا ہے۔“ (بولی سینا)

”تعلیم کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ عمل کی قوت پیدا کرنا ہے۔“ (ہیریٹ اپشیر)

”لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں، قابلیت پر نہیں۔“ (نیرلین)

### عید مبارک

ہجر کے نخل کی ساری  
افزیت اس پن ہوئی دودھ  
تمہے جب دھیرے سے چاہت ہمارے  
وہل نخل کی تھک کے ساتھ کما  
عید مبارک  
انہیں۔ فیصل آباد

### عید اور مضانی

کوئی، چمکتی، چمکتی ہیں  
ہڈیاں، پسلیاں بے چاروں کی

روزہ خودوں سے عید ملتے ہیں  
شامت آتی ہے روزہ داروں کی  
(انور مسعود)

### حضرت حسن بصری فرمایا کرتے تھے،

”اے ابن آدم! تیرے لیے ایک دنیا کی زندگی ہے اور ایک آخرت کی۔ پس تو اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح نہ دے۔ اللہ کی قسم میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے اپنی دنیا کو آخرت پر ترجیح دی کہ وہ جاگ ہوئے، ذلیل ہوئے اور رسوا ہوئے۔“

”اے ابن آدم! جب تیرے لیے آخرت کی بھلائی و خیر ہو کر رہی تو دنیا کی جو تکلیف آئے وہ نقصان نہیں دیتی اور جب تو آخرت کی خیر سے محروم کر دیا گیا ہو تو کیا دنیا کی کوئی راحت تجھے نفع دے سکتی ہے؟“

”اے ابن آدم! دنیا سولہی ہے۔ اگر تو اس پر سوار ہو گا تو دھکے اٹھائے گی اور اگر تو اسے اٹھا لے گا تو یہ تجھے مار دے گی۔“

نورین ظفر خان۔ لودھراں

### نیت

”ایک مرتبہ امام مالک کے پاس کچھ سامان آگیا کچھ ناہر ان کے پاس آئے وہ سامان دیکھا تو انہیں پسند آیا۔ انہوں نے پانچ ہزار دھرم پر بیع کرنا چاہا۔ امام مالک نے ان سے کہا۔“

”رات گزرنے دو صبح دیکھیں گے۔“  
صبح کچھ اور تاخر گئے اور دس ہزار سامان کا دینے لگے لیکن امام مالک نے فرمایا۔  
”میں رات کو پہلے تاخر مل کو سامان دینے کی نیت کر چکا ہوں۔ اب رقم کے عوض نیت نہیں بدل سکتا۔“  
نمر، اقرار، کراچی

### بچے ہمارے عہد کے

بہت دیر تک سامن پر ادھر ادھر گھومنے کے

بعد جب ایک بچہ اپنے ماں باپ کے پاس پہنچا تو باپ نے اس سے کہا۔

”اتنی دیر سے کہاں تھے۔ اب تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی چلو کسی ریستوران میں کھانا کھا لیں۔“  
بچے نے جواب دیا۔ ”ابو! مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے۔ میں چار بیکٹ بیکٹ ادا دلاؤں تو کیم کھا چکا ہوں۔“

باپ بولا۔ ”مگر تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟“  
بچے نے جواب دیا۔ ”پیسوں کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں تو بس بولی ہی ادھر ادھر دھرتا ہوا جھٹکا پھرا پیسے میں کھو گیا ہوں۔“

لیلیٰ انعم، حمیرا انعم۔ گدو میران

### ماہر

”دو گپ باز دیہاتی لوجوان معروف گفتگو تھے۔“

ایک بولا۔

”میرے آبا پرندوں کو ڈرنے والے پتے بنانے میں اتنے ماہر تھے کہ پچھلے سال انہوں نے ایسا پستلا بنا کر کھیتوں میں کھرا کیا کہ پورے سال ایک پرندہ بھی ہمارے کھیتوں کے قریب سے نہیں گزرا۔“

دوسرا بولا۔ ”کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میرے آبا نے پچھلے سال ایک ایسا پستلا بنا کر کھیتوں میں کھرا کیا کہ جو پرندے اس سے پچھلے سال ہمارے کھیتوں سے داند نہ کھا چکے تھے وہ سارے کا سارا ڈوکے مارے داپس لے آئے تھے۔“  
پروین افضل شاہین۔ بہاول نگر

### علاج

”ایک ڈاکٹر فریضے دوسرے ڈاکٹر کو بتا رہا تھا۔ آخر کار میں نے جمال کے لڑکے کا علاج کر ہی لیا تھا۔ ڈاکٹر دلی نے جواب دے دیا تھا۔  
”کیا بیماری تھی اسے؟“ دوسرے ڈاکٹر نے پوچھا۔  
”وہ دانتوں سے ناخن کترتا تھا۔ میں نے اسے ڈینشٹ کے پاس بھیج کر اس کے تمام دانت نکوا دیے۔ پہلے ڈاکٹر نے فریضے بتایا۔“  
مسکان بی۔ ملتان



## بولتے لفظ،

\* خاموشی انسان خاموشی پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں،  
خاموشی خود ایک لڑ ہے اور ہر صاحبِ اسرار خاموش  
رہنا پسند کرتا ہے۔ خاموشی دانا کا زور ہے اور  
حق کا بھرم۔

\* حال کے عمل سے ماضی کا عمل بدل سکتا ہے۔ ماضی  
کفر ہو تو حال کفر پڑھ کے مومن ہو سکتا ہے۔ حال مومن  
ہو ملے تو ماضی بھی مومن۔

\* دریا عبور کرنے کے لیے کشتی ضرور سبب ہے لیکن  
گرداب سے نکلنے کے لیے دعا کا سفینہ چاہیے۔  
گل پری مرزا۔ کراچی

## تسکین

امریکا کے مشہور فلم اسٹار گروری سیک کا کہنا ہے  
کہ میسج ڈاکٹر نے مجھے نصیحت کی کہ میں سگریٹ نوشی چھوڑ  
دوں۔ جب میں نے وعدہ کیا کہ میں آج ہی سے سگریٹ نوشی  
چھوڑ دوں گا تو ڈاکٹر بولا۔

”چونکہ تم سگریٹ نوشی چھوڑ رہے ہو اس لیے مناسب  
ہوگا کہ اپنے سونے کا سگریٹ لائٹر تحفے کے طور پر مجھے  
دے دو“

میموریز حمید۔ ڈیرہ غازی خان

## بات تو سچ ہے مگر،

اگر آپ کسی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھا چاہتے  
تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑ دینا چاہیے۔

ڈیپو میٹ وہ شخص ہے جو ایک عورت کی ساگرہ  
سادن تو یاد رکھ لے لیکن اس کی عمر چھوٹ جلتے۔

جو جم میں کمی کر رہے ہیں لیکن دماغ نہیں ہوتے۔  
تجربہ بہترین استاد ہے لیکن اس مدرسے

کی فیس بہت زیادہ ہے۔  
تین آدمیوں میں لذتہ مکتا ہے بشرطیکہ ان میں

سے دوسرے ہوں۔  
مہمان بٹے جانے کے بعد اکثر بہت اچھے لگتے ہیں۔  
ایک مرتبہ شادی کرنا فرض ہے، دوسری مرتبہ حاققت  
اور تیسری مرتبہ پاگل بن ہے۔  
خزیرہ عمرت۔ بکرات

## قدانت

امام شافعی کا قول ہے کہ قدانت میں چار چیزوں  
سے اضافہ ہوتا ہے۔

۱۔ فضول گفتگو کو چھوڑنا۔

۲۔ مسواک کرنا (ہر وقت سے پہلے)

۳۔ نیک لوگوں کی مجلس میں بیٹھنا۔

۴۔ علماء کی مجلسوں میں بیٹھنا۔

نازش ریحان۔ کراچی

## اپنا اپنا شوق،

ایک جگہ گفتی ہو رہی تھی۔ دونوں پہلوان یا تو چٹکے  
ہوتے تھے یا لوگوں کو دھوکا دے رہے تھے۔ ان کی گفتی  
سے آگے اگر ایک صاحب نے بہت زیادہ لوریٹ محسوس  
کی۔ وہ چیخ کر کہنے لگے۔

”قیال بھادو، بکلی فضول خرچ ہو رہی ہے۔ یہ  
دونوں پہلوان ڈراما کر رہے ہیں“

دوسرے کو نے کسی کی آواز آئی۔  
”نہیں نہیں۔ ابھی قیال مت بھانا، میرا ناول  
ابھی ختم نہیں ہوا“

کرن شفیق۔ کراچی



## خالہ جیلانی



چمکا سا پڑ رہا ہے وہی دشتوں کا رنگ  
ہر چیز بزدل ہے اور چاند رات ہے  
نہت جیلانی  
عید آئی ہے تو آنکھوں میں اتر آئے ہیں  
بھرتی اوس میں بھیجے ہوئے، چھی گئے

علی جیلانی  
عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو  
میں تیرے وصل کی اسے دوست دعا مانگوں گی  
میں تو برسوں سے ہوں تنہائی کے چھوڑی مین  
اب تیری رفاقت کی دعا مانگوں گی

صباح بخاری  
وفا کا سندیس لے کر آئے تھے سمن میں  
گواہ رفاقتوں کا، محبتوں کا بن کر ہال عید  
تمہارے روز و شب کو بھی فروزاں رہا ہر دم  
ہر شب شب بلبات ہو، ہر روز روز عید  
ہوشِ عروسی  
ہم تو احتیاج کی بجٹی میں پس رہے ہیں عدم  
ہمارے واسطے کیا عید اور کیا بقر عید  
افشین

اس نے بھیجے ہیں پاہت میں پلٹے ہوئے  
مقبول، خوشبو، جانا، چڑیاں عید پر  
کاش وہ آجائے جس کے ہیں منتظر  
میرا دل، بام و ذر، کھر کیسا عید پر  
سیر کنول صدیقی  
سچ اگر ہے الفت، لوٹ آؤ جانِ جاں  
لگا تا ہے اور آگ، یہ بھیجا ہوا سامان  
یہ کیا کہ ہر دفعہ ہی دُوری میں عید ہو  
تحفہ دو تو یہ دو جو تحفہ دید ہو

نقارہ بٹ  
اک۔ بھڑے ہوئے انسان کی رفاقت کے بغیر  
گلشنِ دل میں اور ان رہا عید کے دن  
اسے غم دوست تھے میری وفاؤں کی قسم  
میری پگھل پستارے نہ سما عید کے دن  
عفت رشید  
تارے اترے جب پھیلا یا دامن کو  
عید کے چاند میں دیکھا میں نے راجن کو  
چاند رات کی ہندی مجھ سے کہتی ہے  
تم بھی اک پیغام لکھو ناسا جی کو

سمیرا اشفاق  
ہلال عید دیکھ کے مانگتی رہی ہوں جو دعا  
اب کی بلر شاید وہ! اتر ہو جائے  
نیک نخت  
میں تیری راہ میں بکھر جاؤں خوشبوؤں کی طرح  
میرے لیے تو میں یہی ہے منتہائے عید  
روحی بانو  
جس سے چاند ترے بام سے اُبھرا ہوگا  
تو نے اُس میں اسے خود سے دیکھا ہوگا  
عید کے کا روز تیری میز پر بکھرے، بول گے  
اور سر ہانے کوئی پھول بھی رکھا ہوگا

نذرا فقہ  
ہم نے ہلال عید کے ہاتھ بھوایا ہے یہ سندیر  
کرنا ہے تھیں کوئی یاد بہت بار بار آئے کہنا  
افشین  
گزرتی ہیں عیدیں کتنی اپنی اسی گمان میں  
ہمارے آگن میں بھی اترے گا چاند عید کا  
سحر خان  
میں ہوں تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے  
دل دوسرے نگہاں ہے اور چاند رات ہے



# انگلش فیرنس سنو ایلو ویرا کے ساتھ



زمانہ قدیم سے ---

ایلو ویرا کی تسلیم شدہ افادیت

ایلو ویرا با آسانی جلد میں جذب ہو کر کوئی بولی گی اور  
نوائی حال کرتا ہے

ایلو ویرا دھوپ کے معز اثرات سے جلد کو محفوظ رکھتا ہے

ایلو ویرا جلد کو قدرتی لطافت ہم پہنچاتا ہے

ایلو ویرا چہرے کو لخت اور پرکشش بناتا ہے

ایلو ویرا جلد کو نرم اور پرکشش بناتا ہے

ایلو ویرا MAKE UP BASE بھی استعمال کیا جاسکتا ہے

ایلو ویرا ہر قسم کی جلد اور ہر موسم میں استعمال کے لئے موزوں ہے



روپ دکھارے حسین بنائے ایسے نظر ٹکنے پائے

سادہ صنیں --- شہزاد آباد  
کہانیاں ہی سہی، سب مبالغے ہی سہی  
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں  
اب اس کے شہر میں تعبیریں کر کوئی کر مائیں  
فرار آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں  
قدیر غریب --- گجرات

جودل مانگا تو وہ بولے کہ مٹھرو یاد کرنے دو  
ذرا سی چیز تھی ہم نے خدا جلنے کہاں لکھی

مہوش ملک، ناہید غفور ملک --- گنگا پور  
چاک داماں کو جو دیکھا تو ملا عید کا چاند  
اپنی تصویر کہاں بھول گیا عید کا چاند  
ان کے ابروئے خندہ کی طرح تیکھا ہے  
اپنی آنکھوں میں بڑی دیر بچا عید کا چاند

نگہبٹ بشیر --- جہانیاں  
اُسے پانا تھا، اُس کو کھونا تھا  
یہ بھی ہونا تھا، وہ بھی ہونا تھا  
کتنی دیر اوداس کو روونا تھا  
وہ جو ہونا تھا، وہ تو ہونا تھا

منزہ شامی --- کراچی  
یاد آتا ہے سکوت شب میں وہ اکثر مجھے  
کھینچ لاتا ہے میرے اندر سے وہ باہر مجھے  
کچھ خبر لے آؤ اس کی فروری کی یاد شو  
اب بہت سونا لگے اس کے بنایہ گھر مجھے

ندا افضل --- فیصل آباد  
وہ بڑی بھرتی ہے دشت ویاہاں میں ہمیں  
زندگی ہم سے بچھڑ کر خود بھی بچھٹانی بہت

نادیر جہانگیر --- ممبر آزاد کشمیر  
سات رنگوں سے کھیلنے والا  
اک نیارنگ اٹھارہ سکا ہے  
زلف ہو یا عریب کی قسمت  
دوسرا کب سنوار سکتا ہے

صائم شریف --- رحیم یار خان  
کاش عید سعید کے حبسِ جلوں میں  
میری ذاتِ کم گشتہ بھی تجھے یاد آئے  
میر سید واجد علی --- کراچی  
مسافر راہ میں تھک جاتے ہیں  
خیمہ کوئی تو لگائے کہیں

نور، اقرار --- کراچی  
ہم نے دیکھا تو آفت پر تھا سمندر کا سکوت  
ہاں تیرے ساتھ جو گزرے وہ نظارے چمکے  
یہ خبر سن کے فلک پر ہے عیاں عید کا چاند  
دل کی شاخ پر کئی درد کے تارے پھمکے

خالدہ عنایت --- میٹرو باکو  
مجھ کو اک خواب پریشان لگا عید کا چاند  
میری نظروں میں ذرا بھی نہ بچا عید کا چاند  
آنکھ کم کر گیا پھر ملے ہوئے لوگوں کا خیال  
دردِ دل دے کر دُوب گیا عید کا چاند

جہلم ---  
یہ ندیاں جو کہیں دُور جا کے ٹھہرتی ہیں  
نجلتے کون سے دیا کے ساتھ جڑتی ہیں  
لڑتی پلوں کا بوسہ لیا تھا آجِ شرب  
اب تلک میر لب تیلیاں سی آتی ہیں

عمران کوش --- حاصل پور  
ذکرِ شبِ فراق سے دشت اُسے بھی تھی  
میری طرح کسی سے محبت اُسے بھی تھی  
مجھ کو بھی شوق تھا تھے چہروں کی دید کا  
رستہ بدل کے چلنے کی عادت اُسے بھی تھی

ارم احمد --- لاہور  
منظر کھینچنے والے پس منظر نہیں ہوتے  
جنہیں اونچا سمجھتی ہے نظر اونچے نہیں ہوتے  
بہیں بھی سر بلندی کی تمنا تنگ کرتی ہے  
مگر دم دوسرے کو روند کر اپنے نہیں ہوتے

نازش یحیٰ --- کراچی  
ہر اک عشق کے بعد اور اس کے عشق کے بعد  
فرار اتنا بھی آسان نہیں ہوتا سہل جانا



# خارون طاعی

## انہیں کہے دائرے سے

کسی نے سچ کہا ہے کہ شاعر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے لیکن اس کی شاعری ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ پروین شاکر کو ہم سے بچھڑے برسوں بیت گئے لیکن ان کی شاعری آج بھی ایک — نمایاں مقام رکھتی ہے۔ عید کے حوالے سے ان کی نظریں ہمیشہ تازہ رہی ہیں۔

بھیرو دیکھی تو خیال آیا انہیں  
جانے کب پھر ملے ہونے لوگ ملیں  
جی میں آیا ابھی تم سے کہیں  
عید کا چاند مبارک ہو نہیں  
ہم ہیں خاموش ہیں دہشتہ ہی  
لب لکھیں گے تو پکاریں گے ہمیں  
تم سے بچھڑے ہوئے برسوں بیتے  
تم سے کہنا ہے ہی آج نہیں  
مانگنا بھول نہ مایا ہم کو  
چاند کو دیکھ کر اگر ہاتھ اٹھیں۔

## صائمہ جلالیہ کہے دائرے سے

کہتے ہیں محبت کی داولوں میں جواب ہے آپ کو کھودنا ہے وہ غم اترتا ہے اور جو آگے بڑھ کر عشق زار میں داخل ہو جاتا ہے وہ مقاصد زندگی کو پالیتا ہے۔ محبت سے عشق تک کے سفر میں کیا واقعات و حادثات رونما ہوتے ہیں اس کا ذکر زیر گرفتاری نے اپنی اس غزل میں کیا ہے۔ وہ تباہ حال، وہ سر بھرے بڑا نام عشق میں کر گئے تیری جستجو میں جو کھو گئے تیری آرزو میں جو مر گئے

ہے روش روشن میں شگفتگی، کہیں تازگی، کہیں نغمگی  
یہ ہیں سے کس کا گزر ہوا کہ تمام بھول کھیر گئے

سب سرگراںیاں ساتھ تھیں، تیری مہربانیاں ساتھ تھیں  
تیری آرزو میں جہاں ہے تیری جستجو میں بدھ گئے  
کہیں کس طرح سے یہ واقعہ بڑا دکھ بھرا ہے برآمد  
جنہیں ہم سمجھتے تھے آشنا، وہ نظر ہزار کے گزر گئے

رہے ساملوں پہ زہیر ہم بھی اس طرف بھی اس طرف  
جو تلاش ذات میں تھے کم، وہ بھونر میں کیسے اتر گئے

## انیس فاطمہ کہے دائرے سے

میری ڈائری میں تحریر احمد فراز کی یہ غزل شاعری  
سے محبت کرنے والی تمام قاریاں بھول کے نام  
رہیں تیرا قرب نہ باد ہے کیا کیا جلتے  
پھر آج دکھ بھی زیادہ ہے کیا کیا جلتے

ہمیں بھی عرض تمنا کا ڈھب نہیں آتا  
مزارِ یاد بھی سادہ ہے کیا کیا جلتے

کچھ اپنے دوست بھی ترکش بدوی پھرتے ہیں  
کچھ اپنا دل بھی کشادہ ہے کیا کیا جلتے

نہ اس سے ترکش بعلیق کی بات کر مابین  
نہ بھدی کا ارادہ ہے کیا کیا جلتے

سلوک یار سے دل ڈوبنے لگا ہے فراز  
مگر یہ غفلِ اعدا ہے کیا کیا جلتے

## ماریتہ ولدہی کہے دائرے سے

میری ڈائری میں تحریر منیر حسین کی یہ خوبصورت نظم

آپ سب قارئین کی نند۔

## سمجھ میں کچھ نہیں آتا،

ہیں کس بات کی محبوب دیکھاؤں میں رہنا تھا  
کس دل میں اترنا تھا  
چمکتا تھا کس آنکھوں میں  
کہاں پر بھول بنا تھا  
تو کب خوشبو کی صورت کہنے جا ناں سے گزرتا تھا  
سمجھ میں کچھ نہیں آتا

ہیں کس قریہ آب و ہوا کے سنگ رہنا تھا  
کہاں شلش گزرتا تھا  
کہاں مہتابِ آفاق میں کس کو یاد کرتا تھا  
کس کو بھول جاتا تھا

کہاں پر صبح کا آغاز کرتا تھا کہاں سورج نکلتا تھا  
سفر کے دشت میں تنہا تھکے ہارے مسافر کو  
کہاں خمد لگاتا تھا  
کہاں دریا میں کشتی ڈالتا تھا اور کس ساحل اترنا تھا  
سمجھ میں کچھ نہیں آتا

ہیں کس قریہ آب و ہوا کے سنگ رہنا تھا

## دجیدہ توقیر کہے دائرے سے

چند سال قبل نظم "مزار" پڑھنے کا اتفاق ہوا تو یہ  
حقہ ازبر ہو گیا۔ سوچ، فکر اور احساس کے ہزار بار دروا  
کرتی ہوئی ان ہم راشد کی استعدادی نظم "مزار" سے اقتباس  
آپ سب قارئین بھنوں کے لیے۔

یہ مزار سجدہ گزار جس پر سب سے ہم  
یہ مزار تارِ خیر نہیں  
کسی صبح تو کا ملال ہے  
کسے رات کوئی دلی ہوئی  
کسی آنکھ کو سنائی

جواز سے عقدہ لکھائی کا شکار تھا  
کسی قہقہے کا مال ہے

جو دفاعِ ذات کی آرزو میں اسیر تھا  
کبھی گردِ لہا کبھی مہرِ دم سے سوا تھے  
وہ کہاں تھے کے جوان، کیسے گزر گئے  
وہ گزر گئے تجھے خاک ہے کسی جان کر

نہ تری صدا کی طرف بڑھے  
وہ صدا کہ جس کی ہر ایک لے  
کبھی شعلہ ہے، کبھی رنگ ہے  
کبھی دل بنے کبھی ہاں بنے  
یہ نظریں تجھ سے ملا کے

کہ سرورِ وقت سے ان کی ایک نگاہ ان کا نشان بنے  
وہ غم و شادمانی کی لہرائی کا غبار ہے  
یہ غم و شادمانی کا غبار ہے

یہ مزار مہرِ لب سے  
جو نیم خند ہے کبھی  
تو وہ دھلیں جو ہزار سال سے بند ہیں  
کئی آرزو میں اسیر ہیں کہ نجات پائے اہلِ پریں  
جو نیم خند ہے کبھی

انہیں کیا کہیں  
کہ جو آج آنکھ کے سیمہ وند  
کسی رنگ میں کسی مادے میں گنوا چکے  
انہیں کیا کہیں  
کہ جو اپنے ساتھ کوئی کر  
جو ہم سے نہ لاکے

مگر ایک وہ کہ ہزار شعلوں کے سیل میں  
کبھی ایک بار جو کم ہوئے  
خسیر اپنی آپ نہ پا کے

## مہتاب امام کہے دائرے سے

ہماری بہت بھاری اور بہت عزیز ترین بستی جب  
عید کی خوشیوں میں تیار ہے جو تو کچھ اسی طرح کی کیفیت  
محسوس ہوتی ہے جو نیم فز کی نظم میں ہے۔ آپ بھی پڑھیے  
ہوا کچھ تو بتا کہ

اس عید پر کس محل میں سے وہ  
اور اس کے میر ہیں کارنگ کیا ہے  
اور اس کے گسٹوں میں کون سے بھولوں کا گھر ہے  
اور اس نے عید پر کس رنگ کی مہندی لگائی ہے  
کیا لب کے بھی میری خوشبو ہی سانسوں میں بسائی ہے  
ہوا تو کیا بتائے گی، تجھے معلوم ہی کیا ہے؟  
کہ اب کی عید پر  
اس کی سوچوں پہ "پہرا" ہے

\*





## نادرہ خاتون سپتاترے

خط بچوانے کے لیے

خواتین ڈائجسٹ - 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com  
khawateendigest@hotmail.com

### موش مغل ..... بھکر

اس بار میرے قلم اٹھانے کی وجہ صرف اور صرف راشدہ رفعت ہیں جن کی کمائیاں ہمیشہ ہی بڑی اچھی ہوتی ہیں لیکن اس بار میں ایک چیز میں ان سے اختلاف کروں گی اور وہ یہ کہ کیا عمارت اور جمعیتی یہ منطقی انجام ڈر کر کرتے تھے دو محبت کرنے والے دل جو کہ اتنے نرم ہیں کہ ہر کسی کا درد اپنے اندر سولیں وہ بھی اپنی محبت نہ پا سکیں۔ وہ بھی ایک چھوٹی سی غلط فہمی کی وجہ سے۔ فرحت اشتیاق جن کی ایک لائن۔ ”محبت کرنے والے کبھی تنہا نہیں ہوتے محبت انہیں تنہا ہونے ہی نہیں دیتی۔“ مجھے اتنا امپریشن کیا کہ میں ان کی دہرائی ہوئی۔ فرحت آپ نے ہمیشہ کی طرح پوری کمائی میں مصروف کیے رکھا۔ میمونہ خورشید نے تو اس بار ڈرائی دیا ہے کہ اب آگے کیا ہوتا ہے۔ باقی ڈائجسٹ بھی زبردست رہا۔

ج : موش! کبھی جھٹی زندگی پر غور کیا ہے آپ نے؟ کتنے اچھے لوگ ہوتے ہیں ”نرم دل“ محبت کرنے والے“ ایثار و قربانی کے پیکر کیونکہ زندگی میں وہ سب کچھ پالیتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں؟ راشدہ رفعت کی کمائی بھی ایسے ہی لوگوں کی کمائی تھی۔

فرحت اشتیاق تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

شازیہ نیاز احمد ملغانی ..... کوئٹہ کینٹ

آپ سے ایک بات پوچھنی ہے؟ فرحت اشتیاق ہر سال ستمبر میں اپنا ناول شائع کرواتے ہیں اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟ کیونکہ فرحت جی کے جتنے ناول بھی شائع ہوئے ہیں۔ وہ سب ہی ستمبر میں اشاعت ہوئے ہیں۔ اس دفعہ بھی ان کا ناول ستمبر میں شائع ہوا۔ ”متاع جہاں ہے تو“ زبردست تھا۔

باقی راشدہ رفعت نے بھی اپنے ناول کے ساتھ خوب انصاف کیا۔ میمونہ خورشید علی کا ناول ”کسی راستے کی تلاش میں“ بہت اچھا جا رہا ہے رشتہ نگار نے بھی سب ہی قارئین کو گرفت میں رکھا ہوا ہے۔

ج : شازیہ! فرحت اشتیاق ستمبر میں ناول شروع کرتی ہیں اس کی کوئی خاص وجہ ہے یا محض اتفاق ہے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ آپ کو دادیں گے کہ آپ نے یہ بات نوٹ کی اور یاد رکھا کہ فرحت کے ناولز کا آغاز ستمبر میں ہوتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ معذرت کہ آپ کے پچھلے خطوط شامل نہ ہو سکے۔

شہرہ قسنی ..... ملتان

ستمبر کا خواتین ڈائجسٹ ہر لحاظ سے مکمل اور خوب صورت تھا۔ راشدہ رفعت کا مکمل ناول بے حد پسند آیا صمیمہ صدف نے بھی اچھا لکھا لیکن سب سے خوب

صورت اور منفرد فرحت اشتیاق کا ناول ”متاع جہاں ہے تو“ فرحت اتنے تسلسل اور روانی کے ساتھ ہر چیز کو بیان کرتی ہیں کہ پڑھتے ہوئے ارد گرد کا ہوش بھول جاتا ہے۔ فرحت کے مکمل ناول ہمیشہ چند اقساط پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن آپ ان سے کوئی سلسلے وار ناول بھی تحریر کروائیں ہم انہیں ہر ماہ پڑھنا چاہتے ہیں چاہے وہ چند صفحات ہی کیوں نہ لکھیں۔ میمونہ خورشید کا ناول ”راستے کی تلاش میں“ بہت منفرد سا ناول ہے خصوصاً ”دل تو بڑا کا مسئلہ اور اس کے والدین کا اس پر رد عمل جو نہ صرف اس کی خوشی کے لیے دوسروں کی جائز خوشیاں چھین سکتے ہیں بلکہ اپنی دوسری اولاد بھی کھو رہے ہیں لیکن میمونہ جی! حورا اعین کے ساتھ اتنا برا مت بھجئے کہ وہ تو پہلے ہی محروم لوگوں میں سے ہے۔

شازیہ خجندی کا مکمل ناول ”دریچہ دل“ دوبارہ سے تحریر کرنے اور شائع کرنے کے متعلق رائے پوچھی گئی تھی۔ میرے خیال میں ”دریچہ دل“ کو ضرور مکمل کیا جانا چاہیے۔ اسے شازیہ جی کے نام کے ساتھ کتابی صورت میں ضرور شائع کریں۔

سائرہ غلام نبی صاحبہ سے کہیں کہ وہ کتابوں پر باتیں تو واقعی بہت پیاری کرتی ہیں مگر یہ اور بھی پیاری ہو سکتی ہیں اگر وہ یہ باتیں خواتین ڈائجسٹ کے زیر اہتمام چھپنے والے ناولوں پر بھی کریں۔

اور یہ کہ ہم افسانہ یا ناول لکھنے کے لیے ایسے ہی صفحات استعمال کر سکتے ہیں افسانہ یا ناول لکھنے کے لیے صفحات کی قید تو نہیں؟

ج : - تمہارا شعاع ہرماہ کی 25 تاریخ کو خواتین پہلی کو اور کرن 5 تاریخ کو آجاتا ہے۔ آپ کو لیٹ ملنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ملتان کچھنے میں وقت لگتا ہے۔

”دریچہ دل“ کے لیے ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ اسے مکمل کیا جائے اور اس سلسلے میں ہمارے ذہن میں ایک مصنفہ کا نام بھی ہے۔ اگر ان مصنفہ نے رضامندی ظاہر کی تو ضرور مکمل کرا دیں گے۔

میمونہ خورشید علی اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

آمنہ سلیم ..... لاہور کینٹ

میٹرک کے پیر سے فارغ ہو کر پڑھنا شروع کیا تھا۔

ڈانٹ بے شک بڑی تھی۔ لیکن چھپا کر کبھی بھی نہیں پڑھا۔ کیونکہ چھپا کر غلط کام کیا جاتا ہے اور خواتین اور شعاع پڑھنا کوئی غلط کام نہیں ہے۔ میں اگر یہ کہوں کہ میری تربیت میں خواتین اور شعاع نے 50 فیصد دخل کیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ جب میں پڑھتی ہوں کہ ہم چھپا کر پڑھتے ہیں۔ یا رسالے کو گھر والے پھاڑ دیتے ہیں۔ یا اٹھا کر روٹی والے کو دے دیتے۔ حالانکہ ان ہی کمائیوں پر جب ڈرائے بنتے ہیں۔ تو سب گھر والے بڑے ذوق و شوق سے ڈرائے دیکھتے ہیں۔ میں بس یہ کہنا چاہوں گی کہ اچھا یا برا انسان خود ہوتا ہے یا جیسی تربیت ماحول یا صحبت ہوگی ویسا ہوگا ماں باپ کو خاص طور پر اپنی بیٹیوں کو اعتماد اور ملان دینا چاہیے اور آخر میں ایک ریکولیشن کرنا ہے کہ پلیر شازیہ خجندی (مرحوم) کی ”تیرے نام کی شہرت“ میرے ساحر سے کو ”شائع کروں۔“ کیوں کہ سنے پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے یہ ناول نہیں پڑھے۔ میں نے بھی تقریباً تین سال سے باقاعدگی سے پڑھنا شروع کیا ہے اور میں نے بھی یہ ناول نہیں پڑھے ہیں۔

ج : - پیاری آمنہ! آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تمہوڑا سا انتظار کر لیں۔

ہمت سے گھراؤں میں آج بھی لڑکیوں کو ڈائجسٹ پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے وہ چھپا کر پڑھتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ والدین پڑھے لکھے نہیں ہوتے اس لیے انہیں علم ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے بچوں میں جو تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ وہ مثبت راستوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور ہمارے مذہب اور اقدار کے مطابق ہوتی ہیں۔

نائل حاجی معشوق ..... کوٹ غلام محمد

میں 3th کلاس سے خواتین کی خاموش قاری ہوں اور آج ماشاء اللہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی ہوں میری بیٹی آج 14 دن کی ہوئی ہے مگر میں خواتین پڑھے بغیر نہ رہ سکتی۔

مکمل ناول ”زندگی اک سفر“ راشدہ رفعت کا بہت زبردست ناول تھا مگر جمعیتی کے لیے دل دیکھی ہو گیا۔

”محبت خواب سفر“ ناول اب زبردست ہو چلا ہے لائبریری داکٹر کی بس تو نہیں ہو سکتی۔ ابھی ڈاکٹر رخشندہ کے مزید



انکشافات اور حورے ہیں جو انہوں نے اپنے شوہر سے شیر  
نہیں کیے، میرے خیال میں میڈم یا قوت کا بیٹا تھیل ہے۔  
محمود عالم، میڈم یا قوت، آغا جان، داعم، ڈاکٹر رخشندہ یہ  
سب ایک ہی رشتے میں بندھے نظر آتے ہیں۔

ج : پیاری شاہ مبارک ہو آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی  
رحمت سے نوازا ہے۔ محبت خواب سفر کے بارے میں  
آپ کے اندازے درست ہیں یا غلط یہ تو آگے چل کر ہی  
پتا چلے گا۔

خواتین ڈائجسٹ سے آپ کی محبت کا ہمیں بے حد  
احساس ہے۔ تمہارے دل سے شکریہ۔

شازبہ چوہدری شیخوپورہ

سلسلہ ناول ”تیری گلیاں“ فائزہ جی کیا بات ہے کچھ  
دلچسپی آپ نے چھوڑ دی ہے وہ مزہ نہیں اس  
بار ”محبت خواب اور سفر“ رخصانہ جی اب کچھ خوب لکھنے لگا  
ہے۔ غزالہ نگار، بشری رحمن کا افسانہ بھی کچھ خاص نہیں  
جیسا نام ہے، دیکھ کی جوت ویسا کوئی کام نہیں۔ بالی آپ  
سے ہم خفا بھی نہیں ہو سکتے، کیا کریں رشتہ جو ایسا ہے۔

ج : پیاری شازبہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا  
خط شامل نہ کر سکے۔ آپ نے صرف دو مختصر افسانوں پر  
تبصرہ کیا، باقی تحریروں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا؟ فائزہ  
افخار کے ناول میں کہانی کے کردار واضح ہو گئے ہیں۔ اب  
کہانی تیزی سے آگے بڑھے گی۔

سارہ حسنین شجاع آباد

خواتین ڈائجسٹ ہمارے یہاں 9 تاریخ کو ملا ہے۔  
مطلب ہے کہ کافی لیٹ، تبصرہ کا شمار ہمیں اپنے ٹاسٹل  
سے ہی تو نافہ کر گیا۔ سب سے پہلے روزے کے بارے  
میں معلومات حاصل کریں اور بہت اچھا لگا۔ مستقل سلسلے  
سب ہی اچھے ہیں لیکن فائزہ افخار کا ناول ”تیری گلیاں“  
بھول بھلیاں بہت ست روی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

فرحت اشتیاق کا ناول بہت پسند آیا۔ لیکن راشدہ رفعت  
کا ناول ”زندگی اک سفر“ میں کوئی نئی بات محسوس نہیں  
ہوئی۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ تبصرہ کون سی تاریخ تک  
بھیجا جاسکتا ہے۔

ج : سارہ! خواہش آمدید خواتین ڈائجسٹ پر تبصرہ ہمیں  
ہر ماہ کی ہیں، بائیس تاریخ تک موصول ہو جانا چاہیے۔

اس تاریخ کے بعد ملنے والے خطوط شامل کرنا ممکن نہیں  
ہو گا۔

فائزہ افخار کے ناول میں کہانی آگے بڑھی ہے اس خط کو  
پڑھنے کے بعد آپ کو ست روی کی شکایت نہیں ہوگی۔

نغمہ بیٹ لاہور

خواتین ڈائجسٹ کا اور ہمارا تیس سالہ پرانا ساتھ ہے  
مگر کافی عرصہ بعد ”ہمارے نام“ میں قلم اٹھانے کی  
جسارت کی ہے اور وہ اس لیے کہ تبصرہ کے شمارے کی  
تعریف نہ کر کے ہم گناہ گار نہیں ہونا چاہتے۔ ٹاسٹل سے  
لے کر ایئر تک پورا ڈائجسٹ دلی سکین کا باعث بنا بہت  
کوشش کے باوجود کوئی تنقیدی نقطہ ہاتھ نہ لگا۔ ٹاسٹل  
مشرق حسن کا شاندار نمونہ پیش کر رہا تھا یعنی کڑی اکھیاں  
نوں چٹکی لگی۔ صفحہ پلٹا تو کرن روشن نے اندر کی دنیا  
جنگل کے رکھ دی۔ بہت انفار میٹو باتیں پڑھنے کو ملیں اس  
کے بعد انشاء جی سے ملاقات کر کے طبیعت باغ و بہار  
ہو گئی۔ اللہ بھلا کرے غزل قمر کا جنوں نے ناصر محمود خان  
سے ملاقات کروا کے ہماری ایک بڑی خواہش پوری کی۔  
ان کی گفتگو کی ذہانت اور بر جستگی کے تو ہم پہلے ہی قائل  
تھے مزید متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ویسے ایک بات ناصر جی  
سے پوچھنا تھی کہ ہر پارہ فیمو بازار میں آنے سے قبل آپ  
کی انصافی میں کیسے پہنچ جاتا ہے؟ کیا جادوئی چھری ہے آپ  
کے پاس؟

اب آتے ہیں افسانوں کی طرف سچ مانے بشری رحمن کا  
نام دیکھ کر تو میں اچھل ہی پڑی۔ آج ہمارے معاشرے میں  
موسیقی بھائی جیسے بہت سے کردار گردش کر رہے ہیں اللہ  
عورتوں کو بھی ناؤک آپا جیسا سنا پین بخشے۔

صبا پور کی ”محبت نارسائی“ تو میری ڈائری کے صفحات  
میں بند تھی۔ حیران ہوں یہ روداد صبا کے ہاتھ کیسے لگی پتہ  
نہیں کیوں صبا کی تحریریں مجھے اپنی زندگی کا نقشہ پیش کرتی  
ہیں جو بے صورت اور دلکش لفظوں کا چٹاؤ تحریر کو چار چاند  
لگاتا ہے۔ رخصانہ نگار کے ناول ”پیانے“ میں حقیقت کا  
رنگ ابھارا گیا۔ 95 فیصد لوگ اپنے مفاد کے لیے

دوسروں کی زندگیوں کو بے رنگ کرنے سے نہیں  
کتراتے۔ ”باتیں کتابوں کی“ ساتھ غلام نبی کا احمد فراز کی  
رومانی شاعری پر مضمون دل کو دھکی کر گیا۔ ایک اور تحریر  
جس نے اپنی نفاست اور سکھراپے کی وجہ سے میری توجہ

اپنی طرف مبذول کروائی وہ تھا سہویدہ سے مسرت حسن کا  
”باورچی خانہ“ انداز بیاں کیا خوب تھا۔ پاکستان ہوتیں تو  
یقیناً ”زبردستی“ کی مہمان بن کر کباب اور اسپرنگ رول  
کھانے پہنچ جاتی۔

ج : نغمہ! آپ تو ہماری پرانی دوست ہیں کافی عرصہ پہلے  
تقریباً ہر سلسلے میں آپ کا نام نظر آتا تھا۔ اب ایک طویل  
مدت کی خاموشی کے بعد خواتین ڈائجسٹ کے سلسلوں میں  
دوبارہ حصہ لے رہی ہیں تو یقین کریں بے حد خوشی ہو رہی  
ہے خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید  
ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔  
لیکن صرف تعریف نہیں تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی  
ضروری ہے۔ تاکہ ہم پر سچ کی خاموشیوں سے آگاہ ہو کر  
اسے مزید بہتر بناسکیں۔

خالدہ عنایت ٹنڈوالہ

”تبصرہ کا خواتین بیٹھ کی طرح دس تاریخ کو ملا۔ سب سے  
پہلے کرن کرن روشنی پڑھا۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف  
نظر دوڑائی تو فرحت آئی کا نام دیکھ کر دل بہار ہو گیا فائزہ  
افخار کا ناول ”بھول بھلیاں“ اور رخصانہ نگار کا ”محبت  
خواب سفر“ دونوں بہت اچھے جارہے ہیں۔

اس دفعہ راشدہ رفعت اور صمد صدق نے بہت  
اچھا لکھا، افسانوں میں جو افسانہ نمبروں پر مجھے لگا وہ غزالہ  
نگار کا ”دیکھ کی جوت“ تھا۔ اس دفعہ مجھے شاید اس  
افسانے نے خط لکھنے پر مجبور کیا۔

شاہ اور حنا نے احمد مغل کے انٹرویو کا کہہ کر ہمارے دل  
کی بات کہہ دی۔ آپ کی آپ جی میں احمد مغل کا انٹرویو  
دیں گی؟

ہماری طرف سے سب بہنوں کو ملی عید مبارک۔

ج : پیاری خالدہ! آپ کی مبارک باد قارئین تک  
پہنچا رہے ہیں۔ آپ کو بھی عید مبارک! احمد مغل کا انٹرویو  
ضرور لیں گے۔ تمہارا انتظار کر لیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تمہارے دل سے  
شکریہ۔

سعدیہ جان ملک نامعلوم شہر

طویل کتابچے والے دن اور اداس راتوں کی خاموشی  
تمہائی سے بیزار ہو چکی ہوں۔

شاید آپ کو خط لکھ کر دل میں اٹھتی دیکھیں کچھ دیر

کے لیے معدوم ہو جائیں۔ آنکھوں سے برستے آنسو کچھ  
مل کے لیے رک جائیں۔ میں آپ کے ڈائجسٹ کی  
مستقل قاری بننے کی خواہش مند ہوں۔ مگر میں چاہوں بھی  
تو اپنی خواہش پوری نہیں کر سکتی۔

ج : سعدیہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ تمہاری کا شکار  
ہیں خط اور شاعری سے لگتا ہے آپ میں لکھنے کی صلاحیت  
ہے۔ کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ دیں تو اس سے آپ کے  
دل کا بوجھ ہلکا ہو گا اور مصروفیت میں تمہاری کا احساس بھی کم  
ہو جائے گا۔

عائشہ رحمن ہری پور

رخصانہ نگار سے ہم خفا ہونے والے ہیں۔ اس لیے کہ  
وہ بہت تفصیل سے بات بیان کرتی ہیں پوری قسط بڑھ کر  
بھی بندہ سوچتا ہے کہ کیا پڑھا۔ جواب ملتا ہے صرف جتنس  
اور مسپنس۔ ہم میں اتنی برداشت نہیں خواتین میں بھی  
مسپنس کا بڑا بڑا برداشت کریں۔ ویسے آفرین ہے ان پر  
”اتنا لکھنے کے بعد بھی اپنا معیار برقرار رکھتی ہیں۔ فائزہ  
افخار تو اللہ جانے کیا چیز ہیں۔ اتنی بے ساختگی اور انہیں  
سلیم سے کہیں کہ وہ بہت بہت۔ کیا کروں الفاظ نہیں  
ملتے۔ شہر بخاری سے کہیں کہ ”ہم سے ہے زمانہ“ کو جلد  
از جلد لکھتی رہا کریں اور یہ لفظوں کی جادوگری ساتھ غلام  
نبی کہاں سے سیکھ رہی ہیں۔ انہیں کہیں دریا کو کوزے میں  
اتنی عمدگی سے ہر دفعہ بند نہ کریں ہمیں نظر نہ لگ جائے۔  
ناریہ المان کا شاعری میں انتخاب ”بادل برسیں گے“  
لا جواب قلم تھی۔

ج : پیاری عائشہ! بہت شکریہ آپ نے خط لکھا، آپ  
کی تعریف اور تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی  
ہے۔

سازہ کرن صدیقی کوٹ چوہنہ

”خواتین ڈائجسٹ“ حسب معمول 7 کو ملا۔  
ٹاسٹل بھی اچھا تھا۔ یہ ایک ایسا ڈائجسٹ ہے جس کی  
تعریف کرنا سوچ کو موم بنی دکھانے کے مترادف ہے۔  
سب سے پہلے میں ”محبت خواب سفر“ کا ذکر کروں گی۔ اتنی  
زبردست اسٹوری رخصانہ آئی! آپ کا ذہن ہے یا کمپیوٹر  
لوکی میموری جو اتنی پیاری پیاری اسٹوریز تخلیق کر سکتی  
ہیں۔ پلیز پلیز داعم کو عزم سے جد امت کیجیے گا اور  
جماگیر ہدائی کا بہت برا انجام کیجیے گا۔ تھیل کی شادی



عائشہ بخاری سے ہی کیجیے گا۔ اس کے علاوہ فائزہ آبی کی "سیری گلیاں" بھول بھلیاں "زمزمی زمزمی زمزمی"۔ آخر اس زمزمی پر نجانے کتنی لڑکیاں فدا ہوں گی۔ بے چارہ ایک زمزمی اور آٹنی ڈھیر ساری لڑکیاں اس کو دیکھ کر آہیں بھرتی ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ زمزمی کی شادی سوہا سے ہی کروائے اور پلیز ڈشہ کو زمزمی کے سرمت منڈھنا۔ اور مجھے اس منسزہ پیگم پر بہت فصد آتا ہے۔ ساری زندگی تو کچھ نہ کیا اب پرہاے میں اگر انتقام لے رہی ہے وہ بھی ان سے جن کا کوئی قصور ہی نہیں ہے۔ مجھے اس کمائی میں احسن زمزمی اور کل ہمارا کردار بہت زیادہ پسند ہے اور میمونہ آبی کا ناپا سلسلے وار ٹائٹل بھی بہت و نڈر خل ہو جا رہا ہے۔

ج۔ سائزہ اخواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کے مشورہ، تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہے ہیں۔

اعظم سرفراز۔ کراچی

خاموش قاری اس وقت سے ہوں جب خود بھی تھی۔ آج ایک عدد بیٹے کی اماں جان ہوں مگر شوق ہنوز برقرار ہے۔ قلم اٹھانے کی وجہ اس بار کا زبردست شمارہ ہے۔ کھل خوبصورت زور زبردست، اگر تعریف نہ کی تو زیادتی ہو جائے گی ٹائٹل سے لے کر آخری صفحے تک ڈائجسٹ لا جواب تھا۔ کمائیاں ایک سے بڑھ کر ایک سلسلے وار ٹائٹل اپنی انتہاؤں پر ہیں۔ بہرہ محفوظ۔ کھل ہونے تک ویسے "شعاع" اور "نکرن" کا نام تو ٹھیک ہے اگر خواتین کا "شع" رکھ دیا جائے تو آئیو تک نہ کام ہی ایسا کر رہا ہے مگر کھر شعور کی روشنی پہنچانے کا۔ کیا عدنان بھائی (انسانی ابھرنے) سے بذریعہ ای میل بات ہو سکتی ہے۔ مجھے "آپ کا باورچی خانہ" میں شرکت کرنی ہے اس کا کیا طریقہ کار ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے خط کیسے لکھتے ہیں؟

ج۔ باری اعظم خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید خواتین ڈائجسٹ کے کسی بھی سلسلے میں آپ اسی طرح شرکت کر سکتی ہیں جس طرح آپ نے یہ خط لکھا ہے۔ عدنان بھائی کو آپ صرف خط لکھ سکتی ہیں۔

عرشہ۔ کراچی

آپ کے تمام سلسلے ہی بہت عمدہ ہیں۔ کسی ایک کی تعریف دوسرے سلسلے کی حق تلفی کلائے گی۔ لیکن آج

جس تحریر نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ تحریر ہے میمونہ خورشید علی کی "کسی راستے کی تلاش میں" بلاشبہ یہ عمدہ تحریر ہے۔ دراصل میں left handed ہوں یہ تحریر پڑھنے کے بعد مجھے پر یہ انکشاف ہوا کہ میں تو بے left hand سے ڈالتی ہوں میں تقریباً 9 سال سے روٹیاں بناتی ہوں اب اگر کو کوشش کروں دائیں ہاتھ سے بنانے کی تو نہیں بنتیں۔ کافی لوگوں سے معلوم کیا لیکن کوئی نسلی بخش جواب نہیں ملا تو قلم کا سہارا لیا۔ آپ سے گزارش ہے کہ پلیز مجھے بتائے کہ اگر left hand سے روٹیاں بنائیں تو کیا مجھے ٹکنا ملے گا۔ اس کے علاوہ باقی سارا کام سوائے لکھنے کے میں دائیں ہاتھ سے ہی کرتی ہوں۔ آپ کے رسالے میں دو کمائیاں "دل سے لکھے ہیں جو لفظ" اور "میرے ہدم میرے دوست" ان کی آخری قسط میں پڑھ نہیں سکی تو بتائیے کہ یہ دونوں کس مہینے میں شائع ہوئی تھیں۔ "محبت خواب ستر" بہت slow چل رہی ہے تو ڈرافٹ کریں۔

ج۔ عرشہ! میمونہ خورشید علی نے اس ٹائٹل میں یہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ کچھ لوگ قدرتی طور پر بائیں ہاتھ سے کام کرنے کے عادی ہوتے اور یہ کوئی گناہ یا خرابی نہیں ہے جسے مسئلہ بنایا جائے۔ دل شاد بیگم کی ساس نے اپنی بسو کی ایک عادت کو بہت بڑی خرابی بنایا جس سے پورے گھر پر غلط اثرات مرتب ہوئے۔ آپ بائیں ہاتھ سے روٹی بناتی ہیں اور دیگر کام کرتی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے نہ ہی یہ کوئی خرابی یا گناہ کی بات ہے۔ فرحت اذقیاق کے یہ دونوں ٹائٹل کتابی شکل میں آچکے ہیں۔ آپ تو کراچی میں رہتی ہیں یہاں اردو بازار میں کتبہ عمران ڈائجسٹ سے خرید سکتی ہیں۔

مینش آصف پراچہ۔ کراچی

ستمبر 2008ء کے خواتین میں صفحہ نمبر 248 (کسی راستے کی تلاش میں) پر ایک جملہ لکھا ہے۔ دل شاد بیگم کہتی ہیں۔ "آپ اس لڑکی کن ترانیاں سن رہے ہیں؟" یہاں جو لفظ "کن ترانیاں" استعمال ہوا ہے وہ "کن ترانی" سے نکلا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام سے جب انہیں کوہ طور پر بلا کر شرف ہم کلائی بخشا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علی السلام نے اللہ کے دیدار کی خواہش کی تھی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ سورۃ

الاعراف آیت 143۔ گزارش میری یہ ہے کہ ہم اکثر اپنی گفتگو میں اس طرح کے پامالورہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جیسے "بھوک سے میری تو آنتیں قل حوالہ پڑھ رہی ہیں" یا یہاں کا تو "پوا آدم" ہی نرالا ہے۔ وغیرہ ہم بغیر سوچے سمجھے بولتے ہیں یا لکھتے ہیں۔ جو کہ گناہ ہے۔ یعنی ہمارا بھی دور جاہلیت والا حال ہے کہ جو کچھ اپنے باپ دادا کو کرتے دیکھا بغیر سوچے سمجھے اس کی تقلید شروع کر دی۔ میں قاری اور مصنف سب بہنوں سے التماس کرتی ہوں کہ آئندہ وہ ان باتوں کا خصوصی خیال رکھیں اور کسی کو کہتے سنیں تو ان کو بھی سمجھائیں۔

ج۔ مینش بہن! اصلاح کا شکریہ۔ آپ کا خط شائع کیا جا رہا ہے۔

عاشفہ۔ دوچہ قطر

اس ماہ کا ٹائٹل بہت خوب تھا "آنکھوں کو تراوٹ بخشا" اس ماہ کا شمارہ اسے ون تھا۔ کیا ناؤڑ گیانا ٹائٹل کیا افسانے۔ سلسلے وار ناؤڑ بہترین جا رہے ہیں۔ مکمل ٹائٹل "زندگی اک سفر" حقیقت سے قریب تھا۔ ٹائٹل میں "بیانے" اور "راستوں کو چلنا ہے" خوب تھے۔ میمونہ خورشید بھی اچھی مصنفہ ہیں۔ غزلوں میں احمد فراز کو پڑھ کے اچھا لگا اور ان کے پتھر نے کا دکھ بھی ہوا۔ غرض پورا ڈائجسٹ اسے ون تھا۔ کچھ بہت بھلے سے نام ہیں جیسے نکمت عبداللہ، عفت حمری شا، در شمن سلیم، نیلہ راجہ، سائہ کشش، پلیز آپ جہاں کہیں بھی ہیں۔ ہمارے لیے کچھ لکھیں۔ آپ کو کچھ نہیں کما جائے گا۔ نئی رائٹرز بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ رمضان کے پکوان کے حوالے سے ڈشہ بہت مزے دار اور چٹ پٹی سی تھیں۔ "خبریں ویریں" ختم کر کے ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں ایسی رائٹرز کی تحریریں ہوں جو اب ہم میں نہیں یا جن کو مصروفیت میں کھو کر ٹائم نہیں ملتا۔ "سعدیہ عزیز آفریدی اور نکمت عبداللہ" آپ دونوں "عید نمبر" کے لیے کچھ لکھیں۔

ج۔ باری عاشفہ! یاد آوری کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ

بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ اگر لکھنا چاہتی ہیں تو ضرور لکھیں۔

ارم احمد۔ لاہور

آج کل اداسی اور پریشانی کے جنگل میں بھٹکے ہوئے مسافر کی مانند گھوم رہے ہیں وجہ؟۔ وجہ یہ ہے کہ ہم آج کل F.G بائیل کی ذہنت بنے ہوئے ہیں اور دل اپنے "لاوہ" میں پھنوس آئے ہیں۔ یہاں آکر ان کاموں سے پالا سے پڑا ہے جن کو ہم صرف دور سے دیکھا کرتے تھے اور آسان سمجھتے تھے۔ ہم جس گاؤں سے آئے ہیں وہاں اسکول میں لپیڈز انگریزی تو کیا اردو بولنے کا تکلف بھی کم ہی کیا کرتی تھیں اب جب یک دم انگلش کی موٹی موٹی کتب دیکھی ہیں تو اب آتے ہیں ستمبر کے شمارے کی طرف ہائے بے چاری حور جس کے ساتھ ایک بار پھر برا ہو گیا۔ کوئی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے اس کے ساتھ میمونہ جی اچھائی کریں گی۔ فائزہ افتخار نے اس بار بھی پہلے کی طرح پور نہیں ہونے دیا۔ ان کی تحریر کا مسلسل بہت شان دار ہے۔ بشری رحمن نے فن کاری اصل تعریف کر دی۔ موٹی کی شکست نے جی بھر کے مزہ دیا۔ زندگی کے سفر نے تھوڑا تھوڑا پور کیا تھوڑا تھوڑا فریش یعنی ففنی

ج۔ باری ارم زندگی میں مشکلات کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن ہر مشکل کے بعد راحت ہے آسان ہو جاتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ تھوڑی محنت کریں تو انگلش سیکھ لیں گی اور آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچن ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ گلن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کاپی بھی دی نہیں جائے گی۔ اور لاٹری میں شمولیت اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استغناء سے پہلے یا پھر سے تحریر کی اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



## خاموشی کو بیانیہ

احادہ

آمنہ نور درآئی .... لاہور کینٹ

1- میرا نام نور آمنہ درآئی ہے۔ میری ماں جی مجھے ”موہنی“ اور سب مجھے ”ہنی“ کہتے ہیں۔ میرا مھو طوطا بھی مجھے ہنی بلا تا ہے۔ ہمارے گھر کوئی بیل بجائے یا دروازہ کھٹکھٹائے تو طوطا صاحب چیخ کر پکارتے ہیں۔ ”ہنی ہنی! جلدی آؤ گیٹ کھولو اور کوڑا دو۔“ یہ جملہ اس نے رٹا ہوا ہے اور یہ میری چیخیں بن چکا ہے۔ میں نور آمنہ درآئی کلیننگ سائیکالوژی میں ایم ایس کی کر رہی ہوں۔ مشاغل میرے کچھ خاص نہیں ہیں۔ مطالعہ کرنا گھر کو سجانا، کچن صاف کرنا، کھانا پکانا اور اہم کام ”قرآن مجید حفظ کر رہی ہوں تو وہ روزانہ کا سبق یاد کرنا۔“

2- خونی۔ میں اپنی خوبوں پر اتراتی نہیں اور خامیوں کی ہر وقت اصلاح کرتی ہوں اور میری ایک خوبی یا خالی مگر اس صلاحیت نے مجھے بہت تضا کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ میں جملوں میں ”لے لے میں جیسے“ معنی کو سمجھتی ہوں۔ بدلتے لے لے آنکھوں کی ذرا سی تبدیلی مجھے اس کو دیتی ہے کسی کی تعریف مجھے مسرور نہیں کرتی ”دنیا کی بے ثباتی لوگوں کی چالوئی اینٹوں کی منطاب پرستی مجھے بھائی نہیں۔“

آپ مجھے بہت قوی ملی نہ سمجھیں اپنی ماں جی اور بھائی کے ساتھ میں بہت خوش رہتی ہوں یہی سچے رشتے ہیں جو مجھے میسر ہیں۔ اس جون میں ہم تینوں عمرہ پر گئے تھے تو میں اپنی روح و دین حرم پاک اور مسجد نبویؐ روضہ پاک ریاض الجنۃ چھوڑ گئی ہوں یہ زندگی کی واحد خوشی ہے اس پر وہاں پہنچ کر بھی ہمیں یقین نہ آتا تھا ہمیں خود پر رشک آ رہا تھا۔ جب میں اپنے پیارے پاکستان کے حالات پر بہت دلبرداشتہ ہو کر رہی ہوں اور کچھ کر نہیں پاتی تو اس باپوی سے لنگھنے کے لیے میں آنکھیں بند کر کے حرم پاک کا تصور کرتی ہوں ہم تینوں عمرے پر جانے سے بہت خوش تھے اور اس خوشی میں ہم نہ صحیح طرح کھانا کھا رہے تھے اور نہ سو رہے تھے اور جب پاکستان سے جدہ اور وہاں سے مکہ

مکرمہ رات تین بجے پہنچے تو مسلمان ہوئے میں رکھ کر ہم فوراً ”ہی خانہ کعبہ“ عمرہ کے لیے پہنچ گئے۔ کاش میں آپ کو وہ منظر دکھاسکتی یا میں کوئی رائٹر ہوتی تو الفاظ سے تصویر تیار دیتی ”لگا رہی جھکائے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے جب میں طواف والی جگہ پہنچی تو نظرس اٹھا میں سبحان اللہ سامنے خانہ کعبہ اتنی روشنی نور آسمان اتنا شفاف اور اتفاقاً ”چودھویں رات چاند کی اور چاند مانو اتنا قریب کہ ہاتھ بڑھا کر چھو لیں وہ سیاہ چمکیں خلاف میں اللہ کا گھر“ یہی نظر کعبہ پر اور بے شمار دعائیں میں نے یاد کی تھیں کہ یہ سب اللہ سے مانگوں گی۔ کسے ہوش تھا سارا جسم لرز رہا تھا اور آنسو بے تحاشا رواں بنا نہیں سکتی ہمارا کیا حال تھا۔“

3- خواتین ڈائجسٹ سے تعلق آپ یقین کیجئے خواتین ڈائجسٹ سے میرا تعلق اپنی ماں کی گود میں شروع ہو گیا تھا میری ماں جی تمام ڈائجسٹ اور بے شمار ہر قسم کی کتابیں پڑھتی ہیں۔ اور لکھتی بھی ہیں تو میری واحد سہیلی ہونے کے علاوہ ابھی بھی مجھے کتابیاں سناتی ہیں آپ حیران ہوں گے کہ آپ کے رسائل میں جیسے والی تمام سلسلہ وار کتابیاں اور رائرز کو میں بچپن سے جانتی ہوں جیسے وہ بھی ہمارے خاندان کے ممبر ہوں مجھے آپ کی تمام رائٹرز سید ہیں اور عمیرہ احمد بہت زیادہ ”پچھلے دنوں قسط وار کہانی“ ”میرے ہم سفر“ ”بہت پسند تکی۔“ ”محبت خواب سفر“ کے انجام کا انتظار ہے۔

4- میں سالگرہ بہت شوق سے مناتی ہوں مگر پہلے ہم چاروں بابا جانی ”ماما“ بھائی اور میں سالگرہ بہت اچھی طرح مناتے تھے باہر کھانا بلا گھا اور فرمائشیں مجھے ہیشت بہت اچھے گفت لے ہیں گفت میں مجھے اپنا لپ ٹاپ پسند ہے مگر مجھے جو تحفہ زیادہ پسند ہے وہ ایک انگوٹھی ہے۔ (کوئی غلط فہمی نہ ہو) ایسا ہے کہ میرے بابا جانی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری انٹارویس سالگرہ پر مجھے میری پسند کی انگوٹھی لے کر دیں گے مگر تین سال پہلے ہارٹ پر ایلم اور

پاپی پاس کے بعد میرے بابا جانی ہمیں اس بے رحم دنیا میں تنہا چھوڑ گئے تب سب کچھ بدل گیا۔ لوگوں کے انداز لیجے برتاؤ بہت کچھ ”میں“ تفصیل میں جانا نہیں چاہتی پھر میری سالگرہ آئی تو میرے دل میں یہی تھا کہ اب کون میرے لاڈ اٹھائے گا؟ بہرل دعائیں دینے والا ہمارا بابا جانی۔ اب تو ایسے میں میری پچھو جانی نہ جہیں آنکھیں اور بہت سے گفت اور سوئے کی انگوٹھی بابا جان کے وعدے والی تو پچھو نہ جہیں کا گفت میرے لیے بہت اہم ہے یہ تحفہ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔

5- شاعری میں مجھے غالب، میر انشا، جی اور بہت سے شاعر پسند ہیں بہت سی دوسری کتابوں کے ساتھ ”پیر کامل“ دوبارہ پڑھی اور اس سال تفسیر ابن کثیر پڑھ رہی ہوں۔ پسندیدہ شعر

عز میں ہر جہوم میں اس کو تلاش کرتا ہوں  
وہ اک شخص جو اپنی ہی ذات میں غم ہے

ناہید مقصود جگر انوالہ

1- ہم ماشاء اللہ نو بہن ”بھائی“ ہیں۔ تین شادی شدہ، تین منگنی شدہ اور تین کی طرف سے راوی ابھی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ ان تین تین میں سے ایک میں ہوں ناہید، مگر سب بے بی کہتے ہیں۔ تعلیم سہیل گریجویٹیشن آگے نہ پڑھنے کی بہت سی وجوہات ہیں سب سے بڑا ریزن ہوش رہا۔ باہر کوئی خاص نہیں بس رسالے پڑھنے کا جھک ہے جس کی وجہ سے اسی جان اکثر کہتی ہیں رسالے کو ایسے چننی ہے جیسے صبح پیر ہو۔

2- خوبیاں میرے خیال میں ”میں“ ذمہ دار ہوں بات کی تہ تک فوراً ”ناچ جاتی ہوں اور مزید فریڈنی نیچر کی مالک ہوں۔ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا انسان کو اسی وقت پتہ چلتا ہے جب وہ اپنا محاسبہ کرے میں ”جلد باز“ ٹھوڑی سی اسٹوڈی اور منہ پھٹ ہوں۔ اچھی عادت نماز وقت پر پڑھنا اور گھر آئے مہمانوں سے خوش اخلاقی سے ملنا۔ باپ کی نظر میں سمجھ دار ہوں اور بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ میں خوش رہتی ہوں اور مسکراہٹ میرے لبوں سے جدا نہیں ہوتی۔

3- خواتین ڈائجسٹ اپنا ذاتی 2005ء سے باقاعدہ لیتا شروع کیا میں کتابیوں کے ناموں سے زیادہ رائٹرز کے

نام یاد رکھتی ہوں۔ میری سب سے پسندیدہ رائٹرز فاروقی، رخسانہ جی اور راحت جہیں ہیں۔ ان کی تحریریں میں پڑھے بغیر اچھی ہونے کی ضمانت دے سکتی ہوں۔ اور انیسہ جی کی کیا بات ہے وہ آنکھیں اور چھانکیں۔ فروری 2008ء میں چھپنے والی ان کی تحریر کے صفحہ نمبر 261 تا 258 میں نے اتنی بار پڑھے ہیں کہ ہر بار پڑھنے سے دل میں ایک عجیب سی درد کی لہر اٹھتی ہے۔ عزیزہ سید کی تحریروں میں کوئی نہ کوئی پوائنٹ ایسا ضرور ہوتا ہے جو ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

4- گرمیاں مجھے بہت بری لگتی ہیں۔ اسبب شعلی گرمیوں کی راتوں میں پوری ٹیلی کے ساتھ کٹے آسمان تلے سوٹا بڑا جان جو کھوں کا کام ہے اور دن میں بار بار لوڈ شیڈنگ پر کیا کریں ہماری قسمت 30 منی فل گرمی میں ہماری اس دنیا میں تشریف آوری ہوئی۔ سب بہن بھائی وش کرتے ہیں مگر باپ کا گفت سب سے اچھا اور زبردست ہوتا ہے۔ بھائی جان کو یاد دلاتی ہوں آج میری سالگرہ ہے تو بڑی سنجیدہ شکل بنا کر کہتے ہیں۔ ”بہت افسوس سالگرہ ہے بہت افسوس ہوا تمہاری زندگی کا ایک سال اور گزر گیا۔“

5- شاعری میں مجھے علامہ اقبال جی کی ”دعا“ جو اسکولوں میں پڑھی جاتی ہے بہت پسند ہے اور گھر میں اکثر میرے لبوں پر رہتی ہے۔ بھابی شاعری میں مجھے سلطان باہو کی کافیاں بہت پسند ہیں۔ یہ سوچ و فکر کا درد کرتی ہیں ان کو پڑھتے ہوئے انسان کسی اور دنیا میں چلا جاتا ہے۔

چڑھ چٹاں تے کر روشانی ذکر کریندے تارے ہو گلیاں وچ پھرن نمائے لعلال دے و نبارے ہو شالا کوئی مسافر نہ تھیوے کھکھ جنہاں توں ہمارے ہو تاڑی مار اڑا نہ باہو اسال آئے اڑن ہارے ہو اس سال میں نے کتاب ”آپ کو عمر“ پڑھی ہے۔ اس کتاب کو سب بہنوں کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کتاب کو پڑھنے سے درد پاک کی فعالیت گاہ پتہ چلتا ہے۔ اللہ ہم سب کو کثرت درد پاک پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)



دنیا کا کوئی بھی انسان جذبات و احساسات سے خالی نہیں۔ نرم و نازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول فطر رنگ نہ جاتا ہے اسی طرح اظہار کے بغیر جذبات کھلے نہیں رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا یہ راز ہے کہ کوئی ہو اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوب صورت ذریعہ۔ اکثر طویل شعروں کو بھی آپ کے احساس کو اس طرح واضح نہیں کپاتی جو محض ایک شعر کہتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ ”اے“

یہ تو میرے دل میں تھا۔“  
زندگی کی طویل و صوب چھاؤں میں بہت سی یادیں بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بن کر، کبھی لب پر پھول کھلائے۔ اپنی ان یادوں میں ہمیں بھی شریک کیجئے مگر صرف منہ پر اے میں یہ کوئی شعر بھی ہو سکتا ہے، نظم بھی اور غزل بھی۔ اس ماہ سے ہم آپ کے لیے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں ”روشن حرف وہ سارے“

سوالات ہیں۔

- (1) شعر جو اکثر آپ کے لبوں پر رہتا ہے؟
- (2) شعر، نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟
- (3) کسی نے آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟
- (4) وہ غزل جو آپ سب سے زیادہ پسند کرتے ہو؟
- (5) کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

## روشن حرف وہ سارے

عمرانہ کوثر

عمرانہ کوثر۔ حاصل پور

انسان کی زندگی خوابوں سے مژزن ہے۔ جس میں ہر انسان اپنی خواہشات کے آئینوں کو سنا رہا ہے۔ کھلتے رنگوں سے خوشبوؤں سے پھولوں سے چاندنی سے اور نکتے ہی دھنک رنگوں میں بارشوں میں کھیتے ہوئے زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ انسان کی بہت ساری خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں اور بہت سی ادھوری رہ جاتی ہیں۔ انسان موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کاش اسے بھی خواہشات اور جذبات کے اظہار کا موقع مل جائے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں  
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے  
تو مجھے بھی آج اظہار کا موقع ملا ہے تو یہ سہری موقع  
کیوں ہاتھ سے جانے دوں مگر آپ کسی کو بتائیے گا  
میت۔ کیونکہ آپ تو ہماری رازدواں ہیں۔

1۔ ”اے۔۔۔ یہ کیا پوچھ لیا آپ نے۔“ کوئی بات راز بھی رہنے دیا کریں۔ یہ تو راز کی بات ہے جو میں کسی کو نہیں بتاتی۔ چلیں آپ سے کیا پوچھ ”آپ تو ہماری اپنی ہیں۔“ اپنوں سے کیا چھپانا کہاں کا راز۔ اپنوں سے تو ہر بات شہر کر لیتے ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انسان دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہے اور وہ بے اختیار انسان کے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں لیکن اگر بات شعر و شاعری کی ہو تو خوب صورت لفظوں میں اسے جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ مجھے گلوکارہ ناسید اختر کی گائی ہوئی غزلیں بے حد پسند ہیں ان کی سر ملی آواز میرے دل کے تاروں کو چھوکتی ہے ان کی گائی ہوئی غزل کے یہ اشعار مجھے بے حد پسند ہیں اور میں انہیں اکثر گنگنائی رہتی ہوں۔

جس طرف آنکھ اٹھاؤں تیری تصویراں ہے  
نہیں معلوم خواباں ہے کہ تعبیراں ہے  
یاد کرتی ہوں خیالاں میں تیری باتاں کو  
اب تیرا پیار میرے پاؤں کی زنجیراں ہے

2۔ میں تو علامہ اقبال کو ہی زیادہ جانتی ہوں باقی شعرا کو کم ہی جانتی ہوں۔ مجھے اقبال کے سنگڑوں شعر زبانی یاد ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ان کی شاعری سے بے حد شوق ہے۔ حالانکہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اقبال کے اشعار یاد نہیں ہوتے مگر مجھے جو شعر یاد ہو جائے وہ دوبارہ بھول نہیں

ہے۔ میں نے ریڈیو پر اقبال کی یہ نظم گائیکی کے انداز میں سنی تھی جو مجھے بے حد اچھی لگی۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دامن  
مجھ کو پھر انھوں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن  
پھول ہیں صحرا میں پریاں قطار اندر قطار  
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیر بن  
برگ گل پر رکھ گئی تھنم کا موتی بادِ ج  
اور چمکانی ہے اس موتی کو سورج کی کرن  
حسن ہے پروا کو اپنی بے نقالی کے لیے  
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن  
اپنے من میں ذوب کر پا جا سراغِ زندگی  
تو اگر میرا نہیں بننا نہ بن کہنا تو بن  
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں  
تن کی دولت چھاؤں ہے آنا ہے دھن جاتا ہے دھن  
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات  
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن  
3۔ ناں ہی ناں ہماری شخصیت اتنی دلکش متاثر کن اور

جاذبِ نظر کہاں۔ کہ لوگ ہمیں دیکھ کر ہم شعر پڑھیں بلکہ مجھے ہی لوگوں پر اسے سداھے اشعار کہنے کی عادت ہے اور اس طرح لوگوں کو تنگ کرنے میں مزا آتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ مجھے اقبال کی شاعری بے حد پسند ہے مجھے اقبال کی کتابوں اور ان کے حالات زندگی کو تفصیل سے پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں نے اردو میں ماسٹر کیا ہے۔ اردو میرا من پسند سبجیکٹ ہے جب میں اسٹوڈنٹس کو اردو پڑھاتے ہوئے تشریحات میں اقبال کے اشعار لکھواتی ہوں تو لڑکیاں اور بچے بھی کہتی ہیں کہ ”آپ تو اقبال کی دیوانی ہیں“ اور میں سوچ میں پڑ جاتی ہوں اور کہتی ہوں کہ

”کہاں اقبال کی — شخصیت اور کہاں میں بندہ“

4۔ جدید شعرا میں ناصر کاظمی بھی ایک باپور نام ہے۔ بہت سے لوگ ناصر کاظمی کے دیوانے ہیں۔ مجھے گلوکارہ (گل) مبارک بانو شاید تصور خانم کی آواز میں ناصر کاظمی کی یہ غزل بہت اچھی لگتی ہے۔  
دل میں اک لہری اٹھی ہے ابھی  
کوئی نازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانہ دل میں  
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا  
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا  
ہم سخن تیری خاموشی ہے ابھی

یاد کے بے نشان جزیروں سے  
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شر کی بے چراغ گلیوں میں  
زندگی چھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اس حویلی کے  
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یادو ابھی سے اٹھ بیٹھے  
شر میں رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر  
غم نہ کر زندگی بڑی ہے ابھی

5۔ کلاسیکی شاعری کے متعلق میں زیادہ نہیں جانتی اور نہ انٹرنٹ ہے۔ بس صوفی تبسم کے چند اشعار ہی میرے ذہن کی اسکرین پر رہے ہیں۔ وہ میں آپ کو بھی سنا دیتی ہوں۔

سو بار چمن مکامو بار بار آتی  
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تھالی

ہر درد محبت سے ابھتا ہے غم بہتی  
کیا کیا ہمیں یاد آیا جب یاد تیری آتی

”روشن حرف وہ سارے“ اس خوب صورت اور دلکش سلسلے سے رخصت ہونے کو دل ہی نہیں کرتا۔ دل چاہتا ہے کہ اس میں مزید رنگینیاں بکھیرتی ہی جاؤں۔ مگر میں امید اور ناامید کی نگاہ میں ہوں کہ نہ جانے آپ کو میرا انتخاب اچھا لگے گا یا نہیں۔ چلیں میں امید کے سارے پورے باوجود شکر ہوں گی۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔



## کلیان شلوغ

فاطمہ ثانی

کیا واقعی دنیا گول ہے؟

ہم اس دھرتی کا گز بنے اور ہر حکمت میں گھوڑے دوڑائے لیکن ہمیں تو ہر چیز چھٹی ہی نظر آئی۔ دنیا سے زیادہ گول تو ہم خود ہیں کہ بیکنگ سے لڑھکتے ہوئے پیرس پنچ گئے اور کوپن ہیگن سے پھسلے تو کوپن میں اگر کے بلکہ "جا کرنا" پنچ کر دم لیا۔ دنیا کے گول ہونے کا اقرار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یقین نہ ہو تو مشرق کی طرف سے جاؤ چکر کاٹ کر مغرب کی طرف سے پھر اپنے تھان پر آکر کھڑے ہوں گے اس میں ہمیں پیشہ ایک بڑی خطرہ نظر آیا ہے کہ کہیں گولائی کی طرف رہتے ہوئے نیچے ہی نہ گر پڑیں کیونکہ ہم کوئی چھیلی تھوڑی ہی ہیں۔

اس لڑکے کا قصہ آپ نے سنا ہو گا کہ آدھ سیر تیل لینے کے لیے کٹورالے کر گیا تھا کٹورا تھا چھوٹا بھر گیا تو دکان دار نے کہا۔

"باقی کس چیز میں ڈالوں؟"

برخوردار نے کٹورا اووندھا کر کے کہا۔

"اوہر پینڈے کے حلقے میں ڈال دو۔"

پینڈے اوپر کر کے گھر گیا ماں نے کہا۔

"بیٹا! میں نے آدھا سیر تیل لانے کو کہا تھا بس اتنا سا؟

بس کی؟"

اس دانش مند نے اسے بھی الٹ کر کہا۔

"اوہر بھی تو ہے۔"

(دنیا گول ہے! ابنِ انشاء)

شکیلہ اسلم، نکانہ صاحب

عشق اور عقل

شاعری، گلوکاری اور اداکاری کی طرح عشق کرنا بھی فنونِ لطیفہ میں سے ایک ہے۔ دنیا میں تین قسم کے عاشق ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خود کو عاشق کہیں دوسرے وہ جنہیں لوگ عاشق کہیں اور تیسرے وہ جو عاشق ہوتے

عیادت

اس زمانے کے انداز عیادت میں کوئی دل نوازی ہو تو ہو میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں۔ ایک حساس دائم الریض کے لیے مزاج اچھا ہے، ٹیک رمی یا دعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی حملہ ہے جو ہر بار اسے احساس کسری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں تو آئے دن کی پرسش حال سے اس قدر بے زار ہو چکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کر دیا ہے کہ جب تک میں بقلم خود یہ اطلاق نہ دوں کہ آج اچھا ہوں مجھے حسب معمول بیماری بھیجیں اور مزاج پری کر کے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیں۔

(مشاقق یوسفی کی "چراغ تلو" سے اقتباس)

شامین، حنا مین، عینودیا کو

ہم کتنے بے وقوف ہیں؟

کسی گناہ گار نے اللہ تعالیٰ سے جنت اور دوزخ دیکھنے کی درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کے حوالے کر دیا، فرشتے اسے دوزخ میں لے گئے، دوزخ ایک بہت برا ڈانٹنگ حال تھا۔ جس میں شان دار کرسیاں لگی تھیں اور ان کرسیوں پر انتہائی لاغر، کمزور اور بد قیوت لوگ بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے سوپ کے برے برے پیالے رکھے تھے اور ان لوگوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چمچے تھے۔

گناہ گار نے دیکھا، ان لوگوں کی کہنیاں نہیں ہیں اور یہ لوگ اپنے بازو تہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ لوگ پیالے سے چمچ بھر کر پیتے ہیں، چمچ کو منہ تک لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سوپ ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے ہی ان کے کرسیاں پر گر جاتا ہے، وہ صدیوں سے سوپ پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن چمچ ان کے ہونٹوں تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔

فرشتے اسے وہاں سے جنت میں لے گئے۔ یہ بھی ایک بہت برا ڈانٹنگ حال تھا، اس میں بھی لوگ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے بھی سوپ کے پیالے رکھے تھے۔ لیکن یہ لوگ انتہائی صحت مند، خوب صورت اور مطمئن تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنس کھیل رہے تھے، گناہ گار نے فرشتوں سے جنت اور دوزخ کا فرق پوچھا تو فرشتے بولے۔

"ان لوگوں کے بازوؤں میں بھی کہنیاں نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس کا بڑا دلچسپ حل نکال کیا ہے، یہ پیالے سے چمچ بھر کر پیتے ہیں اور یہ چمچ اپنے ہمسائے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں اور ہمسایہ اپنا چمچ ان کے منہ میں چنانچہ دونوں کی بھوک مٹ جاتی ہے۔"

وہ گناہ گار واپس آیا اور اس نے اہل دنیا کو بتایا۔

"جنت اور دوزخ میں صرف عمل کا فرق ہوتا ہے، دوزخ کے لوگ اپنا چمچ اپنے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ جنتی اپنے پیالے سے چمچ بھر کر پیتے ہیں دوسرے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔"

میں نے گناہ گار کی بات سنی تو مجھے اس وقت معلوم ہوا۔ وہ جنت جسے ہم آسمانوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں وہ جنت زندگی بھر ہماری ڈانٹنگ ٹیبل پر بڑی رہتی ہے۔ ہم نے بس ایک چمچ بھرنا ہے، یہ چمچ اپنے ہونٹوں میں بیٹھے محض کے منہ میں ڈالنا ہے اور اللہ کا قرب پا جانا ہے۔

بس اتنی سی بات ہے۔ لیکن ہم اتنی سی بات کے لیے عمر بھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ ہم بھل کے بچے کو ہزاروں میل کے میلے میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔

ہم کتنے بے وقوف ہیں۔

(جاوید چوہدری، زیرِ پوائنٹ) سے انتخاب

انعمتی صدیقی

بشیریدر

راجندر سنگھ بیدی کی باتیں بہت دلچسپ اور بے ساختہ ہوتی تھیں۔ ایک بار دہلی کی ایک محفل میں بشیریدر کو کلام سنانے کے لیے بلایا گیا تو بیدی صاحب نے جو میرے برابر بیٹھے تھے۔ اچانک میرے کان میں کہا۔

"یار! ہم نے دبدب، ملک بدر اور شمر در تو سنا تھا یہ بشیریدر کیا ہوتا ہے؟"

(جبقی حسین کی کتاب "سوپہ وہ بھی آدمی" سے اقتباس)

حمید اعجاز لاہور





خواتین اور باورچی خانہ کے درمیان ایک انٹ رشہ ہے۔ باورچی خانے میں رونق ہو تو گھر کے افراد خوش نظر آتے ہیں۔ ایک صاف ستھرا کچن خاتون خانہ کی خوش سلیقگی کا مظہر ہے۔  
 کھانا کانا بھی ایک آرٹ ہے۔ ذائقہ زیادہ کھی یا جھینے مسالوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ ذائقہ صحیح تناسب سے پیدا ہوتا ہے۔ کھانا پیش کرنے کا انداز بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سادہ سے ڈال چاول بھی اجار، چٹنی، مسالا پانچ کے ساتھ سلیقے سے پیش کیے جائیں تو سب خوش ہو کر کھاتے ہیں۔  
 خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ سے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔  
 - سوانات یہ ہیں -

- 1 کھانا پکانے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند غذا، آہستہ گھروالوں کی صحت۔
- 2 گھر میں اہانک مہمان آگئے ہیں کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے تواضع کر سکیں۔
- 3 کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟
- 4 صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی رہے۔
- 5 گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بننا جا رہا ہے آپ مینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) سب سے ساگر پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔
- 6 کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مد نظر رکھتی ہیں؟
- 7 اچھا کھانے کے لیے کتنی محنت کی تاکل ہیں؟
- 8 کچن کی کوئی ٹپ بتو، یا چاہیں؟
- 9 ان بات کے جوابات بھیجوا اگر آتے۔ بھی اس سلسلہ میں شرکت کر سکتی ہیں۔ ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔ (تصویر پوری نہیں ہے)

## آپ کا باورچی خانہ

### آسیہ آفتاب

#### آسیہ آفتاب لاہور

1- میں کھانا پکاتے وقت اپنے خاندان کے کل پانچ افراد کی پسند ناپسند غذا، آہستہ گھروالوں کی صحت کا مکمل خیال رکھتی ہوں۔ میرے میاں بعض دالیں، آلو، گدوئی اور بھنڈیاں نہیں کھاتے۔ بچے بھنڈیاں اور دال چاول شوق سے کھاتے ہیں۔ میں میاں صاحب کے لیے الگ سے ان کی پسند کی ڈش بنالیتی ہوں۔ اور بچوں کے لیے ان کی پسند پر مشتمل کھانا تیار کرنا مجھے بہت بہت اچھا لگتا ہے۔ تاہم غذا آہستہ کا پہلو بھرور طریقے سے پیش نظر رہتا ہے۔ جہاں تک صحت کا تعلق ہے تو اگر گھر کے کسی فرد کو زلہ زکام ہو

تو اس کے لیے بخنی بنائی ہوں اسی طرح اگر کسی کے پیٹ میں درد ہے تو اس کے لیے کھجور یا دلیہ بناتی ہوں۔ بعض اوقات دسترخوان پر موجود پانچ افراد کے لیے الگ الگ نعمتیں موجود ہوتی ہیں مگر خوشی اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتے ہوئے میں ان کی پسند پوری کرتی ہوں۔  
 2- گھر میں اگر اچانک مہمان آجائیں تو اکثر کباب اور شامی نکلیاں فریئر میں تیار موجود ہوتی ہیں تاہم فوری تیار کرنے کے لیے میں مرغ پلاؤ کا انتخاب کرتی ہوں۔

### مرغ پلاؤ

|           |          |
|-----------|----------|
| اشیاء و۔  | نمک      |
| حسب پسند  | چاول     |
| ایک کلو   | چکن      |
| ایک کلو   | زیرہ     |
| حسب ضرورت | کالی مرچ |
| حسب ضرورت | لوہک     |

دار چینی  
 لہسن  
 تیل  
 ادراک  
 ہری مرچ  
 آلو چوس بنانے کے لیے  
 حسب ضرورت  
 بیس جوئے  
 حسب پسند  
 مٹی بھر  
 دس عدد

آلو کے فنگر چوس بنا کر کڑائی میں تلنے کے لیے رکھ دیں۔ دوسرے چوسے پر ادراک اور لہسن کھی میں فراٹی کر لیں پھر اس میں دھلا ہوا خشک چکن ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ بعد ازاں نمک پیسی ہری مرچ اور تمام مسالے ڈال کر دو اور بھونیں۔ اب اس میں چاولوں کی کوالٹی اور اپنے تجربے اور مہارت کے حسب سے پانی ڈال کر ابل لیں۔ ایک دو ابل آنے پر چاول ڈال دیں۔ جب دھلگائیں تو اوپر فنگر چوس ڈال دیں۔ دم آنے تک مزے دار سا راستہ تیار کر لیں۔ نہایت مزے دار اور منفرد ذائقے والا پلاؤ تیار ہے۔

4- چکن میں موجود تمام برتن ترتیب سے رکھتی ہوں۔ فرش اور دیواروں کو فائل پانی میں ملا کر دھوتی ہوں۔ ہر جگہ اور کچن میں موجود ہر چیز کو صاف ستھرا اور ترتیب سے رکھنا میرا مشغلہ ہے۔ ان کاموں کے لیے خواہ کتنی دیر گری میں چکن میں رہنا پڑے ڈر اگر ان نہیں گزر تا۔ میرا تعلق پنجاب کے شہر لاہور سے ہے اور میری پنجابی ثقافت میرے چکن میں ہر جگہ مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ دودھ پلو بننے والی دہائی، پھوٹا سا لکڑی کا چرخہ ہاتھ سے پانی نکالنے والے نکلے کا ماڈل، رنگین اور خوب صورت چٹکیریں مٹی کے برتن، چھوٹا سا جھجھ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں میرے چکن کی نہ صرف تزینت بڑھاتی ہیں بلکہ میرے گھر آنے والے ہر فرد کی توجہ کا مرکز بھی بنتی ہیں۔

4- موسم اور اپنے موڈ کے اعتبار سے مختلف چیزیں بناتی ہوں۔ کبھی سینڈویچ اور چائے، کبھی پرائے، کبھی دلیہ اور کبھی ہاتھ کی بنی ہوئی سویاں۔ چٹنی والے دن پر تکلف ناشتے کا اہتمام ہوتا ہے جن میں آلو بھرے، قیمہ بھرے پرائے شامل ہوتے ہیں تاہم کبھی کبھی بازار سے نان پنے یا کھوہ پوری بھی منگواتی ہوں۔ خصوصی ناشتہ آہلیٹ پرائے

ہے جس کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔

### آہلیٹ پرائے

عام پرائے کی طرح پڑے بنائیں اور آہلیٹ کا آمیزہ اپنی پسند سے بنائیں۔ پرائے کا پتلا تیل کر توے پر ڈالیں۔ آٹھ دھیمی رکھیں۔ جب پرائے کا ساک جاتے تو پیچھے سے آہلیٹ والا آمیزہ پرائے پر اچھی طرح پھیلا دیں۔ جب پکنا شروع ہو تو دونوں طرف کھی لگا کر کبھی آٹھ پر خستہ اور سرخ کر لیں۔ نہایت لذیذ اور منفرد پرائے تیار ہوں گے وہی کے ساتھ یا اجار کے ساتھ بہت مزہ دیتے ہیں۔

5- گھر سے باہر کھانا کھانا اگرچہ فیشن بننا جا رہا ہے مگر میں اور میری فیملی اس فیشن کا حصہ اپنی زندگی میں ایک حد تک ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ سب سے بڑی بات معیار اور اعتبار کی ہے۔ پرائے میں وہ حلال حرام، صفائی اور آلودگی کا خیال رکھتے ہیں یا محض دعوے ہی کرتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھار ساگر پر یا اگر کچھ پکانے کا موڈ نہ ہو تو باہر سے بھی کھا لیتے ہیں۔ بعض اوقات بچوں کی فرمائش پر بھی چلے جاتے ہیں۔

6- بالکل موسمی تقاضوں کو مد نظر رکھتی ہوں۔ سردیوں میں گرم مزاج والے کھانے پکانے کو ترجیح دیتی ہوں مثلاً ساگ، گوشت پائے وغیرہ جبکہ گرمیوں میں ٹھنڈے مزاج والی سبزیاں اور دالیں منتخب کرتی ہوں۔ ہمارے معتدل تاشیروالے کھانوں کو ترجیح دیتی ہوں۔

7- محنت، محنت اور محنت کی قائل ہوں۔ جتنی محنت کریں گے۔ نتیجہ اسی حساب سے بہترین ہوگا مثلاً دار ہوگا۔ خاندان کا دل اور معدہ آپ کی مٹی میں ہوگا۔

8- اپنے چکن کا ہر کام خود کریں۔ تمام مسالا جات خود پیس، گندم، دھو کر خود پھوٹائیں، سرخ مرچیں خود پیس۔ دلیہ کھی گھر میں خود بنائیں۔ اپنے بچوں، شوہر اور دیگر افراد خانہ کے لیے اتنے پیار، محبت، محنت اور اسلامی اصولوں کے مطابق صفائی سے تمام چیزیں خود تیار کریں کہ آپ کے گھر کا ہر فرد آپ کے ہاتھ کے پکوان کا پابند رہے جی کہ سوائے آپ کے ہاتھ کی بنی چائے کے وہ کہیں سے چائے بھی پسند نہ کریں۔

بہترین ٹپ یہ ہے کہ جو عورت عصر کی نماز قضا نہیں کرتی اس کے ہاتھ میں بہت لذت اور ذائقہ ہوتا ہے۔



# عید کی کھانا

## خالہ جیلانی

سویاں اتار لیں اور دُش میں نکال کر اوپر سے بادام پستے سے  
سجا کر پیش کریں۔

### ملائی لٹو

ضروری اجزاء :

کنڈینسڈ ملک  
پنیر  
دو تین قطرے  
پیارا رنگ  
الائیچی پاؤڈر  
چاندی کا ورق  
آدھی پیالی  
آدھا پاؤ  
دو تین قطرے  
چار یا پانچ قطرے  
دو چٹکی  
ایک عدد

عید موقع ہوتا ہے خوشیاں بانٹنے کا۔ گلے شکوے دور  
کرنے اور آپس کے معاملات خوشگوار بنانے کا۔ نئے  
رنگوں کے پیراہن خوشی سے کھلے چہرے سال بھر کی  
تھکاوٹ دور کر دیتے ہیں۔ بات خوشی کی ہو تو سترخون کا  
بہنا شرط ہے اور عید تو ہوتی ہی کھانے پینے کے لیے ہے۔  
خصوصاً بچے پورا رمضان دن گن گن کر عیدی اور مزے  
مزے کے پلوں کا انتظار کرتے ہیں۔ تو آپ بھی اپنے  
سترخون کو ہمارے منفرد ذائقوں سے خاص بنائیے۔  
آزما ئیے آپ ہی نہیں مہمان بھی خوش ہو جائیں گے۔

### سویاں کا زورہ

ضروری اجزاء :

سویاں باریک  
کھجی  
چینی  
الائیچی  
زعفران  
کیوڑہ  
بادام  
پست  
شکرشیر  
آدھا پاؤ  
تین چھٹانک  
تین چھٹانک / حسب ذائقہ  
سبز آٹھ یا دس  
چوتھائی تولہ  
کھانے کے چار چمچے  
آدھی چھٹانک  
چوتھائی چھٹانک  
چند دانے

ترکیب :

چینی میں ایک پاؤنی ڈال کر قوام تیار کر لیں۔ سبھی میں  
الائیچی ڈال کر کڑکڑائیں اور شکرشیر کے دانے ڈال دیں پھر  
سویاں ڈالیں۔ جب سویاں سرخ ہو جائیں تو چینی کا تیار  
شدہ قوام شامل کر دیں اور آٹھ بالکل ہلکی کر دیں۔ جب  
سویاں گل جائیں تو کیوڑہ میں زعفران ڈال کر پیس لیں اور  
ساتھ الائیچی پیس کر ملائیں۔ یہ سب کچھ سوویں پر ڈال کر  
دم پر لگا دیں اور بادام کی کری اور پستہ کو باریک کاٹ لیں

### بیف چائٹز رول

ضروری اجزاء :

گوشت (پسنڈے)  
اورک  
(باریک چوپ کی ہوئی)  
پیاز  
(بڑی چوکور ٹکڑے کاٹ لیں)  
لہسن  
آدھا کلو  
کھانے کا ایک چمچ  
ایک عدد  
کھانے کا ایک چمچ



بند کر بھی  
کاجر (کدو کش کی ہوئی)  
ہری پیاز (چوپ کی ہوئی)  
تیل  
سویا سوس  
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)  
پودینہ (چوپ کیا ہوا)  
ہری مرچیں  
نمک  
سیاہ مرچ پاؤڈر  
چائٹز نمک  
روٹی ٹی  
تیل (گھنے کے لیے)  
ترکیب :

آدھی پیالی کٹی ہوئی  
آدھی پیالی  
ایک چوتھائی پیالی  
کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

کھانے کے تین چمچے  
کھانے کا ایک چمچ  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے دو چمچے  
کھانے کے تین چمچے  
حسب ذائقہ  
چائے کا آدھا چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ضرورت  
حسب ضرورت

چائٹز نمک ڈالیں۔ بھون کر بند کر بھی  
کاجر 'ہرا دھنیا' ہری مرچیں ڈال کر دو منٹ دم پر  
رکھیں۔ ٹھنڈا کر کے رول پیٹ میں بھر کر رول بنائیں اور  
گرم تیل میں درمیانی آگ میں جل لیں۔ مزیدار چائٹز  
بیف رول تیار ہیں۔

### لفیڑ بوٹی اسٹک

ضروری اجزاء :

مرخی کا گوشت (بغیر ہڈی)  
(کیوبز کئے ہوئے)  
دہی  
اورک ہلسن پیسٹ  
اچھو پاؤڈر  
سرخ مرچ پاؤڈر  
نماؤنیری  
نمک سیاہ مرچ پاؤڈر  
کارن فلوور  
انڈا

آدھی پیالی

کھانے کا ایک چمچ

چائے کا ڈیڑھ چمچ

چائے کا ایک چمچ

کھانے کا ایک چمچ

حسب ذائقہ

کھانے کے دو چمچے

ایک عدد



تیل  
شملہ مرغ (بج نکال کر کیور کاٹ لیں) ایک عدد

### ترکیب :

مرغی کے گوشت کو دھو کر خشک کر کے اس میں دہی، لہسن، اورک پیسٹ، پھوڑا پاؤڈر، سرخ مرچ پاؤڈر، نمائو پری، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر اور کاربن فلور ڈال کر ایک دو گھنٹے کے لیے میسرینٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ فراننگ پن میں تیل گرم کر کے اس میں میسرینٹ کیے ہوئے گوشت کے کیور ڈال کر ہلکی آنچ پر ہلکا سنرا ہونے تک تھیں اس کے بعد گوشت کو فراننگ پن سے نکال کر اسے ٹکڑی کی سیخوں میں اس طرح بروس کریں کہ گوشت کے درمیان میں شملہ مرغ کے کیور بھی شامل کرتی جائیں اور دوبارہ فراننگ پن میں ڈال کر (سیخوں سمیت) گوشت کو سنری مائل ہونے تک تھیں مزید ارچن بونی اسٹک تیار ہے سرونگ ڈش میں نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

### اسپانسی منس اسپگینی

### ترکیب :

اسپگینی کو اگلنے پانی میں 5-7 منٹ کے لیے اہل لیں۔ یہاں تک کہ ایک گنی رہ جائے اس کے بعد چھلنی میں ڈال کر گرم پانی گرا کر ٹھنڈا پانی گزار دیں اور اس میں کھانے کا ایک پیچہ تیل ملا کر اسپگینی کو پالے میں نکال لیں۔ تیل گرم کر کے اس میں پاؤڈل کر سنری مائل کر کے اس میں اورک، لہسن، پیسٹ ڈال کر ایک منٹ تک فرائی کریں۔ قیمہ، دہی، نمک، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر، ثابت دھنیا، گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر بھجھیں۔ تقریباً 5-4 منٹ تک اس کے بعد ڈھکن ڈھانپ کر دہی آنچ پر اتار لیں کہ قیمہ اپنے ہی پانی میں گل جائے۔ اس کے بعد اچھی طرح بھون کر خشک کریں اور ہرا دھنیا ڈال کر مکس کر کے اتار لیں۔ اسپگینی میں مکھن ملا کر ایک ڈش میں چاولوں طرف اسپگینی ڈال کر درمیان میں قیمہ ڈالیں۔ لیوں، نمائو کے سلائس اور زیتون سے گارنش کریں اور پیر چھڑک کر گرم گرم سرو کریں۔ چائیں تو پیر ڈال کر گرم اودن میں 5 سے 10 منٹ رکھ کر سرو کر سکتے ہیں۔

### ضروری اجزاء :

اسپگینی  
تیل  
قیمہ (مشین کا)  
پاؤڈر (چوپ کی ہوئی)  
دہی  
اورک لہسن پیسٹ  
لال مرچ پاؤڈر  
نمک  
ہلدی پاؤڈر  
گرم مسالا پاؤڈر  
زیرہ پاؤڈر  
ثابت دھنیا (کٹا ہوا)  
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)  
مکھن  
پیر (کدو کش کیا ہوا)  
سیاہ زیتون  
لیوں نمائو (سلائس کاٹ لیں) ایک ایک عدد

### بلیک فارسٹ کیک

### ضروری اجزاء :

میدہ  
کو کو پاؤڈر  
بیککنگ پاؤڈر  
شکر  
انڈے  
وینا ایسینس  
کریم (چھینٹ لیں)  
چاکلیٹ (کدو کش کریں)  
چیری (تھنار کر چوپ کریں)  
شوگر سیرپ  
ترکیب :  
میدہ، بیککنگ پاؤڈر اور کو کو پاؤڈر کو ایک ساتھ ملا کر دو مرتبہ چھان لیں۔ اب ایک برتن میں پانی گرم کریں۔ اس اگلنے ہوئے پانی میں حرارت برداشت کرنے والا برتن رکھ کر اس میں انڈے، وینا ایسینس اور شوگر گاڑھا ہونے

تک پھینٹ لیں اب اس میں چھنا ہوا میدہ اور کو کو پاؤڈر اور تھوڑا سا پانی ڈال کر ذرا گاڑھا پیسٹ تیار کریں۔ اب کیک ٹن کو ٹیل لگا کر چھننا کریں اور اس میں یہ کیک والا پیسٹ ڈال کر پہلے سے گرم اودن میں 200 پر 20 منٹ تک کے لیے بیک کریں۔ اب کیک کو اودن میں سے نکال کر گولائی میں کیک کو ایک مرتبہ کانٹیں تاکہ دو گول حصے حاصل ہو جائیں کیک کی چلی تہ پر شوگر سیرپ چھڑک کر اس کے اوپر تھوڑی سی کریم پھیلا دیں۔ اب گرم کر کے اوپر تھوڑی سی چاکلیٹ اور چوپ کی ہوئی چیزیں ڈال کر پھیلا دیں۔ اب اس کے اوپر کیک کی دو سری تہ رکھ کر پہلے شوگر سیرپ پھر کریم اس کے بعد چاکلیٹ اور آخر میں چیزیں ڈال کر پھیلا دیں اب کیک کے اوپر کریم اچھی طرح پھیلا دیں۔ کیک کے اطراف اور باہر ایک کدو کش کی ہوئی چاکلیٹ لگائیں۔ کریم کے اوپر پائپنگ سے پھول بنائیں اور ان کے اوپر چیزیں رکھ کر سجائیں۔

### بروسٹ بریانی

### ضروری اجزاء :

مرغی  
نمک  
چاول  
سرکہ  
اورک پیسٹ  
سیاہ مرچ پاؤڈر  
چالنیز نمک  
پھری پاؤڈر  
لال مرچ پاؤڈر  
انڈا  
ڈبل روٹی کا چورا  
کاربن فلور  
ثابت گرم مسالا  
نمائو کاٹ لیں)  
ہری مرچیں  
ہرا دھنیا  
پودینہ (کاٹ لیں)  
لال مرچ پاؤڈر

دھنیا پاؤڈر  
ہلدی پاؤڈر  
دہی  
پیاز  
تیل  
زرے کارنگ  
کیوڑا

### ترکیب :

نمک لے پانی میں چاول ڈال کر ایک گنی رہنے تک اہل لیں۔ اس کے بعد چاولوں کو تھنار کرانگ رکھ لیں۔ مرغی کو دھو کر خشک کریں اور اس کے اوپر نمک، سرکہ اورک پیسٹ، سیاہ مرچ پاؤڈر، چالنیز نمک، پھری پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، انڈا، ڈبل روٹی کا چورا، کاربن فلور لگا کر تھوڑی دیر کے لیے رکھیں۔ کرانٹی میں تیل گرم کریں۔ اس میں مسالے لگے گوشت کے ٹکڑے ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھپ فرائی کریں اور ہلکا سنرا ہونے پر نکال کر ایک طرف رکھ لیں۔ ایک سوس پن میں تیل گرم کریں اس میں پاؤڈل کر سنری مائل کریں۔ پھر اس میں ثابت گرم مسالا، نمک، نمائو، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، پودینہ، لال مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر اور دہی ڈال کر بھون لیں۔ خوب اچھی طرح بھن جائے تو اس میں فرائی کیے ہوئے گوشت کے ٹکڑے ڈال کر 5 منٹ تک دم پر رکھ دیں۔ بروسٹ مسالا تیار ہے ایک دہی میں تھوڑا تیل گرم کریں۔ اس میں پہلے سے تیار کیے ہوئے چاول کی ایک تہ لگائیے۔ اس کے اوپر بروسٹ مسالے کی تہ لگائیے اور آخر میں بقید چاولوں کی تہ لگا کر چاولوں پر زرے کارنگ اور کیوڑا ڈالیں۔ آخر میں ایک دھنیا ہوا کوئلہ اسٹیل کی کٹوری میں رکھ کر چاولوں کے اوپر رکھیں اور اس پر چند قطرے تیل پکا کر ڈھکن کو مضبوطی سے بند کر دیں۔ کچھ دیر بعد مزیدار بروسٹ بریانی تیار ہوگی۔

### مردوق کی شخصیت

ماڈل :- بشری  
میک اپ :- روز بیوٹی پارلر  
ٹرانسپورٹ :- موسیٰ رضا



مجموعہ کلام  
شاعر  
پبلشرز  
قیمت

یہ وسائل تبسم (مزاحیہ شاعری)  
شوکت جمال  
خون دوست  
400 روپے

جس گھر میں ہماری رہائش ہے، اس میں ہم تو کم رہتے ہیں، ہماری کتابیں زیادہ رہتی ہیں، جس پر ہمارے گھر والوں کا خیال ہے کہ ہم نے اچھے بھلے گھر کو جابلوں کا گھر بنا رکھا ہے۔ ویسے گھر والوں کا ہی کیا کتنا، یوں بھی جسے دیکھو یا تو مواخذہ کرنا چاہتا ہے یا محاسبہ، اب یہ اپنے اپنے مقدور کی بات ہے کہ گھر والوں کے ہاتھ ہم لگتے ہیں تو ہمارے ہاتھ کتاب۔

سو ہم نے بھی مواخذہ اتنی یا محاسبہ اتنی صلاحیت کو کتابوں پر ہی آزمائے گا فیصلہ کیا، اس پر ہمارے بھی خواہوں نے مشورہ دیا کہ محاسبہ کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم نے ان کی تسلی کرانے ہوئے کنا کہ ہم صرف اور صرف سرکاری زبان بولیں گے۔ بس وہ دن ہے اور آج کا دن۔ اکثر تقریب رونمائیوں میں ہماری خود نمائی یعنی رونمائی ہونے لگی ہے۔

خیر شوکت جمال کی نیک طبعی کہ انہوں نے اس دفعہ بھی ہمارے لبوں پر تبسم بکھیرنے کے لیے ”وسائل“ کا بندوبست کیا ہے۔

ورنہ تو وسائل تقلم نے اچھا خاصا شور شرابہ کر رکھا ہے۔ گلی کی لڑاکا عورتوں کی طرح تبسم ہی معززین نے بولنا سیکھ لیا ہے، چاہے انڈیا رساں اخبار کا کوئی صفحہ کھول لیں یا ریویٹ اٹھا کر کوئی بھی بے رحم جینٹل لکالیں اور پھر دور کیوں جائیں شوکت جمال کی تازہ کتاب کے اوراق پلٹے بغیر غائب نہیں ہو سکتے۔ ایک جوان کو چھوڑ کر باقی تیرہ جوان ناطق کسی نہ کسی طرح بولنے میں لگے ہیں۔ کوئی گھٹار سے بول رہا ہے، کوئی پستول سے کوئی لاؤڈ اسپیکر سے

تو کوئی کپیڈ ٹرے۔

یہ ساری بے معنی آوازیں شور میں بدل رہی ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ کوئی کسی کی نہیں سنا چاہتا، خوفزدہ ہے کہ کہیں انعام و تقسیم کی راوند نکل آئے، سو انسان مشین سے قربت بڑھا رہا ہے کہ ان دونوں میں بہت مضبوط رشتہ استوار ہو چکا ہے کہ اب پتہ نہیں چلتا کہ وہ کتنے فیصد انسان رہ گیا ہے اور کتنے فیصد مشین، بلکہ انسان تو کم اور مشین زیادہ۔ ایک بات اور سامنے آئی کہ اس سائنس فیک دور میں ربوٹ نے بھی انسان بننے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے ہیں۔ ہم نے، ہم نے، ہم نے انسان سے مکمل انسان بننے کا بھی ارادہ ترک دیا ہے کہ ہم نے ہنسنا چھوڑ دیا ہے اور جو قوم ہنسنا چھوڑ دے تو سمجھ لیں وہ ہاتھ پیر چھوڑ چکی ہے کہ جو ہو سو ہو۔

دم غنیمت ہے ان کا جو غم کے دھاروں میں بننے کے لیے قوم کو تھپا چھوڑنے کی بجائے قوم کا ہاتھ پکڑ کر اس میں موبائل کھانچے ہیں۔ یقین جانیں کم سے کم ریت میں اعلا درجے کے مزل کی تخلیق رو من میں ہو رہی ہے۔ عدم توازن کی شکار قوم، پینٹس پیچھے اور وٹولے میں لگی ہوئی ہے۔

خیر ایہ تو ہیں ہمارے یہاں کے حالات۔ جس میں کوئی بھی مزل کو شاعر اچھا بھلا طنز گو بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لیے شوکت جمال خالص مزاح کے لیے وسائل و اسباب اکٹھا کرنے معاشی وطن نکل جاتے ہیں۔ جب لوٹتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں ہوتے۔

”یہ وسائل تبسم“ شوکت جمال کا تیسرا مجموعہ ہے، یوں تو عرفانہ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ”جو، بھل، کھڑ، خریف، مسخرو غیر۔“

شوکت جمال کے اس مجموعے میں موضوعات کی وسعت تو ضرور ملتی ہے۔ مگر اس وسعت میں شرارت، شوخی سمیت کر تبسم بن کر لبوں پر بکھر جاتی ہے۔ دلی دلی مسکراتی ہوئی کیفیت سے دل کی کلیاں چٹک چٹک جاتی ہیں

البرٹ راب نے مزاح کے سلسلے میں لکھا ہے کہ۔ ”مزاح کے تبسم میں ترحم شامل ہوتا ہے، جس پر وہ طعن کرتا ہے اس سے اس کو محبت ہو جاتی ہے۔“ اور ہمارا کہنا ہے کہ مزاح کو شاعر خود پر طعن کرتا ہے تو پڑھنے والے کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔

شوکت جمال کے اس مجموعے کی پوری فضا میں مضحکہ خیزی کی بجائے زندگی اور زندہ دل کے مختلف پہلوؤں کی ہنسی بولتی وہ تصویریں نظر آتی ہیں۔ جیسی ہم جی رہے ہیں۔ ان کی ظرافت میں وہ خوشگوارت ہے جو عام انسانی تجربوں پر مبنی ہے۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو سے لطافت کو پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

دور خوف سے تبسم کے آگے کچھ نہیں کہتے بکی ہو دل بھی گھر میں تو ہم مری سمجھتے ہیں مسلسل غیر حاضر ہے جو بھٹی رو تو اہل دل اگر دیکھیں کوئی جگنو، اسے بجلی سمجھتے ہیں فتنے سوال اٹھاتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ ”صرف انسان ہی کیوں ہنستا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہی اتنے شدید مصائب جھیلتا ہے کہ اس کو ہنسی ایجاد کرنا پڑی۔“ اب اسے حالات دیکھیے، اپنے حالات بدلنے والوں کے حالات دیکھیے، پھر شوکت جمال کا شعور کہ وہ شعر میں یوں دھلا ہے۔

جتنے ممبر بنے اسمبلی کے  
ان میں اکثر ہوئے ہیں منصب دار  
جن کے صحنے میں کچھ نہیں آیا  
روڈ پر آگے چلے آخر کار  
اور پھر یہ شہر آشوب کا ما جرا دیکھیے کہ شاعر ظریف  
محض طرفانہ آنکھ ہی نہیں رکھتا، ایک گدا زل بھی رکھتا

”قل، ڈاکے، چوریاں ہیں رات دن لیکن یہاں بے غنیمت اپنی جانیں گر بھا لیتے ہیں لوگ روشنی کا شہر اس کو اس گے کہتے ہیں ہم بام و در پر خوف کی شمعیں جلا لیتے ہیں لوگ آخر میں شوکت جمال کو مبارک باد کہ انہوں نے خوش رنگ شاعری کو بالخصوص خوب رنگ اور ارق میں لپیٹ کر پیش کیا کہ محض کتاب کو دیکھ کر بھی خوش ہوا جا سکتا ہے، اب آپ منتظر رہیں کہ وہ اگلی بار آئیں تو ایک اور کتاب لائیں گے، یہیں کہ صاف صاف ان کا کہنا ہے کہ۔

قلم روشنائی نہیں چھوڑ سکتے  
پڑھائی کھائی نہیں چھوڑ سکتے

☆ ☆ ☆

مجموعہ کلام  
شاعر  
پبلشرز  
قیمت  
کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں  
ارشاد ملک  
میل ہاؤس آف پبلیکیشنز  
150

ارشاد ملک نوجوان شاعر ہیں۔ ”کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں“ سے قبل دو مجموعے آچکے ہیں اور زیر تبصرہ مجموعہ کا تیسرا ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

ارشاد ملک کا کہنا ہے کہ ”بارش میری کم زوری ہے“ جب آسمان اپنی رنگت بدلتا ہے تو میں اپنے سب کام چھوڑ کر بارش کی رم بھم اور ڈھلکی شام کی خاموشی کو صفحہ قرطاس پر اُتارنے لگتا ہوں۔“

بارش کی رم بھم کی طرح ارشد ملک کی شاعری میں یادیں اسی طرح کن من پر پڑتی ہیں کہ شاعر ہمہ وقت اس چھوار میں بھینکتا رہتا ہے بارشیں، یادوں کے رنگ کے ساتھ مکمل دل کر شاعر کے مزاج کا پتہ دیتی ہیں۔

اور پھر ڈھلکی شام کا اسرار، جب دن کے اجالوں پر مہیب سناٹے، گھبراندہ صرے چھانے لگتے ہیں اور ان ستاروں میں دنیا داری کہیں دور رہ جاتی ہے اور شاعر اپنی وحشتوں سمیت تھم رہا جاتا ہے۔

جیسے جیسے شام ڈھلے گی  
دل کی وحشت اور بوسے گی  
لبی سیاہ رات میں یادوں کے سلسلے  
ایسے عذاب آنکھ پر اترے بھی نہ تھے  
اور پھر یاد سے ہی منسلک یہ قلم

تری یادیں  
کسی مقصد کی پوچھی سی  
جنہیں ہم پاس رکھتے ہیں  
جنہیں محفوظ رکھتے ہیں  
جنہیں سب سے چھپاتے ہیں  
جنہیں ہم روز گنتے ہیں

ارشاد ملک اپنے شعری سفر میں عزم تازہ سے آغاز کرتے نظر آتے ہیں۔ کہ ان کا سفر جاری ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے جو صلہ مند ہیں۔





کیونکہ میں اس گانے کی سچی تعریف سننے کا خواہش مند تھا۔ اس گانے پر آرڈی برمن نے دل سے محنت کی۔ کمار سانو نے کئی روز اس کی ریسرچ کی جب فائنل ریکارڈنگ کے لیے آیا تو آرڈی برمن نے محض اس لیے ریکارڈنگ سے انکار کر دیا کہ کمار سانو گندے جیلے میں بغیر شیونائے جیلے آئے تھے۔ گانا اسی وقت ریکارڈ ہوا جب وہ مکمل تیار ہو کر آئے۔

### اداکار کم میزبان

وسیم اکرم نے کرکٹ کی دنیا میں اتنا نام کمایا کہ آج بھی لوگ ان جیسا پورے کی خواہش رکھتے ہیں۔ لیکن اسے ان کی خواہش کہیں یا کیا کہ وہ پیچھے دیکھنے کے بجائے آگے اور آگے نکلنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے کبھی ماڈلنگ کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی ٹیلی ویژن کی دنیا میں جھنڈے گاڑتے۔ لیکن اس مرتبہ انہوں نے ”یار کر“ سے اپنے تمام ہم عصروں کو گلین بولڈ کر دیا ہے۔ کیونکہ اب وہ بھارتی چینل کے ایک ریٹیلنس شو ”ایک کھلاڑی ایک حینہ“ میں سابقہ حینہ عالم مشہور سٹین کے ساتھ میزبانی اور منصف کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں۔ ”اگرچہ ایکٹنگ بہت مشکل کام ہے لیکن میں بالی ووڈ کے بھی اداکار سے زیادہ اچھی اداکاری کر سکتا ہوں (بحیثیت بار بھی آپ نے اداکاری کے کم جو ہر نہیں دکھائے) مجھے یہاں ماڈلنگ اور میزبانی کی ہی نہیں فلموں میں کام کی آفرز بھی ہو رہی ہیں۔ لیکن میں سوچ کچھ کر فیصلہ کروں

یوٹی بی بیان کرنے سے باز نہیں آتے۔ چاہے ان کے سامنے کتنا ہی مستند روایت کار کیوں نہ ہو۔ کبھی وہ ایک کوٹا راض کرتے ہیں تو کبھی دوسرے کو۔ شعیب منصور کے بعد اب انہوں نے اپنی غیر مستقل مزاجی سے اداکارہ ریمیا خان کو بھی خفا کر دیا ہے۔ اسی لیے ان کی فلم ”تنتی حسین ہے زندگی“ کے ہیرو اب شان کے بجائے معمر رانا ہیں۔ معمر رانا جو ان کی پہلی فلم ”کوئی تجھ سا کہاں“ کے ہیرو بھی تھے اس فلم کے لیے بے حد ہرجوش ہیں۔ شان کا کہنا ہے کہ ”والدہ کی ناسازی طبیعت کے باعث میں ریمیا کی فلم میں کام نہیں کر پایا۔ بس کا مجھے بے حد قلق ہے۔“ اس پر ریمیا کا موقف یہ ہے کہ ”میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے شان کی والدہ کی طبیعت مزید خراب ہو اور وہ ساری زندگی مجھے کوستے رہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم ابھی سے درست فیصلہ کر لیں۔“ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مستقل کامیابی نے شان کے حواس سلب کر لیے ہیں اس لیے وہ اپنے آگے کسی کو کچھ گروان نہیں رہے۔ نہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی رانگی لاپتے رہیں اور سننے اور دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔

### نغمہ نگار

تخلیق کار کی دنیا بالکل الگ ہوتی ہے۔ اسے لفظوں اور جذبات کی فضا میں سانس لینے کی عادت ہی ہوتی ہے۔ ایک کے بعد ایک کردار لفظوں کے قالب میں ڈھل کر منظر عام پر آتا ہے اور سننے اور پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ فلموں کے مقبول شاعر جاوید اختر اپنے فن کے حوالے سے کہتے ہیں ”میں نے زندگی میں بھی نہ سوچا تھا کہ میں بحیثیت شاعر نام کمائوں گا۔ 1979ء میں مجھے لیش چوپرا نے اپنی فلم کے لیے گانا لکھنے کی فرمائش کی اور ان کی ضد پر ہی مجھے اس میدان میں قدم رکھنا پڑا۔ رات بھر کی عرق ریزی کے بعد میں نے سلسلہ فلم کا گانا ”دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے“ لکھا۔ جو آؤٹس کو بھی بے حد پسند آیا اور میں اسکرپٹ رائٹر سے نغمہ نگار بن بیٹھا۔ لیکن میری زندگی کا یادگار ترین نغمہ ”لوا سنوری 1942ء“ کا مشہور گانا ”ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا“ ہے۔ جسے میں نے اپنی بیگم کی تعریف میں لکھا تھا۔ شان کو سچے سنو رہے دیکھ کر جس خیال نے جنم لیا اسے میں نے کاغذ پر منتقل کر دیا

## خبریں و بے

### غزل مر

ایلیج پر بلو الیا۔ میری جان پر بن آئی۔ میں نے اس وقت ”روشن جمال یار سے“ گالی جو راک — سے تھوڑا ہٹ گئی۔ ابائے سب کے سامنے مجھے جھڑکتے ہوئے کہا ”شرم کرو روکو۔“ غلط بات بالکل برداشت نہیں کرتے۔ ایک دفعہ آؤٹس کے سامنے غلط گانے پر پتھر بھی پڑ چکا ہے۔ وہ بحیثیت باب انتہائی شفیق انسان ہیں لیکن استاد بننے کی غلطی درگزر نہیں کرتے۔“

(ج ہے با ادب با نصیب اور بے ادب بے نصیب)

### غیر مستقل مزاجی

شان کا بھی جواب نہیں۔ وہ اپنے ہر انداز سے اپنی



### استاد

سُر چگانے کا فن ہر کسی کو نہیں آتا۔ عمدہ گائیکی تک بہت کم گلوکار پہنچتے ہیں۔ شہنشاہ غزل ممدی حسن کے صاحبزادے آصف ممدی کو اس میدان میں کئی سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب بھی وہ اپنے آپ کو طفل کتب سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں ”اگرچہ مجھے اس شعبے میں بائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن میں اس مقام کو نہیں چھو سکتا جس پر اب موجود ہیں۔ میں نے اسی کی گالی ہوئی غزلیں گا کر پہچان بنائی ہے۔ میرے ہر شو میں ان کی گالی غزلیں اور گیت شامل ہوتے ہیں۔ ہر وقت مجھے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ میں آؤٹس کی توقعات پر پورا اتروں اور ایسا کہ نام پر حرف نہ آئے۔ ایک مرتبہ بیرون ملک پروگرام میں ابائے اچانک مجھے گانے کے لیے





**Butterfly®**  
**LONG**

ڈریس ڈیزائنرز کا ڈیزائن کردہ واحد نیپکن

آپ کے لباس کو آرام دہ بنانے میں ڈریس ڈیزائنرز اہم کردار ادا کرتا ہے

اسی لئے ہم نے ہر فلائی **LONG** نیپکن کو ماہر ڈریس ڈیزائنرز سے ڈیزائن کرایا ہے

جنہوں نے ہر فلائی **LONG** نیپکن میں اس طرح اضافہ کیا ہے کہ یہ استعمال میں انتہائی آرام دہ ہو اور آپ میں سائڈ لیج کا کوئی امکان نہ ہو۔

ونگ والے ہر فلائی **LONG** نیپکن میں پلپ کے ساتھ ہائی ایئر ب جیل بھی استعمال کیا گیا ہے تاکہ بھاری دنوں میں دو نیپکن کی جگہ ایک ہی نیپکن بھر پور جذب کر کے مکمل تحفظ فراہم کرے۔

**Butterfly... Protection you can trust...**



Noorah

بنائی لیتا ہے۔ مشکل سے مشکل رکاوٹ بھی رہ میں حاصل نہیں ہوتی۔ موسیقار کم گلوکار احمد جاناں سب پرستاروں کا وسیع حلقہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں "مجھے بچپن سے موسیقی کا جنون تھا۔ اگرچہ میرے بچپن کے زمانے میں اس شعبے کو عزت کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تھا تاہم میرے والد نے میری گانوں کو دیکھتے ہوئے موسیقی کے تمام آلات اور ساز فراہم کر دیے جس نے میرے شوق کو مزید جلا بخشی۔ مجھے ہارمونیم بجانے کا شوق ہے۔ میرے والد نے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ واقعی تم اس میں دلچسپی رکھتے ہو۔ میں نے کہا "ہاں۔" انہوں نے میری جو بھی سالگرہ پر مجھے ہارمونیم تحفہ دیا۔ لیکن موسیقی کی تعلیم کا شوق مجھے از خود ہوا۔ نو سال کی عمر میں میں نے "احمد جاناں سب دی ونڈر بوائے" کے نام سے پہلا اہم پیش کیا جس میں اس دور کے لحاظ سے صرف بی ٹی تھے۔ چونکہ بچپن سے مجھے لاپاک معاشرت حاصل تھی اس لیے اسٹیج پر گانے کی جھجک اور شرم دور ہو گئی۔ میں بارہ سال کی عمر میں اسٹیج پر گیت غزل اور کلاسیکل پر گانا گاتا تھا۔ اس لیے میں لایو پرفارمنس میں پر اعتماد نظر آتا ہوں۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ اللہ نے میری فیلڈ کے قدردان لوگوں سے میرا واسطہ پڑوایا۔ جنہوں نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا اور ہر طرح سے مدد کی۔

(خیر محنت اور لگن ہو تو اچھے اچھوں کو کامیابی مل جاتی ہے اور آپ کے پاس اس کی بالکل کمی نہیں۔)



گا۔" (دستیم صاحب! ازرا سنبھل کے کرکٹ میں آپ کو سنبھالا رہیے والے اپنے ٹیوٹو تھے۔ غیر تو پھر غیر ہوتے ہیں انہیں آنکھیں بدلتے دیر کتنی لگتی ہے۔ کہیں حسدوں کے جھرمٹ میں آپ کو منہ کے بل ہی نہ گرنا پڑ جائے۔)

**خوش بختی**

قسمت اگر مہربان ہو جائے تو کم عمری میں بھی جھنڈے گاڑتے دیر نہیں لگتی۔ ہالی وڈ اداکاراں سن بھی "میری پوٹر میریز" کے کردار سے ایسی ہی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ پرستار انہیں اصل نام سے زیادہ "ہامنی گرنجر" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ "میں دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی ہوں جس پر قدرت نے کم عمری میں ہی کامیابیوں کے در کھول دیے۔ میں نو سال کی عمر سے فلم اسکرین کا حصہ ہوں اور اب میری عمر 18 سال ہے۔ اگرچہ کہ اپنا مقام بنانے کے لیے یہاں پر بے حد جدوجہد کرنی پڑتی ہے لیکن سب مجھے ابھی بھی اسی طرح سلوک کرتے ہیں جیسے میں چھوٹی سی بچی ہوں۔ میرے پرستار مجھے پہچانتے ہیں تو مجھے بہت اچھا محسوس ہوتا ہے اور یہی چیز مجھے مزید بہتر کام کرنے پر مجبور کرتی ہے تو (راتوں رات شہرت شاید آپ جیسے لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔)



**شوق**

باصلاحیت شخص ہر جگہ کسی بھی حالات میں اپنا مقام



انسانی ذہن کے دو حصے ہیں۔ (۱) شعور (۲) لا شعور۔

جب کسی چیز کا خیال بغیر اسے دیکھنے ہمارے ذہن میں موجود ہو اور ہمیں اس کے متعلق سب کچھ معلوم ہو اور اس کا پورا اور اک ہو اسے شعور کہتے ہیں اور لا شعور صرف وہ خیالات ہیں جو ذہن میں موجود ہوں مگر ان کی موجودگی کا علم شعوری طور پر نہ ہو۔ لا شعور ہمارے ذہن کا وہ تاریک گوشہ ہے جس کے بارے میں ہمیں شعوری طور پر کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ فرائڈ نے شعور اور لا شعور کے اس فرق کو فوگرائی کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔ جب فوگرائی جاتا ہے تو سب سے پہلے Negative بنتا ہے۔ پھر ان نیگیشنوں میں سے جو پسندیدہ ہوں انہیں پوزیشنوں میں تبدیل کر کے فوگرائی جاتی ہے۔ اسی طرح خیالات کی بھی لا شعور میں چھان بین ہوتی ہے جو خیالات صحیح ہوں۔ انہیں شعور میں آنے کی اجازت ملتی ہے۔ لا شعور میں جو نا پسندیدہ، متضاد، سرکش اور آوارہ خیالات رہتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح شعور میں آتے رہتے ہیں۔ نارمل حالت میں صحت مندی کی حالت میں شعور کو لا شعور پر سوتے جاتے دونوں کیفیتوں میں مکمل کنٹرول ہونا چاہیے، لیکن بعض اوقات وہ خیالات لا شعور سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انسان ذہنی توازن کو ہینٹتا ہے اور غیر معمولی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جاسکتے وقت جو باتیں شعور میں ہوتی رہتی ہیں سوتے وقت انسانی شعور غافل ہو جاتا ہے تو یہ کئی روپ دھارتی ہیں، کبھی خوابوں کی شکل میں اور کبھی نیند میں چلنے کی حالت میں۔



روایت

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چند لوگوں کے درمیان بالکل اعتماد سے نہیں ہول سکتی۔ اور خصوصاً اگر کوئی مہمان وغیرہ آجائیں تو میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور ہاتھ پاؤں واضح طور پر کانپنے لگتے ہیں۔ مہمان تو خیر دور سے آتے ہیں۔ میں اگر اپنے محلے میں کسی کے گھر اکیلی چلی جاؤں تو مجھ سے بات نہیں ہوتی اور کسی سے بات کرتے ہوئے میرے حلق میں پھندا سا لگ جاتا ہے۔ اگر کوئی ہنس دے تو میری بہت بڑی حالت ہو جاتی ہے۔ بات کرتے ہوئے میرے پاس الفاظ ختم ہو جاتے ہیں۔ ویسے اکیلے میں میں سوچتی ہوں کہ مجھے یہ کتنا چاہیے تھا یہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن سب کے سامنے میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ کلاس میں میڈیم کوئی سوال کرتی ہیں تو مجھے اس کا جواب معلوم ہوتا ہے لیکن جیسے ہی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ میں جواب دوں گا تو فوراً ہی میرا دل زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور اگر کبھی بتانے کے لیے کھڑی ہو جاؤں تو منہ سے ٹھیک سے الفاظ ادا نہیں ہوتے پھر کے عضلات تک پھڑکنے لگتے ہیں۔ میں بہت کم کہیں آتی جاتی ہوں۔ میرے سر کے بال بہت کم ہیں اور مسلسل جھڑتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے بالکل ہی کہیں نہیں جاتی۔ ہمارا ایک کزن ہے جو اکثر ہمارے گھر آتا جا رہتا ہے۔ خصوصاً اس کے آنے پر تو میری بہت بڑی حالت ہو جاتی ہے۔ کھانا وغیرہ کھاتے ہوئے میں ہاتھ اوپر اٹھاتی ہوں تو میرا ہاتھ کانٹے لگتا ہے اگر وہ کچھ ہوتا ہے تو مجھ سے کوئی جواب نہیں دیا جاتا اور اگر بولتی ہوں تو میرے منہ میں پانی بہت آتا ہے جس کی وجہ سے میرے حلق میں پھندا لگ جاتا ہے۔

پلیئر نڈان بھائی اچھے کوئی ایسا مشورہ یا کوئی ایسی دہانتیں کہ میرا دل غیر معمولی طور پر نہ دھڑکے میرے عضلات میرے قابو میں رہیں خصوصاً پھر کے عضلات۔

ج۔ ایک مشورہ ہر نفسیات کہتا ہے کہ اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ میں ذہنی بیماری یا جسمانی بیماری میں سے ایک کو قبول کر لوں تو میں جسمانی تکلیف کو قبول کر لوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جسمانی بیماریاں کچھ عرصے کے بعد ٹھیک ہو

جائیں گی لیکن ذہنی بیماریوں سے چھٹکارا پانا خاصا مشکل ہوتا ہے اور خاص طور پر ایسے میں بھی کہ مریض اپنے جسم کے علاوہ پر تو توجہ دیتا ہے لیکن ذہنی علاج پر نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو اعصابی پہچان شروع ہو جاتا ہے جس کو مریض سمجھ نہیں پاتا لہذا اختلاص قلب شروع ہو جاتا ہے گھبراہٹ شروع ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ مریض یا نفسیاتی مریض ہو جاتا ہے یا سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

جو نفسیاتی بیماریاں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں ان میں ایک بیماری اعصابی تناؤ بھی ہے۔ اعصابی تناؤ سے چھٹکارا پانے کے لیے آپ گھرے اور لیے لیے سانس لیں اور اس عمل کو تین سے پانچ منٹ تک کریں۔ تازہ ہوا اور ملکی ورزش بھی اعصابی تناؤ کا علاج ہے۔ مختلف تقریبات میں جانے سے۔ بھی اعصابی تناؤ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اچھی اور پسندیدہ کتب اور رسائل کا مطالعہ بھی اعصابی تناؤ پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے۔

رومنہ بمن آپ تو مندرجہ بالا ہدایات پر عمل کریں اور ممکن ہو تو خط کے ذریعے اطلاع دیں کہ کون سا طریقہ کار آپ کے لیے سب سے زیادہ سودمند رہا اور کس وقت اور کن حالات میں آپ نے کون سا طریقہ اپنایا۔

زیریں۔ کراچی

میرے بھائی کی عمر دو سال سے عجیب حالت ہے۔ ہر وقت خاموش رہتے ہیں۔ سارا دن بے مقصد کاموں میں گزارتے ہیں۔ زیادہ تر وقت صفائی میں گزارتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تولیہ پر ذرا سا میل تو کیا کوئی معمولی سی شے گرا دشت نہیں کرتے، تولیہ الٹنی پر اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا ایک بھی کونہ اوڑھنا نہیں ہوتا۔ بالی چیزوں کا بھی یہی حال ہے۔ کنگھا، چشمہ، اپنے کھانے کے برتن اور ضرورت کی دوسری چیزیں یہاں تک کہ پہلے کپڑے وغیرہ استعمال شدہ جوتے اور پرانے اخبار رسالے ہر چیز اپنی ترتیب کے لحاظ سے بالکل اسی حالت میں رہے سارا دن یہی سب کرتے گزرتے گزرتے جاتے ہیں۔ ہفتوں گزر جاتے ہیں۔ کسی سے بات نہیں کرتے ہم لوگ اس کی آواز تک نہیں سنتے۔ ہم صرف وہ سن بھائی ہیں والد اور والدہ صاحبہ بھی ان کی وجہ سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ والد صاحب کی بیکری ہے اور بھائی بھی وہیں پر کام کرتے ہیں لیکن دوکان پر صرف شام کو سات بج جاتے ہیں۔ رات کو ہمیشہ دیر سے گھر واپس آتے ہیں۔ تقریباً دو تین بجے تک۔ گھر میں واپس آکر پھر وہی کام شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح روزانہ چار بج جاتے ہیں۔ جب نہیں وہ سوتے ہیں اور دوسرے دن پھر وہی معمول دوکان پر بھی یہی سب ہوتا ہے چاہے گاہک کھڑے رہیں۔ لیکن یہ اپنے کام میں مگن۔ سب کے کہنے پر ایک جگہ نسبت طے کر دی ہے۔ لیکن طبیعت میں معمولی سا فرق نہیں آیا ہے۔ شادی پر تیار ہیں لیکن کسی خوشی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ نے ہمیں زیادتی تو بات نہیں طے کر دی۔ لیکن آپ جانتے زیادتی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دو سال پہلے صحت قابل رشک تھی لیکن اب صحت بھی ٹھیک نہیں۔ بھوک بہت کم لگتی ہے۔ رنگ پیلا رہ گیا ہے۔ جو شخص کسی سے بات نہ کرے اور نہ ہی مذاق کرے۔ بتائیے اس کا کیا عالم ہوتا ہے۔ گھر میں ایسے رہتے ہیں جیسے کسی سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ مشورہ دیجیے کہ ایسی حالت میں ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہیے۔ نڈان بھائی ایک میٹانزم سے اس کا علاج ممکن ہے اور یہ کہاں پر ہوتا ہے اور اس کیس کے بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کا باقاعدہ علاج ہو۔

ج۔ ماہرین نفسیات کی رائے میں کسی شخص سے ماضی میں کوئی ایسی بات گناہ دانستہ یا نادانستہ سرزد ہو جائے تو اس سے شعوری اور لا شعوری طور پر ایسی حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں۔

پہلے تو تحلیل نفسی کے ذریعے اس بات کا کھوج لگانا ہو گا کہ اس کے پس عکس کیا بات ہے کیا حرکت ہے۔ اس کا پتہ چلایا جائے تو پھر اسے اس بات کا یقین دلانا ہو گا کہ اس سے جو بات حرکت سرزد ہوئی اس میں اس کا کتنا قصور ہے یا وہ بالکل بے قصور ہے۔

آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہمارے ہاں میٹانزم سے بھی علاج ہوتا ہے۔ جو لوگ ایسی بات کہتے ہیں یا اس قسم کے وعدے کرتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ عطائی ہیں بلکہ دھوکہ باز بھی۔

کراچی میں کئی اسپتال ہیں جہاں نفسیاتی مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ آپ اپنے بھائی کو وہاں دکھادیں اور اس کے بعد مجھے خط لکھ کر آگاہ کریں۔





### مست کلر سیدال

ہیں۔ میرے منہ پر نہیں ابڑ کے دانے لکھے پھر وہ ٹھیک نہیں ہوئے اب میری عمر 20 سال ہے۔ لیکن یہ دانے ختم ہونے کے بجائے سارے چہرے پر پھیل گئے ہیں۔ میری جلد بہت چکنی ہے مسام بھی کھل گئے ہیں۔ کیل بھی بہت ہو گئے ہیں۔ بہت سے نئے آزمائے ایک طبی نسخہ سے میرے دانے تو کم ہو گئے ہیں لیکن مسام اور کیل ٹھیک نہیں ہوئے۔ مسام سارے چہرے پر پھیل گئے ہیں اور ان میں کیل بھی ہیں۔ یہ کالے ہو رہے ہیں۔ جہاں دانے ختم ہوئے وہاں داغ دھبے بھی بن گئے ہیں۔ پلیز ناجی! مجھے ایسا نسخہ بتائیں جس سے دانے دوبارہ نہ لگیں اور مسام بھی بند ہو جائیں۔ دوسرا یہ کہ مجھے منہ پر خارش بھی ہوتی ہے۔ اور منہ پر وقت سرخ اور سوجا ہوا رہتا ہے منہ سوجا ہونے کی وجہ سے میں اپنی عمر سے بڑی لگتی ہوں۔ میں کمزور میں رہتی ہوں گوئی آسان نسخہ بتائیں؟

ج۔ آپ کا سب سے بڑا مسئلہ جلد کا چکنا ہونا ہے۔ جلد چکنی ہو تو چہرے کے مسام کھل جاتے ہیں اور اس کی بنا پر کیل مسام سے ہو جاتے ہیں۔ منہ پر خارش بھی ہے۔ اور چہرہ سوجا رہتا ہے۔ یہ الرجی کی وجہ سے ہے اگر گاؤں میں — دوائیں دستیاب ہوں تو ایٹنی الرجی استعمال کریں۔ اگر ڈاکٹر ہو تو اس سے مشورہ بھی کر لیں۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے نظام ہضم کا خیال رکھیں بہت ساری بیماریاں پیٹ کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں۔ چکنی مرغن اور تلی ہوئی اشیاء کا استعمال ترک کر دیں۔ کیل سبزیاں اور پھل زیادہ استعمال کریں۔ قبض نہیں ہونا چاہیے۔ جلد کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ دنانہ میں کم از کم تین مرتبہ صابن اور نیم گرم پانی سے منہ دھو لیں۔ منہ دھونے کے بعد چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے ماریں۔ چہرے پر کسی قسم کی کریم وغیرہ ہرگز نہ لگائیں۔ کیل یا بلک ہیڈ کو بھی بھول کر بھی خود انگلیوں سے دبا کر یا کھروچ کر نہیں نکالیں ایسا کرنے سے مستقل طور پر دھبے پڑ جاتے ہیں اگر آپ کے سر میں خشکی ہے تو اس کا علاج کریں کیونکہ کیل مساموں میں خشکی کی وجہ سے شدت بڑھ جاتی ہے۔ جذباتی تناؤ، جلنا، کڑھنا غصہ، جلن بھی کیل مساموں کا ایک سبب ہے اپنے ذہن کو پرسکون رکھیں۔

- 1۔ روزانہ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک لیروں کارس ملا کر پیئیں۔
- 2۔ روزانہ دن میں دو دفعہ صابن اور صاف پانی سے چہرہ دھو کر سفید پھنگری کا ایک ٹکڑا لگیا کر کے چہرے پر ملیں۔ اس سے مسام بڑی جلدی ٹھیک ہو جاتے ہیں اگر آپ نے ان ہدایات پر عمل کیا تو جلد ہی نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

جب بات ہو  
درم و ملائم جلد کی  
... تو پھر سوچنا کیسا!

## تبت سنو

- جلد کو ریٹیم سی طرح نرم و ملائم بنائے۔
- جھانپاں داغ دھبہ دور کرے۔
- چہرے کی زائد چکنائی کو جذب کرے۔
- جلد کو گرد و غبار سے بچائے۔
- جلد کو عموماً کے اثرات اور جھراؤں سے
- عرصہ دراز تک محفوظ رکھے۔



تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم



## کرن فاطمہ مجلسی

میری عمر 22 سال ہے اور نظر آتی 16 سال کی ہوں۔ اس کی وجہ میرا جسم استھالی دھلا پٹا ہے۔ کمزوری بہت زیادہ ہے۔ پھول بازوؤں اور کمر میں اکثر درد رہتا ہے۔ اور کبھی کبھی پیٹ میں کھانے سے پہلے یا بعد میں درد ہونے لگتا ہے ٹانگوں میں بھی درد رہتا ہے۔ سانس بھی پھول جاتا ہے۔ غصہ بہت آتا ہے۔ کھانا نہیں کھایا جانا بھوک ہونے کے باوجود جی مٹا لگتا ہے۔ بلا وجہ دوسروں پر غصہ آنے لگتا ہے۔ پیٹ کمر سے لگا ہوا ہے اور سیدھا ہو کر چلا بھی نہیں جاتا۔ جس کی وجہ سے دوسروں کی تنقید کا اکثر نشانہ بنی رہتی ہوں۔ میری وجہ سے میری امی جان بہت پریشان ہیں۔ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ پیوٹ کے پاس بھی لے کر گئیں۔ کچھ افادہ نہیں ہوا۔ سب کہتے ہیں بیماری نہیں ہے۔ سمجھ میں اعتدال کی بہت کمی ہے۔ دوسروں کے سامنے آنے جانے سے کتراتے ہوں۔ گھر والوں سے بھی ہر وقت نزوس رہتی ہوں کہ کوئی مجھ پر تنقید نہ کرے۔ میں شادی شدہ بھی ہوں۔ سو سال ہو گیا ہے شادی کو اور میرے شوہر شادی کے ایک ماہ بعد ملک سے باہر چلے گئے تھے اور ابھی تک نہیں آئے۔

میں بہت خوف زدہ ہوں۔ مجھے لگتا ہے چند سال اور زندہ رہ سکوں گی۔ پلیز مجھے میری صحت کی بہتری کے لیے اچھا سا مشورہ دیں جو آسانی سے کر سکوں۔ میرا جسم تھوڑا موٹا ہو جائے اور میری صحت بہتر ہو جائے۔

ج۔ کرن! آپ کا مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ بروحا ہوا وزن کم کرنا مشکل ہے لیکن وزن بروحا ہوتا ہے۔ نہیں ہے۔ آپ کے دھلا پٹے اور دوسری شکایتوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو غذا آپ استعمال کرتی ہیں۔ وہ ٹھیک سے ہضم ہو کر جزیروں میں نہیں جاتی۔ بھوک کی کمی کی وجہ سے آپ کھانا بھی کم کھاتی ہیں۔ بھوک ہونے کے باوجود کھانا نہیں کھایا جاتا جی مٹا رہا ہے۔ اس کی وجہ تیزابیت ہے۔ خالی پیٹ رہنے سے تیزابیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ آپ مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کریں تو ایک ماہ میں نمایاں تبدیلی محسوس کریں گی۔

1۔ پوری نیند لیں۔ نیند کا صحت اور خوب صورتی سے گہرا تعلق ہے۔ بھرپور نیند سے صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ چہرہ

کھل اٹھتا ہے۔ جبکہ نیند کی کمی کی وجہ انسان کا مزاج بڑبڑسا ہو جاتا ہے۔ جسم میں ہر وقت دھوا اور خشک محسوس ہوتی ہے۔ اگر آپ پوری نیند نہیں گی تو وزن میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ اچھی اور خوشگوار نیند کے لیے آپ رات کھانے سے پہلے جسم پر مسروں کے تیل کی مالش کریں پھر نیم گرم پانی سے غسل کریں اس کے بعد کھانا کھائیں۔ کھانے کے ایک گھنٹہ بعد تھوڑی دیر چل قدمی کریں۔ سوئے اور رات کے کھانے کے درمیان دو گھنٹے کا وقفہ ہونا چاہیے۔ سوئے سے پہلے ایک گلاس گرم دودھ کا پیئیں۔ اس سے آپ کو گرمی اور پرسکون نیند آئے گی۔

2۔ ٹینشن اور ذہنی تناؤ سے دور رہیں خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کریں۔ شوہر کی دوری تکلیف دہ ہے لیکن اس کو مسئلہ نہ بنائیں ذہن کو مصروف رکھنے کے لیے مطالعہ کریں۔ سزا بن پرسکون ہو گا تو آپ کو کھل کر بھوک لگے گی اور جو کچھ آپ کھائیں گی۔ وہ صحیح طریقے سے ہضم ہو کر خون بنائے گا۔ ذہنی تناؤ کی کیفیت میں کچھ کھانا فائدہ کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔

3۔ کوشش کریں کہ آپ کی غذا میں مرغن غذاؤں کے بجائے سبزیاں اور چھل زیادہ شامل ہوں۔ چلی مرغی مسالے میں پکی ہوئی سبزیاں صحت کے لیے فائدہ مند ہیں۔

4۔ صبح اٹھ کر کھلی فضا میں گھرے سانس لیں۔ اس سے آپ کے جسم کو آکسیجن ملے گی۔

5۔ دودھ سے بنی ہوئی اشیاء دہی، پنیر زیادہ استعمال کریں۔

6۔ ڈاکٹر کے مشورے سے آئرن یا وٹامن کی ٹیبلٹ لے لیں تو اس سے بھی آپ کی صحت پر بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔

8۔ دودھ کو پانی کی طرح ایک گھونٹ میں نہ پیئیں بلکہ آہستہ آہستہ مزہ لیتے ہوئے پیئیں۔ کھانے کو بہت آہستہ چاکر اور تک کھائیں۔ ان ہدایات پر عمل کرنے سے فوری اثرات تو نمایاں نہیں ہوں گے لیکن کچھ عرصہ باقاعدگی سے عمل کرتی رہیں تو فرق محسوس کریں گی۔